سچی کہانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مارچ 2011

نگران اعلیٰ

معراج رسول

کشور کشا: اہل شہنشاہ کا قصہ جس نے نئی تاریخ رقم کی

فسوں گر: مصر کے انقلاب کے داعی کا دلچسپ خواب

ان کے علاوہ بھی بہت سی دلچسپ سچ بیانیاں، سبق آموز واقعات، معلوماتی مضامین

15 — آزاد منش — سرگزشت — ادارہ
ایک صفحہ میں مکمل، مختصر، مختصر ایک نادر روزگار کا تعارف

16 — شہر خیال — گفت و شنید — مدیر اعلیٰ
آپ کی باتیں، آپ کے خیال، آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

24 — کشور کشا — شخصیت — ڈاکٹر ساجد امجد
اس شہنشاہ کی سوانح حیات جس نے بڑے بڑے بادشاہوں کا تاج پامال کیا

55 — فسوں گر — زندگی نامہ — ابن کبیر
مصر کے انقلاب کا ایک اہم کردار جسے نوبل پرائز کا حق دار قرار دیا گیا

71 — تاج محل — تاریخ — ذوالفقار ارشد گیلانی
محبت کی لازوال نشانی کی تاریخ، ایک دلچسپ مضمون

83 — فلمی الف لیلہ — فلم و صحافت — علی سفیان آفاقی
فلم و صحافت کی کہی ان کہی کہانیاں، معروف قلمکار کے حقیقی شب و روز

111 — شیر پا — مہم جوئی — مختار آزاد
ایک ہلمت قبیلے کا تعارف جس کی زندگی کا محور برف پوش پہاڑ ہیں

125 — مسجد وزیر خان — مناظر پاکستان — زلفی شاہ
شہر لاہور کی پہچان بن جانے والی مسجد کا مختصر سا تعارف

130 — سورج کا دیس — سفر کہانی — الطاف شیخ
اگتے سورج کی سرزمین پر گزرے ایام کی روداد پر اثر

147 — شیرنیوں کا قاتل — شکار کتھا — شمیم حیدر
ایک عجیب فطرت شیر کے شکار کا پر لطف قصہ

154 — جنگل کلب — جرم و سزا — سید احتشام
بھارت کی ایک مشہور ہستی سے جڑی قتل کی واردات کا ماجرہ

161 — دانا بینا — حیرت انگیز — شکیل ادریس
اس ہوائی جہاز کی تباہی یقینی تھی تمام انجن بند ہو چکے تھے کہ معجزہ ہو گیا

168 — سراب — معاشرت — کاشف زبیر
بے مثل ولولوں سے گندھی تہلکہ خیز داستان، ایک دلچسپ تحریر

205 — بیت بازی — شعر و ادب — قارئین
شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک دلچسپ سلسلہ

206 — علمی آزمائش — انعامی مقابلہ — ادارہ
ذہین قارئین کے ذوق جستجو کی تسکین کے لیے منفرد انعامی سلسلہ

210 — بادِ سموم — پہلی سچ بیانی — ڈاکٹر شائستہ
ایک ڈاکٹر کی کتھا، اسے علاج کے لیے ڈاکوؤں نے اغوا کیا تھا

229 — دشتِ جنوں — دوسری سچ بیانی — اکمل
وہ قتل کرنے نکلا تھا مگر بغیر قتل کیے سزا خود ہی قبول کر لی

243 — پچھتاوا — تیسری سچ بیانی — ماریہ عرفان
اپنی زندگی خود تباہ کر لینے والی دوشیزہ کی داستانِ عبرت

251 — ستم رسیدہ — چوتھی سچ بیانی — ماجد
ایک عاشقِ زار کی کھلکھلاتی ہوئی داستانِ محبت

259 — فیصلہ — پانچویں سچ بیانی — سجاد علی
معاشرہ کس سمت جا رہا ہے کہ والدین کی جان بھی اپنے گھر میں محفوظ نہیں

265 — بڑا آدمی — چھٹی سچ بیانی — منظر امام
ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے یہ دنیا قائم ہے

270 — وفا پرست — ساتویں سچ بیانی — نفیس
وہ ایک کمین فطرت شوہر کی بیوی تھی مگر باوفا تھی

277 — چراغِ آخرِ شب — آٹھویں سچ بیانی — نعیم احمد
گناہ کتنا ہی مخفی کیوں نہ رہے، سزا ملتی ہی ملتی ہے

287 — طمانچہ — نویں سچ بیانی — توقیر علی خان
اس نوخیز دوشیزہ نے اس کے گال پر ایک نادیدہ طمانچہ رسید کیا

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

✪ تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

آزاد منش

سرگزشت

تحصیل نارووال کے گاؤں کالا قادر میں ایک چرواہا رہا کرتا تھا۔ اس کا نام سلطان محمد خان تھا۔ اس چرواہے نے اپنی کوشش سے تعلیم حاصل کی اور پھر لندن سے بیرسٹری بھی پاس کرلی۔ اسی سلطان محمد خان کے گھر 13 فروری 1911ء کو ایک بچے نے جنم لیا۔ اسے ابتدائی تعلیم مولوی ابراہیم سیالکوٹی نے دی پھر اسے اسکاچ مشن ہائی اسکول میں داخلہ دلوایا گیا۔ اسی اسکول سے اس نے 1927ء میں میٹرک کیا پھر مرے کالج سیالکوٹ سے انٹر کیا اور 1934ء میں اورینٹل کالج سے انگریزی میں ایم اے کرلیا۔ 1917ء میں انقلاب روس کے بعد مارکس اور اینجل نے کمیونسٹ نظریات کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ ان نظریات کا اثر اس پر بھی پڑا اور جب 1935ء میں ڈاکٹر تاثیر، ڈاکٹر ملک راج آنند، صاحب زادہ محمود الظفر اور سجاد ظہیر نے ترقی پسندوں کی انجمن بنائی تو یہ بھی اس میں شامل ہوگیا۔ 1936ء میں بنے بھائی (سجاد ظہیر) نے لکھنؤ میں ترقی پسند مصنفین کا اجلاس بلوایا جس کی صدارت منشی پریم چند نے کی تھی۔ وہ بھی اس اجلاس میں شرکت کرنے پہنچ گیا اور واپس امرتسر آ کر ترقی پسند مصنفین کے لیے زور شور سے کام کرنے لگا۔ 1938ء میں ایم اے او کالج امرتسر میں متعین گورنر پنجاب سلمان تاثیر کے والد ایم ڈی تاثیر پرنسپل ہوا کرتے تھے۔ ان کے ہاں اس کا آنا جانا خوب تھا کیونکہ وہ بھی تو اسی کالج میں 1935ء سے انگریزی پڑھا رہا تھا۔ تاثیر کی بیگم جرمن نژاد تھیں، ان کی ایک بہن بھی جرمنی سے آئی ہوئی تھی۔ اس جرمن دوشیزہ سے اس کی قربت بڑھنے لگی پھر یہ قربت 1941ء میں شادی پر منتج ہوئی۔ نکاح کشمیر کے مقبول رہنما شیخ عبداللہ نے پڑھایا۔ کچھ دنوں تک وہ دونوں میاں بیوی امرتسر میں رہے پھر اس نے ایم اے او کالج کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور میلی کالج آف کامرس لاہور آ گیا لیکن زیادہ عرصہ وہاں بھی ٹک نہ سکا اور فوج کے شعبہ نشر و اشاعت سے وابستہ ہو کر دہلی چلا گیا۔ یکم جنوری 1947ء میں اس نے فوج سے بھی استعفیٰ دے دیا۔ جب وہ فوج سے مستعفی ہوا تو لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر تھا۔ انگریزی حکومت نے اس کی خدمات کے اعتراف میں اسے ایم۔ بی۔ ای کا اعزاز دیا، پھر وہ لاہور آ گیا۔ اب وہ دنیائے ادب میں معتبر مانا جانے لگا تھا۔ یہاں آ کر وہ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ سے جڑ گئے۔ پاکستان ٹائمز، روزنامہ امروز اور ہفت روزہ لیل و نہار کی ادارت سنبھال لی۔ تقسیم کے وقت فسادات میں انسانیت کی جو تذلیل ہوئی اس پر خوب لکھا۔ ایک ایک اداریہ لہو رُلا دینے والا ہوتا تھا۔ ٹریڈ یونین فیڈریشن کے نائب صدر بھی تھے اسی حیثیت سے آئی ایل او کے عالمی اجلاس میں شرکت کے لیے سان فرانسسکو چلے گئے۔ وہاں سے لوٹے ہی تھے کہ 9 مارچ 1951ء میں راولپنڈی سازش کیس کے تحت گرفتار ہوگئے۔ 20 اپریل 1955ء کو رہائی ملی تو پھر سے پاکستان ٹائمز کی ادارت سنبھال لی مگر زیادہ عرصہ تک وہاں رہ نہ سکے اور مستعفی ہو کر فلمی دنیا میں آ گئے۔ اختر کاردار کی درخواست پر فلم ''جاگو ہوا سویرا'' کے مکالمے اور گانے لکھے پھر تاشقند کانفرنس میں شرکت کرنے چلے گئے۔ وہاں سے واپس آئے تو پاکستان میں مارشل لا لگ چکا تھا۔ فوجی قانون کے تحت پھر سے گرفتار کرلیا گیا۔ 9 ماہ بعد فوجی حکومت نے رہا کیا تو انھوں آرٹس کونسل کا سربراہ بنا دیا گیا مگر آزاد منش کب دباؤ میں رہ سکتا ہے۔ انسانیت کی آزادی کے لیے لڑتے لڑتے بالآخر نومبر 1984ء کو کرامویل اسپتال لندن میں زندگی سے آزاد ہوگئے۔ اس آزاد منش کو دنیا فیض احمد فیض کے نام سے پہچانتی ہے۔

شہر خیال

ایم اے خالق بھٹی، صدر پریس کلب اللہ آباد، ضلع رحیم یار خان سے لکھتے ہیں ''اس دفعہ سرگزشت 22 جنوری کو مل گیا تھا۔ انکل نے اردو بیسٹ میں کتابوں کے حوالے سے فکر مندی کی جھلک تھی۔ برصاحب علم، قلم معاشرے کی زوال پذیری پر فکر مند رہتا ہے اور رہنا چاہیے جہاں تک مطالعے کی بڑھتی ہوئی کمی کی عادت ہے تو یہ معاشرے کے لیے بھی خطرناک ہے کیونکہ شائع شدہ تحریریں ذہن میں محفوظ رہتی ہیں جبکہ دوسرے ذرائع فوراً اڑ کھا کر معدوم ہو جاتے ہیں۔ میرے خیال سے مطالعہ کی کمی کی اصل وجہ ڈش چینلز ہیں جن نے ہمیں کتاب سے دور کر دیا ہے اور یہ کتابوں سے دوری خطرناک ہے۔ معاشرے کے زوال کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ اس پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

مختصر سرگزشت میں یاس یگانہ چنگیزی کا تعارف بہت خوبصورت الفاظ میں کرایا گیا۔ اپنی منفرد شاعری کے حوالے سے ان کا نام ادب کی دنیا میں خاصا مشہور ہے۔ ذوالفقار ارشد گیلانی نے مشہور و معروف تاریخی داستان لیلیٰ مجنوں کا قصہ بتایا، اس سے قبل کئی لکھنے والوں نے اس داستان کو پڑھ چکے ہیں، فلمیں بھی دیکھ ڈالی ہیں لیکن تفصیل سے اب پڑھا ہے، ویلڈن سرگزشت۔ خطائی کے حوالے سے مختار آزاد کا مضمون اور 2010,11 کی شہرت یافتہ شخصیت وکی لیکس کے بانی کے بارے میں ابن کبیر نے لکھا جو مختصر ضرور ہے لیکن خاصی معلومات سے مزین تحفہ ہے اور اچھی معلومات صرف اور صرف سرگزشت میں ہی ملتی ہیں۔ قلمی الف لیلہ میں آفاقی صاحب نے جوش ملیح آبادی کے بارے میں اچھا لکھا۔ جوش کی شاعری آفاقی ہے مگر سیاست و کدورت نے ان کے خلاف زمین ہموار کی اور ایک محاذ کھڑا کر دیا۔ جس شخص نے پاکستان کی محبت میں سب کچھ ٹھکرا دیا اس کے ساتھ ہم نے کتنا برا سلوک کیا، آہ بابا وڈا اور لالی وڈ کے بارے میں زیادہ لکھیں، بابا وڈ کے بارے میں کم لکھیں تو اچھا ہے۔ ٹمک کا شہر کی دوسری قسط میں ذلفی شاہ اور سورج کے دیس میں الطاف شیخ کی معلومات بہت اچھی تھی۔ معلومات کی ترسیل کا خواہاں سرگزشت کا ہے وہ یہیں اور نظر نہیں آتا اسی لیے یہ ڈائجسٹ کامیاب ہے۔ سچ بیانیوں میں اریشہ غزل کی بے حس لوگ میں دلچسپ فقروں اور کہانی کی تکلمت بہت بہت اچھی تھی۔ یقیناً اس شمارے کی نمبر ون کہانی شمار ہوگی۔ سسٹر ماریہ عرفان کی عرصہ بعد واپسی پر مسرت ہوئی۔ سسٹر، اب آئی ہو تو بہاروں کی طرح جمے رہنا، میدان مت چھوڑنا۔ اعجاز حسین سنگھار عمرہ کی سعادت حاصل کرنے پر بہت بہت مبارک باد۔ اے ایس ابوالفضل اس دفعہ تو گلکاروں کے چکر میں ہمسایوں کی خبر گیری کرنا بھی بھول گئے۔ ملک ثاقب شاہ نولی پاکستان کی واحد چیز مہنگائی ہے جو آسمان کو چھو رہی ہے، اس کو کہتے ہیں ترقی؟ سسٹر سدرہ ہانو ناگوری بہت مشکور ہوں جو مجھے اپنا ننھا منا سا بھائی بنا لیا ہے۔ بتائیں آپ کی اس نیکی کے بدلے کیا دعا مانگوں۔ اس مرتبہ میرے تین سچے ہمسائے مکرم نیاز، اظہار الحسن اور ثاقب حسن خان کی آمد میرے دل کو سرور کر گئی لیکن محمد حکیم شاہ غائب تھے، کیوں بھائی؟ اس، فدشہر خیال میں سسٹر صائمہ رمضان، رانا محمد شاہد، ملک جاوید، محمد خان سرکانی، راجا ثاقب نواز ثاقب، سسٹر روبینہ ثاقب انصاری، ارشد علی کے تبصرے اچھے بھی تھے اور معلومات بھی لیے ہوئے تھے۔ شہر خیال میں خطوط کی زیادہ تعداد سے رونق بڑھنے پر سرگزشت کی پوری ٹیم کو مبارک باد۔''

رانا محمد شاہد نے بورے والا سے لکھا ہے ''اداریہ نہایت ہی اہم موضوع پر تھا۔ اپنی زبان اور کتابوں سے دوری اس قدر بڑھ چکی ہے کہ اب لوگ کتابیں خریدنے اور پڑھنے کو پیسے اور وقت کا زیاں سمجھنے لگے ہیں۔ مجھے اکثر عارف کا وہ جملہ یاد آ رہا ہے جو انہوں نے اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں کہا تھا کہ ''ہمارے ملک میں جو لوگ پانچ پانچ ہزار روپے کے کباب کھا لیتے ہیں مگر چند سو روپے کتابوں پر خرچ نہیں کر سکتے۔'' شہر خیال میں تبصرہ آپ کو ایک ماہ بعد ملا، حیرت ہے کوریئر کے ذریعے تو اگلے دن پہنچ جاتا ہے؟ (اس کا جواب کوریئر والے ہی دے سکتے ہیں) ذوالفقار ارشد گیلانی نے تاریخی قصہ عشق کو ایک نئے مگر خوبصورت انداز میں بیان کیا، عشق کی یہ اصول داستان یہ ثابت کرتی ہے کہ انسان اس دنیا کے فانی سے چلا جاتا ہے مگر عشق و محبت کے وجذبے امر ہو جاتے ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات تخلیق کی۔ ''خوش قلم'' خطائی کی تاریخ پر مختار آزاد نے ایک معلوماتی مضمون تحریر کیا۔ دور حاضر کے سب سے متنازع موضوع یعنی وکی لیکس کے انکشافات کے ذریعے دنیا بھر کی توجہ حاصل کرنے والے جولین اسانج کی زندگی پر لکھا گیا مضمون زبردست تھا۔ آپ اندازہ لگائیے کہ ایک رپورٹ کے مطابق اس وقت وکی لیکس کا بانی دنیا کا بااثر ترین شخص قرار دیا جا رہا ہے۔ جبکہ چند ماہ پہلے تک لوگ شاید اس کے نام سے بھی واقف نہ تھے۔ ٹمک کے شہر یعنی کیوزہ کے حوالے سے ذلفی شاہ نے دلچسپ اور معلوماتی مضمون لکھا۔ اگر حکومت پاکستان ٹمک کے اس شہر کی طرف توجہ دے تو یقیناً اس سے زیادہ سالانہ ریونیو حاصل ہو سکتا ہے۔ سورج کے دیس کا دورا اور غالباً آخری حصہ تھا۔ شکاریات پسند کرنے والوں کے لیے سید احتشام کا قصہ شکار دلچسپ اور ایڈونچر سے بھرپور تھا۔ سچ بیانیاں ابھی پڑھی نہیں لیکن یقیناً سرگزشت کے روایتی معیار کی ہوں گی۔''

خالد کمیر کی گل افشانی، لاہور سے ''اداریہ کتابوں کی دکان پر تھا۔ یعنی کتب فروش کے پاس۔ بدقسمتی سے ہماری کئی اچھی روایات وقت کے ساتھ دم توڑ رہی ہیں اور ان میں کتاب دوستی آخری نہیں۔ پہلے گلی محلوں میں چھوٹی چھوٹی سی لائبریریاں ہوا کرتی تھیں جہاں پر کفایت سہ اس دکتب سموی کرایہ پر مل جایا کرتی تھیں۔ میں نے بھی اپنے بچپن کے ایام میں ایسی لائبریریز سے استفادہ کیا لیکن آہستہ آہستہ ان لائبریریوں کی جگہ، ویڈیو سینٹرز نے لے لی۔ آج میرے ذہن میں ایک سوال بار بار اٹھتا ہے کہ ہمارا کتب سے تعلق ایک مجبوری کے تحت تھا جب ہمیں کچھ نہیں میسر تھا تو ہم کتاب کا مطالعہ کرتے تھے اور جیسے ہی یہ مجبوری ختم ہوئی، ہم نے کتب بینی سے اپنا تعلق توڑ لیا۔ یاس یگانہ چنگیزی کا مختصر تعارف ہوا۔ شہر خیال میں اعجاز حسین سنگھار صاحب مسلم صداقت پر پورا اترتے آئے۔ اعجاز صاحب، آپ کو عمرے کی سعادت کی مبارک باد۔ تبصرہ خوب لکھا۔ شمیم حیدر طارق، اے ایس ابوالفضل، اکبر ترین کے تبصرے بھی جاندار تھے۔ محمد یہ برکت مغل آپ کی شکایت کا ازالہ کیا جائے گا۔ علی محمد فرخ دسمی، سدرہ ہانو ناگوری، ملک ثاقب شاد نولی، راجا ثاقب نواز ثاقب، تبسم ثمانی، بکرم نیاز، فیصو عثمن آپ تمام کا بہت بہت شکریہ پھر سے مبالغہ تبصرے کو پسند کرلے گا۔ آخر میں انتساب عباس کو یہی کہنا چاہوں گا کہ خط با مقصد یا معنی لکھا کریں۔ ذوالفقار ارشد گیلانی لیلیٰ مجنوں کی کہانی کے ساتھ حاضر تھے۔ نہ صرف کہانی بیان کر رہے تھے بلکہ تمام تاریخی پس منظر کو بھی بیان کیا۔ خطائی کی تاریخ پر مضمون بہت معلوماتی تھا۔ چند ماہ سے مقبول ویب سائٹ وکی لیکس کے بانی کی داستانِ حیات بھی پڑھی۔ ذلفی شاہ دنیا کی دوسری بڑی نمک کی کان کی سیر کروا رہے تھے۔ سچ بیانیوں میں خوش نصیب لڑکی خوش نصیب ثابت ہوئی، بظاہر محبت کرنے والے اور اچھے کردار کے مالک شخص نے اسے کیسا دھوکا دیا جبکہ بعد میں آنے والا شخص جو بظاہر اچھے کردار کا نہیں لگتا تھا لیکن اس نے اپنی زندگی بدل ڈالی۔ شاید اپنی مجبوری کو کم کرنے کی خاطر زندگی کے اطوار بدل ڈالے۔ بے حس لوگ میں ایسی ستم زدہ خاتون کی کہانی پڑھی جو تمام عمر ظلم سہتے سہتے آخر خودکشی پر مجبور ہوئی۔ انسان آخر کہاں تک ظلم اور بے حسی برداشت کر سکتا ہے۔ چھوٹی سی خبر میں ماں کی محبت کا قصہ پڑھا۔ اس مرتبہ پازیٹو پے بھی خوب تھے۔ مارخور پاکستان کا قومی جانور ہے اور اس کی نسل کو بچاؤ کی خاطر IUCN نے اس کے شکار پر پابندی لگا رکھی ہے۔''

افتخار احمد گھمن، لاہور سے لکھتے ہیں ''اس مرتبہ یاس یگانہ چنگیزی کا مختصر تعارف ہوا۔ شہر خیال میں اس مرتبہ اعجاز حسین سنگھار، شمیم حیدر، اے ایس ابوالفضل کے خطوط اچھے لگے۔ رانا محمد شاہد، راجا ثاقب نواز ثاقب کے تبصرے بھی اچھے لگے۔ ذوالفقار ارشد گیلانی صاحب لیلیٰ مجنوں کا قصہ تاریخی پس منظر میں پیش کر رہے تھے۔ محبت کرنے والوں میں ہمارے ہاں جو مقام لیلیٰ مجنوں کے قصے کا ہے وہ دوسرے عشقیہ قصے نہیں لے سکے۔ وکی لیکس کے بانی کی حیات کے چند اوراق ایک کیے گئے۔''

مونا گل کا ضلع بنوں سے اظہاریہ ''سرگزشت کی ترقی کے لیے دعاؤں کے اظہار اور سرگزشت کی کامیابی پر ڈھیروں مبارک باد۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔ (خوش آمدید شکریہ) ابھی سرگزشت مکمل نہیں پڑھا۔ میں سرگزشت کا ایک ایک صفحہ بڑے غور سے پڑھتی ہوں۔ سچی بات ہے کہ سرگزشت سے میرا تعارف سراب کی وجہ سے ہوا۔ میں ڈائجسٹ پڑھنے کی شوقین نہ تھی، نہ ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ سرگزشت پڑھے بغیر چین نہیں آتا اور خاص کر سراب کا بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔ شہباز میرا آئیڈیل ہے۔ مجھے شہباز کے کردار سے ایک انجانی سی محبت ہے۔ سراب کہانی مجھے اپنی پسند ہے کہ شہر خیال میں جو بندہ پابندی سے سراب کی تعریف کرے مجھے وہ تعریف کرنے والا بھی اپنا لگتا ہے۔ بس زندگی میں اتنے شوق، اتنی محبت اور اتنی لگن سے اب تک کوئی کہانی نہیں پڑھی۔ (سراب کے مصنف کا شکریہ زیبر کی طرف سے شکریہ) سرگزشت میں اکثر سچ بیانیاں ہوتی ہیں جو ہم جیسی نادان لڑکیوں کی آنکھیں کھول دیتی ہیں، خاص کر ان لڑکیوں کی جو معاشرے اور ان کے افراد سے بے خبر ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو اس کا اجر عطا فرمائے، آمین۔ سرگزشت رہنما ڈائجسٹ ہے جس میں زندگی کے ہر معاملے اور ہر مسئلے کو اس خوبصورت انداز سے کہانی کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے کہ جس کا کوئی ثانی نہیں۔ تمام کہانیاں بے حد اعلیٰ معیار اور اخلاقی دائرے کی حدود میں لکھی جاتی ہیں۔ میں سرگزشت کی مستقل قاری ہوں اور ارد گرد کے تمام رشتے داروں اور سہیلیوں، دوستوں کو بھی اس کا گرویدہ بنا لیا ہے کیونکہ میں جتنی تعریف کروں، پڑھنے کے بعد سب اسے میرے بیان سے کہیں زیادہ سراہتے ہیں۔ اس ماہ کی سچ بیانیاں بے مثال تھیں۔ بے حس لوگ، دینے والا اور پناہ گاہ، بہت بہت سبق آموز رہیں۔ بے حس لوگ میں زیبا کے کردار اور موت نے بہت رلا دیا۔ یہ ہمارے معاشرے کا ایک حقیقی رنگ ہے۔ سلمان جیسے مرد جو شہر بھی بن جاتے ہیں، ہمارے گرد و پیش میں بہت موجود ہیں خاص کر ہمارے بنوں کے شہر میں۔ دینے والا میں ظفر شاہد صاحب کی غربت نے بہت رلا دیا اور اردو ادب کی ناقدری کا بہت دکھ ہوا۔ معلوم نہیں ہمارے ذہن کیوں غلام ہیں، کیوں انگریزی بولنے اور سیکھنے پر فخر کرتے ہیں۔ ویسے تو ہم لوگ پرائے کپڑے اور جوتے استعمال نہیں کرتے لیکن غیر ملکی چیزوں پر ہمیں فخر ہوتا ہے، آخر کیوں؟ پناہ گاہ بھی بے حد حقیقی ہے۔ اس طرح کے کردار ہمارے معاشرے میں بے حد عام ہیں۔ خوش نصیب میں زرینہ ہی خوش نصیب تھی، ایسا نصیب ہر لڑکی کا نہیں ہو سکتا۔ عورت ایک کھلونا ہے عام سے انتقام جتنا لیا وہی کافی تھا۔ ایمن جیسی معصوم لڑکی کو صرف اغوا کروانا ہی گناہ تھا۔ شاید اس کی معصومیت ہی اسے لے ڈوبی۔ میں بے قصور ہوں میں عبید کو ایک مقام پر بھی خفگ نہ آئی۔ زندگی میں محبت ہوتی ہے لیکن کسی کو خدا بنا لینا بھی ٹھیک نہیں ہوتا، اللہ معاف فرمائے، آمین۔ چھوٹی سی خبر پڑھ کر افسوس اور دکھ ہوا۔ غیر مسلم، غیر ملکی راہنما کی کہانی شائع نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اس میں اسپتال اور ڈاکٹر کا تعارف اچھا نہیں لگا۔ بھارت میں جتنی غربت عام ہے اس کا

سب کو علم ہے، ماضی میں ان غیر مسلموں نے ہم مسلمانوں پر جتنے ظلم کیے ہیں اسے بھولنا پرلے درجے کی بے وفائی ہے۔ پلیز! اتنے بہترین ڈائجسٹ میں ایسا غیر معیاری کام نہ ہو۔ اگر میرے خط کا یہ حصہ آپ مصلحتاً شائع نہ کریں لیکن آپ سب میری اس بات پر غور ضرور کریں۔ لیٹی بخوں تو براہ کرم 151 پر ایم اے واحد کا ''امریکا میں جرائم کی رفتار'' پڑھ کر دل خوش ہوا۔ اگر اس طرح ہمارے لوگ، ہماری کتابیں اور ہمارے ڈائجسٹ غیر مسلموں کی خامیاں بیان کریں تو اس سے اعلیٰ بات اور ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ اس طرح ہی ہم لوگوں میں غیر مسلموں کی ترقی سے متاثر ہونا، ان کی اشیا استعمال کرنے پر فخر کرنا، ان سے مرعوب ہونا اور ہمارے دلوں سے ان کی قدر و قیمت ختم ہو جائے گی۔ یہ سچ ہے کہ صرف آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت اور قرآن کی اتباع میں ہی ہماری کامیابی و کامرانی ہے۔''

✉ **ملک ثاقب شاد تونسہ ایڈووکیٹ** کی آمد، حویلیاں ایبٹ آباد سے لکھتے ہیں ''فروری کا شمارہ 26 جنوری کو ملا، سرورق پر خوبصورت حسینہ آنکھوں میں سپنے اور ارمان لیے کسی کی منتظر نظر آئی ساتھ ہی دل لیکس کے باقی جولین اسانج کسی گہری سوچ میں محو۔ پُرتاثیر اداریہ میں آپ نے نئی نسل کو کتابوں کی اہمیت بتائی اور مطالعہ کی عادت کی نصیحت کی۔ واقعی دورِ جدید میں مطالعے کا شوق بہت کم ہو کر رہ گیا ہے جس کی ایک وجہ تو میرے خیال میں تیز رفتار اور مصروف زندگی ہے۔ انسان زندگی کے دیگر جھمیلوں میں اتنا الجھ گیا ہے کہ اسے مطالعے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ دوسری وجہ معیاری کتابوں کا فقدان بھی ہے۔ شہروں میں بھی شاید ہی کوئی ایک بک شاپ ہو جہاں ہر قسم کی کتب دستیاب ہوں۔ بہرحال آپ سے اتفاق کروں گا، نوجوان نسل کو مطالعہ کی طرف ضرور راغب ہونا چاہیے اور آپ نے بجا فرمایا کہ اگر کسی کو کوئی اچھی کتاب دی جائے۔ میں خود کتاب کو بہترین تحفہ سمجھتا ہوں اور جب مجھے کوئی تحفے میں کتاب دیتا ہے تو دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ مختصر سرگزشت میں اس دفعہ ایک ادبی شخصیت شامل تھی، پسند آئی۔ شہر خیال میں قدم رکھتے ہی اعجاز حسین ستھارصاحب کو کرسیٔ صدارت پر فائز دیکھا۔ ستھارصاحب طویل مفصل اور دلچسپ تبصرہ کے ساتھ حاضر تھے۔ ویسے ستھارصاحب آپس کی بات ہے برا نہ مانیں تو اپنی عمر بتا دیں، تاکہ آپ کی شان میں مذاق ہی مذاق میں کوئی گستاخی نہ ہو جائے۔ سدرہ بانو ناگوری کا تبصرہ پسندیدگی کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر رہا۔ محترمہ سچ مچ کا جھنڈا اٹھائے میدانِ کارزار میں اپنی ہی ہم جنس کے خلاف برسرِ پیکار نظر آئیں۔ میں بھی محترمہ سے اتفاق کروں گا کہ بے شک آج کل کی لڑکیاں سوائے چند ایک کے بعض اوقات اپنے لیے غلط فیصلے کر کے اپنی انا اور زندگی داؤ پر لگا دیتی ہیں اور پچھتاوا ہی ان کا حاصل ہوتا ہے۔ رانا محمد شاہد کی کرپشن کی عالمی رینکنگ کے ساتھ حاضر ہوئے۔ رانا جی کیا ہو سکتا ہے، ایسے حالات میں جب کرپشن، رشوت عروج پر ہو اور جب اتنی کرپشن میں بھی کرپشن ہوتو باتوں سے کیا گلہ۔ جناب! بھکر کے رویندہ ثاقب انصاری بہت مختصر تبصرے کے ساتھ محفل کی رونق بنیں۔ رویندہ جی غالباً آپ عمرہ کی ادائیگی سے واپس آئی ہیں، آپ کو بہت بہت مبارک باد۔ امید ہے کہ ہم گناہ گاروں کے لیے اللہ کے حضور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہوں گے۔ ماریہ عرفان گھوڑے دوڑاتے دوڑاتے شہر خیال میں آگئیں۔ اچھا اور دلچسپ تبصرہ تھا۔ ماریہ جی، ہماری مس بھی مس Miss ہیں دعا کریں ہم بھی مس کو مس کرنے کی تکلیف سے نجات پائیں اور ہماری زندگی میں بھی مس آ جائیں جنہیں ہم بہت مس کرتے ہیں۔ اکبر تین شمارے کے انتظار کرنے پر شکوہ کر رہے تھے۔ تین صاحب، جو چیز انتظار کے بغیر حاصل ہو وہ اپنی اہمیت کھو دیتی ہے اور سرگزشت جیسے زبردست رسالے کو حاصل کرنے کے لیے انتظار جیسی کٹھن صورتحال کو برداشت کرنے کے بعد ہی پڑھنے کا مزہ آتا ہے، تبصرہ اچھا تھا۔ دیگر تبصروں میں راجا ثاقب نواز ثاقب، مکرم نیاز ثاقب حسن خان کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ کچھ نئے چہرے بھی نظر آئے۔ بہت اچھا لگا۔ ارے ہاں، یہ سعید احمد چانڈیو، ایم اے خالق بھٹی، کہیل احمد کھتری اور کشوری صاحبہ محفل سے غائب ہیں ..... جناب، آپ سب لوگ کدھر چلے گئے، واپس آیئے، حاضری لگوایئے ورنہ ڈائرکٹ گرفتاری جاری ہو جائیں گے۔ چرت کہتا خبرتہ ہوئی۔ اور یہ سسٹر قرۃالعین ایڈیکٹ، آپ تو عید کا چاند ہو گئیں، کہاں ہیں؟ کن حالات میں ہیں؟ ٹھیک تو ہیں نا آپ! عرصہ ہوا آپ نے حاضری نہیں دی۔ ارے آپ اپنی برادری کی ہیں، بار کی بدولت معافی ہے۔''

✉ **اعجاز حسین ستھار**، نور پور تھل سے ''اس بار زیادہ خطوط کو جگہ دی گئی ہے، کئی نئے نام بھی سامنے آئے ہیں۔ سید امتیاز بخاری کے علاوہ پرانے لکھاری غیر حاضر ہیں، یہی وجہ ہے کہ رنگ جم نہیں سکا بس روایتی انداز میں سب نے محض حاضری لگائی ہے۔ کردار وں کی کھوج، مشورے اور نوک جھونک والے تبصروں کی کمی ہے۔ (آپ شروع کریں اور پھر آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا!) لیلیٰ مجنوں کی داستان ہم سب سے سنتے آ رہے ہیں لیکن یہاں کئی مستند معلومات ملیں، سچی بات ہے یہ پہلی بار انکشاف ہوا ہے کہ دونوں کرداروں کا تعلق عرب سرزمین سے ہے اور یہ بات سونی صد درست اور قابل توجہ ہے کہ اس تحریر کو اردو ادب میں ایک اضافہ سمجھا جا سکتا ہے۔ فلمی الف لیلہ پڑھتے پڑھتے ہم بابا بن گئے ہیں۔ چلتے ہوئے کمر پر سہارا کے طور پر اور خود کو سیدھا رکھنے کے لیے ہاتھ رکھنا مجبوری بن گیا ہے، لگتا ہے ہماری جوانی اور تندرستی کے سنہری دن علی سفیان آفاقی نے چرا لیے ہیں کیونکہ وہ جواں سال ہوتے جا رہے ہیں۔ اس بار بھولی بسری یادوں کو تازہ کرنے کے لیے تصاویر دی گئی ہیں جس سے مزہ دوبالا ہو گیا ہے۔ نمک کا شہر پڑھ کر حیرت زدہ رہ گئے، ہم کہاں کہاں گھوم آئے لیکن اپنے قریب کے جوہ اور پاکستان کے خزانے کو دیکھنے کی زحمت نہ کر سکے حالانکہ اس میں کتنے دلچسپ نظارے ہمارے منتظر ہیں۔ سچ، سچ، پچاس فٹ چوڑی چھتیں، مینارِ پاکستان کا ماڈل، دیوارِ چین، شملہ پہاڑی اور کتنے بے شمار ماڈل تخلیق کیے گئے ہیں جن میں ہنرمندوں نے مختلف رنگوں کا

نمک استعمال کر کے قابلِ دید بنا دیا ہے۔ ہماری بیگم اپنے نمک کے ترجیح کورس کے آخر میں یہاں کے نظارے دیکھ چکی تھیں، وہ اب ہم پر سبقت لے جانے کی وجہ سے فخر محسوس کر رہی ہیں۔ مجھے بھی ٹریفک بھانے کے لیے اس سفر کے لیے وقت نکالنا ہوگا۔ (کم اللہ، امید ہے کہ آپ کا یہ سفر خیریت کار آمد اور مطلوباتی ثابت ہوگا، یوں بھی آپ دہرائی جدید اشاعت مرتب کرتی ہے) سراب پچھلی قسط کی طرح اب کی بار بھی بنگاہ خیز رہی اور ہم ظہیر ظہیر کر اور انس بحال کر کے پڑھتے اور آگے بڑھتے رہے۔ کاشف ظہیر صاحب ہاتھ ہولا رکھتے ہوئے گزوردل قارئین کا خیال رکھیں، آج کل یہ سلسلہ عروج پر ہے۔ سسپنس، دلچسپی اور روانی کی جتنی تعریف کی جائے، کم ہے۔ ہم شریف کی صحت یابی کے لیے گمرمند ہیں لیکن امید ہے شبہاز اس صدمے سے بچ جائیں گے۔ ناول جاذبِ توجہ بن گیا ہے اور اب یہ جوزفی کتنی کا کارنامے سرانجام دے گی، کہانی کا اختتام انتہائی دلچسپ موڑ پر ہوا ہے اس لیے مارچ کے شمارے کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ اب اپنے پسندیدہ، جسے ٹھن ٹھن کی بیانوں کی طرف آتے ہیں۔ خوش نصیب کی زرینہ کے سیدھی راہ سے بھٹک جانے پر حیرت نہیں ہے، بھلا اس کی عمر دیکھیے، یہی کوئی سترہ سال رہی ہوگی، یہ تو لڑکیوں کے ہنسنے کھیلنے اور کدکڑیاں بھرنے کے دن ہوتے ہیں ایسے میں انہیں ورغلانا مشکل کام نہیں ہے پھر سرفراز کا یہ پہلا شکار نہیں ہوگا، وہ ماہر شکاری تھا بھی سارے انتظامات کر لیے، حاملہ ہونے کا محض بہانہ تھا وہ کسی نئی بھولی لڑکی کو تاڑ رہا ہوگا۔ اس لیے بساط لپیٹ کر چلتا بنا اور کبھی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت نہ کی۔ زرینہ کو اپنی بے گناہی اور معصومیت کے صلے میں نیا ساتھ ملا ہے جتنے گناہ، ثواب اور رزق حلال کا ادراک ہے اس لیے پُرسکون گھریلو زندگی سے آراستہ ہے اب دونوں کو اپنی بے اعتبار زندگی کے بدلے میں ایسی راتیں ملی ہیں وہ جتنا سجدۂ شکر ادا کریں، کم ہے۔ عورت ایک کھلونا کے انجام نے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ میں اپنے طور پر سمجھتا ہوں، عامرہ نے انتقام میں جو قدم اٹھایا، سراسر غلط فیصلہ تھا، اسے نارمل زندگی گزار کر خوشیاں سمیٹنی تھیں، جیسے تیسے ہارون یوسف کو اس دھندے سے روکنا تھا لیکن وہ خود طاقت کے نشے میں ہوش کھو بیٹھی۔ اس کے بچانے دولت کے حصول کے لیے ناانصافی اور ظلم کیا لیکن خود اس نے دولت کی طاقت کے بل بوتے پر حاکم بنا لیا۔ ایمن کو جتنی اذیت دے کر وہ درندہ بن بیٹھی تھی۔ اسے مظلومیت سے سبق سیکھنا تھا لیکن الٹا دوسروں کو ذلیل کرنے کا مشن اپنا لیا اور عمر کے کسی دور میں بھی تسلی نہ ہوئی اور آخر ساری سزاؤں نے موت سے ہمکنار کر دیا حالانکہ شوہر کو زیادتی پر اکسانے کی مجرم وہ خود ہے، اتنی آسانی سے ہاتھ آیا شکار کون چھوڑتا ہے۔ اس کے سارے فیصلے غلط تھے لیکن اپنے ساتھ دوسروں کو بھی سولی چڑھا دیا شاید اس کے انجام سے ایسا ذہن رکھنے والے کئی دوسرے لوگ خود میں مثبت سوچ پیدا کر لیں، یہی بات عامرہ کی بخشش کا سامان بن سکتی ہے۔ میں بے قصور ہوں میں عبید اپنے دکھوں میں سوچ رہے ہیں کہ یہ سب رافعہ نے مل کر کھیل کھیلا گیا ہے، شاید استاد نے بلیک میلنگ کا حربہ آزمایا ہو۔ جیسے عبید کو راستے سے ہٹایا گیا تھا، اب اس سازش کا شکار شکیل ہوا ہے۔ مکافاتِ عمل کی زد میں استاد بھی آئے گا بس مناسب وقت کا انتظار کیجیے لیکن جس سادگی اور آسانی سے عبید پھنسا ہے دوسرے اپنی چالاکی سے قتل گاہ تک آنے میں کچھ وقت ضرور لیں گے۔ بے حس لوگ کی روحی نے اعلیٰ کردار، اخلاق اور حق کے لیے آواز اٹھا کر کارنامہ سرانجام دیا، اپنا ذاتی مفاد نہ تھا بلکہ مشکلات بڑھنے کا اندیشہ تھا لیکن انسانی ہمدردی اور انصاف کی بات پر قطعاً سمجھوتا کرنے سے انکار کر دیا یہی وجہ ہے وہ محفن سے نکل آئی اور آج باعزت اور پُرسکون زندگی گزار رہی ہے۔ ان کی پھپھو کو ہوش تو آ گیا ہے لیکن جب کئی معصوم جانیں ان کی ناانصافی، ہٹ دھرمی اور تند مزاج کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں۔ زیبا نے ایک قدم کیا غلط اٹھایا کہ منزل سے بھٹک گئیں۔ مردوعورت کے نے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا لیکن زبانی جمع خرچ اور عملی زندگی کا فرق سلیمان کے رویے سے واضح طور پر سامنے آ گیا ہے، یہ اس راہ کے مسافروں کے لیے وارننگ ہے۔ شکستِ خواب میں فراز پولیس مین ہونے کے باوجود عقلمت کی بلندیوں پر نظر آئے ہیں۔ وہ چاہتے تو نزہت کو بلیک میل کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا کرنا گوارا نہ سمجھا کہ جہاں دوسروں کی عزت روگی وہاں ردِ دیل ایسے سلے کہ ازدواجی زندگی نثالی ہوگی۔ سچی بات ہے کہ ہمیں رشتے جوڑنے سے پہلے ظاہری چمک دمک کے بجائے لین دین اور برتاؤ دیکھ لینا چاہیے۔ کبھی ظاہری جاہ وجلال اور وجاہت کے پیچھے کریہہ صورت اور بدخصلت لوگ ہوتے ہیں لیکن بندہ اتنا آگے بڑھ کر پھنس چکا ہوتا ہے کہ واپس آنے کی کوئی صورت نہیں رہتی۔ دینے والا من اصل تو یقین کی طاقت سے ہمکنار ہوئی ہے۔ ظفر کے لیے دوسرا کوئی راستہ بچا ہی نہ تھا، جب خلوصِ نیت سے گزرگیا تو کشتی پار اتر گئی۔ کیا خبر جب اس خاص شخصیت کا پارٹ بھر جائے تو اس شاہکار مواد کو ادب کے شائقین کے لیے عام کر دیں، یہ بھی دعا میں سمیٹنے والا عمل ہے۔ پناہ گاہ میں ممانی کی سوچ اور گھناؤنے منصوبے پر حیران ہیٹا ہوں۔ ایسا تو کسی پرائی خانہ جنگی دشمنی میں کیا جاتا ہے اور مخالف کو نقصان پہنچا کر جتنی لذت محسوس کی جاتی ہے حالانکہ وہ خود بھی کی ماں ہیں۔ اس طرح کا ذہن اور درندہ صفت فطرت رکھنے والوں کا انجام ہو چنا ہوں تو سارا بدن کانپ جاتا ہے ہمیں قہرِ خداوندی سے بچنے کی سبیل کرنا چاہیے۔''

✉ **سدرہ بانو ناگوری** کا مکتوب، کراچی سے ''سرگزشت کا شمارہ فروری 21 جنوری کو ملا جو کہ ہمیشہ کی طرح بھرپور تھا۔ سب سے پہلے شہرِ خیال پر نظر دوڑائی۔ اعجاز حسین صدارت کی کرسی پر فائز نظر آئے۔ ایم اے خالق بھٹی بھائی اور مرزا طاہر الدین بیگ کے خطوط کی کمی محسوس ہوئی (دیر سے موصول ہونے کی وجہ سے ایسا ہوا) ایک خوشخبری بھی منتظر تھی کہ آپی ماریہ عرفان آئی ہیں، اب مزہ آئے گا۔ خوب خاکش وہما کے ہوں گے شہرِ خیال میں، مارشل لا لگے گا، ہر جملہ سنسر شپ کی زد میں آئے گا کیونکہ آپی ماریہ عرفان وائڈ کیٹ سے آئی ہیں، اب دھیان سے لکھتا ہوگا اور لکھنے سے پہلے سو چنا ہوگا اور جملوں کو حدِ ادب کا خیال کرنا ہوگا۔ ویلکم آپی، موسٹ ویلکم۔ فلمی الف لیلہ میں انکل علی سفیان نے فلمی دنیا کی ان برائیوں کا ذکر کیا ہے جو فلمی دنیا سے

معاشرے میں پھیل گئی ہیں، گویا ظلموں نے معاشرے میں بگاڑ پیدا کیا ہے اور نتیجہ قلمی صنعت ابلی موت آپ مرگئی ہے تو انکل سفیان اس کا مرثیہ لکھ رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان کے لیے میں تاسف کیوں ہے؟ (اس لیے کہ کسی کی ری چھوٹی سی قلم انڈسٹری کا بہت نام تھا) خیر خیال اپنا اپنا، انداز اپنا اپنا۔ سراب کی قسط اس رفعہ بڑی دھانسو قسم کی تھی، ایکشن ہی ایکشن، کافی دنوں سے جو ساکت تھا، وہ دوڑ ہوا ہے اور شہباز ایکسٹن میں آ رہا ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ بیت بازی کے بعد بچی بیانوں کی طرف توجہ مرکوز کی، خوش نصیب زرینہ کی کہانی پڑھ کر لگا کہ اس عورت کے ساتھ نہ جانے کس کی دعائیں تھیں یا اس نے کون سی ایسی نیکی کی تھی کہ اتنے بڑے اور غلط کام کرنے کے باوجود بھی وہ ایک خوشگوار اور پُرسکون زندگی کی حق دار ٹھہری۔ اتنے اچھے شخص کا ساتھ ملا اور زندگی کے خوبصورت ایام کا آغاز ہوا۔ عورت ایک کھلونا شہلا رفیق کی روداد پڑھ کر بہت دکھ ہوا کہ سجا تایا عامرہ اپنے سلطان اس سے بدلہ لینا چاہتی تھی انہیں برباد کرنا چاہتی تھی لیکن ایمن جیسی معصوم لڑکی کے ساتھ ظلم ہوتا دیکھ نہیں سکی تھی اس وجہ سے وہ اپنے شوہر کو قتل کرنے پر مجبور ہوگئی اور آخر کار زندگی سے ایک طویل ترین جنگ لڑنے کے بعد موت کی ابدی نیند سو گئی۔ میں بے قصور ہوں میں عبید کے ساتھ بہت برا ہوا۔ حقیقت میں وہ بے قصور تھا کہ انجانے میں دوبار عمر قید کی سزا پانے پر مجبور ہوگیا۔ شکست خواب، نرجست نے بہت ستایا کیا۔ ایک لڑکی جو ہمیشہ اونچے اونچے خواب دیکھتی رہی ہے اس نے جو چاہا وہ تو نہ ملا لیکن وہ ضرور ملا جو اس کے لیے بہترین تھا اور وہ عبید کے ساتھ ایک بہتر اور خوشگوار زندگی گزار سکتی ہے۔ چھوٹی سی خبر: ڈاکٹر کیا، شرما کی داستان میں اس ماں کی عظیم قربانی جو اس کے بیٹے کے کام نہ آ سکی مدتوں دل پر نقش رہے گی۔ بے حس لوگ، اور ہیضہ غزل کی داستان مجیب سے دکھ میں مبتلا کر گئی کہ اتنے ظالم لوگ ایک عورت پر ظلم کرتے رہے صرف اس کا قصور یہ تھا کہ وہ ان چاہی تھی، اتنی چھوٹی سی غلطی کی اتنی بڑی سزا کہ وہ خوشیوں کے لیے ترستی رہی اور اچھے وقت کا انتظار کرتے کرتے وقت گزارتی رہی لیکن شاید خوشیاں اس سے روٹھ گئی تھیں کہ وہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ دریا میں کود کر خودکشی کرنے پر مجبور ہوگئی۔ باقی کہانیاں بھی اچھی لگیں۔ اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ سرگزشت اسی طرح ترقی کرتا رہے اور انکل کے لیے ڈھیر ساری دعائیں قبول کیجیے۔"

✉ **رانا محمد سجاد** کا نوازش نامہ، نواں شہر شاہ جمال سے "سرگزشت کا شمارہ 22 جنوری بطور تحفہ کر ہے حاصل کیا۔ ہیضہ کی طرح خوراسراب کی طرف دوڑ لگائی۔ کاشف زبیر صاحب کی اس تحریر نے سرگزشت کو مزید دلکش بنا دیا ہے۔ اب کی بار بھی سراب دلفریب رہی۔ یقیناً اگلی اقساط مزید چپ ثابت ہوں گی کیونکہ ہیرو صاحب کو باہر آنے کی اجازت مل گئی ہے۔ (مصنف کی طرف سے شکریہ) اس کے بعد قلمی الف لیلہ کا مطالعہ کیا۔ آفاقی صاحب اچھے موضوع کو بحث میں لاتے ہیں۔ واقعی یہ صرف بالی وڈ نہیں، بلکہ پاکستانی فلمیں بھی ان سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ حال ہی میں ریٹا ملک نے جو دیارِ غیر میں گل کھلائے ہیں وہ سب کے لیے شرم کا مقام ہے۔ اس پر ڈھٹائی کا مظاہرہ بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ سرگزشت کا معیار اب پہلے سے بہت بہتر ہوگیا ہے۔ اب کی بار اتنا ہی کیونکہ میرے ایم اے کے پیپر ہو رہے ہیں۔ انشاء اللہ ان سے فراغت کے بعد تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضر خدمت ہوں گے۔" (اللہ کرے آپ امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کریں، آمین)

✉ **قرۃ العین زینب** لکھتی ہیں شہر ملتان سے "میں معذرت خواہ ہوں کہ اتنے طویل عرصے تک بوجہ مصروفیت حاضر نہیں ہو سکی مگر اب ایک کاوش کے ساتھ حاضر ہوں۔ اس تحقیقی مضمون کے لیے کافی تحقیق کی جب حسب ضرورت مفید لٹریچر تو لکھ رہی ہوں "شہر ملتان" کا ایسا تاثر قائم ہے کہ اب قلم اٹھاتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ پتا نہیں یہ بھی پڑھنے والوں کو اتنا ہی پسند آئے یا نہیں مگر اتنا ضرور ذہن میں رکھ کر پڑھیے گا کہ میں نے دل سے محنت کی ہے۔ قوی امید ہے کہ سرگزشت کے معیار پر "دلیس کی تاریخ" پر اترے گا۔" (اس شہر نے سے فارغ ہو کر مضمون ارسال کر دیں گا)

✉ **منظر علی خان** کا خط، لاہور سے "ماہنامہ سرگزشت کا فروری کا شمارہ کسی قدر تاخیر سے دستیاب ہوا۔ سب سے پہلے سراب کا مطالعہ کیا۔ کاشف زبیر صاحب کا انداز تحریر جسس اور ولولے سے بھرپور ہے۔ انداز بیاں خوب بلکہ بہت خوب ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ قلمی جھنوں کی روحانی داستان پر تحقیق جناب ذوالفقار ارشد گیلانی کی فاضلانہ کاوش ہے۔ شیریں فرہاد، ہیر رانجھا، سسی پنوں طرز کی لوک داستانوں کی حقیقت یا افسانوی ارتقاء پر بھی کام کیا جائے تو بہت خوب ہوگا۔ خوش قلم کے عنوان سے خطاطی پر مضمون تحقیقی اور علمی ہے۔ قلمی الف لیلہ ہزار داستان ہے۔ کبھی ماضی کا تذکرہ اور کبھی حال کی خبر۔ شاید قلمی دنیا کا کینوس ذرا مایوسی اور آرٹسٹوں کی طرف موڑ نا پڑے گا۔ نمک کا شہر، پونم بارکی کہانی کا تسلسل ہے اور معلوماتی ہے۔ سورج کا دیس جاپان کی عکاسی ہے مگر لگتا ہے کہ ساحل سمندر اور بحری جہاز کے کارکن جاپان کے ماحول میں زیادہ آگے تک نہیں جا سکے اور سفرنامہ میں نقشہ کشی کم ہونے کی وجہ سے خشکی رہ گئی ہے۔ قصۂ شکار میں سید احتشام صاحب نے شیروں کا قتل عام تو کیا ہے مگر اتفاقی دلچسپی اور تنوع موجود نہیں ہے۔ خوش نصیب میں اسلم کے کردار کا دوسرا رخ خوب ہے۔ عورت ایک کھلونا میں سجا تا نے انتقام بھی خود سے لیا ہے۔ میں بے قصور ہوں، میں عبید نے ایک عبث نہ کرنے والی رافعہ سے انتقام نہیں لیا بلکہ خود کو چھنایا۔ بے حس لوگ کے کردار پورے معاشرے میں موجود ہیں۔ انجام وہی ہونا ہے جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ خودسر نظیاتی کہانی ہے۔ چھوٹی سی خبر، انسانی المیہ اور معاشرتی بے حسی کا فسانہ ہے۔ پناہ گاہ، بخش حسن اتفاق ہے کہ متا کو ناول گئی ورنہ ایسے حالات میں انجام کچھ اچھا نہیں ہوتا۔"

✉ **بشریٰ افضل**، بہاولپور کے طویل خط سے اہم نکات "22 جنوری کو من پسند سرگزشت ہمارے حسین ہاتھوں میں جھٹک کر رہا تھا لیکن نامکمل

پر ناز ک انجام سینہ نہیں متاثر نہ کر سکی بھر پیشانی میں بتلاتھی پھر بھی کھل کر مسکرا دی تھی۔ اس کے بعد تیز مزاج یک ملکی سرگزشت لے ہماری "خطوط کے تذکرے میں اضافہ کیا ہے۔ بے چارا اپنی انکل کی طرف رخ کیا باقی تمام ساتھی سوائے ایک دو کے بھرے سمیت غائب تھے۔ نئے لکھنے والوں میں مجھے وہ نباہت نظر نہیں آیا، ٹوک بھوک کے بغیر تو مکمل سونی سونی ہے، یہاں پر مجھے۔ سیاست کی بساط پکھی نظر آئی۔ کرسی صدارت پر اعجاز حسین کو مضبوطی سے ڈٹے پایا۔ بڑے خوش نظر آ رہے تھے بھی اس کرسی کے لیے ہی تو لوگ محنت کرتے ہیں۔ ثاقب حسن کا خط مزاح کا شاہکار تھا۔ انکل اب آپ کی طبیعت کیسی ہے، خدا آپ کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر قائم رکھے، آمین۔ پہلے بچانیوں کا تنا کر لیں۔ عورت ایک کھلونا، اگر عورت انتقام پر اتر آئے تو کچھ بھی کر سکتی ہے۔ آخر اس نے فیصلہ چھوڑ دیتی تو صحت مند بھی رہتی اور بچتا بھی کیونکہ ایمن کی محبت میں شوہر کو قتل کر ڈالا۔ میں بے قصور ہوں، بے چارہ، عبید واقعی بے قصور تھا۔ ویسے اس نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری، دوبالہ رافعہ سے نہ ملتا۔ اس پر تو وہ مثال صادق آتی ہے کہ آنکل بھلے مار۔ بے حس لوگ۔ بے چاری زیبا کو پسند کی شادی کی اتنی بڑی سزا کہ وہ بیٹیوں سمیت خودکشی جیسی حرام موت مری حالانکہ روحی نے اس کا ساتھ دینا چاہا مگر ان کی بے حسی نے روحی کو گھر سے نکلوا دیا۔ بے زندگی کا مقصد لوگوں کے کام آنا، میری دوست کا سوال ہے ان لیں سب ساتھی ضرور جواب دیں تاکہ میری دوست کا مسئلہ ہو جائے۔ سوال ہے کہ اولاد کی تربیت میں ماں کا ہاتھ ہوتا ہے یا باپ کا یا ماں باپ مل کر بچوں کی تربیت کرتے ہیں۔ اگر میاں بیوی کی آپس میں نہ بنتی ہیں اور وہ الگ ہونے رہیں تو متاثر کون ہوگا؟ بچے۔ اور ماں تو بچوں کی پرورش اچھی ہی کرنے کی کوشش کرے گی مگر شوہر بیوی کو نیچا دکھانے کے لیے بچے کو ماں سے اس طریقے سے دور کرے کہ ماں بے بس ہو کر رہ جائے۔ بیٹیاں، ماں کو گندی گالی دے اور باپ سامنے بیٹھا دیکھتا رہے! اگر باپ کو ماں شکایت لگائے، اس کی زبان کون روکے گا تو باپ جواب دے کر سمجھ لے خود ہی پھر بچے کے ذہن پر کیا اثر ہوگا اور ماں کے دل پر کیا گزرے گی؟ مجھے یہ ہی سمجھ نہیں آئی کہ دنیا یہ کیوں کہتی ہے کہ بچوں کی تربیت ماں کرتی ہے۔ جب باپ، ماں کو بچوں کے سامنے کے کہ تم تو میری رکھیل ہو۔ اس ماں کا ایک المیہ نہیں ہے۔ بدقسمتی سے بیٹیاں بھی ماں کا ساتھ نہیں دیتیں۔ باپ کی غلط تربیت نے ماں کے خلاف ان کے دلوں میں اتنا زہر بھر دیا ہے کہ وہ اپنی ماں کو ماں ماننے سے ہی انکاری ہیں۔ ایک المیہ تو آیا کہ اس عورت کا گھر ہی مقام ہی ختم کر دیا۔ شوہر اپنی اولاد کے سامنے کہتا ہے کہ تم یہاں کرایہ دار ہو۔ بیٹا کہتا ہے پیئنگ گیسٹ ہو۔ بیٹیاں کہتی ہیں تم ہماری ماں نہیں ہو۔ میری وہ سہیلی میرے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی اور اس کی آواز رندھ گئی اور بولی میں گھر ہی چھوڑ دوں گی۔ جب میری کسی کو ضرورت ہی نہیں میری زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں، میں گھر کیا، دنیا ہی چھوڑ دوں گی۔ میں نے اس کو دلاسا دیا، ایسا مت کرنا خدا ناراض ہوگا۔ آپ دعا کریں کہ اس عورت کے وجود کو گھر میں تسلیم کر لیں، آمین۔ اس دوست کی مثالوں کے ساتھ وضاحت کی ہے کہ آخر عورت کیسے بچوں کی پرورش کرے کہ شوہر ہر بار درمیان میں آ جائے، کوشش یہ ہو کہ ماں بچے کو بھانپ جائے پھر بچہ تو خلاف ہوگا نہ، ماں کا دل خون کے آنسو روئے گا۔ صرف میری پیاری دوست کا ہی المیہ نہیں بلکہ نہ جانے کتنے گھر جاہل مردوں کی وجہ سے ماؤں کی اولاد کی صحیح تربیت میں رکاوٹ بنتے ہیں ضرور اس تفصیلی سوال کا جواب دیجیے، کتنے ہی گھرانے کی بے بس ماؤں کو مشورہ ملے گا۔ اسی سوال کے جواب میں ان کا مسئلہ حل ہو جائے گا کہ وہ بچوں کی تربیت میں کیا حکمتِ عملی اختیار کریں۔"

✉ **راجا ثاقب نواز ثاقب** کی گل افشانیاں، رتی بھی سابہوال سے "فروری کا سرگزشت فروری سے پہلے ملا۔ انشائیہ میں معراج رسول میں ادب کی اہمیت اور کتب بینی کی طرف راغب کرنے کے لیے نسخہ آسان نسخہ جات سے مستفید کر رہے تھے۔ تیز مزاج چنگیزی سے ملاقات کر کے بزمِ دوستاں میں وارد ہوئے۔ فصیحہ مریم، بابت حسن خان اور خوبصورت نام کی مالکہ، سدرہ جاوید نو گوری کے الفاظ نمایاں لگے۔ اب کی بار نئے چہروں کی آمد زیادہ محسوس ہوئی، دو سرگزشت کے اعلیٰ معیار کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ عوفانی پیارے کے دو کرداروں کی داستان لیلیٰ بھوں نے متاثر کیا۔ خوش قلم آنکھیں بند کر کے پڑھی کیونکہ ماہ دولت کی لکھائی اس قدر شاندار ہے کہ ڈاکٹروں کی لکھائی کو بھی ماند کرتی ہے۔ فتنہ ساز جولیان اسانج کی زندگی کا مختصر سا تعارف کروانے پر ابن کبیر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ویسے میں ذاتی طور پر اسانج کے نئے اقدامات کے سخت خلاف ہوں۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی، ہمارے راہنماؤں نے اپنی محنت سے عوام کی جیب کاٹ کر جو مال بیرونِ ملک کے بینکوں میں جمع کروایا ہے کیا کبھی اس کا بھانڈا پھوڑنے کو بالکل تیار بیٹھا ہے۔ قلمی الف لیلہ کو اب کی بار ماضی کی تصاویر سے مزین کیا گیا تھا۔ نمک کے دیس گیموڑہ کے ساتھ آپ کو یہ ہدایت ضرور لکھنی چاہیے تھی کہ بلند فشارِ خون کے حامل قارئین بھی اس تحریر سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ جاپان کی سیر کا اختتام ہوا (کس نے کہا؟) قصہ شکار میں اب کی بار شیروں کی آخری ہچکی میرا مطلب تھا آخری چنگھاڑ سنی۔ بائسل کی نسبت سے بڑی کہانی خوش نصیب غیر متاثر کن رہی۔ زرینہ نے ماں باپ سے چوری سرفراز کا ساتھ نبھانے کا ایک غلط فیصلہ کیا جس کی قیمت بھی اسے چکانی پڑی مگر منصور کی پیدائش کے بعد نہ سہی، کم سے کم اسلم کو اپنا لینے سے قبل بھی کیا ہی اچھا ہوتا کہ زرینہ اپنے گھر والوں سے دوبارہ رابطہ تو کر لیتی۔ اولاد اور ماں باپ کا رشتہ انتہائی نازک ہے اور اس رشتے کی پاسداری بہت ضروری ہے۔ عورت ایک کھلونا کے آخر میں پوچھے گئے سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر عامرہ یا سجا تا سبحان یوسف کی مرضی کو پورا ہو لینے دیتی تو شاید خود بھی آج زندہ ہوتی، یہ سبحان یوسف کی موت ہی کا دکھ تھا جو کینسر کا روپ دھار گیا۔ میں بے قصور ہوں، میں بے چارہ عبید قسمت کے بیر بھیر کا شکار ہوگیا۔ بے حس لوگ، میں روحی کے سابقہ سسرال اور مرکزی کردار حمیدہ پھپھو کو زیبا اور اس کی بچیوں کی آہ لگ گئی۔ شکستِ خواب میں فراز صاحب نے ہماری پولیس کا ایک نیا ہی رخ ہمارے سامنے لا کھڑا کیا۔ چھوٹی سی خبر کے اختتام کا کچھ کچھ اندازہ تھا پھر بھی متا

کی قربانی کے رائگاں جانے کا افسوس ہوا۔ دینے والا میں مغفرت اللہ کے لیے کے قدر دان ہمارے منتظر تھے۔ خیر ہمیں شازیہ نے خوامخواہ ہی ذکی محبت کی ہے۔ شاید والدہ کے پیار کی کمی کو وہ پورا نہیں کر سکی۔ پتا نہیں، میں جانے مستقبل کا راز ہی اس کے لیے چھپن ہی چھپا ہے۔ محفل بیت بازی میں ملک شکیل احمد اور خالد وارثی صاحبہ کے اشعار بہتر لگے۔"

✉ **طاہر الدین بیگ**، میر پور خاص سے رقم طراز ہیں: "علی عمران آفاقی کی الف لیلہ سے شروع کرتے ہیں۔ آفاقی صاحب بات کی خوبصورت لکھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے خدا انہیں سلامت اور تندرست رکھے، آمین۔ اس دفعہ آفاقی صاحب نے غیر ممالک کی عریانی اور مغربی علوم سے یا اپنے ہی ملک کی تاریک فلموں سے لی گئی فلمی کہانیوں پر روشنی ڈالی۔ آفاقی صاحب کی خدمت اقدس میں نہایت احترام اور عقیدت سے عرض کرتے ہیں کہ جس طرح کی بھارتی فلمیں سینماؤں کی زینت بن رہی ہیں، پوسٹری دیکھ کر آپ حیران اور پریشان ہو جائیں گے اور اگر اندر چلے گئے تو آپ بے ہوش ہو جائیں گے، رشید ڈوگر صاحب، سعید علی خان صاحب اور کچھ دوسرے جس طرح کی فلمیں بنا رہے ہیں میری آپ سے گزارش ہے کہ ایک بار ان ہدایت کاروں کی فلموں کے ٹریلر ضرور دیکھ لیں۔ وادام سکیتھ، پرویز راٹا اور محترم مسعود بٹ صاحب کی فلموں میں صائمہ خان کے جس طرح کے ڈانسز ہیں، آپ سینما حال سے باہر نکل آئیں گے۔ وادام نرگس کبھی جس طرح اپنے بالائی حصوں کو سینما ہال کے اسکرین پر پیش کرتی ہیں، آپ سے التماس ہے کہ ضرور دیکھیں۔ جہاں تک نقالی کا سوال ہے، بھارت والوں نے ہماری بہت سی کاپی کی مگر تم نے آپ کی ہی تحریروں سے پڑھا ہے کہ مختر ہم وزیر علی اور عطاء اللہ ہاشمی صاحب نے کوئی بھی اور بنگل فلم نہیں بنائی۔ نذیر صاحب کی فلم پھیرے بھارتی فلم گاؤں کی گوری کی کاپی تھی۔ ہیلی کوئلن جو بھی فلم نوکر لفظ بہ لفظ بھارت کی کاپی تھی۔ جب اس کی کامیابی پر محترم الیاس رشیدی (مرحوم) نے نوکر کے یونٹ کی دعوت کی تو آپ نے انہیں منع کیا تھا۔ ہمارے جہاں رائٹرز کی پہلی ہی فلم سہراب سوری کی فلم مجرم سا سے لی گئی تھی عجائبہ، کاپی کی ہم نے انگلش فلم (ٹوئی کرنس، کرک ڈنکس) ناریں بلہائے صدائے ضمیر کاپی کی گئی مجبور اور جوہر ان گوا کی۔ مسعود پرویز اور خواجہ خورشید کے علاوہ کوئی ڈائریکٹر ہے جس نے اور بنگل کام کیا ہو؟ مجھے معاف فرمائیے، اس حمام میں سب ننگے ہیں۔ کچھ زیادہ ہیں اور کچھ کم۔ ایک فراتھی ناول ایسا ہے جس پر ہم نے پہلے زبردست ہٹ فلم سات لاکھ بنائی بعد میں گروودت مرحوم نے اسے سہراب سمز 55 میں کاپی کیا اس کے علاوہ دور دور تک کوئی ایسا نام نظر نہیں آتا۔ جہاں تک گانوں کا تعلق ہے انہوں نے ہمیں بہت ہی کاپی کیا اب میں کیا عرض کروں ہماری پہلی سپر ہٹ فلم کسی میں ایک گانا شرط فلم سے" نہ یہ چاند ہوگا نہ تارے رہیں گے" لفظ بہ لفظ کاپی کیا گیا ایسا کیوں کیا گیا اس کا جواب اب صرف عزیز میرٹھی ہی دے سکتے ہیں کیونکہ فلمساز ہے ہی آنند اور ہدایت کار داؤد چاند اس دنیا میں نہیں رہے۔ اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ شکاریات میں بہت دلچسپ واقعات پڑھنے کو ملے۔

گیلانی صاحب کی لیلیٰ مجنوں پڑھ کر بہت لطف آیا اور شمی دل کی عشق لیلیٰ کی یاد تازہ ہوگئی جس میں مجنوں کے کردار میں ستوش کی اداکاری لاجواب تھی، ایسی لاجواب اداکاری کرتا ہوا مجنوں پھر نظر نہیں آیا۔ ایک کلاسک شاہکار تھا جو مقابلہ کی وجہ سے صرف 26 دن میں تیار ہو کر عوام کے سامنے آیا اور بگڑ چھلنی ہے دل گھبرا رہا ہے کے بجوں کو بہت ہی پذیرائی نصیب ہوئی، واقعی جناب، اس ماہ کا خاص تحفہ خوش قلم بہت خوب تحریر تھی۔ ہندوستان پر حکمران مغل شہنشاہوں کا خطاطی سے لگاؤ بہت خوب رہا۔ پاکستان میں بھی خطاطی کے بہت نام گزرے، صادقین بہت مشہور ہوئے، ماں کے لاڈلے جولیاں پر تحریر فتنہ ساز بھی لاجواب تحریر تھی۔ ایسی تحریریں آنا ضروری ہیں تاکہ امریکا کے چہرے سے نقاب سرکتا رہے، اب کیا تعریف کریں ٹمک کے شہری، پھر سورج کے دیس پڑھ کر تو لطف ہی آ گیا۔"

✉ **ناصر مغل** کا ای میل، راولپنڈی سے: "محترمی! میں یہاں کے ایک روزنامہ سے منسلک ہوں، میری خواہش ہے کہ میں سرگزشت کے لیے بھی لکھوں۔" (آپ مضمون بھیج دیں۔ اداریہ پڑھ کر فیصلہ کرلے گا کہ مضمون سرگزشت کے مزاج کا ہے یا نہیں)

✉ **اصغر عباس** کا تبصرہ، میاں چنوں خانیوال سے: "امیر علی کی سوانح عمری نے متاثر کیا۔ امیں نے امیر علی کا کافی مطالعہ کیا اور ان کی کتب کو بھی پڑھا، وہ اسلام کے انگریزی کے اولین مورخ تھے۔ سرگزشت کا خاصہ ہے ہر قسط اسٹوری کی شخصیت کے کچھ پہلو گوشے سامنے لاتا ہے لیکن اس میں یہ بات نظر نہ آئی مثلاً کچھ لوگ اسے متنازع کہتے ہیں۔ ذاتی زندگی اور بچوں کے بارے میں کچھ نہ تھا اس لیے میں اسے جامع سوانح عمری نہیں کہوں گا صرف مصنف نے ایک کتاب یا مقالہ جس کا ذکر مضمون کے آخر پر ہے کچھ ترمیم کر کے چھپوا دیا ہے۔ کوہستان نمک پسند آیا۔ جامع اور معلوماتی مضمون ہے۔ اللہ ذلفی شاہ کو سلامت رکھے۔ بلند خیال درمیانے درجے کا مضمون ہے، عنوان اسکائی اسکریپر کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ سفرنامہ نے حسب سابق متاثر کیا۔ پری زاد اچھا بھی کہا جاسکتا ہے، دلچسپ ہے، ہمت اور جہد مسلسل کی داستان ہے۔ فلمی الف لیلہ کو آج تک میں پسند کرتا ہوں لیکن میرے ابو نے مکمل رد کر دیا ایک تو باتوں کی تکرار دوسرا آفاقی صاحب کے پاس سوا واب ختم ہے اور درمیان میں بیگم نیلی کا ذکر جس کی کوئی تک ہی نہیں اور ہر ایپسوڈ موضوع کو آفاقی صاحب ہٹ ٹپ کر جاتے ہیں جیسے خوارزمی، البیرونی اور ڈاکٹر تدبر خان حالانکہ ان پر مکمل مضمون آنا چاہیے، یہ سلسلہ اب ختم کر دیں یہ میرے ابو کا رواں اور صاف گوئی پر مبنی تبصرہ ہے۔ زنگ ہی نے متاثر کیا۔ میرے خیال میں سرگزشت کا معیار پہلے سے بہتر ہوا ہے لیکن بہتری کی مزید گنجائش ہے تاکہ ادبی پرچے لکھے اور سلجھے لوگ

ہیں اسے پڑھنا شروع کریں، سرگزشت کا شمار خواتین کے رسالے میں نہ ہونے لگے۔ قارئین کے معیار نے دل جیت لیا اسے اشد ضرورت ہی معیاری ہیں۔"

✉ **اقتصاب عباس** کا خط، راولپنڈی سے: "ناکردہ بی ایک عظیم طریقے سے سکیڈوش ہوئیں، نہ کوئی گھوڑ، نہ کوئی آپ ڈوم ڈم، نہ کوئی ٹوپی، نہ کوئی دعا، نہ کوئی طوائف، میرے لیے کچھ بھی نہیں، جائے آپ کا سفرنامہ اب کبھی نہیں چھپنے کا۔ میر اکرم کے دکھڑے سنے بھی عرصہ بیت گیا۔ نہ مہین زینب بھی اکثر وقار اریاں جبریل کرتی نظر آتی ہیں اپنا رنج کسی ایک جانب ہی رکھیں۔ میری لاڈلی ہی، الوکھی سی بہنا ماریہ عرفان کے حال واحوال سے بھی آگاہی ملتی رہنی چاہیے۔ پرنس اے بی کی تجویز کے بارے میں بھی کوئی خبر خیر کی دے دیا کریں۔ سردیوں کی شدت ہے، چلغوزے، مالٹے، گنڈیریاں، گاجریں، سبز چائے، مونگ پھلیاں اور میرے نہاں، نہ جانے کیا کیا۔"

✉ **وحید الزماں** کی شکایت، لاہور سے: "میں سرگزشت کا پرانا قاری ہوں۔ ہمیں انہرین خلوں میں عریانی سے بہت شکایت ہے جس کا تذکرہ فلمی الف لیلہ میں بھی ہوتا ہے۔ میرے خیال میں آپ نے پاکستانی ٹیلنٹ کے ڈرامے وغیرہ نہیں دیکھے جن میں بقول علامہ اقبال یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود! ہماری صدیوں کی ثقافتی پہچان" رونا" تو ان ڈراموں میں تقریباً ناپید ہوتا جارہا ہے۔ اگر کچھ خواتین کسی مجبوری کے تحت اس کا استعمال کرتی بھی ہیں تو صرف برائے نام۔ اس کا جواصل مقصد ہے وہ تو ختم سمجھیے۔ اب تو ایسے اشتہار تو اتر سے دکھائے جارہے ہیں جن کے ذریعے کسی شیمپو کے فوائد بتانے کے لیے سارے کپڑے اتار کر بالوں کو دکھایا جاتا ہے۔ ایک شوہر میربان خواتین بغیر دوپٹے کے انتہائی تنگ کپڑے پہن کر شرکت کرتی ہیں۔ حیرت نام ہے جس کا گھی جیور کے گھر سے! کئی چینلز سے نیم عریاں لڑکیاں اور لڑکے بے ہنگم شور دھوم دھاڑا اور مکتے ہوئے سارے سارے دن ساری رات دیکھے جاسکتے ہیں۔ کچھ فلم والوں نے بجائے فلموں کے ڈراما سازی شروع کی ہے لیکن اپنی پرانی عادتیں نہیں بدلیں۔ ان ڈراموں کا صرف ایک موضوع ہے یعنی جنسی بھوک اور ہوس جسے محبت کا نام دیا جاتا ہے۔ انہیں اچھی طرح پتا ہے کہ موضوعات کی یکسانی اور کمی نے فلم انڈسٹری کو تباہ کیا اب یہ لوگ ٹی وی کے پیچھے پڑ گئے ہیں، اللہ رحم کرے، ان کے ڈراموں کے بیرد یکروں پر بنی تین تین منزلہ کوٹھیوں میں رہتے ہیں، لمبی لمبی مہنگی کاروں میں پھرتے ہیں، پتا نہیں چلتا کہ ان کا کیا کاروبار ہے، انہیں نہ فکر نہ فاقہ، میرے خیال میں بڑھتی ہوئی دہشت گردی اور ڈاکا زنی کی وارداتوں میں ان ڈراموں کا بھی حصہ ہے۔ میرا کے ذیلی دفاتر میں اور غالباً ہیڈ آفس میں بھی کیبل پر دکھائی جانے والی نشریات کی مانیٹرنگ کا کوئی انتظام نہیں ہے جس کی جو مرضی ہوتی ہے وہی چینل اپنے کیبل میں شامل کر لیتا ہے۔ آپ اور ہم ارباب اختیار سے یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ یہ ہماری نئی نسل کو کہاں لے جارہے ہیں اور میرا کس مرض کی دوا ہے؟"

✉ **ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب** کی شرکت، بھکر سے: "فروری کا سرگزشت اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ ملا۔ سرورق کوئی خاص نہ تھا۔ شہر خیال میں سب اپنے اپنے چکر میں لگے نظر آئے۔ سعید چاند نظر نہ آئے، کس بدلی میں چاند چھپے۔ ٹھیک تو ہیں ناں؟ ہم آئے تو آپ غائب! راجا ثاقب نواز ثاقب، رانا شاہد، اکبر علی، اعجاز حسین کے تبصرے پسند آئے۔ پرانے لوگ کہاں چھپ گئے، پلیز جلدی جلدی اپنے بلوں سے نکل کر اپنی خیریت کی اطلاع دیں۔ ہمیں ایسا نہ ہو کہ ہم صحرا میں نکل پڑیں۔ بیت بازی اپنی رونق برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اشعار کے انتخاب سے سب کے ذوق کا پتا چلتا ہے۔ یہ سلسلہ ختم نہیں ہونا چاہیے۔ کہانیوں میں خوش نصیب ایک سبق آموز کہانی ہے۔ بہت سی لڑکیاں جاسوسی سمجھے گھر سے نکل پڑتی ہیں جس کی وجہ سے ماں باپ گھر والوں کی عزت تو خراب ہوتی ہی ہے خود کو بھی تباہ کر لیتی ہیں۔ بعد میں پچھتانا پڑتا ہے کہ وہ شخص جس کی خاطر اس نے یہ قدم اٹھایا وہ اس کی محبت، اس کی قربانی کو پاؤں تلے روند کر اسے سچ مچ شعبدار میں چھوڑ دیتا ہے۔ یہ جانے بغیر کہ جس لڑکی نے اس کو پانے کے لیے سب کچھ داؤ پر لگا دیا اس بے اس کا کیا ہوگا۔ زرینہ کی طرح سب کے انجام اچھے نہیں ہوتے۔ اس لیے مشورہ ہے کہ قدم اٹھانے سے پہلے سوچ لینا چاہیے کہ کہ مرد بھی باوفا نہیں ہوتا۔ عورت ایک کھلونا پڑھ کر بہت دکھ ہوا کہ دولت انسان کو جانور بنانے میں دیر نہیں لگاتی۔ اس کہانی کو پڑھ کر ایک شعر یاد آرہا ہے۔ بڑے خلوص سے لوٹا ہے دوستوں نے مجھے، کہ پھول ہاتھ میں آستین میں خنجر تھا۔ انسان جیسا کرتا ہے اس کی سزا اور جزا ضرور ملتی ہے۔ اللہ پاک ہم سب کو نیک ہدایت عطا فرمائے، آمین۔ انکل، اگر سرگزشت میں لکھنے والے کسی کا فون نمبر مانگوں تو کیا مل جائے گا؟ (جی نہیں، ہم مصنف کی اجازت کے بغیر کسی کا بھی فون نمبر کسی اور کو نہیں دیتے) انشاء اللہ آئندہ ماہ تفصیل سے تبصرہ کروں گی۔"

تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط: فاروق انجم ساہلی، لاہور۔ محسن علی موم، بالاکوٹ۔ سید محمد عظیم شاہ، خانپور۔ نثار احمد، ڈیرہ اللہ یار۔ زاہد رفیق، لالیاں۔ محمد نواز ش بروہل، زاہد حسین، گھارو۔ نعمان ایوب، کھونگی۔ صفدر حیات، گولارچی۔ احمد شاہین، کبیر والا۔ نعمان ارشد، جلالپور بھٹیاں۔ زلیخا، احمد پور سیال۔ نصرت شاہین، فقیر والی۔

کشور کشا

ڈاکٹر ساجد امجد

تاریخ کے صفحات پر واقعات کا وہ دریا موجزن ہے جو خود میں سبق آموز ہے۔ اسی شہنشاہ کی مثال لے لیں، اس بے روزگار کی کہ اپنی زندگی کو جاہ و جلال کا آئینہ سنایا، وہ کچھ کر دکھایا جس کا لوگ خواب دیکھتے ہیں۔ اس نے بڑے بڑے شہنشاہوں کے تاج کو نہو کروں میں اڑایا اور کفور کلشا کہلایا مگر اسے ایک "پھنسی" نے کہیں کا نہ چھوڑا اور شکستہ زندگی سے بمکنار کر دیا۔

کتوں کے پیشے لگا دینے والے شہنشاہ کی دم آخر بے چاری

نادر شاہ تخت طاؤس پر رونق افروز تھا۔ احمد شاہ ابدالی جو اس کا ذاتی محافظ اور نہایت چہیتا تھا' سراپا ادب بنا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ نادر شاہ جو اپنے ملازموں سے بہت کم گفتگو کرتا تھا تاکہ رعب قائم رہے لیکن اس وقت موسم کی شوخی نے اسے بھی شوخ بنا دیا تھا اور پھر اس کے سامنے کوئی اور نہیں احمد شاہ کھڑا تھا جس کے بارے میں وہ بار بار واشگاف الفاظ میں کہہ چکا تھا کہ میں نے ایران' توران' ہندوستان کسی مقام پر بھی استاذ ہین' صلاحیتوں سے بھرپور' وفادار اور بہادر نوجوان نہیں دیکھا۔

موسم نے ایک اور انگڑائی لی۔ نادر شاہ نے احمد شاہ کی طرف بھرپور نظروں سے دیکھا پھر جیسے کسی خیال نے اسے آواز دی ہو اور وہ یوں گم ہو گیا جیسے آواز سننے کی بہ غور کوشش کر رہا ہو' کچھ دیر بعد چونکا اور حکم دیا۔

"آگے آ' احمد شاہ ابدالی!"

احمد شاہ قریب پہنچا تو ایک مرتبہ پھر نادر کی آواز اس کے کانوں میں آئی "اور قریب آؤ۔"

کس کی مجال تھی جو نادر کے اتنے قریب آیا ہو لیکن حکم یہی تھا۔ وہ اس کے اتنے قریب پہنچ گیا کہ اگر نادر سرگوشی میں بھی بات کرتا تو وہ سن سکتا تھا۔

"احمد خان ابدالی! یاد رکھو میرے بعد بادشاہت تمہارے ہاتھ آئے گی۔ تمہارا یہ فرض ہے کہ میری اولاد کے ساتھ زیادہ لطف و مہربانی کا برتاؤ کرنا۔"

احمد شاہ نے مودبانہ جواب دیا "ولی نعمت! میری تمنا تو یہ ہے کہ میں آپ پر قربان ہو جاؤں۔ اگر آپ کو میرا سر بھی درکار ہو تو میں حاضر ہوں۔ مجھ سے کیا گستاخی ہوئی ہے کہ آپ مجھے یہ سزا سناتے ہیں۔"

"مجھے اپنی فیاضہ شاہی پر ناز ہے۔ میں اچھی طرح محسوس کر سکتا ہوں کہ تم ایک دن بادشاہ بنو گے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ اگر ایسا ہو جائے تو میری اولاد کے ساتھ رعایت کرنا۔"

"آقا کو یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ آقا کے عزیز و اقارب مجھے ہمیشہ عزیز رہیں گے۔"

نادر شاہ درانی کی پیش گوئی اس کے لیے حیران کن تھی۔ اس سے زیادہ حیرت کا باعث یہ تھا کہ نادر جیسا محتاط بادشاہ اس کا اظہار کیوں کر رہا تھا۔ اسے کچھ یقین ہوا کچھ نہیں ہوا۔ وقت نے دبے پاؤں گزرنا شروع کر دیا۔

احمد شاہ اس واقعے کو بھول بھی چکا تھا کہ ایک روز ایک درویش جس کے سر پر اونی ٹوپی تھی اور جسم پر برائے نام لباس تھا کہیں سے آنکلا اور اس سے ملا۔ اس نے بھی وہی خوشخبری سنائی جس کا اظہار نادر شاہ کر چکا تھا۔

"میں تمہارے چہرے پر بادشاہت کا جلال دیکھ رہا ہوں۔ مجھے تھوڑا سا سوتی کپڑا دو تاکہ میں تمہارے لیے دعا کر دوں' جلدی کرو بہت جلد تخت شاہی تمہیں حاصل ہونے والا ہے۔"

احمد شاہ ابدالی نے نادر شاہ کی بات کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی لیکن اس درویش کی بات کو نظر انداز نہ کر سکا۔ اس نے فوراً ایک سوتی کپڑا درویش کو دے دیا۔

اس درویش نے اس کپڑے کو لیا اور بچوں کی طرح احمد شاہ کے خیمے کے عین مقابل ایک چھوٹا سا خیمہ تیار کر دیا اور کچھ قرآنی آیتیں تلاوت کرنے لگا۔ "نواب تم بادشاہ بن گئے۔"

احمد شاہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ کیا ہونے

والا ہے۔ اس کی نظریں جاتے ہوئے درویش کا تعاقب دور تک کرتی رہیں۔ بعد میں معلوم ہوا اس درویش کا نام صابر شاہ ہے۔

☆☆☆

نادر شاہ کردوں کی سرکوبی کے لیے مشہد سے نکلا تھا۔ سولہ ہزار کی نفری اس کے ساتھ تھی۔ کردوں کا پیچھا کرتے ہوئے وہ خابوشان کے مقام تک چلا گیا اور اس سے دو فرسخ کے فاصلے پر فتح آباد میں ایک اونچے میدان میں پڑاؤ ڈال دیا۔

کوئی غیبی طاقت اسے خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی شیطانی قوت اس مقام پر اس کے اردگرد منڈلا رہی ہے۔

اس کے بھتیجے علی قلی خان نے علمِ بغاوت بلند کر رکھا تھا اور کردوں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ یہ پریشان کن بات ضرور تھی لیکن ایسی بھی نہیں تھی کہ وہ حواس باختہ ہو جائے۔ یہ تو کوئی اور ہی طاقت تھی جو اسے خوف زدہ کیے ہوئے تھی۔ وہ اتنا خوف زدہ ہو گیا تھا کہ اپنے خیمے میں ایک گھوڑا زین کسوا کر تیاری کی حالت میں کھڑا رکھتا تھا کہ نہ جانے کس وقت اسے فرار ہونا پڑے۔ پھر اس نے قلات کو نکل جانے کی کوشش کی لیکن اس کے محافظوں نے اسے روکا اور یقین دلایا کہ وہ اس کے دشمنوں سے خواہ وہ کوئی بھی ہوں اپنے آخری قطرۂ خون تک جنگ کرتے رہیں گے۔ اس نے اس یقین دہانی پر قلات جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

اس کے جاں نثاروں نے اسے یقین دلایا تھا لیکن نادر شاہ کا وہم بڑھتا جا رہا تھا۔ اسے شک تھا کہ اس کے قتل کی سازش ہو رہی ہے۔ اسے اپنے دو عمائدین محمد قلی خان اور صالح خان کی فکر تھی کہ وہ اس سازش میں شریک ہیں۔ اس نے اس خطرے کو ٹالنے کا ارادہ کر لیا۔

رات کے اندھیرے میں تین سوار دُلکی چال سے خیمۂ شاہی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تینوں افغان تھے۔ ان میں ایک احمد شاہ ابدالی تھا۔ اس کے پیچھے اس کے دو ماتحت سوار چلے آ رہے تھے۔ خیمے کے قریب پہنچ کر احمد شاہ نے شناخت کرائی۔ دروازے پر کھڑے سورماؤں نے اسے جگہ دے دی۔ اس کے دونوں ساتھی باہر ہی رک گئے تھے۔ انہیں باہر ہی رکنا تھا۔ ان کو تو اس وقت کوئی قدم اٹھانا تھا جب ان کا کمانڈر احمد شاہ انہیں کوئی حکم دے یا کسی خطرے کو بھانپ کر وہ خود ہی کوئی حرکت کریں۔

نادر شاہ اپنے کیمپ میں چار ہزار افغان جنگ جو سپاہی رکھتا تھا۔ یہ غیر ملکی سپاہ اس کی... پوری طرح وفادار اور ایرانیوں کی دشمن تھی۔ احمد شاہ ان سب کا کمانڈر تھا حالانکہ اس کی عمر اس وقت چوبیس پچیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس وقت یہی احمد شاہ اس کے حضور حاضر تھا۔

''میں اپنے اردگرد خطرات منڈلاتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ میں تمہیں یہ ذمے داری سونپتا ہوں کہ تم اس خطرے کا سدِباب کرو۔''

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔''

''میں نے یہ کہنے کے لیے تمہیں بلایا ہے کہ میں اپنے محافظوں سے مطمئن نہیں ہوں البتہ تم سب کی وفاداری اور بہادری کا مجھے علم ہے اور میں اس کا قدر شناس بھی ہوں۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ کل صبح محافظوں کے تمام افسروں کو گرفتار کر لو۔ اگر کوئی مزاحمت کرے تو اس کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کرنا۔ یہ میرے ذاتی تحفظ کا سوال ہے اور میں اپنی زندگی کی بقا کے لیے صرف تم پر بھروسا کرتا ہوں۔''

جس وقت یہ باتیں ہو رہی تھیں' ایک جاسوس خیمے سے لگا کھڑا تھا۔ اس نے یہ باتیں سنیں اور ان باتوں کا خلاصہ محمد قلی خان تک پہنچا دیا۔ اب وقت نہیں تھا کہ وہ دن نکلنے کا انتظار کرتا وہ فوراً صالح خان کے پاس پہنچا۔

''قلی خان اگر صبح ہو گئی تو ہماری زندگی کی شام ہو جائے گی۔ جو کرنا ہے اسی رات کے کسی پہر کرنا ہے۔''

''تو پھر عہد کرو' ہم ایک دوسرے کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیں گے۔''

''ہم دونوں کا دشمن ایک ہے۔''

''اور آج رات ہی اسے ٹھکانے لگانا ہے۔''

''ہاں' یہ ضروری ہے ورنہ اگلی صبح خود قتل ہونے کے لیے تیار ہو جانا۔''

ان دونوں نے اسی وقت اپنے بھروسے کے آدمیوں کو باخبر کیا۔ انہیں ساتھ لے کر نادر کے خیمے کی طرف چلے۔ ان آدمیوں کی تعداد تقریباً سو تھی۔

نادر شاہ اس وقت اپنی محبوب بیوی ''چوکی'' کے خیمے میں شب باشی کے لیے آیا ہوا تھا۔ یہ کس کو معلوم تھا کہ وہ سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے۔ اس کی ہیبت کا یہ عالم تھا کہ محمد قلی خان اور صالح خان کے سوا ان کے ساتھیوں میں سے کسی کی بھی ہمت نہ ہوئی کہ خیمے میں داخل ہوتے۔ وہ راستے ہی سے لوٹ گئے۔ صرف صالح خان اور قلی خان خیمے کے اندر جانے کی ہمت کر سکے۔ دربان نے تھوڑی سی ہمت کی لیکن اسے ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر دیا گیا۔ ہاتھا پائی کا شور سن کر ''چوکی'' کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے تاریکی میں اپنی طرف آتے ہوئے

صالح خان کو پہچان لیا اور سوئے ہوئے نادر شاہ کو بیدار کیا۔ غصے اور حیرت کے ساتھ نادر اچھل کر بستر سے اترا اور آگے بڑھتے ہوئے صالح خان پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی اور تلوار اٹھا کر حملہ آور پر لپکا۔ کچھ خیمہ میں تھا' کچھ غصے سے بے قابو۔ آہست کو بھی اسی وقت ساتھ چھوڑنا تھا۔ خیمے کی رسی سے اس کا پاؤں الجھا اور وہ زمین پر گر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا' صالح خان نے وار کر دیا اور نادر کا ایک ہاتھ کٹ گیا۔ ہاتھ بھی وہ جس میں تلوار تھی۔ صالح خان دوسرا وار کرنا چاہتا تھا لیکن اس کا ہاتھ جیسے بے جان ہو گیا۔ نادر کی بہادری کا خوف ابھی تک اس کے دل میں تھا۔ اس نے کسی ہیجانی جذبے سے وار کر تو دیا تھا لیکن اب مٹی کا بت بنا کھڑا تھا۔ اتنی ہمت نہیں تھی کہ دوسرا وار کرتا۔ زخمی نادر سنبھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ تلوار بھی دوسرے ہاتھ میں سنبھال لی تھی۔ چاہتا تھا کہ جوابی وار کرے کہ اچانک قلی خاں کو ہوش آ گیا اور اس نے ایک مہلک وار کر کے نادر کا سر اس کے تن سے جدا کر دیا۔

نادر شاہ کی ایک حرم جو بی بی صاحبہ کہلاتی تھی اپنی ایک باندی کو احمد شاہ کی طرف دوڑایا۔ اس باندی نے آنسوؤں کی تحریر میں نادر کے قتل کی اطلاع دی۔

پہلے پہل تو احمد شاہ کو یقین نہیں آیا کہ نادر شاہ قتل ہو گیا ہے لیکن بات سچ تھی۔ اس کی فوج چار ہزار ابدالیوں پر مشتمل چوکس تھی اور نادر شاہ کے حکم پر عمل درآمد کے لیے صبح ہونے کا انتظار تھا کہ یہ خبر آ گئی۔ ابدالی ریلا کر کے خیمہ شاہی کی طرف بڑھے لیکن 6 ہزار قزلباش محافظ راہ کی رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ جلد ہی مزید چار ہزار ایرانی سپاہی قزلباش دستوں کا ساتھ دینے کے لیے اور آن پہنچے۔ اس قدر تعداد کے باجود افغانوں نے ان کی صفیں چیر کر اپنا راستہ بنایا اور چوکی کے لیے نکل پہنچے۔

جو سنا تھا وہ سچ تھا۔ احمد شاہ نے اپنے محسن کی لاش خون میں لت پت پڑی دیکھی۔ وہ دہشت زدہ تھا لیکن آگے بڑھ کر نادر شاہ کی انگلی سے شاہی انگشتری اتار لی۔ اپنے آقا کی لاش کو سلامی دی۔

شاہی خیمے میں اس وقت ہر طرف افراتفری' شور وغل اور ہنگامے کا عالم تھا۔ اس اثنا میں کہ ایرانی قزلباش شاہی املاک و جائداد کی فکر میں سرگرداں تھے' دوسرے قبائل باہمی جنگ میں اور اس سے زیادہ لوٹ مار میں مصروف تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس حادثے کے صرف چار گھنٹے کے اندر اندر کہیں شاہی خیمے کا پتا نشان تھا' نہ شاہی ہیرے' جواہرات اور دوسرے املاک کا۔ نادر شاہ کے ساتھ ہی یہ ساری چیزیں

سوانحی خاکہ

نام..... احمد خان
لقب..... احمد شاہ دُرّانی (ابدالی)
والد..... زماں خان
قبیلہ..... سدوزئی
پیدائش..... 1722ء بہ مقام ملتان
وفات..... 1772ء
تدفین..... قندھار

غائب ہو گئیں۔

نادر شاہ کا سر محمد قلی خان نے فوراً ہی اس کے بھتیجے علی قلی خان کے پاس بھیج دیا اور مقتول کی خواہش کے مطابق قتل کے نویں روز اسے مشہد روانہ کر دیا گیا اور وہاں خیابانِ اعلیٰ میں اس مقبرے کے اندر اسے سپردِ خاک کر دیا گیا جو اسی مقصد کے لیے تعمیر ہوا تھا۔

نادر شاہ کے قتل ہوتے ہی احمد شاہ کو وہ درویش یاد آ گیا جس نے شاید تین سال کا عرصہ اسے دیا تھا کہ وہ بادشاہ بن جائے گا۔ احمد شاہ کو اب اس کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ وہ اس درویش کی کرامت کا قائل ہو گیا کہ شاید میں اب بادشاہ بن جاؤں۔

☆☆☆

افغانوں کے لیے بہترین موقع تھا کہ وہ غیر ملکی جوئے سے نجات حاصل کر کے آزادی اور حریت سے بہرہ ور ہوں۔ ان کے جو علاقے نادر شاہ نے بہ زورِ شمشیر حاصل کر لیے تھے' ان کی طرف واپس ہو جائیں۔ نور محمد خان علی زئی افغانوں پر حکومت کر رہا تھا جو نادر شاہ کا نامزد کردہ تھا اور اب یہ افغان اس علی زئی کے احکام کی متابعت اور پیروی کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس عدم پیروی کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنا ایک سردار جلد از جلد منتخب کر لیں۔ ان لوگوں کی روایت تھی کہ ہر قومی مسئلے کے لیے جرگہ منعقد کیا کرتے تھے اس مرتبہ بھی یہی ہوا۔ انہوں نے جرگہ منعقد کیا جس میں قبیلے کے تمام سردار شریک ہوئے۔

ایک سردار نے کھڑے ہو کر اس جرگے کا مقصد بیان کیا۔

''بھائیو! اس جرگے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ہم اپنے لیے ایک سردارِ اعلیٰ کا انتخاب کر لیں۔ ہم میں سے ہر ایک' مجھ سمیت اس کا حکم ماننے کا پابند ہو اور یہ ضرورت اس

لیے پیش آرہی ہے کہ ہم قندھار کی طرف پیش قدمی کرنے والے ہیں۔ سردار اعلیٰ کے بغیر یہ مشکل بلکہ ناممکن ہے' ہم سلامتی اور تحفظ کے ساتھ قندھار اس طرح پہنچ جائیں کہ ہماری فوج' ہمارے متعلقین' ہمارے سپاہی اور ہمارے ملازم صحیح سلامت ہوں کیونکہ ہمارے سروں پر قزلباشوں کا خطرہ منڈلا رہا ہے۔''

یہ تجویز پیش ضرور کی گئی لیکن جب بحث کا آغاز کیا گیا تو معلوم ہوا یہ اتنا آسان کام نہیں۔ ہر قبیلہ آرزومند تھا کہ یہ منصب اعلیٰ اسے نصیب ہو۔ جب ایک نام پیش کیا جاتا' دوسرا اعتراض کردیتا۔ ہر قبیلے کو اپنی سیادت اور اعلیٰ نسبی پر فخر تھا اور وہ اس کا برملا اظہار کررہا تھا جس سے دوسرے قبیلوں کا طیش میں آجانا لازمی تھا۔

اس کش مکش میں آٹھ روز گزر گئے تھے۔ اس دوران بعض لوگ اپنے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ انہی میں ایک حاجی جمال خان بھی تھے جو محمد زئی قبیلے کے سردار تھے۔ انہوں نے کئی قبیلوں کو اپنے ساتھ ملا کر جرگے کے سامنے اپنا نام پیش کردیا لیکن اس کے مخالف قبیلوں نے سختی سے اس...بات کی مخالفت کی۔ اب حالت یہ ہوئی کہ افغان دو گروہوں میں بٹ گئے۔ جمال خان کے حامیوں نے تلواریں سونت لیں کہ اب فیصلہ تلوار سے ہوگا۔ دوسرا گروپ بھی سامنے آگیا۔ اسی وقت درویش صابر شاہ نہ جانے کہاں سے نمودار ہوگیا۔

''ٹھہرو' نادانو! ان لایعنی باتوں سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ خدا نے احمد خان کو تم سب سے بڑا اور باعظمت آدمی بنایا ہے۔ افغان خاندانوں میں یہ سب سے بالا اور برتر ہے۔ خدا کی مرضی کے سامنے سر جھکا دو ورنہ یاد رکھو اس کی مشیت سے سرتابی تمہیں کہیں کا نہ رکھے گی۔''

اس درویش کی تقریر میں نہ جانے ایسا کیا جادو تھا کہ تلواریں نیام میں چلی گئیں۔ حاجی جمال خان جو تمام سرداروں میں سب سے زیادہ طاقتور سمجھا جاتا تھا اپنی جگہ سے اٹھا اور احمد شاہ کے حق میں دستبرداری کا اعلان کردیا۔ اس کے ساتھ ہی تمام سرداروں نے احمد شاہ کو سردار اعلیٰ کی حیثیت سے قبول کرلیا۔

احمد شاہ نے اسے بھی تائید ایزدی کی ایک نشانی سمجھا۔ یہ درویش جو اس کی زندگی میں آرہا تھا اور ایک نئے انداز سے ظاہر ہورہا تھا، احمد شاہ کے دل میں اس کی طرف سے عقیدت کا پیدا ہوجانا فطری امر تھا۔

صابر شاہ نے دیکھ لیا تھا کہ تمام سردار احمد شاہ کے سامنے گھٹنے ٹیک چکے ہیں۔ اگر اس وقت احمد شاہ کو بادشاہ بنادیا جائے تو کسی طرف سے مخالفت کی کوئی آواز بلند نہیں ہوگی۔ اس نے اس عظیم نفسیاتی لمحے سے فائدہ اٹھایا۔ احمد شاہ کو ابھی بادشاہت کا اعلان کرنے میں تامل تھا لیکن صابر شاہ وقت ضائع کرنے کے حق میں نہیں تھا۔

درویش نے زمین پر ایک چھوٹا سا چبوترا بنایا۔ احمد خان کا ہاتھ پکڑ کر اس پر بٹھایا اور کہا ''یہ تمہاری مملکت کا تخت شاہی ہے۔ اب تم بادشاہ دردوراں ہو۔''

احمد شاہ نے اس خطاب میں تھوڑی سی ترمیم کی اور دردوراں کے بجائے ''دران'' کردیا۔ اس وقت سے اس کا قبیلہ ابدالی کے بجائے درانی کہلایا جانے لگا۔ اب وہ احمد شاہ ابدالی نہیں احمد شاہ درانی تھا۔

اس نے بادشاہ بنتے ہی جرگے کے مشورے سے افغانستان کا سیاسی تعلق ایران سے منقطع کرنے کا اعلان کردیا اور یہ قرارداد پیش کرکے منظور کی گئی کہ اب مملکت آزاد ہے اور خودمختار ہے اور خود اپنا ایک بادشاہ رکھتی ہے اس لیے اب اسے ایران کی ماتحتی میں نہیں رکھا جاسکتا جیسا کہ نادر شاہ کے زمانے میں تھا۔

یہ فیصلہ بالاتفاق ہوا۔ جملہ افراد قبائل اور سرداران قبائل نے اس فیصلے کی پُرجوش تائید کی۔ مخالفت میں ایک بھی آواز نہ اٹھ سکی۔ وطن کی آزادی سب کو عزیز تھی۔

احمد شاہ کی ماتحتی میں چار ہزار افغان تھے۔ انہیں لے کر وہ سرزمین قندھار کی طرف روانہ ہوا۔ اس سے پہلے ہرات پر قبضہ کرنا چاہیے تھا لیکن وہاں نادر شاہ کا نامزد گورنر موجود تھا اور ابھی احمد شاہ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ اسے ہر طرف کرسکتا۔ لہٰذا وہ براہ راست قندھار کی طرف بڑھا۔ راستے میں چند ہزار ایرانی فوج اس کا راستہ روکے کھڑی تھی جسے اس نے آسانی سے زیر کرلیا اور پھر بہ آسانی قندھار میں داخل ہوگیا۔

احمد شاہ کی خوش قسمتی اس کے ساتھ ساتھ سفر کررہی تھی یا پھر درویش صابر شاہ کے قدموں کی برکت تھی جو اب بھی احمد شاہ کے ساتھ تھا۔

وہ قندھار میں داخل ہوا ہی تھا کہ والیٔ لاہور اور والیٔ کابل کے نمائندے احمد سید خاں کی معیت میں دو کروڑ روپے کا خزانہ جو زرنقد اور بے شمار ہیرے جواہرات اور شالوں پر مشتمل تھا، تین سو اونٹوں پر لدا ہوا قندھار پہنچا۔ یہ تحائف نادر شاہ کی خدمت میں بھیجے جارہے تھے۔ اہل قافلہ بے خبر تھے کہ نادر شاہ ہلاک ہوچکا ہے۔ وہ تو چند روز ستانے

کے لیے قندھار آئے تھے کہ دنیا ہی بدلی ہوئی دیکھی۔

کاروان ابھی شہر سے کچھ فاصلے پر تھا کہ احمد شاہ نے چند سرداروں کو اہل قافلہ کے پاس بھیجا اور منادی کرائی کہ نادر شاہ ہلاک ہوچکا۔ احمد شاہ درانی اب افغانستان کا بادشاہ ہے لہٰذا اس خزانے پر اب اس کا حق ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے سپاہی وہاں پہنچ گئے اور اپنی حفاظت میں اس خزانے کو شہر تک لے آئے اور احمد شاہ کے قدموں میں رکھ دیا۔

احمد شاہ نے اس وقت کمال فیاضی کا مظاہرہ کیا۔ اس خزانے کو شاہی خزانے کا حصہ بنانے کے بجائے جبکہ اس خزانے کی اسے اس وقت ضرورت بھی تھی، سب کا سب اپنی فوج کے سرداروں، سالاروں اور سپاہیوں اور حکومت کے اعلیٰ عہدے داروں میں تقسیم کردیا۔

یہ دریادلی اس کا مزاج تھا یا مصلحت، دونوں حالتوں میں فائدہ اسی کو ہوا۔ اس کی فیاضی سے دشمن بھی دوست بن گئے۔ اپنے متعدد قبائل تھے جنہوں نے اس کے انتخاب کو دل سے تسلیم نہیں کیا تھا۔ دولت کا لالچ انہیں بھی اس کے قریب لے آیا، وہ سوچنے لگے کہ اگر اس کے ساتھ رہے تو اس کی فیاضی سے وہ بھی مستفید ہوتے رہیں گے۔ اس کے دامن دولت سے وابستہ ہونے کے لیے لوگ جوق در جوق آنے لگے۔ نادر شاہ کے وہ قزلباش ملازم جو کابل اور پنجاب میں متعین تھے، واپس آکر اس نئی حکومت سے وابستہ ہونے لگے۔ چند ایرانی پلٹنیں بھی افغان حکومت کی ملازمت میں داخل ہوگئیں۔ ہر طرف احمد شاہ درانی اور اس کی فیاضی کے چرچے ہورہے تھے۔ پیشہ ور سپاہی اس کی طرف دوڑ دوڑ کر آرہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ قسمت آزما احمد شاہ قسمت آزمائی کے لیے نکلے گا۔ اس کے ساتھ رہے تو مال غنیمت میں بھی خاطر خواہ حصہ ملتا رہے گا۔ کچھ لوگوں نے پس وپیش کیا تو احمد شاہ نے انہیں طاقت سے کچل دیا۔

☆☆☆

احمد شاہ درانی کا نام ماں باپ نے احمد خان رکھا تھا۔ یہ زمان خان ابدالی کا دوسرا بیٹا تھا جو سدوزئی قبیلے کا سردار اعلیٰ تھا۔ احمد خان اور بعد میں احمد شاہ درانی فرمان روائے قندھار کہلانے والا 1722ء میں یہ مقام ملتان پیدا ہوا۔

زمان خان ہرات کا گورنر تھا۔ احمد شاہ کی پیدائش کے چند ماہ بعد ہی اس کی وفات ہوگئی۔ یہ زمانہ احمد شاہ کی ماں زرغونہ علی کوزی کے لیے نہایت ناسازگار تھا۔ نومولود بیٹے کی سلامتی اسے پریشان رکھتی تھی چنانچہ علی زئی قبیلے کے سردار حاجی اسمٰعیل کی پناہ میں چلی گئی اور شرط یہ قرار پائی کہ

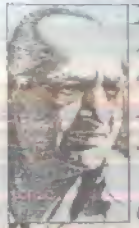

میں نے اشفاق اور بانو قدسیہ سے کہا کہ کل میں جارہی ہوں لندن، لاہور کے اردبوں سے ملا دو چائے پر اور فیض صاحب کو ضرور بلاؤ۔ بہت دنوں سے نہیں دیکھا۔''

''فیض صاحب کو تم خود کہو، باقی میں سب کو بلالوں گی۔'' پھر دوسرے دن روزہ کھلنے کے وقت (ملکہ ترنم) نورجہاں پیاری نے مجھے اپنی کاڑی میں بانو قدسیہ کے گھر چھوڑا۔ اس کا بھی بہت دل چاہ رہا تھا کہ فیض صاحب کو دیکھنے جائے مگر اس کی ریکارڈنگ تھی۔ (آنکھیں بند کرکے) وہ بھی کیسے فیض صاحب کو مسکرا کر یاد کررہی تھی۔ فریدہ خانم کیسے پیار اور محبت سے فیض صاحب کی چاہت کی باتیں کرتیں۔ یہ کیسے آپ..... محبوب تھے سب کے! ساری عورتیں کیسے آنکھ بند کرکے آپ کو پیار سے یاد کرتیں۔ ایک دوسرے کے سامنے کوئی کسی سے نہیں جلتا تھا اور آپ سب کے محبوب تھے اور اس دن پارٹی میں، میں نے پوچھ ہی لیا۔ سادگی سے، پیاری سی بانو قدسیہ کبھی مجھے، کبھی فیض صاحب کو دیکھ رہی تھیں'' کی کل اے فیض صاحب، ھن بیگم اقبال دا کی بنے گا'' ایک دبلی سی خاتون جو کچھ دیر پہلے فیض صاحب کے پاس سے اٹھ کر گئی تھیں، قدسیہ کا اشارہ ان کی طرف تھا۔

سحاب قزلباش کے مضمون ''ستارۂ وفا'' سے اقتباس

وہ اپنی بیٹی کی شادی حاجی اسمٰعیل سے کردے گی، اس نے یہ شرط منظور کرلی۔ حاجی اسمٰعیل نے نومولود احمد شاہ کے لیے تعلیم وتربیت کی تمام سہولتیں مہیا کیں۔

زمان خان کی مسند پر محمد خان نے قدم رکھا۔ 1722ء کے موسم سرما میں محمد خان نے مشہد کی طرف کوچ کیا تھا لیکن چار مہینے کے محاصرے کے بعد بھی جب وہ قبضہ نہ کرسکا تو اسے ذوالفقار خان کے حق میں دستبردار ہونا پڑا جو زمان خان کا بڑا بیٹا اور احمد شاہ کا بڑا بھائی تھا۔

اس کے بعد سے اگلے دس برسوں تک ذوالفقار خان روایتی جنگوں میں گھرا رہا۔ محمد خان کے ورثا ایک ایک کرکے اس کے سامنے آتے رہے۔ پھر وہ طوفان برپا ہوا جس کا نام

نادر شاہ درانی تھا۔ مشہد پر اس کا قبضہ ہوتے ہی ذوالفقار خان دوسرے سرداروں کے ساتھ مل کر نادر شاہ کے مقابلے پر آتا رہا لیکن نادر شاہ کی طاقت اب کسی کے سنبھالے نہ سنبھلتی تھی۔ ذوالفقار خان نے اس زبردست سپہ سالار کے مقابلے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن ہر مرتبہ ہزیمت اٹھانی پڑی۔ بالآخر اسے اپنا علاقہ فرح چھوڑنا پڑا۔

دس سال کا احمد شاہ، ذوالفقار خان کے ساتھ تھا۔ یہ دونوں پناہ حاصل کرنے کے لیے قندھار کی طرف بھاگ رہے تھے۔ یہ پناہ کے لیے قندھار آئے تھے لیکن ہوا الٹی چل پڑی۔ میزبان میر حسین (گورنر) نے دونوں بھائیوں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔

چار سال بعد ایک زبردست معرکے کے بعد نادر شاہ نے قندھار پر قبضہ کرلیا۔ یہاں اسے اس کا دیرینہ دشمن ذوالفقار خان اور اس کا چھوٹا بھائی احمد شاہ ملے۔ احمد شاہ کی عمر اس وقت چودہ سال تھی۔ نادر شاہ کی قیافہ شناسی اتنی زبردست تھی کہ اس لڑکے کے ماتھے پر لکھی ہوئی تمام تحریریں پڑھ لیں۔ اس نے حاجی اسمٰعیل کی سفارش سے ذوالفقار خاں کو بہت سا مال و متاع دے کر باڑ ندراں کی فرماں روائی سونپ دی اور احمد خان کو اپنے ذاتی نگہداروں میں شامل کرلیا۔ بعد میں وہ نگہداروں کا سربراہ بنا دیا گیا۔

یہی احمد خان، نادر شاہ کی ہلاکت کے بعد ابدالیوں کا سردار اعلیٰ منتخب ہوا پھر بادشاہ قرار پایا۔ اس نے نادر شاہ کے ساتھ رہتے ہوئے ہندوستان، ترکیہ اور دوسرے مقامات پر جنگی مہمات میں حصہ لیا تھا اور اپنی شجاعت اور دلیری کے جھنڈے گاڑ دیے تھے اور اب اپنے وطن کی آزادی کے لیے کوشاں تھا۔ اب وہ صرف احمد خان نہیں احمد شاہ درانی فرماں روائے قندھار تھا۔

☆☆☆

یہ احمد شاہ کی ذہانت تھی کہ وہ ہر کام بروقت کرنے کا عادی تھا۔ ایک سال پورا گزر چکا تھا لیکن ابھی تک اس نے رسم تاج پوشی نہیں کی تھی۔ اب اس نے دیکھ لیا کہ بادشاہت مستحکم ہوگئی ہے۔ مخالفت کی آواز کہیں سے نہیں اٹھے گی تو رسم تاج پوشی کا اعلان کردیا۔ یہ رسم ایک مسجد میں ادا کی گئی۔ شہر کے سب سے بڑے عالم نے یہ رسم ادا کی۔ قبائلی رسوم کے مطابق اسی عالم نے خطبہ پڑھا جس میں احمد شاہ کا نام لیا گیا اور مٹھی بھر گیہوں نئے بادشاہ کے سر پر سے نچھاور کیے اور حاضر الوقت انسانوں کے سامنے اعلان کردیا کہ بادشاہت کے لیے احمد شاہ کو خدا نے اور قوم نے منتخب کیا ہے۔''

احمد خان نے تخت نشینی اور تاج پوشی کی رسم انجام دینے کے بعد باقاعدہ ''شاہ'' کا خطاب اپنے لیے استعمال کیا۔ اس نے اسی مسجد میں یہ اعلان کیا کہ اب اسے احمد شاہ درانی کے لقب سے یاد کیا جائے اور آئندہ اس کے قبیلے کو ''ابدالی'' نہ کہا جائے بلکہ ''درانی'' کہا جائے۔

تاج پوشی کی اس رسم کے بعد اس کے سامنے دو اہم ترین مسائل تھے جنہیں اسے حل کرنا تھا۔ ایک تو افغانی قبائل کی تنظیم دوسرے اس نئی حکومت کے استحکام اور تحفظ و سلامتی کا بندوبست۔ نظم مملکت چلانے کے لیے اس کے سامنے نادر شاہ کی مثال موجود تھی لیکن جب اس نے غور کیا تو اپنے حالات کو نادر شاہ کے حالات سے مختلف پایا۔ ایرانی قوم جس سے نادر شاہ کا سامنا تھا، صدیوں سے ایک مخصوص قسم کے نظام شاہی کو اپنائے ہوئے تھی اور یہ لوگ اس کے سامنے سر جھکاتے چلے آرہے تھے لہٰذا نادر شاہ بغیر کسی مزاحمت کے کامیاب ہوگیا۔ اس کے برعکس احمد شاہ کا معاملہ دوسرا تھا۔ اس کا سامنا ایک آزاد مزاج قوم سے تھا۔ انہوں نے اگر نادر شاہ کی غلامی قبول کی تھی تو اس کی تمام تر بنیاد نفرت اور سختی پر تھی۔ یہ لوگ کسی کی حاکمیت قبول کرنے کو تیار نہ ہوتے تھے چاہے یہ شخص ان ہی میں سے کیوں نہ ہو۔

احمد شاہ کو اپنا راستہ خود بنانا تھا۔ وہ افغان تھا۔ اس کی ساری زندگی افغانوں ہی میں گزری تھی۔ ان کی نفسیات سے واقف تھا۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ قبائل پر حکومت براہِ راست نہیں کرے گا بلکہ ان کے سرداروں کے ذریعے کرے گا۔ ان کے اندرونی معاملات و مسائل اور نظم و انتظام میں اس نے ذرا بھی مداخلت نہیں کی۔ یہ ایک خود مختار بادشاہ کے لیے عجیب سا فیصلہ تھا لیکن اس کی ذہانت جانتی تھی کہ قبائل کا دل اسی طرح جیتا جاسکتا ہے۔ اسی طرح یہ سردار بہ وقت ضرورت سپاہ مہیا کرسکتے ہیں۔ اس نے ان زمینوں کے مالکانہ حقوق کا جو درانیوں کو حاصل تھے، برقرار رکھا۔ اس کے سوا ان سے کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا سوائے قلیل تعداد سپاہ وہ مقرر کردے اسی تعداد میں سپاہیوں کو ضرورت کے وقت فراہم کردیں۔ کلیدی عہدے درانیوں کے پاس رکھے۔ انہیں احساس دلایا کہ درانی کوئی غیر نہیں خود اس کے اپنے لوگ ہیں اور یہ کہ وہ ان کی آزادی کا دشمن نہیں۔ اگر جنگ کرے گا تو اس کے لیے غیر ملکی سرزمین اختیار کرے گا۔

پڑوسی ممالک کے ابتر حالات نے اس کے اس جذبے کو مزید ہوا دی۔ نادر کی تاخت و تاراج نے عظیم ہندی اور ازبک حکومت کو پارہ پارہ کردیا تھا اور اب ان میں کوئی دم

نہیں رہ گیا تھا۔ نادر شاہ کی ہلاکت نے ایران کا آفتاب اقبال بھی غروب کردیا تھا۔ احمد شاہ کے سامنے وسیع میدان تھا جس میں گھوڑے دوڑا کر وہ دنیا کا رخ بدل سکتا تھا۔

اسے سب سے پہلے ان گورنروں کو اپنی طاقت کا اسیر بنانا تھا جسے نادر شاہ نے مقرر کیا تھا اور اب وہ خود مختار بنے بیٹھے تھے۔ اس نے غزنی پر قبضہ کرلیا۔ اس نے کابل کے لوگوں سے یہ وعدہ کرکے کہ ان کا اقتدار ختم نہیں ہوگا، اپنے داخلی مسائل میں پورے طور پر آزاد ہوں گے، کابل میں داخل ہوگیا۔ کابل کے سقوط نے اس کی مملکت میں ایک اور صوبے کا اضافہ کردیا۔

اب احمد شاہ کو لاہور کی جانب روانہ ہونا تھا جہاں کا گورنر شاہ نواز خان تھا اور نہایت طاقتور سمجھا جاتا تھا لیکن اب احمد شاہ کے پاس بھی اتنی طاقت تھی کہ وہ اس کے دانت کھٹے کرسکتا تھا۔

وہ شاہدرہ کے پاس پہنچ کر رکا ہوا تھا کہ پیر صابر شاہ جو اس کے ساتھ آیا تھا اچانک غائب ہوگیا۔ احمد شاہ کو اس سے اتنی عقیدت تھی کہ ایک لمحے کو خود سے جدا نہیں ہونے دیتا تھا بلکہ بعض نے تو یہ تک دیکھا تھا کہ احمد شاہ تخت شاہی پر متمکن ہے اور ایک درویش غبار میں لت پت اس کی گود میں سر رکھے لیٹا ہے۔ اکثر وہ ہاتھ اٹھا کر اس کا کان یا ناک اپنی طرف کھینچتا ہے اور کہتا ہے ''اے افغانی، دیکھ میں نے تجھے بادشاہ بنا دیا۔'' یہ وہی فقیر پیر صابر شاہ تھا۔ اب یہ غائب ہوگیا تو افغانی کو سخت صدمہ پہنچا۔ اس نے تو یہ تک سوچ لیا تھا کہ کوئی نحوست آنے والی ہے اسی لیے درویش نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

لوگوں نے دیکھا، لاہور کی سڑکوں پر ایک فقیر بھاگنے کی طرح چل رہا تھا جسے بہت جلدی مچی ہے۔ جہاں مجمع دیکھتا ہے، ٹھہر جاتا ہے اور آواز لگاتا ہے۔ ''ایک آفتاب گہنا گیا دوسرا چمکنے والا ہے۔ اس کی حکومت آنے والی ہے۔ تلوار سے بچو اور اس کا استقبال کرو۔''

ایک جگہ کچھ لوگوں نے اسے روک لیا ''تم یہاں کیوں آئے ہو، کس کے آنے کی خبر سناتے پھر رہے ہو؟''

''اس شہر سے میرا لگاؤ ہے۔'' درویش نے کہا ''یہاں کے باشندوں سے تعلق خاطر بھی رکھتا ہوں۔ یہاں کے فرمانرواؤں کا ہمدرد اور بہی خواہ بھی ہوں جن کے ساتھ میں زندگی کے دن بسر کرچکا ہوں لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ بے وفائی سے نہ آدمی خوش ہوتا ہے نہ خدا۔ اور یہ بھی کہ احمد شاہ کی تلوار کا تمہاری تلوار مقابلہ نہیں کرسکتی۔''

انوار قطبی

انوار قطبی (Aurora) آسمان پر روشنی کی قدرتی نمود کو کہتے ہیں۔ قطب شمالی کے قریبی علاقوں میں رات کے وقت آسمان چمک دار سبز، سرخ، نیلی اور زرد رنگ کی روشنی سے دمک اٹھتا ہے۔ یہی روشنیاں دراصل انوار قطبی کہلاتی ہیں۔ انوار قطبی عموماً 80 تا 160 کلومیٹر کی بلندیوں پر شمالی یا جنوبی قطبین کے قریب واقع ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ان کی بلندی 1,000 کلومیٹر سے بھی تجاوز کرجاتی ہے۔ انوار قطبی سورج کے چارج شدہ ذرات سے بالائی لطیف اور ٹھنڈی فضا میں ہوا کے مالیکیولوں سے ٹکرانے پر وجود میں آتی ہے۔

تلاش: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

کسی نے کہا ''جناب عالی، آپ کا مقصد اس ارشاد سے کیا ہے؟ کیا ہماری تلوار لکڑی کی بنی ہوئی ہے اور ابدالی کی تلوار آہن کی ہے۔''

درویش نے جواب دیا ''نہیں، یہ بات نہیں۔ دونوں تلواریں آہن کی بنی ہوئی ہیں لیکن اس کا آفتاب اقبال نصف النہار پر ہے اور تمہارا اقبال گہنا چکا ہے۔''

یہ خبریں کہیں چھپ سکتی تھیں شاہ نواز خان تک بھی پہنچ گئیں۔ اس کے آدمیوں نے شاہ نواز کو باور کرایا کہ مرد درویش لوگوں کو بغاوت پر اکسا رہا ہے لہٰذا شاہ نواز نے اسے اپنے پاس بلوایا۔

''احمد شاہ کس ارادے سے لاہور کی طرف آرہا ہے۔''

''ایک فاتح کا ارادہ کیا ہوتا ہے؟'' درویش نے کہا۔

''اچھا تو وہ لاہور فتح کرنے آیا ہے؟''

''وہ ہندوستان فتح کرنے کا عزم رکھتا ہے۔''

''تمہیں مجھ میں اور اس میں کوئی فرق نظر آتا ہے؟''

''وہ افغانستان اور خراسان کا بادشاہ ہے اور ہندوستان فتح کرنے کا عزم رکھتا ہے۔ تمہاری حیثیت صرف ایک صوبے دار یعنی گورنر کی ہے۔ تم آزاد نہیں ایک دوسرے شخص

کے غلام اور خادم ہو۔ (شہنشاہِ ہند کے) تمہارے مفاد میں یہ ہے کہ میرے ساتھ احمد شاہ درانی کے پاس چلے چلو۔ وہ تمہاری عزت بڑھائے گا۔ اعزاز میں اضافہ کرے گا اور پورے ملک کی وزارت تمہیں سونپ دے گا۔''

شاہ نواز خان کو یہ باتیں اتنی ناگوار گزریں کہ اس نے حکم دیا، اس درویش کو بخشی عصمت اللہ خان کے حوالے کردیا جائے۔ بخشی عصمت اللہ خان نے شاہ نواز کا اشارہ پاکر پیر صابر شاہ کو ہلاک کردیا۔

یہ خبر جیسے ہی احمد شاہ کے کیمپ میں پہنچی اس نے فوراً کوچ کا حکم دیا۔ اس کے غضب کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اس نے دریائے چناب کو عبور کیا اور شہنشاہ جہانگیر کے مقبرے میں آ کر مقیم ہوگیا۔ اُدھر شاہ نواز نے بھی جنگی تیاریاں شروع کردیں۔ اس نے اپنے خیمے شہر سے باہر نصب کردیے تاکہ تیاریوں کی یہ چشم خود نگرانی کرسکے۔

شاہ نواز نے اپنے ایک سپہ سالار جلسہ خان کو حکم دیا کہ احمد شاہ کی افواج کا مقابلہ کرے اور اسے روکے لیکن یہ افغان سردار اپنے ہم قوم افغانوں سے مل گیا اور اپنے ساتھ پوری فوج اور سارا ساز و سامان بھی لیتا گیا۔

احمد شاہ کے پاس کوئی توپ نہیں تھی اس لیے وہ بہت محتاط تھا۔ سامنے آنے سے گریز کرتا رہا اور چھوٹوں سے کام لیتا رہا۔

اس دن سارا دن جنگ ہوتی رہی تھی۔ شاہ نواز خان پریشان تھا کہ اس قدر طاقت کے باوجود اسے غلبہ کیوں حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ اسے رہ رہ کر پیر صابر شاہ کا خیال آ رہا تھا۔ اس کی کہی ہوئی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ کہیں یہ اس درویش کے قتل کا نتیجہ تو نہیں۔ گھبرا کر ایک آدمی کو درویش شاہ کلب علی کی خدمت میں بھیجا جو بے اتنے مہم مانے جاتے تھے۔

جانے والے نے شاہ صاحب کو شاہ نواز خان کا پیغام پہنچایا ''اس جنگ کا انجام کیا ہوگا؟''

شاہ کلب علی نے حساب کتاب لگا کر بتایا ''بادشاہ سے کہنا، آج کا دن اس کے لیے منحوس ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آج لڑائی بند رکھو۔ کل سے فتح و ظفر تمہارے قدم چومے گی۔ آج جنگ چھڑ گئی تو تمہیں شکست سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔''

منجم کا یہ جواب پاتے ہی شاہ نواز خان نے اپنے افسرانِ فوج آدینہ بیگ خان اور کوڑا مل کو پیام بھیجا کہ درانیوں کے خلاف پیش قدمی فوراً روک دو۔''

شاہ نواز خان اپنے افسران کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا ہی تھا کہ توپوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اس نے نوالہ ہاتھ سے رکھ دیا، یہ کون ہے جس نے جنگ کا آغاز کردیا۔

توپوں کی آوازیں سنتے ہی شاہ نواز کے آدمی جنگ گاہ کی طرف دوڑ پڑے تھے۔ معلوم ہوا، درانی حملہ آور ہوئے تھے۔ فرلباش اس یلغار کو نہ روک سکے اور درانی سپاہی خندقوں میں گھس آئے۔ اب جنگ کا پھر جانا ناگزیر تھا۔ شاہ نواز نے آدینہ بیگ کو حکم دیا کہ وہ فوراً جنگ گاہ کی طرف مدد کے لیے روانہ ہو لیکن شاید اسے منجم کی ہدایت یاد تھی۔ وہ خندقوں کی طرف جانے کے بجائے دوسری طرف چلا گیا۔ تماشا دیکھنے والوں میں ایک تماشائی کا اور اضافہ ہوگیا۔ میدان میں سورج غروب ہوا تو وہ شہر کی طرف واپس آ گیا۔

ابدالی فوجیں دفعتاً ٹوٹ پڑیں۔ سواروں نے اتنی تیزی سے یورش کی اور اہلِ لاہور پر ایسی زبردست یورش کی کہ وہ حیران رہ گئے۔ بدحواسی کے عالم میں ان میں بھگدڑ مچ گئی۔

بخشی عصمت اللہ خان اور آدینہ بیگ پہلے ہی میں فرار ہوگئے۔ ان کے فرار سے دوسرے سرداروں میں بھی افراتفری پھیل گئی۔ شکست سر پر منڈلا رہی تھی۔ شاہ نواز خان اب بھی ڈٹا ہوا تھا۔ وہ ہاتھی پر سوار ہوا اور اپنے خیمے میں آ گیا تاکہ فوج کا حوصلہ بلند ہو اور اس کے اکھڑے ہوئے قدم جم سکیں لیکن اس کے عزیزوں نے مشورہ دیا کہ شہر کے کسی محفوظ مقام پر پناہ گزیں ہوجائے۔ اس نے یہ مشورہ مان لیا اور دوبارہ ہاتھی پر سوار ہوگیا۔ اس کا ہاتھی خیمے سے آگے بڑھا تھا تو وہ لوگ بھی جو اس کا ساتھ اب تک دے رہے تھے، سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

شاہ نواز خان شہر کے اندر اپنی حویلی میں چھپا ہوا تھا۔ چند باوفا ساتھیوں کے سوا اس کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ احمد شاہ کے پیرومرشد کو قتل کرنے کے بعد وہ اس سے رحم و کرم کی توقع بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اب جان کی سلامتی صرف راہِ فرار میں نظر آ رہی تھی۔ جب رات آدھی ہوئی تو خاموشی سے دہلی کی طرف فرار ہوگیا۔

صبح ہوئی اور شاہ نواز کے فرار کی خبر احمد شاہ کو ہوئی تو وہ اپنے کیمپ سے باہر نکلا اور بغیر کسی مزاحمت کے مفرور گورنر کے فوجی صدر دفتر اور عسکری سامان پر قابض ہوگیا۔

احمد شاہ کے سامنے ابھی ایک اور مہم تھی۔ اسے یہ اطلاع بھی مل چکی تھی کہ مغل شہنشاہ محمد شاہ ایک بہت بڑی مہم اسے شکست دینے کے لیے تیار کر رہا ہے۔

لاہور کی فتح کے بعد بے حد و حساب مالِ غنیمت اس کے ہاتھ آیا تھا۔ گزشتہ 35 سال سے جو کچھ زر و نقد اور سامانِ جنگ جمع ہوا تھا اس سب کا مالک اب احمد شاہ تھا۔ اتنا کچھ ملا

کہ اس کی فوج کے پانچ ہزار پیادے ایک باقاعدہ سوار رجمنٹ میں تبدیل کردیے گئے۔ اس کی فوج میں توپ خانے کا اضافہ بھی ہوگیا۔ اب وہ اسلحہ سے عاری، محض اپنی دلیری پر تکیہ کرنے والا افغان بادشاہ نہیں تھا۔ اب اس کے پاس اتنا ساز و سامان تھا کہ ہندوستان پر مہم کشی کا خواب پورا کرسکتا تھا۔

اس نے لاہور میں پانچ ہفتے قیام کیا اور ایک مقامی حکومت تشکیل دے دی جس کا سربراہ جلسہ خان داسی کا ہم قوم تھا اور اپنے پاؤں ہندوستان (دہلی) کی طرف پھیلا دیے۔

☆☆☆

''محمد شاہ (شہنشاہِ ہند) کے دربار میں جمود اور سازش کا دور دورہ تھا۔ نادر شاہ کے تباہ کن حملے نے بھی جسے ابھی کچھ زیادہ مدت نہیں گزری تھی محمد شاہ کے اعیان و امرا میں سے کسی کو بیدار نہیں کیا تھا۔ سب مست خواب تھے۔ ان میں سے کسی کو بھی نہ فرض کا احساس تھا نہ آنے والے دور کا اندیشہ۔ خود شاہِ دہلی کا یہ حال تھا کہ افیون نے اس پر قبضہ جما رکھا تھا۔

وزیرِ اعظم قمرالدین خان بار بار حاضر ہو کر خطرے کا احساس دلا رہے تھے اور یہ اصرار کر رہے تھے کہ جب تک بادشاہ خود افواجِ ہند کی سالاری کے فرائض انجام نہیں دے گا، یہ آرام طلب اور سست گام ہندوستانی، ابدالی سپاہیوں کے سامنے نہیں ٹھہر سکیں گے۔''

جب یہ خبریں موصول ہوئیں کہ احمد شاہ تیس ہزار سوار لے کر لاہور سے روانہ ہوچکا ہے تو وزیرِ اعظم چند افسروں کے ساتھ شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

''نادر شاہ کی غارت گری کو لوگ ابھی بھولے نہیں ہیں کہ احمد شاہ ابدالی ہوا پر سوار دہلی کی طرف دوڑا چلا آ رہا ہے۔''

''بے شک، ہم لاہور میں شاہ نواز خان کی مدد کو نہ پہنچ سکے لیکن احمد شاہ کی اتنی ہمت نہ ہوگی کہ وہ دہلی کا رخ کرے۔''

''گستاخی معاف! نادر شاہ کے بارے میں بھی ہمارا یہی خیال تھا۔''

''نادر شاہ سے دہقانی احمد شاہ کا مقابلہ بے سود ہے۔ اس کے پاس اتنے وسائل کہاں؟''

''جاسوسوں نے خبر دی ہے کہ اس کے ساتھ تیس ہزار سپاہی اور توپ خانہ ہے۔''

ہوا کی رفتار

زمین پر تیز رفتار ترین ہوا کا ریکارڈ 231 میل فی گھنٹا ہے جو 10 اپریل 1934ء کے روز ماؤنٹ واشنگٹن' نیو ہیمپشائر (امریکا) میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔ براعظم قطب جنوبی (انٹارکٹیکا) کبھی کبھار ہوا کی رفتار 200 میل فی گھنٹا یا اس سے بھی زیادہ ہوجاتی ہے۔ ماہرین کے مطابق دنیا میں سب سے تیز ہوا اسی مقام پر چلتی ہے۔ ذرا سوچیے کہ اگر ہمیں اس تیز اور سرد ہوا میں کھڑا ہونا پڑ جائے تو ہماری کیا حالت ہوگی؟ اگر 0 درجے سینٹی گریڈ پر 50 میل فی گھنٹا کی رفتار سے ہوا چلے تو ہمیں اس کا درجہ حرارت منفی 56 ڈگری محسوس ہوگا۔

انتخاب: محمد حذیفہ، کراچی

''میں افواجِ شاہی کو پیش قدمی کا حکم دے چکا ہوں۔ پھر میرے پاس کیوں آئے ہو۔''

''خدمتِ شاہ میں یہی عرض کرنے کہ افواجِ شاہی نے ذرا بھی نقل و حرکت نہیں کی ہے۔ غلام کی تجویز یہ ہے کہ احمد شاہ کے خطرے کو معمولی نہ سمجھیں۔ سالاری کے فرائض آپ خود انجام دیں تاکہ اس مردہ فوج میں کچھ جان پڑے۔''

''دیکھتے نہیں کہ ہم بیمار ہیں۔ اطبا نے ہمیں نقل و حرکت سے منع کردیا ہے۔''

کہن سال وزیرِ اعظم سوچ رہا تھا، معمولی سی بیماری بادشاہِ ہند کو اس عظیم قومی فرض سے کس طرح روک سکتی ہے۔ اس نے مشورہ دیا کہ شہزادے کو اپنا قائم مقام بنا کر سالاری سونپ دی جائے۔ بادشاہ اس پر بھی تیار نہیں ہوا اور بالآخر وزیرِ اعظم قمرالدین خان کو سالاری کا منصب عطا کردیا گیا تاکہ وہ فوج کی پیش قدمی کو ممکن بنائے اور احمد شاہ کا راستہ روکے۔

سونی پت کے قریب پہنچ کر شاہی جنگی کونسل نے شہنشاہِ دہلی سے استدعا کی کہ ولی عہد شہزادہ احمد کو فوج کے ساتھ رکھا جائے تاکہ اس کے حوصلے بلند رہیں۔ بالآخر شہنشاہ نے یہ تجویز مان لی اور شاہ زادہ فوج سے جا ملا۔

شاہی فوج چاہتی تھی کہ احمد شاہ دریائے ستلج عبور نہ کرسکے۔ پانی پت پہنچ کر فوج کو از سرِ نو ترتیب دیا گیا اور پھر

شاہی فوج سرہند پہنچ گئی۔ وزیر قمرالدین کا سارا ساز و سامان قلعہ سرہند میں لا کر اتارا گیا۔ اس کی حفاظت کے لیے ایک ہزار سواروں اور پیادوں کا دستہ ایک خواجہ سرا کی ماتحتی میں کافی سمجھا گیا۔

شاہی افواج، احمد شاہ سے دوبدو ہونے کے لیے ستلج پار کرنا چاہتی تھیں۔ دریا لدھیانہ کی طرف سے بھی پار کیا جاسکتا تھا لیکن شاہزادے نے مشورہ دیا کہ ''مچھی واڑے'' کی طرف کوچ کیا جائے جہاں سے دریا پایاب ملے گا۔ یہی غلطی تھی۔ لدھیانہ اور سرہند سے گزرتی ہوئی شاہراہ عظیم کو ترک کردینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ احمد شاہ درانی کے لیے مغل دارالسلطنت کی طرف کوچ کرنے کا راستہ صاف ہوگیا۔

☆☆☆

احمد شاہ نے لاہور سے نکلنے سے پہلے ہی سرہند کے فوج دار علی محمد خان روہیلہ کو لکھ دیا تھا کہ وہ اطاعت و رفاقت کے لیے تیار رہے۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ اس کے صلے میں وہ اسے ہندوستان کا وزیر بنا دے گا۔ علی محمد خان نے یہ خط ملتے ہی سرداروں کی ایک مجلس طلب کی۔ مجلس کے افغان سرداروں نے متفقہ طور پر یہ رائے دی کہ احمد شاہ کی دعوت فوراً قبول کرلینی چاہیے لیکن علی محمد خان کی رائے اس کے برخلاف تھی۔

''احمد شاہ ہندوستان میں قیام اختیار نہیں کرے گا۔ بہت جلد وہ اپنے ملک واپس چلا جائے گا لہٰذا میری رائے میں یہ مناسب نہیں ہوگا کہ ہم اس ملک کے لوگوں کی نظروں میں ذلیل ہوں اور ہندوستان کے شہنشاہ اور سرداروں کے معتوب ہوں۔''

اس رائے کے ساتھ ہی اپنی تمام سپاہ کو جو ہزار سواروں اور پیادوں پر مشتمل تھی، ساتھ لے کر کوہستان کمایوں کی طرف چلا گیا۔ اب قلعہ سرہند میں صرف وہ ایک ہزار سپاہ رہ گئی جسے قمرالدین خان نے حفاظت پر مامور کیا تھا۔

احمد شاہ نے ان تمام حالات سے بے خبر لدھیانہ کے مقام پر ستلج عبور کیا اور سرہند کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ مغلوں نے دشمن کے ایسے کسی اقدام کو روکنے کا کوئی بندوبست نہیں کیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ درانی فوجیں نہایت تیزی سے بڑھتی چلی گئیں۔ اتنی تیزی سے کہ چالیس میل کا فاصلہ صرف ایک دن میں طے کر کے فصیل کو ہاتھ لگا کر کھڑی ہوگئیں۔ یہاں مامور ایک ہزار سپاہیوں کا دستہ کتنی دیر مزاحمت کرتا، گولہ بارود ختم ہوگیا تو مجبور ہوکر قلعے کے دروازے کھول دیے گئے۔

قلعے کا سارا خزانہ اور وزیر قمرالدین کی خواتین حرم احمد شاہ کے قبضے میں آگئیں۔ مرد قتل کردیے گئے اور عورتیں باندیاں بنالی گئیں۔

شاہی فوج جولدھیانہ کا راستہ چھوڑ کر ''مچھی واڑہ'' کی طرف بڑھی تھی کہ وہاں سے ستلج عبور کر کے احمد شاہ کو دریا پار کرنے سے پہلے ہی دبوچ لے گی۔

ایک مقام پر جہاں شہزادہ خیمہ زن تھا کہ ہرکاروں نے آکر اطلاع دی کہ احمد شاہ نہ صرف ستلج پار کر چکا بلکہ سرہند کے قلعے پر بھی قابض ہوگیا۔ خبر ایسی دہشت ناک تھی کہ شہزادہ اس پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے اپنے خاص آدمی سرہند کی طرف روانہ کیے تاکہ حقیقت معلوم ہو۔ سرہند اس مقام سے 24 میل دور تھا۔ ہرکارے یوں گئے اور یوں آگئے۔ خبر، افواہ نہیں تھی۔ احمد شاہ سرہند پر قبضہ کر چکا تھا بلکہ مزید یہ معلوم ہوگیا کہ احمد شاہ دہلی پر یلغار کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے اور بہت جلد کوچ کرنے والا ہے۔

یہ خبر فوراً دہلی پہنچائی گئی۔ یہ خبر ایسی تھی کہ شہنشاہ کی افیون کا نشہ جاتا رہا۔ اسے یقیناً نادرشاہ درانی کی آمد یاد آگئی ہوگی۔ خبر نے قلعے کی دیواریں پھلانگیں تو چند افواہیں بھی ساتھ ہوگئیں۔ لوگوں میں مشہور ہوگیا کہ احمد شاہ بس دروازہ کھٹکھٹانے ہی والا ہے اور فوج دارالحکومت میں موجود نہیں۔ لوگوں میں ایسی بھگدڑ مچی کہ لوگ اپنا مال و متاع سمیٹ کر فرار ہونے لگے۔ شاہی کارندے کہتے پھر رہے تھے کہ افواج شاہی نے احمد شاہ کو سرہند ہی میں روک لیا ہے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں لیکن لوگ یقین کرنے کو تیار نہیں تھے۔

خطرہ بدستور قائم تھا۔ شہنشاہ نے صرف اتنا کیا تھا کہ اپنے امرا کو حکم دیا کہ وہ اپنی اپنی فوج کو لے کر دہلی سے باہر نکلیں اور چوکیوں پر قابض ہوجائیں۔ قلعے کی حفاظت کا انتظام بھی سخت کردیا گیا۔

احمد شاہ نے سرہند کے باغات میں مورچے لگائے ہوئے تھے کہ شہزادہ اپنی فوج لے کر سرہند کی طرف بڑھا۔ شہزادے کی خبر ملتے ہی احمد شاہ کی فوج نے پانچ میل آگے بڑھ کر خندقیں کھودلیں۔ جاسوسوں کو آگے بھیجا گیا کہ مغل افواج کی نقل و حرکت کا پتا لگائیں۔ معلوم ہوا اس نے قصبہ مان پور کے قریب چھاؤنی ڈالی ہے۔

احمد شاہ کو مغلوں کے مقابلے میں یہ سہولت حاصل تھی کہ سرہند پر قبضہ ہونے کے باعث نہ پانی کی تکلیف تھی نہ رسد اور اناج کی فراہمی میں کوئی دشواری تھی۔ دھوپ سے بچنے کے لیے باغات بھی موجود تھے۔ اس کے برعکس مغل فوج بے آب و گیاہ میدان میں تھی جہاں کنویں بھی ضرورت سے کم تھے۔ اس لحاظ سے ان کا پلّہ بھاری تھا کہ ان کے پاس بڑے پیمانے پر توپیں اور بھاری اسلحہ تھا۔

احمد شاہ کی کمزوری یہ تھی کہ اس کے پاس صرف ایک بھاری توپ تھی اور باقی چند چھوٹی چھوٹی توپیں تھیں۔ ان حالات میں اس کی ذہانت ہی اسے جنگ پر آمادہ کرسکتی تھی۔ اس نے چھاپا مار جنگ کا آغاز کردیا۔ چھوٹے چھوٹے دستے ادھر اُدھر گشت کرتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں میں افراتفری پیدا ہوگئی اور وہ پیش قدمی کرنے کے بجائے صرف دفاع پر مجبور ہوگئے۔ ان کے پاس رسد کا کوئی بندوبست نہیں تھا، آس پاس کے علاقوں سے ایک دانہ بھی نہیں پہنچ سکتا تھا کیونکہ ان علاقوں پر پٹھان قابض تھے۔

جب ایک ہفتہ گزر گیا اور درانیوں نے دیکھ لیا کہ مغلوں کے اعصاب ٹوٹ چکے ہیں۔ اگر اس وقت حملہ کردیا جائے تو وہ طیش میں آکر غلطیاں کریں گے۔ انہوں نے اپنی واحد توپ استعمال کی۔ نشانہ اتنا درست تھا کہ گولے خندقوں اور امرا کے خیموں پر برسنے لگے۔ بڑی تعداد میں لوگ مجروح اور ہلاک ہوئے۔ وزیراعظم قمرالدین ابھی لڑائی چھیڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن حالات ایسے ہوگئے کہ وہ پوری قوت سے حملہ کرنے پر مجبور ہوگیا۔

وزیر قمرالدین مغل سالار اعلیٰ، اپنے خیمے میں نماز چاشت سے فارغ ہوا ہی تھا کہ دفعتاً اس کے خیمے کو چاک کرتا ہوا ایک گولہ افغان فوج کی طرف سے آکر گرا۔ پہلے وہ زمین پر گرا پھر اچھلا اور اس کی پیٹھ کو زخمی کرتا ہوا گزر گیا۔ آہ و فغاں کا شور بلند ہوا۔ وزیر کا بیٹا معین الدین خان جو میر منو کہلاتا تھا باپ کی حالت سن کر میدانِ جنگ سے خیمے میں آیا۔ دیکھا کہ باپ کا دم لبوں پر ہے۔

میر منو بھی باپ کو اپنی آغوش میں لیے بیٹھا تھا۔ باپ کے لبوں پر آخری الفاظ تھے۔

''میرے بچے، میرا تو اب چل چلاؤ ہے۔ شہنشاہ کا کام ابھی باقی ہے۔ تم فوراً سوار ہوکر میدان میں جاؤ اور دشمن پر حملہ کردو۔ قبل اس کے کہ یہ خبر مشہور ہو۔ آقا کا حقِ نمک ہر چیز پر بالا ہے۔ میری پروا نہ کرو۔''

میر منو نے قمرالدین خان کو خون آلود کپڑوں میں خیمے کے اندر ہی دفن کردیا اور زمین ہموار کردی۔ باپ کے ہاتھی پر سوار ہوا اور حکم دیا کہ نقارے بجائے جائیں۔ لشکر میں یہ مشہور کردیا گیا کہ وزیراعظم بیمار ہیں اس لیے خیمے سے نکل نہیں سکتے اس لیے میر منو نے فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔

میر منو ایک جذبۂ انتقام کے ساتھ میدان میں اترا تھا۔ وہ اتنی دلیری سے لڑا کہ اسے دیکھ کر اس کی فوج بھی شجاعت کا پیکر بن گئی۔

جنگ کے دوران کئی نشیب و فراز آئے لیکن میر منو اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ یہاں تک ہوا کہ ہندوستانی فوج کی بڑی تعداد اپنی جگہ چھوڑ کر دہلی کی طرف فرار ہونے لگی لیکن میر منو افغانوں کے سینے اپنے تیروں سے چھیدتا رہا۔ پھر میر منو کو نئی کمک مل گئی اور جنگ کا پانسا پلٹنے لگا۔

جنگ کا فیصلہ نہ جانے کس کے حق میں ہوتا کہ درانیوں کے بارود خانے میں آگ لگ گئی۔ لاہور سے جو آتشیں بان ساتھ لائے تھے وہ اڑ اڑ کر خود ان پر گرنے لگے۔ شعلے تھے کہ آسمان سے باتیں کررہے تھے۔ ایسی افراتفری مچی کہ پسپائی کے سوا کوئی راستہ نہ رہا لیکن احمد شاہ نے حسنِ تدبیر سے کام لیتے ہوئے سرہند کی طرف پسپائی اختیار کی۔

رات کی تاریکی میں وہ سرہند پہنچ گیا اور افغانستان جانے کی تیاری کرنے لگا۔ آخری حجت کے طور پر اپنا ایک سفیر شہزادے کے پاس بھیجا اور صلح کا طلب گار ہوا لیکن شہزادے نے تمام شرائط صلح رد کردیں۔

سرہند ہی میں اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کے بھتیجے لقمان خان نے قندھار میں بغاوت کردی ہے۔ اب اس کا افغانستان جانا اور بھی ضروری ہوگیا تھا۔ وہ تیزی کے ساتھ اپنے ملک کی طرف بڑھ گیا۔

قندھار پہنچتے ہی اس نے لقمان خان کو گرفتار کرلیا۔ بعد میں اسے قتل کردیا گیا۔

لقمان سے نجات پانے کے بعد احمد شاہ کے لیے شوقِ مہم جوئی کے دوراستے تھے۔ ہندوستان میں اپنے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کرلے یا اپنے قبیلے کے وطن ہرات کو فتح کرے جو اب تک ایرانیوں کے قبضے میں تھا۔ اس نے بہت سوچا اور بالآخر ہندوستان پر حملے کو ترجیح دی۔

اس کا دشمن ''میر منو'' اس وقت پنجاب کا گورنر تھا۔ وہ ہرات کی طرف جاکر میر منو کو یہ موقع دینا نہیں چاہتا تھا کہ میر منو پشاور کی طرف بڑھ آئے اور افغانستان میں داخل ہوجائے۔ دہلی کے سیاسی حالات بھی ایسے تھے کہ حملے کی دعوت دے رہے تھے۔ شہنشاہِ دہلی محمد شاہ کا انتقال ہوچکا تھا اور شہزادہ احمد شاہ کے لقب سے تخت نشیں تھا۔ اس کی ناتجربہ کاریوں اور رنگینیوں نے ملکی استحکام میں افراتفری کا بازار گرم کردیا تھا۔ امرا آپس میں دست و گریباں تھے۔ پنجاب میں سکھوں نے امن و امان تباہ کر رکھا تھا۔ پورا ملک بے چینی

کے الاؤ میں جل رہا تھا۔ احمد شاہ نے اس کا فائدہ اٹھایا اور پنجاب کی طرف پیش قدمی شروع کردی۔ میر منو کو جیسے ہی خبر ملی، وہ بھی لاہور سے نکلا اور چناب پر راستہ روک کر دشمن کا مقابلہ کرنے لگا۔

میر منو، احمد شاہ کی آمد کی خبریں برابر دہلی پہنچا رہا تھا اور مدد کا طالب تھا لیکن نہ شہنشاہ کوئی اہمیت دے رہا تھا نہ وزیراعظم کو جلدی تھی۔ میر منو کے پاس اس کی قسمت تھی یا اس کی دلیری۔ یہ دونوں چیزیں ہر وقت ساتھ نہیں دیتیں۔ وہ بے سہارا تھا اور احمد شاہ مسلح کر کے ہتھیار ڈالنے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ اس کو احمد شاہ کی شرائط پر صلح کرنی پڑی۔

احمد شاہ درانی کی شرائط کے مطابق چودہ لاکھ سالانہ محصولات احمد شاہ کو بھیجنا طے ہوئے تھے۔

اس قضیے سے نمٹنے کے بعد وہ ہرات کی طرف متوجہ ہوا۔ پچیس ہزار کا لشکر لے کر ہرات کی جانب چل پڑا۔ شہر کو بزور فتح کرنے کے لیے اس نے پیش قدمی کی لیکن کمین گاہوں سے اتنی آگ برسی اور اتنا جانی نقصان ہوا کہ پیچھے ہٹنا پڑا۔ اب محاصرے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ یہ محاصرہ کئی ماہ تک جاری رہا۔

کئی ماہ کے محاصرے سے اکتا کر آخرکار اس نے افغانوں سے اپیل کی کہ دھاوا بول دیں اور جب تک قلعہ فتح نہ ہو جائے، واپس ہٹنے کا نام نہ لیں۔ اس کی اپیل رائگاں نہیں گئی۔ رات کو مشعلوں کی روشنی میں فیصلہ ہوا تھا، صبح ہوتے ہی افغانوں نے قلعے پر دھاوا بول دیا۔ ہزاروں مرے ہزاروں زخمی ہوئے۔ خون کا دریا بہتا رہا۔ لاشوں کا فرش بچھتا رہا لیکن افغانوں کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی اور شام تک قلعے تک پہنچ گئے۔

رات نے اندھیرا کیا تو افغان سیڑھیاں لگا کر قلعے کی دیواروں پر چڑھ گئے۔ قلعے کے دروازے کھول دیے۔ تمام فوج اندر آ گئی اور صبح تک قلعے کو تباہ و برباد کرتی رہی۔

ابدالیوں کا وطن بھی دوسرے افغان صوبوں سے منسلک ہو گیا اور افغانی علاقوں کا افغانستان کے نام سے ایک واحد ملک عالم وجود میں آ گیا۔ اس کے بعد عرصے تک اس نے ہندوستان کا رخ نہیں کیا لیکن خاموش بھی نہیں بیٹھا۔ طویل کش مکش کے بعد مشہد اور نیشاپور کو حاصل کر لیا۔ اب ہرات اس کا جنگی مرکز تھا۔ یہاں سے اس نے اپنے ایک وزیر بیگی خان کو لشکر جرار دے کر دریائے آمو (دریائے جیحوں) کے شمال مشرق کے علاقوں کی طرف بھیجا۔ یہاں ایسے قبائل تھے جنہوں نے ابھی تک شاہ کی اطاعت قبول نہیں کی تھی۔

وزیر بیگی نے یکے بعد دیگرے تمام علاقوں پر قبضہ کر لیا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر بدخشاں، ہندوکش کے دوسرے اضلاع اور کابل کے مغرب میں "ہزارہ جات" کو بھی فتح کر لیا۔

ان علاقوں کی تنظیم کرنے اور انہیں مستقل صوبے داروں کے سپرد کر کے بیگی خان قندھار چلا آیا جہاں احمد شاہ پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔

اب احمد شاہ نے ایک مرتبہ پھر پنجاب کا رخ کیا۔ اس کا بہانہ یوں بھی بن گیا کہ میر منو سے جس محصول کی ادائیگی کی شرائط طے ہوئی تھی، میر منو اس رقم کو باقاعدگی سے نہیں بھیج سکا تھا۔

احمد شاہ نے اپنا سفیر رقم کے مطالبے کے لیے میر منو کے پاس بھیجا۔ میر منو پہلے تو ٹال مٹول کرتا رہا اور پھر دوٹوک جواب دے دیا کہ بقایا جات فوری طور پر ادا کرنے کا کوئی امکان نہیں۔ احمد شاہ کا سفیر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میر منو نے زبردست جنگی تیاری کر رکھی ہے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ رقم ادا کرنا نہیں چاہتا۔

احمد شاہ کابل سے روانہ ہو کر پشاور پہنچ گیا اور پیغام بر کے ذریعے ایک مرتبہ پھر رقم کا مطالبہ کیا۔ اسے یقین تھا کہ میر منو یہ دیکھ کر کہ میں پشاور تک آ گیا ہوں، رقم ضرور ادا کر دے گا لیکن میر منو کا خیال تھا کہ وہ آسانی سے احمد شاہ کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس نے نہایت بے مروتی کا جواب بھجوا دیا۔

"دو سال کی رقم واجب الادا ہے۔ میں ایک سال کی رقم دوں گا۔ یہ لینا ہے تو لے لو۔ اگر جنگ کرنا چاہتے ہو تو اس کے لیے میں تیار ہوں۔"

احمد شاہ نے دریائے سندھ عبور کیا تو میر منو نے اس کی خدمت میں نو لاکھ کی رقم بھیجی۔ یہ رقم چونکہ اس کی مانگی ہوئی رقم سے کم تھی اس لیے اس نے پیش قدمی جاری رکھی۔ میر منو نے بھی راوی عبور کر کے ڈیرے ڈال دیے۔

ابھی لڑائی چھیڑی نہیں تھی کہ احمد شاہ کو ایک ترکیب سوجھی۔ اپنے خیمے کو جوں کا توں کھڑا رہنے دیا۔ پھر دائیں جانب ہو کر راوی کو چپ چاپ پار کر لیا اور لاہور کی شمالی جانب سے چلتے ہوئے شالامار باغ کے جنوب مشرق میں پڑاؤ ڈال دیا اور اپنی فوج کو دور تک پھیلا دیا۔

میر منو کے ایک سردار جہاں خان نے احمد شاہ کے کیمپ کے نزدیک پڑاؤ ڈال لیا۔ میر منو لاہور کے باہر خندق کھود کر بیٹھ گیا۔ افغانوں نے باقاعدہ لڑائی شروع نہ کرنے کی پاداش میں دیہات کو تباہ کرنا شروع کر دیا۔ چالیس کوس کے رقبے میں تمام دیہات کو برباد کر ڈالا۔ یہ حالت ہوئی کہ تین تین

منزل تک چراغ نظر نہ آتا تھا۔

میر منو نے دہلی سے کمک طلب کی اور ڈیڑھ ماہ تک انتظار کرتا رہا۔ دہلی میں ایک دوسرے کے خلاف سازشیں چل رہی تھیں۔ شہنشاہ کے حکم کے باوجود اس کے وزیر اور سردار پہلو تہی کرتے رہے حتیٰ کہ صفدر جنگ دہلی چھوڑ کر اودھ چلا گیا کہ وہاں کے انتظامی حالات کو درست کرے۔ احمد شاہ دہلی کے دروازے پر دستک دے رہا تھا اور اسے اپنے علاقے کے انتظامی معاملات کی فکر ہو رہی تھی۔ تنگ آ کر میر منو نے تن تنہا جنگ چھیڑ دی۔ اس کی بہادری قابلِ داد تھی۔ اس کی فوج بھی خوب جم کر لڑ رہی تھی لیکن سازشیں یہاں بھی کام کر رہی تھیں۔ اس کے امرا اقتدار کے لالچ میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی تاک میں تھے چنانچہ میر منو کا وفادار کوڑا مل، اس کے فوج دار آدینہ بیگ کے ہاتھوں مارا گیا جبکہ وہ میدانِ جنگ سے اپنے آقا میر منو سے ملنے جا رہا تھا۔ ان سازشوں کے درمیان فوج کتنی دیر ٹھہرتی۔ ایک وقت وہ آیا کہ مغلوں کے توپ خانے پر احمد شاہ نے قبضہ کر لیا۔

میر منو نے نمازِ عشا میدانِ جنگ میں ادا کی مگر اس حال میں کہ بندوقوں کے لیے گولی بارود تک نہ تھا۔ دس ہزار سپاہی تھے جو ابھی تک اس کے ساتھ موجود تھے۔ وہ میدانِ جنگ چھوڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس کے سردار اسے مجبور کر رہے تھے۔ بعض کا خیال تھا، وہ دہلی چلا جائے۔ کوئی پہاڑوں میں جانے کو کہتا تھا۔ وہ کسی تجویز کو خاطر میں نہیں لایا اور احمد شاہ سے ملنے اس کے کیمپ میں پہنچ گیا۔ وہ ہتھیار لگائے بغیر آیا تھا۔ گھوڑے سے کودا اور ایک پٹھان سے استدعا کی کہ وہ اسے اپنے بادشاہ کے پاس لے چلے۔

احمد شاہ سے اس کی ملاقات ہوئی تو ایک بہادر دوسرے کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ احمد شاہ نے دل کھول کر اس کی دلیری کی داد دی۔

"تم نے پہلے ہی کیوں نہ اطاعت قبول کر لی۔" احمد شاہ نے پوچھا۔

"اس وقت میرا دوسرا آقا تھا۔" میر منو نے جواب دیا۔

"اس آقا نے دہلی سے تمہیں کمک کیوں نہ بھیجی تاکہ تم اور اچھی طرح مجھ سے لڑتے۔"

"اسے یقین تھا کہ میر منو اتنا طاقتور ہے کہ فوج بھیجنے کی ضرورت نہیں۔"

"اگر میں گرفتار ہو کر آتا تو تم مجھ سے کیا سلوک کرتے۔"

"میں تمہارا سر کاٹ کر شہنشاہ کے پاس بھیج دیتا۔"

"یہ بتاؤ، میں تم سے کس قسم کا سلوک کروں؟"

"اگر تم سوداگر ہو تو فدیہ لے لو۔ اگر عادل ہو اور رحم دل ہو تو شانِ خسروانہ سے معاف کر سکتے ہو۔"

اس کے جواب سے خوش ہو کر احمد شاہ نے ایسی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ "میرا فرزند" کہہ کر بغل گیر ہو گیا۔ شاہی خلعت، خنجر اور اپنی دستار سے نوازا اور اپنا گھوڑا بطور تحفہ عنایت کیا۔ اسے تین دن تک اپنا مہمان بنا کر رکھا۔

ان تین دنوں میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ ان میں دہلی کی طرف کوچ کرنے کا تذکرہ بھی آیا لیکن میر منو نے اس کے قبضۂ قدرت میں ہونے کے باوجود اس کی مخالفت کی۔

"اگر آپ دہلی کی طرف کوچ کریں گے تو سب لوگ ہم زبان ہو کر مجھے غدار کہیں گے۔ اب آپ نے میری جاں بخشی کی ہے اور مجھے فرزند کہہ کر پکارا ہے تو جب تک میں زندہ ہوں، آپ ہندوستان پر حملہ کرنے کا خیال دل میں نہ لائیں یا پھر روانہ ہونے سے پہلے مجھے جان سے مار دیں۔"

"فرزند، اگر تم کہتے ہو تو میں یہ خیال فی الحال ترک کیے دیتا ہوں۔"

افغان بادشاہ احمد شاہ درانی اس وعدے کے ساتھ اپنے وطن کو لوٹا کہ جب تک میر منو زندہ ہے وہ ہندوستان پر حملہ کرنے سے باز رہے گا۔

وہ اپنے وعدے پر قائم تھا اور نہ جانے کب تک قائم رہتا۔ ہندوستان کو اس کی تباہ کاریوں سے نجات ملی رہتی ... لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

لاہور سے سات آٹھ کوس دور مالک پور ایک گاؤں تھا۔ معین الملک میر منو ان دنوں وہاں خیمہ زن تھا۔ ہرکارے خبر لائے کہ بعض کھٹ قریب کے گنے کے کھیت میں چھپے ہوئے ہیں۔ ان کے ارادے نیک معلوم نہیں ہوتے۔ میر منو کے دل میں نہ جانے کیا آئی۔ گھوڑے پر سوار ہو کر چلا گیا اور سکھوں کو گھیر لیا۔ اچانک اس کا گھوڑا بھڑک کر پچھلے پاؤں پر کھڑا ہو گیا اور بے قابو ہو گیا۔ بدقسمتی سے اس کا پاؤں رکاب میں پھنس گیا اور وہ زمین پر گھسٹتا چلا گیا اور بے ہوش ہو گیا۔ اسی صدمے سے وہ تین دن بعد انتقال کر گیا۔

میر منو کی وفات کے بعد اقتدار کے ایوانوں میں جیسے بھونچال سا آ گیا۔ اس کی بیوہ مغلانی بیگم بلا کی زیرک اور مدبر تھی۔ اس نے لاہور کے اقتدار کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے شوہر کے دشمنوں سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتی تھی۔ مغلانی بیگم نے وزیر کی شکایت کرتے ہوئے احمد شاہ

درانی کو مراسلات بھیجے۔ اُدھر نجیب خان (نجیب الدولہ) نے بھی احمد شاہ کو بلاوا دیا پھر اپنے بھائی سلطان خان کو اس کی خدمت میں بھیجا کہ وہ لشکرِ جرار لے کر ہندوستان آ جائے' یہ بھی کہلا بھیجا کہ اس نے 25 ہزار پٹھانوں کی فوج فراہم کرلی ہے۔ دریائے گنگا کے پار دوسرے علاقوں سے چالیس ہزار افغانوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔

احمد شاہ نے ان مراسلوں کے جواب میں ہندوستان کا رخ کیا۔ لاہور سے نکل کر ستلج کو پار کیا اور دہلی کی طرف روانہ ہوگیا۔

یہ خبر جونہی دہلی پہنچی، ہلچل مچ گئی۔ وزیر غازی الدین کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ صوبے داروں سے کوئی توقع نہیں تھی۔ نجیب الدولہ خفیہ طور پر احمد شاہ سے ملا ہوا تھا۔ اتنی فوج کہاں سے جمع ہو اور کیسے مقابلہ ہو۔ اس نے تنگ آمد بہ جنگ آمد کے مصداق سورج مل جاٹ سے بات چیت کی لیکن بات نہیں بنی۔ اب یہی رہ گیا تھا کہ لڑے بغیر صلح کی بات چیت کی جائے۔ اس نے ایک سفیر کو دو لاکھ کے تحائف دے کر درانی کی خدمت میں بھیجا کہ وہ اسے دہلی کے قصد سے روکے۔

اس سفیر کی ناکامی نے وزیر غازی الدین کو ہراساں کر دیا۔ اس نے گھبرا کر مغلانی بیگم کا دامن تھاما۔ مغلانی بیگم کو وہ نفرت سے دیکھتا رہا تھا اور اس کی لڑکی کو کسمپرسی کی حالت میں رکھا گیا تھا۔ اب قسمت نے وہ دن دکھایا کہ اس کے سامنے گڑگڑا رہا تھا۔ اس نے مغلانی بیگم کی منت سماجت کی کہ وہ احمد شاہ کے کیمپ میں جا کر اس سے ملاقات کرے اور اسے حملہ نہ کرنے کی ترغیب دے۔ مغلانی بیگم نے آخر اس کی درخواست قبول کرلی۔

احمد شاہ سے اس کی ملاقات کرنال کے قریب ہوئی۔

تھوڑی سی گفتگو کے بعد احمد شاہ نے کہا "تمہیں چاہیے تھا کہ لاہور آ کر یہ سب کچھ کہتیں۔ وہاں سے میں واپس چلا جاتا۔ اب تو میں اتنے قریب پہنچ گیا ہوں کہ شہر دہلی دیکھے اور مغل شہنشاہ سے ملے بغیر میرا واپس جانا ناممکن ہے۔"

احمد شاہ پانی پت سے دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ مغلانی بیگم نے غازی الدین کو مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ لڑنے کی سکت نہیں رکھتا تو دہلی چھوڑ کر کسی اور جگہ چلا جائے۔ وہ کہاں جاتا عافیت اسی میں سمجھی کہ اطاعت قبول کرلے۔

وزیر نے اطاعت قبول کرلی تھی۔ کسی مزاحمت کا اندیشہ نہیں تھا۔ قلعے میں برائے نام بادشاہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا احمد شاہ اور اس کے سپاہیوں کے سوا اس شہر میں کوئی نہیں بستا۔ شہری ہراساں تھے۔ حفاظت کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ انہیں نادر شاہ یاد تھا۔ اس کے آنے پر بھی نظامِ امن تھا اور پھر قلعے کے قتلے لوٹ لیے گئے تھے۔

احمد شاہ کی آمد کا پہلا جمعہ تھا۔ جمعہ کی نماز کے وقت بعض خوشامدی جامع مسجد میں گئے اور شاہ کے نام کا خطبہ پڑھوایا کس مفتی کی مجال تھی کہ انکار کرتا حالانکہ بادشاہ وقت زندہ تھا۔ یہ مطالبہ احمد شاہ کی طرف سے آیا بھی نہیں تھا۔

بادشاہِ دہلی نے سنا کہ مسجدوں میں اس کے نام کا خطبہ نہیں پڑھا گیا ہے تو اسے اپنی توہین کا یقین آ گیا۔ اس نے حرم سرا خالی کردی اور بال بچوں کو لے کر اندرون خانہ چلا گیا۔

مغلوں کا قلعہ معلی، زیب و زینت کی کون سی چیز تھی جو یہاں نہیں تھی۔ اس کے باوجود احمد شاہ کے لیے قلعے کی تزیب آرائش کا کام شروع ہوا تاکہ وہ شان و شوکت سے قدم رنجہ فرمائے۔

احمد شاہ شہر میں داخل ہوا تو گلیوں، بازاروں میں دو رویہ سپاہی استادہ تھے۔ شاہ کے جلوس کے آگے ہاتھی چل رہے تھے اور ہر ہاتھی پر اس کے خصوصی سپاہی بیٹھے تھے۔ احمد شاہ خود گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ قلعے میں پہنچ کر گھوڑے سے اترا تو توپیں داغ کر سلامی دی گئی۔ شہنشاہ نے اس کا استقبال نہایت شان و شوکت اور پُرتکلف تقریب کے ساتھ کیا۔ بیش قیمت تحائف پیش کیے گئے۔

شہر دہلی کا حال یہ تھا کہ سناٹا تھا۔ کسی مکان سے کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ دن گزر گیا تو لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔ احمد شاہ اور اس کے حرم شاہی حرم سرا میں داخل ہوئے تو فوج نے گھوڑوں سے اتر کر اپنا ڈیرا قلعے کی خندق کے پاس لگا لیا۔ محافظ دستہ بازاروں اور گلیوں میں پھیل گیا۔ کئی جگہ لوٹ مار بھی ہوئی اور مندی کو آگ لگا دی گئی۔ دوسرے دن شاہ نے شہر کی حفاظت کا فرمان جاری کیا۔ محافظ دستے کے سردار کو اعلان کرنے کا حکم دیا۔

"میں شہر کے باشندوں کو امن و حفاظت دیتا ہوں۔ فوج کسی کو بھی تنگ یا ہراساں نہیں کرے گی۔ کسی مکان کو آگ نہیں لگائی جائے گی اور نہ کسی کو قید کیا جائے گا۔ کسی لڑکی، عورت سے اس کی مرضی کے بغیر شادی نہیں کی جائے گی۔ جو بھی زیادتی کرتا پایا جائے گا، سزا پائے گا۔"

ان اقدامات و اعلانات کے بعد سہمے ہوئے لوگ گھروں کو لوٹنے لگے۔ اسی دن شاہ عالم گیر احمد شاہ سے دیوانِ عام میں گیا۔ دونوں کے درمیان دوستانہ گفتگو کے بعد کھانا تناول کیا گیا۔

اہم ترین اعلان وہ تھا جو احمد شاہ نے عمائدین کو مخاطب کر کے کیا۔

"عالم گیر ثانی ابھی تک دہلی کے تخت پر متمکن ہے۔ وہ کسی الزام میں بھی تخت سے اتارا نہیں جا سکتا۔ حکومت کے کاروبار کا مالک تو وزیر تھا۔ جس نے شاہ کا نام لے کر ہم سے صلح کی تھی لہٰذا بادشاہ پر بدعہدی کا الزام دھرا نہیں جا سکتا۔ میں ہندوستان کی سلطنت پر اسی کو بحال رکھوں گا۔"

پائیدار دوستی کی نشانی کے طور پر دونوں بادشاہوں نے پگڑیاں بدل لیں۔ بیش قیمت تحائف کا تبادلہ بھی ہوا۔

احمد شاہ افغانستان سے چل کر یہاں تک یونہی تو نہیں آ گیا تھا کہ بادشاہِ دہلی کو بادشاہ تسلیم کرے اور چلا جائے۔ اسے اپنے سفر کی صعوبت کا تاوان وصول کرنا تھا۔ سابق وزیر غازی الدین کو حکم ہوا کہ اس نے جتنے جواہرات شاہی جواہر خانے سے لے جا کر اپنی حویلی میں رکھے ہیں، درانی خزانے میں داخل کرے۔ پہلے تو وہ انکار کرتا رہا مگر پھر ایک کروڑ روپے کے جواہرات اور تین لاکھ اشرفیاں اس کی حویلی سے برآمد ہوئیں۔ نئے وزیر نظام الدولہ نے وزیر بننے کے لیے دو کروڑ کی رقم کی پیش کش کی تھی لیکن اب صرف ایک کروڑ ادا کر کے پہلو تہی کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اس کے بزرگوں کا دفینہ کہیں دبا ہوا ہے۔ اس کی بنیاد پر میں نے رقم کی ادائی کا وعدہ کیا تھا۔ وہ دفینہ ملے گا تو دے دوں گا۔

اس کی والدہ کو بلایا گیا کہ وہ اس دفینے کا پتا بتائے لیکن وہ بھی کچھ بتانے سے قاصر تھی۔ اس پر احمد شاہ کو جلال آ گیا۔ اس نے چیخ کر کہا۔ "اگر تم دفینے کا پتا بتا دو تو تمہارے ساتھ ماں اور بہن جیسا سلوک ..... ہوگا ورنہ تمہاری انگلیوں کے ناخنوں پر پنسلیں گاڑی جائیں گی۔"

اس دھمکی پر وہ بوڑھی عورت پگھل گئی "مجھے صحیح جگہ تو نہیں معلوم لیکن اتنا معلوم ہے کہ دفینہ ہے اسی حویلی میں۔"

اسی وقت سرنگ لگانے والوں کو حویلی کھودنے کے لیے بلا لیا گیا۔ تین روز تک فرشوں کی کھدائی اور چھتوں کی شکست و ریخت ہوتی رہی۔ بالآخر دفینہ مل گیا۔ اس دفینے میں اتنا کچھ تھا کہ احمد شاہ کو چکر ہی تو آ گئے ہوں گے۔ ہیرے، موتی، جواہرات، سونے چاندی سے مرصع عصاؤں کے علاوہ قد آدم سونے کی دو سو موم بتیاں بھی برآمد ہوئیں۔

شاہ کی نقدی اور دولت کے لیے تلاش صرف یہیں تک محدود نہیں رہی بلکہ امرا اور وزرا کے مکانات کی منظم تلاشی لی گئی۔ جو لوگ گھروں سے بھاگ گئے تھے ان کے گھروں کے تالے توڑ کر پوشیدہ دولت برآمد کرلی گئی۔ جو لوگ قلعے سے تعلق نہیں رکھتے تھے لیکن دولت مند تھے ان کی بھی خانہ شماری کرائی گئی اور ان سے ان کی استطاعت سے زیادہ کا مطالبہ کیا۔ لوگوں نے زیورات، برتن اور کپڑے تک فروخت کر کے تاوان ادا کیا۔ کچھ نے تو زہر کھا کر خودکشی کرلی۔

جب شہر کی ساری دولت سمٹ چکی تو احمد شاہ نے اپنے بیٹے تیمور کے لیے عالم گیر ثانی کی بیٹی افروز بانو بیگم کا رشتہ طلب کیا۔ بادشاہ کی کیا مجال جو انکار کرتا۔

شہر دہلی اس کا مطیع ہو چکا تھا۔ کوئی آواز ایسی نہیں تھی جو اس کے خلاف اٹھتی لیکن اس نے جاٹوں اور مرہٹوں میں بغاوت کی بو سونگھ لی۔ وہ اس سرکش قوم کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا۔ جاٹوں کے علاقوں میں گھستے ہی اس کی آواز گونجی۔

"جاٹوں کے علاقے میں داخل ہو کر ہر قصبے اور ہر شہر کو لوٹ کر تباہ کر دو۔ متھرا ہندوؤں کا متبرک شہر ہے' اس کے باشندوں کو تلوار کی باڑھ پر رکھ لو۔ اکبر آباد (آگرہ) تک کوئی کھڑی فصل نہ رہے۔ کافروں کے سروں کی قیمت پانچ روپے فی سر ادا کی جائے گی۔"

آواز بلند ہونے کی دیر تھی کہ بلب گڑھ کا قلعہ چٹکی بجاتے ہاتھ میں آ گیا۔ شہزادہ جواہر سنگھ قزلباشوں کا لباس پہن کر رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھا کر جمنا کی طرف بھاگ گیا۔

متھرا میں یہ حال تھا کہ جاٹوں نے یہ عزم کر رکھا تھا کہ پٹھان ان کی لاشوں کو روند کر ہی اس متبرک شہر میں داخل ہو سکتے ہیں لیکن پٹھانوں کے کانوں میں احمد شاہ کی آواز گونج رہی تھی۔ یہ پروہتوں کا شہر تھا۔ نہ یہاں کوئی فصیل تھی نہ خندق۔ صرف ہندوؤں کا عزم تھا جسے پٹھانوں کی تلواروں نے خون میں نہلا دیا۔ احمد شاہ کے سردار جہاں خان نے پہلے تو قتلِ عام کا حکم دیا اور پھر شہر کو آگ لگا دی گئی۔ پورا شہر بڑیوں کے الاؤ کی طرح جل گیا۔ اسی طرح بندرامن اور گوکل کا بھی یہی حشر ہوا۔

دوسری منزل آگرہ تھی۔ یہاں لوٹ مار تو مچی لیکن جہاں خان قلعہ فتح کرنے میں ناکام رہا یہ مہم ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ افغان کیمپ میں ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی۔

اس بڑے پیمانے پر قتلِ عام ہوا تھا کہ ندی نالے لاشوں سے پٹے پڑے تھے۔ تعفن زدہ ہوا نے ہیضے کی بیماری کو دور دور تک پہنچانا شروع کر دیا۔ یہاں نہ کوئی دوا میسر تھی نہ علاج کی کوئی دوسری سہولت۔ اموات اتنی کثرت سے واقع ہونے لگیں کہ احمد شاہ نہ بھی کہتا تو اس کے فوجی اپنی جانیں بچا کر بھاگ کھڑے ہوتے۔ وبا ایسی شدید تھی کہ گھوڑے تک مرنے لگے۔ اب واپسی کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ احمد شاہ

نے ایک قاصد کو مغل شہنشاہ عالم گیر ثانی کے پاس دہلی بھیجا اور کہلوایا کہ وہ جاٹوں کے خلاف لڑائی ترک کر کے دہلی آ رہا ہے اور پھر ضروری انتظامات کر کے پشاور اور قندھار کے راستے سے کابل روانہ ہو گیا۔

احمد شاہ نے اپنے بیٹے تیمور شاہ کو پنجاب اور ہندوستان کے دیگر مقبوضات کا نگراں مقرر کیا۔ سردار جہاں خان کو بھی سپہ سالار اعلیٰ مقرر کر کے ہندوستان میں چھوڑ گیا۔

☆☆☆

وہ قندھار میں تھا کہ اس کے ہرکاروں نے اسے ایک عریضہ پہنچایا۔ یہ عریضہ نجیب الدولہ روہیلہ کا تھا جو ہندوستان میں اس کا نمائندہ تھا۔ لفافہ چاک کیا گیا۔ میر منشی قریب بیٹھا تھا۔ اس نے پڑھنا شروع کیا۔

''مرہٹوں کی چیرہ دستیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ بادشاہ دہلی ان کا یرغمال بن چکا ہے۔ ان کی بڑھتی ہوئی طاقت نے مجھے بھی مجبور کر دیا ہے کہ میں دہلی سے نکل جاؤں۔ میں سکرتال میں ہوں لیکن یہاں بھی ان کی یورشوں سے تنگ ہوں۔

اگر ان مرہٹوں کا سدباب نہیں کیا گیا تو یہ قلعہ دہلی میں اپنے گھوڑے باندھیں گے۔ ہندوستان میں اب کوئی ایسا نہیں جو اس سیلاب کو روک سکے۔ آپ کے بہت سے مقبوضات مرہٹوں کے قبضے میں چلے گئے ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ ایک مرتبہ پھر ہندوستان کی راہ لیں ورنہ یہاں اسلام کا نام لینے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔''

اسی قسم کے خطوط جے پور اور مارواڑ کے ہندو راجاؤں کی طرف سے بھی موصول ہوئے۔ جن میں انہوں نے درخواست کی تھی کہ ہندوستان آ کر ان کے علاقوں کو مرہٹوں سے محفوظ رکھنے میں مدد دے۔

احمد شاہ مقامی انتظامات میں اتنا الجھا ہوا تھا کہ ان خطوط کے باوجود اسے ہندوستان کی طرف رخ کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ ایک روز ایک سوار آیا۔ قندھار کے دروازے کھلے ہوئے تھے لیکن کسی اجنبی کو اندر کیسے جانے دیا جا سکتا تھا لیکن جب اس نے یہ بتایا کہ وہ دہلی سے چلا آ رہا ہے۔ بادشاہ دہلی کی طرف سے احمد شاہ کے لیے پیغام لایا ہے تو واقعہ کی سنگینی نے سب کو چوکنا کر دیا۔ شاہ کو فوراً اطلاع کی گئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ شخص شاہ کی خدمت میں تھا۔

''ہمارے برادر کا کیا حال ہے؟'' شاہ نے اس شخص سے پوچھا۔

''ہندوستان کی خبریں آپ تک پہنچتی رہتی ہوں گی۔''

''دہلی کے انتظامات تو ہم مکمل کر آئے تھے۔''

''دہلی میں سب خیریت ہے۔ عماد الملک غازی الدین کے سوا سب بادشاہ کا احترام کرتے ہیں۔''

''اسے کیا ہوا؟''

''بادشاہ سلامت اس کے مظالم سے بہت تنگ ہیں۔ شہریوں کی جان وبال میں ہے۔ بادشاہ نے مجھے اس مقصد سے بھیجا ہے کہ آپ وزیر سے ان کی جان چھڑائیں۔''

''ہمارے برادر سے کہنا، آپ مشکل میں ہوں اور ہم خاموش رہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

تین دن کی میزبانی کے بعد احمد شاہ نے مہمان کو رخصت کیا اور سردار جہاں کو حکم دیا کہ وہ پنجاب کی طرف کوچ کر جائے۔ کچھ دنوں بعد وہ خود بھی بولان کے راستے ہندوستان میں داخل ہو گیا۔

جب تک احمد شاہ پہنچتا سردار جہاں خان مرہٹہ سردار سباجی کو اٹک سے نکال چکا تھا۔ مرہٹے تو عقل مند تھے کہ مزاحمت کے بغیر اٹک سے نکل گئے لیکن احمد شاہ کو لاہور میں سکھوں کی مزاحمت کا سامنا کرنا۔ ایسی خونریز لڑائی ہوئی کہ خود شاہ کے دو ہزار آدمی کھیت ہو گئے۔

جہاں خان اور احمد شاہ دونوں سرہند پہنچ گئے۔ لشکر کی تعداد کا یہ عالم تھا کہ پندرہ ہزار سوار جہاں خان کے ساتھ تھے جس نے شاہ سے پہلے سرہند میں قدم رکھا اور چالیس ہزار سپاہ کے ساتھ احمد شاہ پہنچ گیا۔

اس کی پیش قدمی کی خبریں برابر دہلی پہنچ رہی تھیں۔ وزیر اعظم غازی الدین تخت پر پریشان تھا۔ اسے اپنے جرائم یاد تھے اور سمجھ رہا تھا کہ احمد شاہ اس سے باز پرس ضرور کرے گا۔ اس سے زیادہ وہ اس بات سے پریشان تھا کہ احمد شاہ کو ہندوستان آنے کی دعوت کس نے دی ہے۔ اس نے کسی نہ کسی طرح معلوم کر ہی لیا کہ بادشاہ نے خفیہ طور پر احمد شاہ کو اطلاع پہنچائی ہے۔

اس کے زر خرید اس کے حکم پر سب کچھ کرنے کو تیار تھے۔ اسی رات بادشاہ اپنی خواب گاہ کی طرف جا رہا تھا کہ ایک سایہ اس کے سامنے آیا اور دوسرے لمحے بادشاہ قتل ہو چکا تھا۔ دوسرے دن خان خاناں انتظام الدولہ کو بھی راستے سے ہٹا دیا گیا۔

شہنشاہ کے قتل کی اطلاع پہنچی تو احمد شاہ کا مشتعل ہونا لازمی تھا لیکن مرہٹے ایسا سر اٹھا رہے تھے کہ دہلی تک پہنچنے کے لیے لاکھ رکاوٹیں اس کے راستے میں تھیں۔ سب سے بڑا دشمن داتاجی راستے میں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ دہلی جانے سے پہلے وہ سکرتال آ کر نجیب الدولہ کی مدد کرے گا اس لیے

ملہار راؤ ہلکر اور سورج مل جاٹ بھی اس سے آ ملے۔ اس نے یہاں پانچ ہفتے قیام کر کے آگرے کی جانب کوچ کیا۔ اگلے دو روز میں اس نے فوراً دہلی پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود گورنر دہلی، یعقوب علی خان مرہٹوں کی طاقتور اور بہتر اسلحہ سے آراستہ فوج کا مقابلہ نہ کر سکا۔ دہلی مرہٹوں کے قبضے میں چلا گیا۔ برسات ابھی تھی کہ احمد شاہ کی کمک نہ پہنچ سکی۔ یعقوب خان نے قلعہ خالی کر دیا۔

مرہٹے تو اس لالچ میں دہلی تک چڑھے چلے آئے تھے کہ دولت کے انبار ان کا انتظار کر رہے ہوں گے لیکن یہاں تو جھاڑو پھری ہوئی تھی۔ ''نادر شاہ درانی اور پھر اس کے بعد احمد شاہ درانی پہلے ہی سب کچھ لوٹ کر لے جا چکے تھے۔ جو کچھ باقی بچا تھا اسے غازی الدین نے ہتھیا لیا تھا۔

سداشیو بھاؤ کو روپوں کی سخت ضرورت تھی۔ سپاہیوں کو عرصے سے تنخواہ نہیں ملی تھی۔ نوبت فاقہ کشی تک آ گئی تھی۔ ان حالات میں دیواریں ہی نوچی جا سکتی تھیں۔ مرہٹے شاہ جہاں کے دیوان خاص میں گھس آئے۔ چھتوں پر منوں ٹنوں چاندی کے استر چڑھے ہوئے تھے۔ چھتیں اتار کر تکے ڈھال لیے گئے لیکن اس ترکیب سے بھی ایک مہینے سے زیادہ کام نہ چل سکا۔

اب بھاؤ کا یہاں رکنا فضول تھا۔ اس نے دہلی کی حکومت اپنے مقرر کردہ گورنر نارو شنکر کے حوالے کی اور شہر سے نکل کر ایک مقام ''باولی'' پر قیام کیا۔ مقصد یہ تھا کہ اگر افغان جمنا عبور کر کے اس طرف آنا چاہیں تو انہیں دلی کی طرف نہ بڑھنے دیا جائے۔

وہ یہاں کب تک پڑا رہتا جبکہ اسے فاقوں سے نجات بھی حاصل کرنی تھی۔ اسی راہ پر ایک مقام ''کنج پورہ'' تھا جہاں خوراک اور جانوروں کے چارے کے بڑے بڑے ذخائر تھے۔ دراصل یہ شہر احمد شاہ کی افواج کے لیے سامانِ رسد کا مرکز بن چکا تھا۔ بھاؤ نے اس شہر کو لوٹنے اور اس پر قبضہ کرنے کا منصوبہ تیار کیا تاکہ جنس اور نقدی ہاتھ آ سکے۔

اس نے ایک کام یہ کیا کہ دہلی کے تخت سے شہنشاہ جہاں ثانی کو زبردستی اتار کر شاہ عالم ثانی کی بادشاہت کا اعلان کر دیا تاکہ وہ جب تک رہے اس کا احسان مند رہے۔

کنج پورہ۔۔۔ کی دفاعی فوج دس ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ غیر اہم سا شہر تھا اس لیے مزید کوئی دفاعی سامان تھا نہیں چنانچہ جب مرہٹے اچانک ان پر ٹوٹ پڑے تو دفاعی فوج زیادہ دیر تک انہیں روک نہ سکی۔ عبدالصمد خان محمد زئی اس داتاجی نے ضروری سمجھا کہ سکرتال کا محاصرہ چھوڑ کر درانی بادشاہ کا راستہ روکے۔ وہی ہوا کہ دونوں فوجیں آمنے سامنے آ گئیں۔ مرہٹہ سپاہی بڑی جانبازی سے لڑ رہے تھے لیکن افغانوں کی تعداد ان پر غالب آ گئی۔ اگر افغان تعداد میں کم ہوتے تو شاید نتیجہ دوسرا ہوتا۔

داتاجی نے ابھی مکمل شکست تسلیم نہیں کی تھی۔ وہ اب بھی اپنے کیمپ میں موجود تھا اور صبح کی لڑائی کی تیاریاں کر رہا تھا جبکہ احمد شاہ کو دہلی پہنچنے کی جلدی تھی جہاں اورنگ زیب کے بیٹے کام بخش کے پوتے کو تخت پر بٹھا دیا گیا تھا اور یہ بھی خبریں مل رہی تھیں کہ وزیر اعظم غازی الدین، احمد شاہ کے خوف سے بھاگ گیا تھا اور سورج مل جاٹ کی پناہ میں تھا۔

احمد شاہ نے رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر کشتیوں کے پُل سے دریائے جمنا عبور کیا اور گنگا جمنا دوآب میں داخل ہو گیا۔ سہارن پور کے نزدیک نجیب الدولہ بھی احمد شاہ سے مل گیا۔ دونوں دریائے جمنا کے مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ دہلی کی جانب بڑھنے لگے۔

داتاجی اب بھی اس کے تعاقب میں تھا۔ وہ بھی دہلی کی جانب بڑھنے لگا اور کرنال، پانی پت ہوتا ہوا سونی پت پہنچ گیا۔

ایک مقام پر دونوں کا ٹکراؤ ہوا۔ فتح افغانوں کے مقدر میں لکھی ہوئی تھی۔

احمد شاہ دہلی پہنچا تو جو خبریں ملی تھیں ان کی تصدیق ہوئی۔ تخت پر بیا شہنشاہ بیٹھا تھا۔ غازی الدین فرار ہو چکا تھا۔ احمد شاہ کا مقصد دہلی پر قبضہ کرنا نہیں تھا۔ اس نے نئے شہنشاہ کو بدستور رہنے دیا البتہ اپنے ایک وزیر شاہ ولی خان کے ایک رشتے دار یعقوب علی خان کو دہلی کا گورنر مقرر کیا اور خود بھرت پور کے سورج مل جاٹ کی سرکوبی کے لیے آگے بڑھ گیا۔

وہ عرصے تک مرہٹوں کی سیاست اور ان سے جھڑپوں میں گھرا رہا۔ مرہٹے ایسی طاقت تھے جو کسی طرح رام ہونے میں نہیں آتے تھے۔ ایک جگہ شکست کھاتے تو دوسری جگہ نمودار ہو جاتے۔ یہاں تک کہ احمد شاہ، سورج مل جاٹ سے بات چیت پر مجبور ہو گیا لیکن یہ بات چیت بھی بے نتیجہ رہی۔ مغرور جاٹ نے ہیروئی حملہ آور سے اتحاد کی تمام پیش کشوں کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔

☆☆☆

سداشیو بھاؤ ایک آندھی کی طرح اٹھا اور دکن سے دہلی کی طرف چل دیا۔ دریائے چمبل کے شمالی کنارے پر

دفاعی فوج کی کمان کر رہا تھا۔ اس کے قتل ہوتے ہی فوج کی کمر ٹوٹ گئی اور مرہٹے شہر میں داخل ہو گئے۔ مرہٹوں کے ہاتھ بے انتہا مالِ غنیمت آیا۔ غلہ، نقدی اور دیگر مالِ تعیشت۔ جس میں تین ہزار گھوڑے، اونٹ اور توپیں بھی شامل تھیں۔

مرہٹوں نے مکانات کو لوٹ لیا اور شہر کو تاراج کر دیا۔ سامان کی مقدار اتنی تھی کہ سپاہیوں کی تنخواہ جنس کی شکل میں دی جانے لگی۔

احمد شاہ "الوپ" شہر میں خیمہ زن تھا۔ وہ دہلی جانے کے لیے بے تاب ضرور تھا لیکن کچ پورہ کے لٹ جانے کی وجہ سے اس کی فوجوں کے پاس راشن ختم ہو چکا تھا۔ اس حال میں اس نے چاہا کہ سداشیو بھاؤ سے صلح کر لے لیکن بھاؤ نے فتح کے نشے میں مصالحت کی شرائط ٹھکرا دیں۔

برسات کی وجہ سے دریاؤں میں سیلاب کی کیفیت تھی۔ اس نے اپنے آدمی پایاب گھاٹوں کی تلاش میں بھیجے تاکہ کسی طرف سے پار اترنے کا موقع مل جائے۔ قدرت بھاؤ کی مدد کر رہی تھی اور مرہٹہ سردار اسے پٹھانوں کی کمزوری سمجھ رہا تھا۔

وہ باغپت کے نزدیک ایک گھاٹ پر پہنچا۔ اس نے روزہ رکھا ہوا تھا۔ ایک تیر پر قرآن کی آیات پڑھ کر تیر کو دریا میں پھینکا اور اپنے سپاہیوں سے کہا، جمنا میں گھوڑے ڈال دو۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ پوری فوج پار اتر گئی۔

جب سداشیو بھاؤ کو شاہ کے دریا عبور کرنے کی خبر ملی تو وہ منزلیں مارتا ہوا پانی پت پہنچ گیا۔ احمد شاہ بھی اس سے ڈھیڑ کے لیے پانی پت آیا اور مرہٹہ فوج سے پانچ میل کے فاصلے پر مورچے قائم کر لیے۔ اب مرہٹے اور پٹھان ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہو گئے۔

شاہ کے فوجی اپنے مورچوں میں بند بیٹھے تھے۔ یہ احمد شاہ کی حکمتِ عملی تھی کمزوری نہیں لیکن مرہٹوں نے اسے اس کی بزدلی سمجھا اور یہ سمجھنے لگے کہ شاہ ان سے لڑنے کی ہمت نہیں کر پا رہا ہے۔ تھک ہار کے افغانستان بھاگ جائے گا۔ انہیں تو اس وقت ہوش آیا جب شاہ نے ایک مضبوط مورچہ سنبھال کر لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ چھوٹی چھوٹی جھڑپیں شروع ہو گئیں جو دو مہینے تک جاری رہیں۔ یہ بڑا اعصاب شکن مرحلہ تھا بالآخر مرہٹوں کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ مرہٹوں کے توپ خانے سے گولہ باری شروع ہو گئی۔ دوسری طرف سے بھی جواب آیا۔ دن بھر کے کسی پہر میں بھی کسی فریق کو برتری حاصل نہ ہو سکی اور دن چھپ گیا۔ روہیلے رات کی تاریکی میں موقعے کا انتظار کر رہے تھے۔ اندھیرے میں سائے چل پھر رہے تھے۔ معلوم ہوا مرہٹے اپنے مورچوں کی طرف پلٹ رہے ہیں۔ بس یہی موقع تھا۔ نجیب الدولہ کا بھائی سلطان خان ایک ہزار سوار اور پانچ ہزار پیادہ فوج کے ساتھ تیار کھڑا تھا۔ اس نے اشارہ کیا اور سپاہی مرہٹوں پر ٹوٹ پڑے۔ گولیوں کی ایسی بارش کی کہ مرہٹہ سوار سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان کی توپیں روہیلوں کے قبضے میں آ گئیں۔

اب احمد شاہ نے وہ حکمت اختیار کی جو مئی میدان میں بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اس نے چاہا کہ سامانِ رسد کا کوئی قافلہ مرہٹوں تک نہ پہنچ سکے اور وہ غذائی قلت کا شکار ہو جائیں۔ ہر رات پانچ ہزار درانی سوار دشمن کے مورچے کے نزدیک پہنچے۔ طاقتور تر کی گھوڑوں پر سوار رات بھر مرہٹہ کیمپ کے گرد یہ دائرے کی شکل میں گھومتے رہتے۔

ان کے اس طرح پہرا دینے سے جانوروں کے چارے کے بھی لالے پڑ گئے۔ دہلی جانے والی سڑک پہلے ہی بند تھی کیونکہ وہاں افغان فوج پڑی ہوئی تھی۔

مرہٹوں کی آمد کے وقت پانی پت میں غلے کے ذخائر نہیں تھے۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ شہر کے لوگ بھوکوں مرنے لگے۔

اس صورتِ حال سے گھبرا کر سداشیو بھاؤ نے شجاع الدولہ سے التجا کی کہ کسی قیمت پر بھی شاہ سے صلح کرا دے۔ اس نے ایک سادہ کاغذ پر زعفرانی رنگ میں اپنی ہتھیلی کا نشان لگا کر بھیجا اور ہندوؤں کی مقدس چیزوں کی قسم کھا کر اسے یقین دلایا کہ مرہٹوں کے سفیر کی حیثیت سے جو تصفیہ وہ قبول کرے گا، مرہٹے اس کے پابند رہیں گے۔

شجاع الدولہ نے سفیر کی خدمات انجام دیں۔ احمد شاہ اس کی باتوں سے متاثر بھی ہوا تھا اور چاہتا تھا کہ اپنی مرضی کی شرائط پر صلح کر لے لیکن نجیب الدولہ جو اس کا اتحادی تھا اور دوسرے خونخوار روہیلہ سردار جنگ پر مُصر تھے۔ وہ اسے کفر اور اسلام کی جنگ قرار دے رہے تھے۔ شاہ کو ان کی بات ماننی پڑی۔ ایک وقت وہ تھا جب بھاؤ نے اس کی صلح کی پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا، اب احمد شاہ اس پیش کش کو حقارت کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔

خوراک اور چارے کی قلت کی وجہ سے مرہٹوں کی زندگی ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی۔ جب صلح کی امیدیں دم توڑ گئیں تو انہوں نے بھوک سے مرنے کے بجائے میدانِ جنگ میں مرنا پسند کیا۔ سداشیو نے اگلے دن لڑنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے سرداروں کو حکم دیا کہ جنگ کی تیاری کریں۔

شجاع الدولہ کو خط لکھا "اب فیصلہ کن لمحہ آ چکا ہے۔ اگر کچھ کر سکتے ہو تو فوراً کر دیا کھل کر انکار کر دو۔ اس کے بعد الفاظ اور خطوط کے تبادلے کا موقع گزر جائے گا۔"

شجاع الدولہ یہ خط لے کر احمد شاہ کے پاس گیا۔ احمد شاہ سوچتا تھا کہ اسے شجاع الدولہ کی آمد کی خبر ہوئی۔ وہ اس وقت شب خوابی کے لباس میں تھا۔ اس نے لباس تبدیل کرنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ خط دیکھتے ہی گھوڑے پر سوار ہوا اور فوج کو تیاری کا حکم دے کر ایک میل آگے بڑھ گیا تاکہ لشکر کی صف آرائی کی نگرانی کر سکے۔

بھاؤ نے ہارے ہوئے جواری کی طرح ایک ہی داؤ پر سب کچھ لگا دیا۔ اس نے مرکز کی کمان خود سنبھالی اور جنگ میں کود پڑا۔

احمد شاہ نے لشکر کی ترتیب میں ایک پیدائشی جرنیل کی خداداد صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ اٹھارہ ہزار سپاہی ایک سردار کی کمان میں مرکز میں متعین کیے اور پانچ پانچ ہزار افغانوں کے دو دستے جو ایرانی گھوڑوں پر سوار تھے، لشکر کی آخری حدود پر صف آرا ہو گئے۔ اس طرح اس کے مسلمان حلیف ہر دو جانب سے درانیوں میں گھر گئے۔ ان کے فرار یا غداری کی راہیں مسدود ہو گئیں۔ اس سے یہ بھی ہوا کہ لشکر کے پہلوؤں پر حملہ کرنا ممکن نہ رہا۔

لڑائی کا آغاز مرہٹوں کی طرف سے ہوا۔ ابراہیم خان گاردی نامی بہادر ایک ہاتھ میں جھنڈا اور دوسرے میں بندوق لیے اپنے سپاہیوں کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اس نے دوپٹن توشہ کے ایک سردار برخوردار خان کے افغانوں کو روکنے کے لیے بھیجیں اور خود شاہی فوج کے افغانوں پر حملہ آور ہوا۔ اس گھمسان کا رن پڑا کہ روہیلوں کے قدم اکھڑ گئے۔ معلوم ہوتا تھا وہ بھاگنے پر مجبور ہو جائیں گے لیکن احمد شاہ جو دور کھڑا افغانوں کو دیتے ہوئے دیکھ رہا تھا، اس نے فوراً کمک بھیجی۔ دست بہ دست لڑائی میں حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ مرہٹے بھاگ کھڑے ہوئے اور یہ پہلا حملہ ناکام ہو گیا۔

سداشیو بھاؤ جی نے افغان فوج کے مرکز پر حملہ کر دیا۔ ہر دو جانب سے گولہ باری شروع ہو گئی۔ مرہٹوں کی بھاری توپوں کے مقابلے میں افغانوں کی ہلکی توپیں زیادہ موثر ثابت ہوئیں جو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائی جا سکتی تھیں۔

کچھ دیر بعد مرہٹوں کی توپیں اچانک خاموش ہو گئیں۔ انہوں نے حکمتِ عملی تبدیل کر لی تھی۔ میدان میں "ہر ہر مہادیو" کے نعرے گونجے اور مرہٹے افغانوں پر چڑھ دوڑے۔ افغانوں میں ابتری پھیل گئی۔ کچھ افغان ایسے خوف زدہ ہوئے کہ بھاگ نکلے۔ سرداروں نے ان سپاہیوں کو واپس بھیجا اور کمک کے لیے تازہ دم دستے بھیجے گئے۔ ان تازہ دم سپاہیوں کے سامنے تھکے ہارے مرہٹوں کے پاؤں اکھڑ گئے لیکن سداشیو بھاؤ ایک بہادر سپاہی کی طرح آخر تک لڑتا رہا۔

مرہٹوں پر مزید دباؤ ڈالنے کے لیے احمد شاہ کی ہدایت پر ایک نیا طریقۂ جنگ اختیار کیا۔ انہوں نے مرہٹوں کو تین اطراف سے گھیر لیا۔ ایک دستہ داہنے ہاتھ سے آتا اور مرہٹوں پر بندوقوں کی گولیوں کی بوچھاڑ کرتا ہوا بائیں جانب چلا جاتا۔ اسی طرح بائیں ہاتھ والا دستہ گولیاں چلاتا ہوا داہنی طرف پہنچ جاتا، تیسرا دستہ سامنے سے آتش بازی کرتا ہوا آتا اور پھر پلٹ کر مرہٹوں کے عقب میں چلا جاتا۔ اس طریقۂ جنگ نے مرہٹوں کو اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنی صفیں دوبارہ منظم کر سکیں۔ ابھی وہ سانس بھی نہ لینے پاتے کہ افغان دستے اپنی بندوقیں بھر کر پھر گولیاں برسانے کے لیے پہنچ جاتے۔

اسی عالم میں دوپہر ہو گئی تھی کہ سداشیو بھاؤ نے اپنے ذاتی ملازم اور جس قدر دوسرے سپاہی مل سکے جمع کیے اور نہایت بے جگری سے افغانوں پر آخری حملہ کیا لیکن پہلے ہی ہلّے میں برچھے کے وار سے زخمی ہو گیا اور اسی وقت ایک گولی کسی طرف سے آئی اور اس کی ران میں پیوست ہو گئی۔ وہ گھوڑے سے گر پڑا۔

سداشیو نے زمین پر گرتے ہی اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کا گھوڑا دور جا چکا تھا۔ بھگدڑ میں کسی نے غور بھی نہیں کیا کہ کون گرا۔ وہ اٹھا اور اپنے برچھے کی مدد سے چلنا شروع کر دیا۔ چند قدم بھی نہیں چلا تھا کہ پانچ افغان سواروں نے اس کے قیمتی لباس سے اسے پہچان لیا۔ انہوں نے اسے للکارا۔ وہ زخمی تھا مگر بہادر تھا۔ کسی شیر کی طرح ان پر جھپٹ پڑا لیکن جلد ہی کاٹ ڈالا گیا۔ اس کا سر تن سے جدا کر کے شاہ کو بھیج دیا گیا۔

مرہٹہ سردار سداشیو بھاؤ جی، ہندوستان پر مرہٹہ قوم کی بادشاہت کے خواب اپنے ساتھ لے کر موت کے گھاٹ اتر گیا۔

مرہٹوں کو اتنا نقصان پہنچا کہ وہ پھر کبھی سر اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ صرف میدانِ جنگ میں 28 ہزار مرہٹے کام آئے۔ ہزارہا فرار ہوتے ہوئے مارے گئے۔ تقریباً پانچ ہزار مرد اور عورتیں قیدی بنا لیے گئے۔ بے شمار جواہرات، نقدی، اسلحہ اور گھوڑے فاتح لشکر کے ہاتھ آئے۔

پانی پت شہر میں بوعلی قلندر کے مزار تک جانے والے راستے پر شاہ کے محافظ دستے دورویہ کھڑے تھے۔ احمد شاہ درانی کو مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے آنا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار اس طرف سے گزرا۔ اس نے ایک بیش بہا چغا زیب تن کیا ہوا تھا جو کوہ نور اور دیگر جواہرات سے مزین تھا۔ مزار کے قریب جا کر وہ گھوڑے سے اتر گیا۔ پیدل چلتا ہوا مزار کے اندر پہنچا اور دوزانو بیٹھ گیا۔ بڑی دیر تک سر جھکائے فاتحہ خوانی میں مشغول رہا پھر وہاں سے اٹھا تو اس کی آنکھیں نم تھیں اور کندھے جھکے ہوئے تھے۔

پانی پت میں چند دن قیام کر کے وہ دہلی کی جانب روانہ ہوا۔ دہلی سے سولہ میل کے فاصلے پر سابق ملکہ زینت محل اور اس کے پوتے جواں بخت نے اس کا استقبال کیا اور دہلی تک اس کے ساتھ آئے۔

اس وقت دہلی کی مغل سلطنت زبوں حالی کا شکار تھی اور اس کا اقتدار بالکل جاتا رہا تھا۔ اس کا وارث شاہ عالم ثانی بہار میں مقیم تھا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا جواں بخت حکومت کر رہا تھا۔

شاہ عالم ثانی نے احمد شاہ کی دہلی میں موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور اپنے معتمد نیر الدولہ کو شاہ کے پاس بھیجا کہ وہ اس کی بادشاہت کی تصدیق کرے۔ احمد شاہ نے اس کی بادشاہت کی تصدیق کی اور جملہ والیانِ ریاست اور بنگال میں کرنل کلائیو کو شاہی فرامین کے ذریعے شاہ عالم ثانی کو دہلی کا بادشاہ تسلیم کرنے کی ہدایت کی۔

شاہ عالم ثانی ابھی بہار ہی میں تھا کہ اسے احمد شاہ درانی کا پیغام ملا ''دہلی آ کر اپنے آباؤ اجداد کا تاج و تخت سنبھالو۔''

احمد شاہ کے ہاتھ میں ہندوستان کی تقدیر آ چکی تھی۔ وہ چاہتا تو اس عظیم ملک کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیتا لیکن اس نے یہ حق اس کے حق داروں کو دیا۔

پانی پت کی شکست کے باوجود مرہٹوں نے شکست قبول نہیں کی تھی۔ احمد شاہ سمجھ رہا تھا کہ مرہٹے شاہ عالم ثانی سے تعرض نہیں کریں گے لیکن جب اسے یہ خبر ملی کہ مرہٹہ پیشوا بالاجی راؤ ایک بڑے لشکر کے ساتھ گوالیار کے نواح میں پہنچ گیا ہے تو اسے سوچنا پڑا۔ وہ ابھی کسی جنگ میں الجھنا نہیں چاہتا تھا اور یوں بھی وہ جنگ سے پہلے صلح کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس نے بالاجی راؤ کو خط لکھا۔

''کوئی ایسی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہمارے آپ کے درمیان شکر رنجی قائم رہے۔ یہ صحیح ہے کہ آپ کا بیٹا اور بھائی جنگ میں کام آئے لیکن یہ سب کچھ بھاؤ صاحب کی وجہ سے ہوا۔ انہوں نے ہمارے سامنے جنگ کے سوا کوئی راہ نہیں چھوڑی۔

ہم دہلی کی حکومت کے معاملات آپ کے ہاتھوں میں چھوڑنے کو تیار ہیں بشرطیکہ آپ شاہ عالم ثانی کی حمایت کریں اور دریائے ستلج تک پنجاب کا پورا علاقہ ہمارے پاس رہنے دیں۔''

ایک وکیل کے ذریعے یہ خط پیشوا کو پہنچا دیا گیا۔ پیشوا پہلے ہی صلح کا متمنی تھا۔ اس نے اپنے وکیل گنگا دھر کو حکم دیا کہ دہلی جا کر صلح کی شرائط طے کر لے۔

ادھر یہ وکیل آیا ادھر احمد شاہ نے سورج مل سے گفت شنید شروع کر دی تاکہ اس سے بھی شرائط طے کر کے دہلی کو محفوظ بنا دیا جائے۔

زینت محل سورج مل سے گفتگو کے حق میں نہیں تھی کیونکہ اس نے اس کے شوہر کے قاتل غازی الدین کو پناہ دے رکھی تھی۔ اس نے احمد شاہ کو سمجھایا کہ سورج مل لڑے بغیر کوئی حکم ماننے والا نہیں چنانچہ شاہ نے گفتگو کے بجائے فوج کشی کا قصد کیا اور وزیر شاہ ولی خان کو حکم دیا کہ اس پر چڑھائی کرے۔

یہ لشکر ''آنولے'' کے لیے روانہ ہوا لیکن یہاں پہنچ کر درانی سپاہیوں نے متھرا کی جانب کوچ کرنے سے انکار کر دیا۔ انہیں گھر چھوڑے ہوئے دس مہینے گزر چکے تھے۔ وہ سب وطن جانے کے لیے بے قرار تھے۔ مالِ غنیمت ملنے کی امید بھی ختم ہو چکی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اب سورج مل کی توپوں کے گولوں کے سوا انہیں کچھ نہیں ملے گا۔ مجبور ہو کر احمد شاہ نے اس لشکر کو واپس بلا لیا۔ وطن واپسی کا بگل بج گیا۔ دونوں منصوبے ادھورے رہ گئے۔ پیشوا سے صلح بھی نہ ہو سکی اور سورج مل سے ٹکراؤ بھی نہ ہو سکا۔

وہ پنجاب میں داخل ہوا اور سکھوں سے الجھتا ہوا افغانستان لوٹ گیا۔

افغانستان سے اس کی طویل غیر حاضری کا فائدہ اٹھا کر چند سرداروں نے سرکشی کا اظہار کیا اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ ان میں ایک حاجی جمال خان تھا۔

جس وقت یہ خبریں افغانستان پہنچ رہی تھیں کہ مرہٹوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا، گنج پورے کا شہر لوٹ لیا گیا تو جمال خان نے یہ سوچ کر کہ اب شاہ کو شکست ہو گئی۔ وہ اگر افغانستان واپس بھی آیا تو ایک شکست خوردہ کی حیثیت سے لٹا پٹا واپس آئے گا، اس نے قندھار میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا لیکن جب حالات نے پلٹا کھایا اور پانی پت کے میدان میں شاہ کو عظیم فتح حاصل ہوئی تو جمال خان کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے فوراً اپنی بادشاہت کا اعلان واپس لیا اور حکومت سے دستبردار ہو گیا۔

اس کے بعد شاہ کے بھتیجے عبدالخالق نے علم بغاوت بلند کیا۔ اس کے ساتھ دو اور سردار دلاور خان اور زال بیگ بھی شامل ہو گئے ..... یہ دونوں سردار احمد شاہ کے ساتھ ہندوستان گئے تھے اور پھر اس کے لشکر سے بھاگ آئے تھے۔ یہاں آ کر انہوں نے یہ افواہ اڑائی تھی کہ شاہ کو پانی پت میں شکست ہو گئی ہے۔

اس بغاوت کی خبر شاہ کو دہلی میں مل چکی تھی۔ اس نے اپنے ایک نامور جنرل عبداللہ خان کو عبدالخالق کی سرکوبی کے لیے افغانستان روانہ بھی کر دیا تھا لیکن جب تک وہ پہنچتا، عبدالخالق، شاہ کے بڑے بیٹے مرزا سلیمان کو نکال کر دارالخلافے پر قبضہ کر چکا تھا۔ بہت سے سردار عبدالخالق کے ساتھ مل گئے تھے لیکن جب ان سرداروں نے عبداللہ خاں کو اپنے سامنے دیکھا تو انہیں اس حقیقت کا علم ہوا کہ پانی پت کے میدان میں شاہ کو شکست نہیں، فتح حاصل ہوئی ہے تو یہ سردار عبداللہ خاں کے سامنے پیش ہوئے اور احمد شاہ سے وفاداری کا اظہار کیا اور قندھار شہر مع باغی عبدالخالق، عبداللہ خان کی تحویل میں دے دیا۔

یہ احمد شاہ کی ہر دل عزیزی اور مقبولیت ہی تھی کہ طویل غیر حاضری کے باوجود یہ لوگ اس کی وفاداری کا اظہار کر رہے تھے اور اس کے لیے جان دینے پر تیار تھے۔

احمد شاہ، افغانستان واپسی کے لیے نکلا تھا اور پشاور میں تھا کہ اس نے اپنے بیٹے مرزا سلیمان کو لکھا کہ جس طرح بھی ہو باغیوں کو گرفتار کر کے تہ تیغ کیا جائے۔

سلیمان نے زال بیگ کو خط لکھا۔ دوستانہ تعلق ظاہر کیا اور پچھلی باتیں بھلا کر اسے قندھار بلایا۔ وہ اس چال میں آ گیا۔ قندھار میں قدم رکھتے ہی اسے گرفتار کر لیا گیا اور شہزادے کے حکم سے اس کی گردن مار دی گئی۔ دوسرا باغی سردار دلاور خان بچ نکلا کیونکہ اس نے ہرات پہنچ کر گورنر شہزادہ تیمور کی پناہ حاصل کر لی تھی۔

احمد شاہ افغانستان واپس آیا تو مطلع بالکل صاف تھا۔ کہیں کسی یورش کی خبر نہیں تھی تمام قبائل نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ اس کے تمام مقبوضہ صوبوں میں جشن منایا جاتا رہا۔ قندھار گیا تو وہاں بھی بغاوتوں کا سر کچل دیا گیا تھا۔

وہ قندھار میں مقیم تھا کہ اسے قندھار کی از سر نو تعمیر کا خیال آیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نادر شاہ درانی نے جب قندھار فتح کیا تھا تو اس کے قریب ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی تھی جس کا نام نادر آباد رکھا گیا تھا اور اسے دارالخلافہ بنایا تھا۔ یہ شہر اب قندھار کا حصہ تھا لیکن ایرانیوں کے ہاتھوں افغانوں کی شکست اور غلامی کی یادگار تھا۔ شاہ نے ایک نیا قندھار بسانے کا ارادہ کر لیا۔

اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے قندھار کی مشرقی جانب ایک نہر کھدوانے کا فیصلہ کیا اور یہ طے پایا کہ نیا قندھار اس نہر کے مغربی کنارے پر تعمیر ہو گا لیکن یہ علاقہ علی کوزئی قبیلے کے غنی خان کی ملکیت تھی اور چونکہ اس کے آدمی اپنی زمینیں چھوڑنے کو تیار نہ تھے اس لیے شاہ کو اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ اس کے بعد اس نے مغرب کی جانب موضع مارو کے نزدیک ایک قلعہ تعمیر کرانا چاہا لیکن اس پر بارک زئی رضامند نہ ہوئے۔ شاہ ان قبائل کو رضامند کرنے کے لیے اپنی قوت استعمال کر سکتا تھا لیکن وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے طاقت استعمال کرنے کے حق میں کبھی نہیں رہا تھا۔ اس نے کسی اور مناسب قطعہ زمین کی تلاش شروع کر دی۔ اس دوران پوپلزئی اس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مجوزہ شہر کی تعمیر کے لیے اپنا علاقہ پیش کیا۔ شاہ ان کی پیش کش سے بہت خوش ہوا اور ان کی جاگیر میں ایک مناسب قطعہ زمین منتخب کر کے نئے دارالخلافے کی بنیاد رکھی جس کا نام احمد شاہی قندھار یا اشرف البلاد قرار پایا۔

اس نے تمام افغان قبیلوں کو دعوت دی کہ یہاں اپنے مکانات تعمیر کریں۔ مکانات بنانے کے لیے اس نے لوگوں کو مفت زمین فراہم کی اور سرکاری عمارتیں بھی بنوانا شروع کر دیں۔ شہر میں ایک خوبصورت نہر بھی بنائی گئی اور تمام تعمیرات پر بے دریغ دولت خرچ کی۔ چونکہ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک کے ماہر کاریگر تعمیرات کا کام کر رہے تھے اس لیے تمام عمارتیں نہایت خوبصورت اور مضبوط بنیں۔ قلعے کی تعمیر پر خاص توجہ دی گئی۔

☆☆☆

احمد شاہ کو افغانستان کے عوام نے پہلے سردار اعلیٰ اور پھر بادشاہ تسلیم کیا تھا۔ قبائلی جرگے کا یہ انتخاب غلط ثابت نہیں ہوا۔ اس نے بہت جلد، محض چالیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اپنے آپ کو عوام کے اعتماد کا اہل ثابت کر دیا۔ اپنی قوم کے جنگجو قبیلوں کی باہمی لڑائیوں پر قابو پا کر انہیں ایک لڑی میں پرو دیا۔ یہ ایسا کارنامہ تھا جو بڑے سے بڑے فاتح کے بس کا نہیں تھا۔ وہ چونکہ یہیں پلا بڑھا تھا، ان کے مزاجوں سے واقف تھا اس لیے اس نے حکمتِ عملی ایسی بنائی جو بادشاہت

کی کسی کتاب میں درج نہیں تھی بلکہ اپنے حالات کو دیکھ کر خود وضع کرلی تھی۔ اقتدار کے تمام اہم سرچشموں کو اپنے ہاتھوں میں مرکوز ضرور رکھا لیکن قبائل کا انتظام ان کے سربراہوں پر چھوڑ دیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ آزادی پسند لوگ ہیں، انھیں غلام نہیں بنایا جاسکتا۔ نہ یہ کسی کا حکم ماننے پر تیار ہوتے ہیں۔ اس نے مطلق العنان بادشاہ بننے کے بجائے سربراہ حکومت کا کردار ادا کیا۔

ملک کے انتظامی امور میں مدد کرنے کے لیے اس نے نو سرداروں پر مشتمل ایک مجلس مشاورت قائم کی تھی جس کی مرضی کے خلاف کوئی اہم قدم نہیں اٹھایا جاتا تھا۔ وہ ان قبائلی سرداروں سے جو کسی زمانے میں اس کے ہم مرتبہ تھے اور جنہوں نے اسے بادشاہ بنایا تھا کبھی متکبرانہ انداز میں پیش نہیں آیا۔ دربار میں کورنش کی غلامانہ رسم کو ختم کرکے اعلان کیا کہ بادشاہ کو سلام کرنے کے لیے ہاتھ کو ماتھے تک لے جانا کافی ہے۔

اس کی انہی رواداریوں کا نتیجہ تھا کہ افغانستان کے مختلف علاقے یکجا..... ہوکر ایک سیاسی وحدت کی شکل اختیار کرگئے۔ اس سے پہلے افغانستان چند چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا جن پر ظالم حکمرانوں کا تسلط تھا۔ ان کے درمیان ہمیشہ باہمی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ ان کی آپس کی لڑائیوں سے بیرونی طاقتیں فائدہ اٹھاتی تھیں۔ اکثر یہ ملک دوسرے ملکوں کے صوبے کی حیثیت اختیار کیے رہتا تھا۔

احمد شاہ کے زمانے میں افغانستان پہلی دفعہ ایک آزاد ریاست کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر ابھرا۔ اس نے افغانوں کو ایک قوم بنادیا۔

وہ چاہتا تھا کہ افغان بھی اوروں کی طرح پھلیں پھولیں اور ان کی قوت میں اضافہ ہو۔ ان کی تعداد بڑھانے کے لیے اس نے پشتو بولنے والے تمام قبیلوں کو افغان قوم کے دائرے میں لے لیا اور اپنی سلطنت کے مختلف حصوں میں آباد کیا۔

بعض ایسی سماجی اصلاحات کیں جو ایک طرف افغانستان کو جدید افغانستان بنانے کا باعث بنیں دوسری جانب یہ کہ کسی افغان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس نے معاشرے میں عورتوں کے مرتبے کو بلند کیا۔ طلاق کو ممنوع قرار دیا اور بیوہ عورتوں کی دوبارہ شادی کی پُرزور تحریک شروع کی۔ اس نے لوگوں پر زور دیا کہ کسی شخص کی موت کے بعد اس کے کسی نزدیکی رشتے دار کو اس کی بیوہ سے شادی کرلینی چاہیے۔ اگر ایسا کوئی نزدیکی رشتے دار نہ ہو تو بیوہ اپنے متوفی خاوند کے گھر رہے اور تاحیات اس کی چھوڑی ہوئی جائداد سے متمتع ہو۔

یہ قانون بھی بنایا کہ اگر کوئی عورت بغیر اولاد کے مرجائے تو اس کے باپ بھائی یا دوسرے رشتے دار اس کے شوہر سے جہیز کی واپسی کا مطالبہ نہ کریں۔

وہ نہایت فیاض سلطان تھا۔ خاص طور پر اپنے سپاہیوں کے لیے تو بہت ہی فراخ دل تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ میں انہی کی حمایت اور تلواروں کے بل بوتے پر اس اعلیٰ مرتبے تک پہنچا ہوں۔ میں انہیں اپنی دولت میں سے دار کھتا ہوں۔ وہ بلا کا جنگجو ہونے کے باوجود نہایت رحم دل تھا اپنے بنائے ہوئے قوانین پر سختی سے عمل درآمد کراتا تھا۔ اس معاملے میں وہ کسی سے رعایت کا قائل نہیں تھا۔ اس کے عہد حکومت کی دو خصوصیات تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس نے مفاد عامہ کے کام کیے اور دوسرے یہ کہ دربار کے کمطراق کے باوجود طبعی سادہ مزاجی برقرار رکھی جس کی وجہ سے اس کی ہر دلعزیزی میں بھی اضافہ ہوا۔ وہ ہر شخص سے مل لیتا۔ مقدمات کا فیصلہ کرتے ہوئے انصاف کے اعلیٰ ترین اصولوں کو پیش نظر رکھتا اور درشت الفاظ استعمال کرنے سے گریز کرتا۔

اس کی مذہبی رواداریوں نے بھی اسے مسلمانوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ افغانستان میں آباد غیر مسلم اور قندھار میں تجارت کے لیے آنے والے غیر مسلموں کو مکمل آزادی تھی۔

☆☆☆

وہ قندھار کی تعمیر میں مصروف تھا کہ پنجاب سے دل شکن خبریں آنے لگیں۔ اس نے پنجاب کی حکومت کا جو نظام قائم کیا تھا اسے سکھوں نے اس کے افغانستان آتے ہی درہم برہم کردیا تھا۔ ان کی ہمتیں بڑھتی جارہی تھیں۔ ان کی سرکوبی ضروری تھی اور شاہ تعمیراتی کاموں میں مشغول تھا۔ اس نے خود آنے کے بجائے اپنے ایک سپہ سالار نورالدین کی کمان میں ایک فوجی مہم پنجاب بھیجی۔

چناب پار کرتے ہی اس کا مقابلہ سردار چڑھت سنگھ سے ہوا جو گوجرانوالہ پر قابض تھا۔ نورالدین کو شکست ہوئی۔ اس نے بھاگ کر سیالکوٹ کے قلعے میں پناہ لی۔ اس کے ساتھ 12 ہزار سپاہی تھے اور نواحی علاقہ تمام سکھوں کے قبضے میں تھا اس لیے جلد ہی خوراک اور جانوروں کے چارے کی قلت پیدا ہوگئی۔ اس نے جب تک بہتر سمجھا اس محاصرے کو قبول کیا اور پھر تنگ آکر رات کی تاریکی میں فوج کو اس کی قسمت پر چھوڑ کر قلعے سے نکل کر جموں پہنچ گیا۔ اس کے فرار کی خبر ملتے ہی افغان فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔ سکھ سردار نے اس فوج کو واپس جانے دیا۔

درانی جرنیل کی شکست کا حال سن کر لاہور کا حاکم خواجہ عبید ایک بڑے لشکر کے ساتھ سکھوں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا اور گوجرانوالہ پر حملہ کردیا۔

یہ خبر سنتے ہی بہت سے سکھ سردار چڑھت سنگھ کی مدد کے لیے گوجرانوالہ پہنچ گئے۔ خود خواجہ عبید کی فوج کا ایک سکھ دستہ ہی ان سے مل گیا۔ حالات ہی ایسے ہوگئے کہ فرار کے سوا کوئی راہ نہیں تھی۔ خواجہ عبید نے توپ خانہ اور دیگر سامان وہیں چھوڑا اور لاہور واپس آگیا۔

فوج کا توپ خانہ ہاتھ لگ جانے سے سردار چڑھت سنگھ اور اس کے حلیفوں کی طاقت میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ اب انہوں نے پنجاب بھر میں اپنی فتوحات کو وسعت دینا شروع کردی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سکھ پورے پنجاب کو اپنی مٹھی میں دبا کر بیٹھ جائیں گے۔

سکھوں کے حوصلے اتنے بلند ہوئے کہ وہ سردار جسا سنگھ کی کمان میں لاہور جا پہنچے اور وہاں کے سرکردہ لوگوں کی مدد سے شہر میں داخل ہوگئے۔ لاہور کے قلعے پر خواجہ عبید کا قبضہ تھا۔ اس کے باوجود سکھوں نے جسا سنگھ کو "سلطان القوم" کا خطاب دے کر شاہ لاہور ہونے کا اعلان کردیا۔ جسا سنگھ نے ایک فوجی دستہ لاہور میں چھوڑا تاکہ خواجہ عبید کو محصور رکھے اور خود جالندھر دوآب پر بلہ بول دیا۔ یہاں بھی درانی فوج دادوں کو شکست فاش دی۔

دریائے سندھ سے لے کر ستلج تک پورا پنجاب سکھوں کے تصرف میں آگیا۔

سکھوں نے امرتسر میں دیوالی کا تہوار نہایت دھوم دھام سے منایا۔ ہندوستان بھر کے سکھ وہاں جمع ہوئے اور یہ قرارداد منظور کی گئی۔

"ملک کو بیرونی حملہ آوروں سے نجات دلانے کے لیے احمد شاہ کے جملہ پنجابی حلیفوں کے علاقے پر قبضہ کرلیا جائے۔"

اس قرارداد کو احمد شاہ کے تمام پنجابی حلیفوں تک پہنچادیا گیا۔ شاہ کے پنجابی حلیفوں میں عاقل داس بھی تھا۔ اس کا علاقہ جنڈیالہ، امرتسر سے صرف بارہ میل کے فاصلے پر تھا۔ اس نے جونہی قرارداد کے مضمون کو پڑھا، ایک شتر سوار شاہ کی جانب دوڑا دیا اور التجا کی کہ وہ اس کی مدد کرے۔

احمد شاہ اس سے پہلے ہی اپنے افسروں کی مدد کے لیے پنجاب کی طرف کوچ کرچکا تھا۔ یہ ہندوستان پر اس کا چھٹا حملہ تھا۔

وہ "روہتاس" میں تھا کہ اسے عاقل داس کی طرف سے ایک خط ملا جس میں فوری امداد کی درخواست کی گئی تھی۔ اس نے یہ انکشاف بھی کیا تھا کہ سکھوں نے اس کے علاقے جنڈیالہ کا محاصرہ کررکھا ہے۔

اس وقت احمد شاہ کے ہمراہ کچھ چیدہ سوار تھے۔ اس کی فوج پیچھے آرہی تھی۔ وہ تیزی کے ساتھ روہتاس سے نکلا اور جنڈیالہ کے نواح میں پہنچ گیا اور ایک شامیانہ لگا کر اپنے لشکر کا انتظار کرنے لگا۔

عاقل داس کو بڑی حیرت اس وقت ہوئی جب اسے یہ معلوم ہوا کہ سکھوں نے محاصرہ ختم کردیا ہے۔ اس نے اسے سکھوں کی کوئی چال سمجھی۔ اس کا خیال تھا کہ سکھوں نے دھوکا دینے کے لیے محاصرہ اٹھالیا ہے تاکہ ہم شہر کے دروازے کھول دیں اور وہ بہ آسانی شہر میں داخل ہوجائیں۔ اس نے سکھوں کا پتا لگانے کے لیے جاسوسوں کو روانہ کیا۔ اس کا خیال تھا سکھ گردونواح میں کہیں چھپے ہوئے ہوں گے۔

اس کے جاسوس سارا علاقہ چھان مارنے کے بعد واپس آگئے۔ انہوں نے اطلاع دی کہ سکھ واقعی چلے گئے ہیں۔ انہوں نے دریائے بیاس عبور کرلیا ہے لیکن ایک انکشاف انہوں نے اور بھی کیا۔

"یہاں سے چار میل کے فاصلے پر ایک شامیانہ نصب ہے۔ اس شامیانے میں ایک شخص جواہرات سے مزین پگڑی باندھے بیٹھا ہے۔ بارہ بندوق بردار اس کے سامنے مودبانہ بیٹھے ہیں۔ خدا جانے کون تھا وہ، اس کے چہرے پر ڈاڑھی تو ضرور تھی لیکن وہ سکھ ہرگز نہیں تھا۔"

اس اطلاع کے بعد عاقل داس کی سمجھ میں آگیا کہ سکھوں نے محاصرہ کیوں ختم کردیا۔ جسے میرے جاسوس دیکھ کر آئے ہیں وہ یقیناً احمد شاہ درانی ہے۔ اس کی آمد کی خبر پاکر ہی سکھ غائب ہوئے ہیں۔ عاقل داس اسی وقت شاہ کے سامنے حاضر ہوا اور نذر پیش کرکے سکھوں کی شورش اور جنڈیالے کے محاصرے کا حال اسے سنایا۔ شام ہونے تک وزیر ولی خان بھی تین ہزار افغان سپاہیوں کے ساتھ آپہنچا۔

سکھوں نے محاصرہ ختم کردیا تھا۔ اب شاہ کے وہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں رہا تھا۔ وہ لاہور واپس چلا گیا۔

مالیر کوٹلہ میں سکھوں کے اجتماع کی خبر سن کر وہاں کے حکمران بھیکن خان نے سرہند کے گورنر زین خان کو مدد کے لیے پکارا۔ ایک خط اس نے احمد شاہ کو لکھ دیا کہ سکھوں کی بیخ کنی کا اس سے بہتر موقع ہاتھ نہ آئے گا۔

احمد شاہ نے خط ملتے ہی لاہور چھوڑ دیا اور زین خان کو

مطلع کیا کہ وہ سکھوں پر حملہ کر دے۔ مدد کے لیے میں بھی آتا ہوں۔ زین خان نے شاہ کی حمایت ملتے ہی سکھوں پر حملہ کر دیا۔ سکھ اس غیر متوقع حملے کے لیے تیار نہیں تھے لیکن لڑائی سامنے آ گئی تو انہیں بھی لڑنا پڑا۔ دوپہر تک شاہ بھی میدان میں آ گیا۔ جنگ کا نقشہ کچھ ایسا بن گیا کہ سکھ حاوی نظر آنے لگے۔ شاہ نے بہت چاہا کہ وہ سکھوں کے گھیرے کو توڑ دے لیکن وہ اپنی جگہ ڈٹے ہوئے تھے۔ آخر سکھوں کی صفوں میں ابتری کے آثار پیدا ہوئے اور وہ پیچھے ہٹنے لگے لیکن لڑائی سے پیچھے نہیں ہٹے۔

شام کے قریب سکھوں نے فرار کا راستہ اختیار کیا۔ اس وقت تک پچاس ہزار سکھ قتل کیے جا چکے تھے۔ سکھوں کے لیے یہ نقصانِ عظیم تھا۔

شاہ سرہند میں کچھ دن قیام کرنے کے بعد لاہور چلا گیا۔ وہ اپنے ساتھ سکھوں کے کٹے ہوئے سروں سے بھری ہوئی پچاس گاڑیاں اور ایک کثیر تعداد قیدیوں کی لے کر لاہور گیا تھا۔ اس کا خیال تھا اس طرح سکھ خوف زدہ ہو کر اس کی اطاعت قبول کر لیں گے۔

افغانستان واپس ہونے سے پیشتر وہ دہلی کی سلطنت کے معاملات بھی طے کر دینا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے نجیب الدولہ اور شاہ عالم ثانی کے نمائندوں کو لاہور بلوایا۔

احمد شاہ دہلی کے نظام میں کوئی تبدیلی نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے شاہ عالم کی تخت نشینی کی تصدیق کر دی۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی منظور کر لیا کہ وہ ہندوستانی والیانِ ریاست میں اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے انہیں شاہ عالم ثانی کی اطاعت کی ترغیب دے گا البتہ اس مقصد کے لیے کوئی فوجی امداد دینے سے انکار کر دیا۔

پنجاب، کشمیر، سرہند میں ضروری انتظامات کرنے کے لیے وہ کچھ دن رکا رہا لیکن پنجاب کی جھلستی ہوئی گرمی سے گھبرا کر قندھار چلا گیا۔

احمد شاہ نے جونہی پنجاب چھوڑا، سکھ پھر اپنی کمیں گاہوں سے نکل آئے اور ہر طرف پھیل گئے۔ انہوں نے جالندھر دوآب پر تسلط جما لیا۔ اردگرد کے بیشتر دیہات پر قبضہ کر کے اپنے لیے چھوٹی سی ریاست کی بنیاد ڈال لی۔ ان کی ہمتیں اتنی بڑھ گئیں کہ وہ سرہند پر چڑھ دوڑے۔ زین خان مارا گیا اور سرہند پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔ افغانوں کے مکانات منہدم کر کے زمین سے ملا دیے گئے۔

پنجاب پر قبضہ کرنے کے بعد انہوں نے جمنا عبور کیا۔ سہارن پور کو لوٹا اور اس کے بعد شاملی اور کاندھلہ کی جانب بڑھ گئے۔

اس کے بعد سکھ لاہور پر چڑھ دوڑے اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ شہر کا حاکم کابلی مل، احمد شاہ کا ملازم تھا لیکن اسے بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑائی۔ بھاری خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ اس کے باوجود سکھوں نے یہ شرط پیش کی کہ ہمارا ایک وکیل لاہور میں رہے گا اور کابلی مل اسے دس روپے روزانہ دیا کرے گا۔

افغانوں کا رعب جاتا رہا۔ ان کی حکومت شہر اور قلعے تک محدود ہو گئی، آس پاس کا تمام علاقہ سکھوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔

سکھوں نے یہ تمام فتوحات دو سال کے عرصے میں مکمل کر لی تھیں۔ احمد شاہ ابھی تک افغانستان میں تھا لیکن جب لاہور اور ملتان میں سکھوں کی سرکشی بہت بڑھ گئی، سرہند اور جالندھر دوآب بھی ہاتھ سے نکل گیا تو احمد شاہ نے پنجاب جانے کا قصد کیا۔ اس نے سکھوں کے خلاف اعلانِ جہاد کیا۔ اپنے حلیف بلوچ نصیر خاں کو لکھ بھیجا کہ وہ اس جہاد میں اس کا ساتھ دے۔ نصیر خاں پہلے ہی تیار بیٹھا تھا۔ اس نے علماء سے جہاد کا فتویٰ حاصل کر لیا تھا۔

احمد شاہ اٹھارہ ہزار سپاہی افغانستان سے لے کر چلا۔ بلوچ سردار بارہ ہزار سپاہی لے کر شاہ سے آ ملا۔ دونوں نے دریائے راوی پار کیا اور لاہور آ گئے۔ یہ ہندوستان پر احمد شاہ کا ساتواں حملہ تھا۔

لاہور پہنچ کر شاہ نے ایک مجلس جنگ بلوائی تاکہ تمام سردار سکھوں کی بیخ کنی کے لیے اپنی اپنی تجاویز پیش کریں۔ سب کی رائے یہ تھی کہ چونکہ سکھوں کا طریقہ جنگ یہ ہے کہ چوروں کی طرح آتے ہیں، بھیڑیوں کی طرح حملہ کرتے ہیں اور غائب ہو جاتے ہیں لہٰذا غازیوں کو ان پر ناگہانی حملہ کرنا چاہیے۔ اس طرح ان کی صفوں میں انتشار پھیل جائے گا۔

"بت پرست لاکھی کے جنگلوں میں روپوش ہیں جو یہاں سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم جنگل کے نزدیک پہنچتے ہی ان پر ٹوٹ پڑیں۔" شاہ نے حکم دیا۔

اگلی صبح جب سب ممتاز افغان سردار حسب دستور شاہ کے سامنے صف آرا تھے۔ ایک سوار تمام شاہی آداب بالائے طاق رکھتے ہوئے مجلس میں داخل ہوا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ اسے گھوڑے سے اتر جانا چاہیے۔

اس نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے چیخ کر کہا "سکھوں نے ہراول دستے کو شکست دے دی ہے۔ اگر شاہ جلدی ان کی مدد کو نہیں پہنچا تو بہت جانی نقصان ہو گا۔"

یہ سنتے ہی شاہ کے حکم سے امدادی فوجیں دوڑ پڑیں۔ نصیر خان بھی جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر میدانِ جنگ کی طرف چلا۔

سکھوں کی رہنمائی شاہ کا پرانا دشمن چڑھت سنگھ کر رہا تھا۔

اس نے یہ ہوشیاری کی تھی کہ الگ الگ جتھے بنا دیے تھے۔ ایک جتھا ایک جگہ افغانوں کو مصروف رکھتا، دوسرا جتھا دوسری جگہ نمودار ہوتا۔ شاہ کی کچھ فوج وہاں چلی جاتی۔ اس طرح سکھوں نے شاہ کی فوج کو تقسیم کر رکھا تھا۔ جب سکھ پسپا ہونے لگتے تھے تو ایسے غائب ہوتے تھے کہ انہیں جاسوسوں کی مدد سے ڈھونڈنا پڑتا تھا۔

یہی اس وقت ہوا۔ سکھوں نے لاکھی کا جنگل خالی کر دیا۔ معلوم ہوا وہ امرتسر گئے ہیں۔ شاہ کی فوج امرتسر گئی۔ سکھوں کا وہاں بھی کوئی پتا نہیں تھا۔ صرف تیس سکھ اکال تخت کے بنگلے میں چھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے افغانوں سے جنگ کی لیکن یہ تیس کے تیس مارے گئے۔

سکھوں کے بار بار روپوش ہو جانے کی وجہ سے ان سے کھل کر لڑائی کا امکان نہ رہا تھا۔ انہی دنوں خبر آئی کہ سورج مل جاٹ کے بیٹے جواہر سنگھ نے پندرہ ہزار سکھوں کی مدد سے نجیب الدولہ کو سخت تنگ کر رکھا ہے۔ میر نصیر خان کی رائے یہ ہوئی کہ افغان فوج راستے میں سکھوں کی بیخ کنی کرتے ہوئے سرہند پہنچے اور پھر وہاں سے نجیب الدولہ کے علاقے میں جا کر اس کی گلوخلاصی کرائی جائے۔

شاہ نے اعلان کیا کہ یہ پورا علاقہ دارالحرب ہے اس لیے لشکریوں کو لوٹ مار کرنے کی پوری آزادی ہے۔ سپاہیوں کو ایسے نادر مواقع کہاں ملتے تھے۔ ان کے جوش میں مزید اضافہ ہو گیا۔

افغان لشکر نہایت اطمینان سے ایک دن میں چار میل کا فاصلہ طے کرتا ہوا پندرہ دن میں بٹالہ پہنچ گیا اور پورے علاقے کو لوٹ لیا۔ جو راستے میں آیا اسے مارا۔ جس کا گھر سامنے پڑا اسے لوٹا۔ تمام دیہات اور قصبے خالی پڑے تھے۔ آبادی بھاگ گئی تھی۔ اب ان کا مال لشکریوں کا مال تھا۔

افغانوں نے دریائے بیاس عبور کیا تھا کہ ایک روز سکھ اچانک نمودار ہو گئے لیکن اپنی عادت کے مطابق ایک ہی ہلے میں غائب بھی ہو گئے۔ شاہی فوج نے چھ میل تک ان کا تعاقب کیا لیکن جب رات ہو گئی تو ان کا تعاقب ترک کر دیا گیا۔

شاہ نے حکم دیا کہ اب سرہند جانے کے بجائے نجیب الدولہ کی مدد کے لیے کنجپورہ کی جانب روانہ ہوا جائے لیکن پھر یہ خبر آ گئی کہ نجیب الدولہ اور جاٹوں میں صلح ہو گئی ہے اس لیے کنجپورہ جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ نصیر خان نے مشورہ دیا کہ کچھ عرصہ دہلی میں قیام کیا جائے لیکن وہ یہاں کی گرمی اور برسات سے سخت خوف زدہ تھا اس لیے افغانستان واپسی کا حکم بحال رہا۔

واپس ہوتے ہوئے وہ سرہند میں داخل ہوا۔ پورا شہر کھنڈر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ انسان تو انسان کوئی پرندہ بھی نظر نہ آتا تھا۔

اس وقت سرہند سردار آلا سنگھ کے تسلط میں تھا۔ شاہ نے فیصلہ کیا کہ آلا سنگھ سے کوئی تعرض نہ کیا جائے بلکہ اسے یہاں کا حاکم تسلیم کیا جائے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ سرہند پر کوئی سکھ ہی حکومت کر سکتا ہے۔ اس نے آلا سنگھ کو اپنے حضور طلب کیا اور بیش بہا خلعت اور راجا کا خطاب مع طبل و علم عطا ہوا۔ آلا سنگھ نے وعدہ کیا کہ وہ ساڑھے تین لاکھ سالانہ خراج ادا کرتا رہے گا۔

اگلے دن شاہی لشکر ایک میل آگے نہ گیا ہو گا کہ سکھوں کی ایک کثیر تعداد نے اس کا راستہ روک لیا۔ یہ سکھ جانے کہاں روپوش ہو جاتے تھے اور پھر اچانک نمودار ہو جاتے تھے۔ شکست کھا کر بھاگتے تھے لیکن پھر مقابلے پر آتے تھے۔ سامنے آ کر لڑنے کو تیار ہی نہیں ہوتے تھے کہ ایک ہی مرتبہ میں فیصلہ ہو جائے۔

شاہ نے سکھوں کو صف بستہ دیکھ کر اپنے سرداروں کو لڑائی کی تیاری کا حکم دیا۔ مرکز کی کمان خود سنبھالی۔ سکھوں کی طرف سے گولیوں کی بارش شروع ہوئی تو لڑائی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ یہ خوں ریز جنگ اندھیرا ہونے تک جاری رہی۔

اگلے روز طلوعِ آفتاب کے وقت سکھ افغان فوج پر حملہ آور ہوئے۔ سامنے سے بلہ بولا اور شاہی لشکر سے گتھ گئے۔ یہیں سکھوں کی غلطی تھی۔ وہ اس طریقہ جنگ کے عادی نہیں تھے اور پھر افغانوں کی تلوار بازی کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

سکھوں نے حسبِ دستور راہِ فرار اختیار کی۔ افغانوں نے تین میل تک ان کا تعاقب کیا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو شاہی لشکر میں واپس آ گئے۔

کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ سکھ پلٹے اور پھر افغانوں پر حملہ آور ہوئے۔ وہ ادھر اُدھر پھیل کر ہر طرف سے یورش کر رہے تھے۔ افغانوں نے بہ مشکل ہتھیار سنبھالے۔ شام ہوتے ہوتے سکھ اچانک غائب ہو گئے۔

جالندھر دوآب سے گزرتے ہوئے سکھ سات دن تک روزانہ اسی طرح شاہی لشکر کو تنگ کرتے رہے۔ بیاس کے

ساحل پر پھر ایک معرکہ ہوا۔ یہ آخری معرکہ ثابت ہوا کیونکہ اس کے بعد وہ واپس نہیں آئے۔

اب احمد شاہ نے لاہور کے قیام کو بھی ضروری نہیں سمجھا۔ اسے وطن جانے کی جلدی تھی کیونکہ وہ اپنے لشکر میں بے زاری کے آثار دیکھ رہا تھا۔

دریائے راوی عبور کیا اور کوچ کرتا ہوا چناب کے کنارے جا پہنچا۔ دریا بہت چڑھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو بھیجا کہ کوئی ایسا گھاٹ تلاش کریں جہاں پانی کم ہوتا کہ دریا پار کرنے میں سہولت ہو۔ ان میں سے ایک نے بتایا کہ پہاڑوں کے دامن میں جہاں پانی آٹھ دھاروں میں بٹ جاتا ہے، دریا آسانی سے عبور ہو جائے گا۔

شاہی لشکر اس کے بتائے ہوئے مقام پر پہنچا اور گھوڑے پانی میں ڈال دیے۔ پانی واقعی زیادہ گہرا نہیں تھا، چھ دھارے آسانی سے پار کر لیے لیکن باقی دو دھارے بہت گہرے تھے۔ تیز رفتار دھارے نے تباہی مچادی۔ یہ معلوم ہوتا تھا یوم حساب آن پہنچا ہے۔ ایسی ابتری پھیلی کہ کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ پانی کا بہاؤ اتنا تھا کہ جو اس کے سامنے آیا اسے بہا کر لے گیا۔ سیکڑوں مرد، عورتیں اور شاہی خزانے کے علاوہ ہزار ہا سامان سے لدے ہوئے اونٹ، گھوڑے اور خچر دیکھتے ہی دیکھتے بہہ گئے۔

اس روز اتنا مالی اور جانی نقصان ہوا کہ سکھوں کے ساتھ جنگ میں بھی نہ ہوا ہوگا۔ سب کے سب ہراساں کھڑے تھے۔ اپنے سامنے اپنا مال و متاع جاتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔ افسردگی کا غبار تھا جو ہر چہرے پر نظر آ رہا تھا۔

''جہاں خاں۔'' احمد شاہ کی آواز گونجی۔

''جی خان، میں حاضر ہوں۔''

''اس تجربے کے بعد ہم کوئی اور تجربہ نہیں کر سکتے۔ تم کچھ آدمی اپنے ساتھ لے کر جاؤ اور جہلم پر پل کا انتظام کرو، ہم پیچھے آتے ہیں۔''

جہاں خان اسی وقت جہلم کی طرف روانہ ہوا اور خود شاہ دو یا تین فرسنگ روزانہ کی مسافت طے کرتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔

جہلم پر پُل بنایا جا چکا تھا۔ لشکر نے دریائے جہلم عبور کیا۔ روہتاس پہنچ جانے کے بعد نصیر خان اور اس کے بلوچی ہمراہی شاہ سے رخصت ہو کر اپنے ملک کی جانب روانہ ہوئے اور شاہ نے افغانستان کی جانب کوچ کیا۔

ہمیشہ یہی ہوتا تھا، اس مرتبہ بھی یہی ہوا۔ شاہ کو پنجاب چھوڑے ایک ماہ ہوا تھا۔ اس نے مارچ 1765ء میں پنجاب چھوڑا تھا اور اپریل میں سکھوں نے امرتسر میں بیساکھی کا تہوار منایا۔ اس موقعے پر ایک عام اجتماع (گورمتا) ہوا۔ اس اجتماع میں فیصلہ ہوا کہ احمد شاہ کا خطرہ ٹل گیا ہے لہٰذا اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر لاہور پر قبضہ کر لیا جائے۔ یہ موقع اس لیے بھی سنہرا ہے کہ حاکم لاہور کابلی مل اس وقت لاہور میں موجود نہیں، وہ جموں گیا ہوا ہے۔

سردار لہنا سنگھ اور گوجر سنگھ دو ہزار سکھوں کے ایک لاہور پہنچے اور موضع باغبانپورہ کے کچھ آدمیوں کی مدد سے جو قلعے میں ملازم تھے ایک چور دروازے سے اندر داخل ہو گئے اور قلعے پر قبضہ کر لیا۔ کابلی مل کے بھتیجے امر سنگھ نے شہر کی فصیل سے قلعے پر چند گولے برسائے لیکن یہ ہاتھی پر پتھر برسانے کی حرکت تھی۔ صرف پچیس سکھ قلعے سے نکلے اور اسے گرفتار کر کے لے آئے۔

پنجاب کا دارالخلافہ سکھوں کے قبضے میں آ گیا۔

آلا سنگھ نامی سردار نے شاہ کی اطاعت قبول کر لی تھی اور سرہند کا حاکم بن گیا تھا۔ اسے سکھ اپنی ذلت سمجھتے تھے لہٰذا ایک فوجی مہم اس کے خلاف بھیجی گئی۔

سرہند اور دوسرے علاقوں میں شاہ کی دستبرد سے نجات حاصل کر کے سکھوں نے ہر طرف اپنی حکومت قائم کر لی۔ گنگا جمنا دوآب میں جا گھسے اور نجیب الدولہ کے علاقوں کو تاراج کر دیا۔ اب وہ مرہٹوں سے قوت آزما تھے۔

ہندوستان میں ایک نئی طاقت ایسٹ انڈیا کمپنی کی ابھر رہی تھی۔ انگریزوں نے اب سیاست میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ والیانِ ریاست حتیٰ کہ مغل شہنشاہ نے بھی کسی بیرونی حملہ آور کی طرف دیکھنے کے بجائے انگریزوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہر وہ چال چل رہے تھے کہ ہندوستانی ان کے مرہونِ منت ہو جائیں۔ احمد شاہ سے ان کا اتحاد کمزور پڑتا چلا جائے۔ انگریز چاہتے تھے کہ پنجاب میں افغان دشمن حکومت قائم ہو تاکہ احمد شاہ دہلی تک نہ پہنچ سکے۔

انگریزوں کو معلوم تھا کہ اگر احمد شاہ نے دہلی آ کر ہندوستانی امرا اور والیانِ ریاست سے گٹھ جوڑ کر لیا تو ان کے تمام عزائم خاک میں مل جائیں گے۔ اس لیے ان کی تمام کوششیں اس امر پر مرکوز تھیں کہ شہنشاہ اور شجاع الدولہ کو احمد شاہ سے ملنے اور تعلقات قائم کرنے سے روکا جائے۔ بظاہر وہ بادشاہ کے مطیع اور خیر خواہ تھے لیکن اندر ہی اندر دلی طریقے سے اس کی تباہی کا سامان کر رہے تھے۔ شاہ عالم محسوس کرتا تھا کہ احمد شاہ سے اتحاد کر کے وہ ہندوستان پر اپنا اقتدار قائم کر سکتا ہے مگر وہ انگریزوں کے ہاتھوں بے بس تھا۔ کوئی ذاتی ذرائع

نہ ہونے کی وجہ سے اس کا انحصار تمام تر انگریزوں پر تھا۔

یہ حالات تھے جن میں، دو سال افغانستان میں گزارنے کے بعد 1766ء میں وہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ یہ اس کا ہندوستان پر آٹھواں حملہ تھا۔

اس نے دریائے سندھ عبور کیا اور کسی مزاحمت کے بغیر ایک مقام ''سکھی آہور'' تک پہنچ گیا۔ یہاں سکھ سرداروں نے آٹھ یا دس ہزار سواروں کے دستے متعین کر رکھے تھے۔ افغانوں نے انہیں آسانی سے تتر بتر کر دیا۔ شاہ دریائے جہلم عبور کر کے گجرات پہنچا۔ چناب عبور کیا اور راوی دوآب میں داخل ہو کر سیالکوٹ کی جانب روانہ ہوا۔ یہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ نواحی دیہات میں سکھوں کی ایک کثیر تعداد دلچسپی ہوئی ہے۔ شاہ کے وزیر حضوری سعادت خان نے رائے دی کہ مقامی زمینداروں پر ڈیڑھ لاکھ روپیا تاوان ڈالا جائے اور ان سے عہد لیا جائے کہ ہر اس شخص کو جو شکل و صورت سے سکھ معلوم ہوتا ہو پکڑ کر لوٹ لیں۔ زمینداروں نے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ سکھوں کو پناہ نہ دیں گے۔

اس کے بعد اس نے مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے لاہور کا رخ کیا۔ مختلف سردار اور ان کے سپاہی جو لاہور کے قلعے میں تھے، احمد شاہ کی آمد کا سن کر فرار ہو گئے۔ افغانوں کے ہراول دستے نے لاہور پر قبضہ کر لیا۔

اس نے اپنی فوج کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے سکھوں کی بیخ کنی کے لیے بھیجا۔ سکھوں کی ٹکڑیاں انہیں ملیں ضرور لیکن انہوں نے حسبِ دستور جم کر لڑنے سے گریز کیا۔ شاہ کی فوج کے گرد منڈلاتے رہتے اور جیسے ہی موقع ملتا لشکر پر جھپٹتے اور جو ہاتھ لگتا لے بھاگتے۔

کئی مہینوں تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ شاہ اور اس کے سپاہی سکھوں کی ان حرکات سے تنگ آ چکے تھے بالآخر شاہ نے سکھ سرداروں کو خطوط لکھے۔

''اگر آپ ہماری ملازمت اختیار کرنا چاہیں تو آ کر ہمارے لشکر میں شامل ہو جائیں اور اگر آپ کا ارادہ جنگ کرنے کا ہے تو مردوں کی طرح میدان میں اتریں۔''

مختلف سفارتوں کے ذریعے یہ بھی کوششیں کی گئیں کہ وہ شاہ سے صلح کر لیں۔ انہیں باور کرایا گیا کہ انہیں ان کے علاقوں سے بے دخل نہیں کیا جائے گا لیکن سکھوں نے مصالحت کی بات چیت سے انکار کر دیا۔ انہیں معلوم تھا کہ شاہ جلد ہی افغانستان چلا جائے گا اور ان کے مقبوضات خود بخود انہیں مل جائیں گے۔

احمد شاہ بیاس عبور کر کے جالندھر دوآب میں داخل ہوا۔

سکھوں نے بادشاہ کو یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ بے خبری میں بلوچی نصیر خان پر ٹوٹ پڑے اور اسے کھلے میدان میں شکست دے کر شاہی لشکر کا مال و اسباب لوٹ لیا۔

شاہ نے سکھوں کی ان سرگرمیوں کو نظر انداز کیا اور دہلی کی جانب روانہ ہوا۔ اس کے جاتے ہی سکھوں نے لاہور، راوی اور ستلج کے درمیانی علاقے پر قبضہ کر لیا اور وہاں اپنی فوجیں متعین کر دیں۔

جب شاہ انبالہ سے بیس میل کے فاصلے پر سنبھل آباد میں تھا تو نجیب الدولہ اس سے ملنے آیا۔ احمد شاہ کو یہ دیکھ کر سخت غصہ آیا کہ باوجود وفاداری کے بلند بانگ دعووں کے والیانِ ریاست میں کوئی اس کے استقبال کے لیے نہیں آیا حتیٰ کہ شجاع الدولہ بھی نہیں۔

''نجیب الدولہ، یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں۔ کیا ہمارے احسانات کا یہی صلہ ہے کہ کوئی ہمارے استقبال تک کے لیے نہیں آیا۔''

''حضور، اب آب و ہوا کچھ ایسی ہی ہے۔''

''کیا مطلب نجیب الدولہ؟''

''انگریز اپنی چال چل چکا ہے۔ وہ آپ کی طاقت توڑنے کے درپے ہے۔''

''ہماری تلوار انگریزوں کی گردن تک بھی پہنچ سکتی ہے۔''

''انگریز آپ کے خلاف نبرد آزما نہیں ہیں۔ انہوں نے شاہ عالم ثانی اور شجاع الدولہ کو اپنی مٹھی میں کر لیا ہے۔ انہوں نے وزیر اور شہنشاہ کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ شاہ کا استقبال کرنے یا اسے مالی تعاون دینے سے احتراز کریں اور اگر وہ دہلی کی جانب پیش قدمی کرے تو اس کا مقابلہ کریں۔''

''کیا مرہٹے اور جاٹ ہماری تلوار کی طاقت کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ کیا انہیں پانی پت کا میدان یاد نہیں رہا؟''

''وہ ابھی تک اسی کشمکش میں تھے لیکن سکھوں کی شدید مزاحمت اور ان کے ہاتھوں شاہی لشکر کی بعض شکستوں نے ان کا خوف دور کر دیا ہے۔ والیانِ ریاست کے رویے میں تبدیلی آ گئی ہے۔''

''ہم انہیں بتائیں گے کہ ہماری تلواروں کو ابھی زنگ نہیں لگا ہے۔ ہم دہلی ضرور جائیں گے۔''

نجیب الدولہ یہ سن کر سناٹے میں آ گیا۔ وہ بدلی ہوئی صورتِ حال کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ احمد شاہ دہلی کی طرف کوچ کرے۔ بالآخر اس نے سر جھکا کر عرض کیا۔ ''اگر اعلیٰ حضرت نے دہلی جانے کا عزم کر ہی لیا ہے تو

پھر کچھ نہیں ہوسکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ جدھر سے گزریں گے، لوگ گھر بار چھوڑ کر بھاگ جائیں گے اور پورا ملک ویران ہوجائے گا چونکہ اعلیٰ حضرت نے مجھے شرف باریابی بخشا ہے اس لیے میری ایک درخواست بھی منظور فرمائیں۔ اگر دہلی جانے کا ارادہ نہیں ٹل سکتا تو پھر روانہ ہونے سے پیشتر میری جان کی قربانی قبول فرمائیں۔''

احمد شاہ نے بھانپ لیا کہ بیشتر ہندوستانی والیان ریاست کے مخالفانہ رویے کی وجہ سے دہلی جانا مناسب نہ ہوگا۔ اس نے اسمٰعیل آباد چھوڑ دیا اور اور سرہند آ گیا۔ آلا سنگھ کا پوتا امرسنگھ اس وقت سرہند پر قابض تھا۔ شاہ نے اسے اپنے حضور طلب کیا اور نولاکھ کے واجبات کا مطالبہ کیا جو آلا سنگھ کے زمانے سے ریاست پٹیالہ کے ذمے چلے آرہے تھے۔

اس کے پاس ادا کرنے کے لیے اتنی رقم کہاں تھی۔ نجیب الدولہ نے اس سے کہا، پٹیالہ کا قلعہ کیا حیثیت رکھتا ہے۔ میں آپ کو دکھاؤں گا کہ نجیب آباد میں بیرا پھر گڑھ کا قلعہ کتنا مضبوط ہے تو وہ سمجھ گیا کہ اسے قیدی بنا کر نجیب آباد لے جانے کی باتیں ہورہی ہیں ورنہ وہ تو یہ سمجھ رہا تھا کہ معاملہ رفع دفع ہوجائے گا۔

آلا سنگھ کی بیوہ نے سنا کہ اس کا پوتا روہیلوں کی قید میں جارہا ہے تو اس نے سر پیٹ لیا۔ وہ خفیہ طور پر شاہ ولی خان سے ملی اور کچھ تحائف نذر کر کے اس کے آگے دامن پھیلا دیا۔

''میں آلا سنگھ کی بیوہ رانی فتح کور ہوں۔ شاہ درانی نے آلا سنگھ کو سرہند کا حاکم بنایا تھا۔ میرا شوہر ہر ساڑھے تین لاکھ خراج ادا کرنے کا پابند تھا لیکن ہماری برادری نے اسے کبھی حاکم تسلیم نہیں کیا بلکہ اس سے نفرت کرتے رہے۔ ہمیشہ یہاں شورش برپا رہی اور آلا سنگھ شاہ درانی کا نادہند ہوگیا۔ اب میرا پوتا امرسنگھ تخت نشین ہوا ہے۔ آلا سنگھ کی رقم اس سے مانگی جارہی ہے۔ ہم ابھی تک شاہ کے وفادار ہیں لیکن رقم کہاں سے لائیں۔ شاہ نے اسے قید کرلیا ہے۔ اس کے قید کرنے سے کیا مل جائے گا۔ بس یہ ہوگا میرا پوتا مجھ سے چھن جائے گا۔ آپ شاہ سے سفارش کریں اور میرے پوتے کو قید سے رہائی دلوادیں۔ آپ چاہیں تو سرہند کا حاکم کسی اور کو بنادیں۔''

شاہ ولی خان فتح کور کی باتوں سے اتنا متاثر ہوا کہ شاہ سے نیز درسفارش کی۔ اس کی سفارش پر بادشاہ نے نہ صرف امرسنگھ کو رہا کردیا بلکہ اسے سرہند کا علاقہ اور راجا راجگان کا خطاب بھی عطا کیا۔ امرسنگھ نے شکرگزاری کے طور پر اپنے سکوں پر شاہ کا نام کندہ کرایا اور مہر پر اپنے نام کے ساتھ بادے زنی کا اضافہ کیا۔

افغان سپاہیوں کو کافی عرصے سے تنخواہ نہیں ملی تھی اس لیے برتقریباً چار سو افغانیوں کا ایک دستہ حکم عدولی پر اتر آیا اور قصور، پاک پٹن اور ملتان کے رستے افغانستان کی جانب روانہ ہوگیا۔ شاہ کا دل بھی اب ہندوستان سے ہٹ گیا تھا۔ اپنے سپاہیوں کی یہ بے دلی دیکھی تو وہ بھی ملتان کے راستے سے افغانستان واپس ہوگیا۔

اس کی واپسی کے فوراً بعد سکھ دوبارہ دریائے سندھ اور جمنا کے درمیانی علاقے کے مالک بن بیٹھے۔ افغانوں کی جانب سے زادن خان، لاہور کا صوبے دار تھا۔ اس نے چپکے سے شہر لاہور سکھوں کے حوالے کیا اور نکل گیا۔ سرہند کا علاقہ امرسنگھ کے پاس تھا ہی۔

ایک سال بعد 1769ء میں احمد شاہ درانی نے ایک مرتبہ پھر پنجاب پر آخری دفع فوج کشی کی۔ وہ سندھ اور جہلم عبور کر کے چناب کے بائیں کنارے تک پہنچا اور گجرات کے قریب خیمہ زن ہوگیا۔ یہ وہ وقت تھا جب سکھوں نے نہایت مضبوطی سے اپنے قدم پنجاب میں جمالیے تھے۔ سکھوں نے یہ مقام اتنی جانفشانی سے حاصل کیا تھا کہ اب انہیں ان کے علاقوں سے نکالنا آسان نہیں تھا جبکہ انہیں انگریزوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ شاہ کے اتحادی بھی اس سے منہ موڑ چکے تھے۔ وہ اب بھی ایک کوشش کر دیکھتا لیکن خود اس کے ہمراہیوں میں اندرونی خلفشار بڑھ گیا لہٰذا اس نے یہی بہتر سمجھا کہ افغانستان لوٹ جائے۔

وہ واپس ہوگیا لیکن واپسی میں پشاور اور کابل کے درمیان اس کے لشکر کے اندرونی خلفشار نے باہمی تشدد کی شکل اختیار کرلی جس کے نتیجے میں خود لشکر میں لوٹ مار شروع ہوگئی اور اس کے کئی سردار اور متعدد سپاہی مارے گئے۔ بہت سے لشکر سے جدا ہوکر منتشر ہوگئے۔ احمد شاہ کابل سے قندھار چلا گیا۔

پنجاب میں اپنے سپہ سالاروں کی ہزیمت اور سکھوں سے ناکام جنگوں سے دلبرداشتہ ہوکر اس نے آئندہ ہندوستان نہ جانے کا ارادہ کرلیا۔ اپنے اتحادیوں کی طرف سے بھی اسے مایوسی ہوئی تھی۔

وہ کچھ دنوں قندھار کی تعمیر نو میں مشغول رہا تھا لیکن وہ تو اس کا عادی رہا تھا کہ اپنے سپاہیوں کو ہمیشہ مشغول رکھے۔ اس کا خیال تھا کہ آرام اور بے کاری اس کے جنگجو سرداروں میں نخالی رجحانات کو آرام طلب اور بزدل بنادے گی۔ اسی لیے وہ انہیں کسی نہ کسی طرح کسی نہ کسی غیر ملکی مہم میں مصروف رکھتا

تھا۔ یہ مہمات ہی اس کا مالی ذریعہ تھیں۔

اس نے اپنے لشکر کی دوبارہ تنظیم نو کی۔ ہندوستان جانے کے بجائے مشہد اور آس پاس کے علاقوں کو آزاد کرانے کی ٹھانی۔

وہ ایک مضبوط فوج لے کر مشہد کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ حاکم مشہد نصراللہ مرزا نے شہر پناہ کے دروازے بند کرا لیے اور دفاعی انتظامات مستحکم کرنے میں مصروف ہوگیا۔ کبھی کبھی پانچ سو یا ہزار آدمیوں کا دستہ شہر سے برآمد ہوتا اور محاصرہ کرنے والوں پر گولیاں برسا کر اندر بھاگ جاتا۔

یہ سلسلہ چلتا رہا۔ احمد شاہ کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کے پاس شہر پناہ کو مسمار کرنے کا ذریعہ موجود تھا لیکن امام رضا کے روضے کا احترام کرتے ہوئے وہ نہیں چاہتا تھا کہ مشہد پر گولہ باری کرے۔ اس نے شاہ ولی خان کو نصراللہ مرزا کے پاس مصالحت کی گفتگو کے لیے بھیجا جس میں شاہ کی یہ کمزوری زیر بحث تھی کہ شاہ حضرت امام رضا کے روضے کا احترام کررہا ہے ورنہ شہر میں داخل ہونا اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ نصراللہ مرزا اور اس کے باپ شاہ رخ نے اس دلیل کو تسلیم کیا اور شہر پناہ کے دروازے کھول دیے۔ احمد شاہ نے اسے یہ بھی یاد دلایا کہ شاہ رخ چونکہ نادر شاہ درانی کا پوتا ہے اور میں نے اپنے آقا سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اس کی آل اولاد کا ہمیشہ خیال رکھوں گا۔ مجھے مشہد پر گولہ باری کرتے ہوئے یہ پاس بھی تھا۔

شاہ رخ اس کے اس جذبے سے بہت متاثر ہوا اور آئندہ اس سے بغاوت نہ کرنے کا عہد کیا۔ شاہ رخ نے اپنی بیٹی گوہر شاد، شاہزادہ تیمور کے عقد میں دے دی اور شاہی لشکر کے لیے ایک ایرانی دستہ فراہم کرنے کا بھی وعدہ کیا۔ نصراللہ مرزا نے اپنی جانب سے اظہار اطاعت کے طور پر ایک خوبصورت سفید گھوڑا، جس کی قیمت پندرہ ہزار روپے تھی اور نام غریب تھا، شاہ کو پیش کیا۔ اس تحفے سے خوش ہوکر شاہ نے اسے فرزند خاں کا خطاب عطا کیا۔ احمد شاہ نے بدستور شاہ رخ کو خراسان کا حاکم رہنے دیا۔

☆☆☆

انگریزوں نے میر قاسم کو معزول کردیا اور سابقہ نواب میر جعفر کو بنگال، بہار، اڑیسہ کی صوبے داری پر بحال کردیا تھا۔

میر قاسم کو بکسر کی لڑائی میں شکست دینے کے بعد انگریز صوبہ بنگالہ پر پوری طرح قابض ہوچکے تھے۔ شجاع الدولہ کے ہتھیار ڈال دینے سے اودھ بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے رحم و کرم پر رہ گیا تھا اور مغل بادشاہ کو سائل کی حیثیت سے انگریزی کیمپ میں جانا پڑا۔ شاہ عالم سے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی حاصل کر کے انگریز سوداگر اس علاقے کے حکمران بن گئے اور ان کا ہندوستان پر حکومت کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہونے لگا۔

میر قاسم مسلسل کوشش میں لگا ہوا تھا کہ انگریزوں کا زور توڑ سکے۔ اس مقصد کے لیے وہ انگریزوں کے خلاف ہندوستانی والیان ریاست کا اتحاد قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے مرہٹوں اور سکھوں سے بھی خط و کتابت کی تھی لیکن کوئی اس کی مدد کو نہ آیا۔ اب اس کی آخری امید احمد شاہ سے وابستہ تھی لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ احمد شاہ ان دنوں افغانستان کے معاملات میں الجھا ہوا ہے۔ اس کے باوجود اس نے احمد شاہ کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔

احمد شاہ نے ہندوستان کے حالات دیکھتے ہوئے ہندوستان کے مشرقی علاقے میں کسی فوجی مہم کو خلاف مصلحت سمجھا خصوصاً اس حالت میں کہ درمیانی علاقے میں چار سو میل تک سکھ جیسے خطرناک حریفوں کا سامنا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی صحت بھی اب اس قابل نہیں رہی تھی کہ یہ صعوبت برداشت کرتا۔ بے دریغ فوجی مہمات نے اس کے مضبوط قویٰ کو وقت سے پہلے متاثر کردیا تھا۔ اسے ذیابیطس کا مرض بھی لاحق ہوگیا تھا۔ پھر اس کی ناک پر ایک پھنسی نکلی جو بڑھ کر پھوڑے کی شکل اختیار کرگئی اور وہ زخم اب پورے چہرے پر پھیلتا جارہا تھا۔ شاہی اطبا علاج کر کر کے تھک چکے تھے لیکن کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اس میں اتنی سوزش ہونے لگی کہ شاہ کو کسی پہلو قرار نہ آتا تھا۔

تکلیف اتنی بڑھ گئی تھی کہ اب اسے اپنی زندگی کی امید بھی نہیں رہی تھی۔ اگر زندگی باقی بھی رہتی تو اس پھوڑے نے اس کے چہرے کو بدہیت کردیا تھا۔ اس نے افغان سرداروں کو طلب کیا اور ان کے سامنے اپنے جانشین کے نام کا اعلان کردیا۔ یہ نام شہزادہ تیمور کا تھا جبکہ بڑا بیٹا سلیمان مرزا تھا۔ سرداروں نے اس کے حق میں آواز اٹھائی۔ ''یہ سراسر غیر منصفانہ انتخاب ہے۔ جانشینی کا حق بڑے بیٹے کا ہوتا ہے۔ سلیمان مرزا یہاں موجود نہیں لیکن ہم تو سمجھتے ہیں کہ یہ حق اسے ملنا چاہیے۔''

احمد شاہ نے جواب دیا ''میں نے تیمور کا انتخاب ذاتی پسندیدگی کی بنا پر نہیں کیا بلکہ مفاد عامہ کے خیال سے کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تیمور، سلیمان سے چھوٹا ہے لیکن وہ حکومت کا زیادہ اہل ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ سلیمان افغانوں کا اعتماد حاصل کرنے میں ناکام رہا ہے؟ کیا آپ اس بات سے انکار

کر سکتے ہیں، وہ تشدد پسند ہے اور رحم دلی اسے چھو کر نہیں گزری۔ کیا آپ کو یہ علم نہیں کہ وہ آج تک نہ بروقت کسی بغاوت کا پتا چلا سکا اور نہ اسے فرو کر سکا۔''

سردار اس کے دلائل سے مطمئن ہو گئے۔

1772ء کے موسم گرما میں شاہ کے مرض نے شدت اختیار کر لی۔ اس کی ناک کا ناسور، اس کی جان کا ناسور بنا ہوا تھا۔ جوگی، پنڈت، طبیب سب آزما کر دیکھ لیے لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ مایوسی اتنی بڑھی کہ اس نے قندھار کا محل چھوڑ دیا۔ اس نے قندھار سے نوے میل دور کوہ سلیمان میں ایک محل تعمیر کرایا تھا، وہاں منتقل ہو گیا تا کہ عام لوگوں کو اس کی بیماری کا علم نہ ہو سکے۔

شہزادہ تیمور ہرات میں تھا جب اس نے باپ کی بیماری کے بارے میں سنا۔ وہ فوراً قندھار پہنچا اور وہاں سے کوہ سلیمان آیا۔

شاہ ولی خان کو معلوم تھا کہ شہزادہ اپنے باپ سے ملنے ضرور آئے گا۔ وہ شہزادے سے چشمک رکھتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ شاہ کا تخت اسے ملے۔ شاہ جب سے کوہ سلیمان آیا تھا، شاہ ولی خان برابر اسے تیمور کی طرف سے بھڑکا رہا تھا۔ بادشاہ کے اتنے کان بھرے کہ وہ تیمور کی طرف سے متنفر ہو گیا چنانچہ جب معلوم ہوا کہ... تیمور اس سے ملاقات کے لیے آیا ہے تو شاہ نے حکم جاری کیا۔ ''شاہزادہ فوراً واپس چلا جائے۔''

شہزادے نے بہت التجا کی لیکن شاہ ولی خان کا جادو چل چکا تھا۔ بدنصیب تیمور باپ کی شکل دیکھے بغیر ہرات لوٹ گیا۔ شاہ نے کہہ دیا کہ اس کے مرنے کے بعد سلیمان مرزا کی بادشاہت کا اعلان کیا جائے۔

اس دن کے بعد سے شاہ کی حالت روز بہ روز بگڑتی چلی گئی۔ رفتہ رفتہ اس کی زبان لڑکھڑانے لگی اور الفاظ اس طرح خلط ملط ہونے لگے کہ وہ بولتا اور سمجھنے والے سمجھنے کی کوشش کرتے کہ وہ کیا بول رہا ہے۔ اس کے بعد یہ حالت بھی نہیں رہی۔ قوتِ گویائی بالکل ہی سلب ہو گئی۔ اب وہ اشاروں سے گفتگو کرنے لگا تھا جسے اس کا خادمِ خاص یاقوت خان ہی کچھ سمجھ لیا کرتا تھا۔ بعض اشارے اس کی سمجھ میں بھی نہ آتے تو بادشاہ مایوسی سے آنکھیں بند کر کے کسی سوچ میں گم ہو جاتا۔ شاید وہ یہ سوچتا ہو گا کہ پہاڑوں کو لرزا دینے والا یہ آہنی بدن کتنا بے بس ہو گیا ہے۔

آخر اسی عالمِ بے چارگی میں وہ 23 اکتوبر 1772ء کی رات اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف پچاس سال تھی۔ اس کے کارناموں کو دیکھتے ہوئے یہ عمر کتنی کم لگتی ہے۔

یاقوت خان نے جو شاہ کا خادمِ خاص تھا اس کی موت کو اخفا... رکھا اور شہزادہ تیمور کو مطلع کیا کہ قندھار آ کر تخت و تاج سنبھالے۔

اس کے بعد وہ بادشاہ کے جسدِ خاکی کو لے کر قندھار روانہ ہوا۔ اس نے شاہ کو ایک چارپائی پر لٹایا اور یہ مشہور کر دیا کہ شدید علالت کے باعث بادشاہ نے لوگوں سے ملنا جلنا بند کر دیا ہے۔ چارپائی کے گرد پردے کھینچ دیے گئے تا کہ کوئی شخص شاہ کی نعش کو نہ دیکھ سکے۔

یاقوت خان دن میں کئی بار اس انداز سے پردے کے پیچھے جاتا گویا وہ اپنے آقا سے احکامات لینے یا اسے کھانے پینے کی کوئی چیز پہنچانے جا رہا ہے۔ بادشاہ کا خزانہ بھی وہ اپنے ساتھ لے آیا تھا جو بہت سے خچروں پر لدا ہوا تھا۔

اس سفر کے دوران کسی کو بھی حقیقتِ حال کا پتا نہ چل سکا لیکن جب قندھار ایک منزل دور رہ گیا اور سلیمان مرزا باپ کے استقبال کو آیا اور اس نے باپ سے بات کرنے کے لیے پردے کے پیچھے جھانکنا چاہا تو یاقوت خان اسے نہ روک سکا۔ مزید اخفائے راز ممکن نہ ہو سکا۔ یاقوت خان کو بتانا پڑا کہ احمد شاہ درانی اب اس دنیا میں نہیں رہا۔

احمد شاہ درانی کو قندھار کے مغربی حصے میں دفن کیا گیا۔ اس کی قبر پر یہ کتبہ کندہ ہے۔

''احمد شاہ درانی ایک عظیم بادشاہ تھا۔ اس کے انصاف کا یہ عالم تھا کہ اس کی قلمرو میں شیر اور ہرن ایک ساتھ رہتے تھے۔ اس کے دشمنوں کے کان اس کی فتوحات سے بہرے ہو گئے تھے۔''

احمد شاہ نے تیمور کو جانشین نامزد کیا تھا لیکن وزیرِ اعظم شاہ ولی خان نے قندھار میں اپنے داماد سلیمان کی بادشاہت کا اعلان کر دیا مگر تیمور فتح یاب ہو کر قندھار میں داخل ہوا اور تخت پر قبضہ کر لیا۔ شاہ ولی خان اور اس کے حواریوں کو تہ تیغ کر دیے گئے۔ قندھار کے عوام نے سلیمان کی تخت نشینی کی حمایت کی تھی۔ ان کے باغیانہ رویے کے پیشِ نظر وہ دارالخلافہ قندھار سے کامل لے گیا۔

اس نے بیس سال تک کامیابی سے حکومت کی لیکن اس کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے اگلے پچیس سالوں تک باہمی سازشوں اور لڑائیوں میں مصروف رہے۔ اس خلفشار میں افغان سلطنت زوال پذیر ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

ماخذات: احمد شاہ درانی از گنڈا سنگھ
نادر شاہ مترجم طاہر منصور غاروقی

فسوں گر

ابنِ کبیر

دشتِ ملامت کی کڑی دھوپ میں وہ شعلہ' اظہار لے کر نکلا اور یہ بھول گیا کہ جو حق کے طلبگار ہوتے ہیں بس وہی گناہ گار ٹھہرائے جاتے ہیں۔ پھر بھی وہ آندھیوں میں گھرے پنچھی کی طرح اندھی رفتار سے محوِ پرواز رہا اور بالآخر اس کا صلہ نوبل پرائز کی شکل میں اسے مل گیا۔

ایک عالمی شہرت یافتہ ادیب کا زندگی نامہ

قاہرہ کے ایک بڑے اسپتال کے کمرے میں 6 دسمبر 1911ء کی اس یخ بستہ دوپہر میں مصر کے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے مغربی لباس میں ملبوس شخص نے بستر پر دراز اپنی بیوی کا ہاتھ تھام رکھا تھا، بیوی کے چہرے کی رنگت نقاہت کی عکاس تھی۔ چند گھنٹے قبل ہی اُس نے ایک بچے کو جنم دیا تھا۔ پورے دس برس بعد وہ اس محل سے گزری تھی۔

قدامت پسند سوچ رکھنے والے دونوں میاں بیوی خوش تھے کہ خدا نے انہیں ایک اور بیٹا نوازا ہے جو بڑھاپے میں اُن کا سہارا بنے گا۔

''اب ہمارا خاندان مکمل ہو گیا۔'' اُس شخص نے محبت سے اپنی بیوی کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔ اُس کی نظریں اُس نومولود پر ٹکی تھیں، جو پاس ہی ایک پنگوڑے میں لیٹا تھا۔

''کوئی نام سوچا پاشا؟'' عورت نے اپنے مجازی خدا کی جانب دیکھا، جو ایک سرکاری ملازم تھا، اور اُس وقت کسی

نیل کی ارض مرتفع اور زراعت کے قابل اراضی پر پھیلے قدیم پتھروں پر کندہ کاری کے جو نمونے ملتے ہیں، وہ قبل از تاریخ کے مصر کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ یہ اب سے پندرہ ہزار قبل کی بات ہے، جب انسان نے پتھر سے اوزار بنانے سیکھے۔ ''اسٹون ایج'' کا درمیانی حصہ جسے درمیان حجری (Mesolithic) کہا جاتا ہے، میں شکار اور ہائی گیری کے کلچر پر زرعی کلچر کا غلبہ ظاہر ہونے لگا تھا، جس نے بدلتے موسم کی مدد سے 8000 قبل مسیح میں مصری زمین کو صحرا کی شکل دینی شروع کی۔ اُس زمانے میں مختلف قبائل نے نیل کے گرد آباد ہونا شروع کیا، اور وہاں زرعی معاشروں کی داغ بیل ڈالی، جس کی بدولت اس زمین نے آگے چل کر تہذیب کا گہوارہ بننے کا اعزاز حاصل کیا!

وقت گزرتا رہا اور جس کی بہتر تفہیم کے لیے آج کا انسان اُسے مختلف ادوار میں تقسیم کرتا ہے۔ نیل کے مغربی کنارے کے قبیلے ''نقادا'' سے، جو قدیم مصر میں ''تبت'' کہلاتا تھا، ملنے والے مٹی کے برتن اور مرتبانوں پر نقش تصویری تحریروں سے قبل از تاریخ کے مصر کی بابت معلومات ملتی ہے۔ الغرض موجودہ مصر کی جڑیں قبل از تاریخ تک پھیلی ہوئی ہیں۔

پہلے فرعون تصور کیے جانے والے ''مینس'' نے تین ہزار سال قبل مسیح میں اِس سرزمین پر ایک متحد ریاست کی بنیاد رکھی۔ اِسی خاندان کے طاقت ور حکمراں آنے والے تین ہزار سال تک۔ سیاہ و سفید کے مالک رہے۔ ان ہی برسوں میں مصر کی ثقافت پروان چڑھی، اور اُس کی شناخت بنی۔ شاہی سلسلے کے ابتدائی دو فرعونوں کا زمانہ جو اندازاً 2700 سے 2200 قبل از مسیح کا درمیانی حصہ ہے، آج اہرام کی وجہ سے تاریخ انسانی میں خاص مقام کا حامل ہے۔ سولہویں صدی قبل از مسیح سے گیارہویں صدی قبل مسیح کا زمانہ تاریخ میں ایک نئی مملکت کے قیام کا زمانہ ہے، جس کا آغاز اخناتون فرعون کے وقت سے ہوتا ہے۔ اُس زمانے میں مصر نے ''سپر پاور'' کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔

تیسواں فرعون وہ بدنصیب انسان تھا، جسے اِس وسیع ریاست کا زوال دیکھنا پڑا۔ 343 قبل از مسیح میں اِس سرزمین پر پیدا ہونے والے ''نیکتانیبو دوم'' نے جنگ میں شکست کھائی، اور یہ ریاست فارس کے زیر تسلط آ گئی۔ بعد میں رومنوں نے بھی اِس پر

گہری سوچ میں گم تھا۔

چند ساعت خاموشی چھائی رہی۔ گرد کا بگولا کمرے کی کھڑکی پر دستک دے رہا تھا۔ پھر شوہر نے ایک گہرا سانس لیا۔ اُس کے لب وا ہوئے۔ ''اپنے بیٹے کا نام ہم مصر کے معروف گائنا کالوجسٹ، نجیب باشا محفوظ کے نام پر رکھیں گے، جس کے زیر نگرانی ہمارے لختِ جگر کی پیدائش ہوئی۔ بے شک، زچگی کے معاملات میں نمایاں ترین طبی خدمات انجام دینے والا یہ طبیب ہمارا ہیرو ہے!''

جواب میں مصری حُسن سے مالا مال اُس عورت کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ اُس نے انگڑائی لیتے اپنے بیٹے کو دیکھا اور کہا۔ ''ہاں، آج ہمارا خاندان مکمل ہو گیا!''

اِس گنجان شہر کا شمار عرب دنیا اور براعظم افریقا کے بڑے شہروں میں ہوتا تھا۔ قاہرہ اس وقت بھی اپنی قدامت اور خوبصورتی کی وجہ سے دور دور تک مشہور تھا اور اِسے اسلامی فنِ تعمیر کے شان دار نمونوں کے سبب 'میناروں کا شہر' کہا جاتا تھا۔ دسویں صدی میں قاہرہ کے باقاعدہ قیام سے قبل وہ زمین جس پر موجودہ شہر آباد ہے، مملکت میں مرکزی اہمیت کا حامل تھا، جس کے واضح نشانات آج بھی یادگاروں سے بھرے پڑے پرانے قاہرہ میں ملتے ہیں۔ اسی قاہرہ سے اس نومولود نجیب نے بڑے ہو کر شہرت حاصل کی۔

پانچ بھائی اور دو بہنوں میں نجیب سب سے چھوٹا تھا۔ وہ سب کا لاڈلا تھا، شرارتوں میں تو پیش پیش رہتا۔ قاہرہ کے گمالیہ کوارٹرز میں اُس کے ابتدائی ایام کٹے، وہاں کی گلیوں میں وہ دوڑتا بھاگتا تھا، اپنے ہم جولیوں کے ساتھ تفریح کے نئے نئے مواقع تلاش کرتا تھا۔ دوپہر کا بڑا حصہ اِسی سرگرمی میں صرف ہوتا تھا۔ اور جب اُس کی ماں کو پتا چلتا کہ ''ننھا'' گھر سے غائب ہے تو اپنے بچوں کو خوب جھڑکیاں سناتی۔

''اپنے چھوٹے بھائی کا دھیان رکھا کرو!'' یہ کہہ کر وہ گھریلو خاتون خود محلے میں نکل جاتی۔ تھوڑی تلاش کے بعد وہ بالآخر اپنے لاڈلے کو مٹی کے گھروندے بناتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیتی۔ پہلے سوچتی کے سزا کے طور پر ایک تھپڑ رسید کر دے، پھر اُس کی معصوم آنکھیں دیکھ کر پیار آ جاتا۔

نجیب کی پیدائش کے تیرہ برس بعد اُس کا خاندان گمالیہ سے مصر کے ایک اور مشہور اور گنجان علاقے العباسیہ میں جا بسا۔ اِن علاقوں کی بود و باش نے نجیب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

اُس کے والد ایک سول سرونٹ اور قدامت پسند انسان تھے، روایات کو خصوصی اہمیت دیتے تھے۔ نجیب نے ایک معاملے میں تو اُن کی پیروی کی یعنی پیشہ ورانہ سفر میں اُس نے بھی سرکاری ملازمت کا چناؤ کیا تاہم دیگر معاملات میں وہ

چڑھائی کی۔ دو ہزار برس تک غیر ملکی حکمراں اس مملکت کے سیاہ و سفید کے مالک بنے رہے۔ بازنطینیوں کے زیر تسلط آنے سے قبل، پہلی صدی میں حضرت عیسیٰ کے حواری خاص مرقس نے مصر کو عیسائیت سے روشناس کروایا۔

639 عیسوی تک بازنطینی اس سرزمین کے حکمراں تھے۔ پھر عرب کی سرزمین سے مسلمانوں کے لشکروں نے مصر پر چڑھائی کر دی اور یوں اسلام اِس ریاست میں داخل ہو گیا۔

اگلی چھ صدیوں تک مسلمانوں نے اِس ریاست پر حکومت کی، اور خلیفہ کے الفاظ کو حکم کا درجہ حاصل رہا۔ 1517 میں ترکوں نے اسے تسخیر کر لیا، اور یوں سلطنت عثمانیہ کا حصہ بن گیا۔ اُس صدی میں طاعون کی صورت ''سیاہ موت'' نے دنیا کے بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ مصر بھی اُس کی زد میں آیا، اور چالیس فی صد آبادی اُس عفریت کی نذر ہو گئی۔

پندرہویں صدی کے اواخر میں عثمانی حکومت کے اقدامات حالات میں بگاڑ کا سبب بننے لگے۔ عوام متنفر ہو گئے اور معاشی و سماجی ادارے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے۔ غیر ملکی تاجروں نے رختِ سفر باندھ لیا، زراعت تباہ ہو گئی۔ 1687 سے 1731 کے درمیان چھ قحط آئے۔ 1784 کے قحط نے ریاست کی بڑی آبادی کو نگل لیا۔

1798 میں نپولین بوناپارٹ کی سربراہی میں فرانسیسیوں نے مصر پر حملے شروع کیے۔ حالات میں تیزی سے بگاڑ آتا گیا۔ اُسی زمانے میں ترک فوج کی البانوی رجمنٹ کا کمانڈر محمد علی پاشا اُبھر کر سامنے آیا۔ استنبول میں بیٹھے سلطان نے اُسے مصر میں اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ یہ ظاہر تو مصر پر حکومت کرنے والا کارندہ سلطان کے زیر اثر تھا، لیکن حقیقت یہ تھی کہ استنبول کی گرفت کم زور ہوتی جا رہی تھی، اور بالآخر محمد علی نے مصر پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ اور اِسی خاندان کے دورِ حکومت میں، جب مصر برطانوی سامراج کے زیر اثر تھا، جدید عربی ادب کو بین الاقوامی دنیا میں متعارف کروانے والا تخلیق کار پیدا ہوا، جس کی علمیت کے سامنے مغرب کا تعصب نہ ٹھہر سکا، جس کے گرویدہ بنا لینے والے اسلوب نے قارئین و ناقدین کو حیرت کے وسیع سمندر میں دھکیل دیا۔ 88ء میں ادب کا نوبیل انعام حاصل کرنے والے مصر کے اِس طفلِ جلیل کا نام نجیب محفوظ تھا!

روایت شکن ثابت ہوا!

گھر کا ماحول مذہبی تھا جس میں جبر کا عنصر بھی جھلکتا تھا۔ اُسی ماحول میں مستقبل کے اِس عظیم فن کار کی تربیت ہوئی۔ بعد کی زندگی میں وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ اتنے جبر میں اُس میں موجود تخلیقی عنصر بھلا کیوں کر محفوظ رہا۔ صرف اس لیے کہ اسے بچپن ہی میں مطالعے کی لت پڑ گئی تھی!

''امّاں، مجھے کچھ پیسے چاہئیں۔'' ننھا نجیب اکثر اپنی والدہ کا حیاء کھینچ کر اُسے متوجہ کرتا۔ جب جواب میں وہ اُسے ڈانٹتی تو وہ منہ بسورتا، ناراضی کا اظہار کرتا لیکن وہیں کھڑا رہتا۔ بالآخر ماں کا دل پسیج جاتا اور نجیب چند سکّے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا پھر وہ اپنے بہن بھائیوں کی جانب رخ کرتا، جہاں سے منت سماجت کے بعد مزید سکّے حاصل ہو جاتے۔ تب وہ خوشی خوشی بازار کی جانب بڑھ جاتا جہاں پرانی کتابوں کی ایک بڑی دکان تھی۔

اُسے کتابوں سے عشق تھا۔ کلاسیکی ادب اُس کا بنیادی موضوع تھا، وہ مغربی لٹریچر سے بھی جڑا رہتا۔ جب بھی قاہرہ کی پُرہجوم گلیوں میں گھٹنے والے سستی کتابوں کے اسٹالوں سے مغربی ادب کا کوئی ترجمہ اس کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ اسے لے کر گھر کے کسی کونے میں جا بیٹھتا۔

معلومات حاصل کرنے کا شوق دیکھ کر ماں اسے میوزیم لے جانے لگی، جہاں قدیم آثار و ادرات اُسے ششدر کر دیتے۔ وہ ان میں گہری دلچسپی لیتا اور اس بابت سنجیدگی سے معلومات حاصل کرتا۔ اس موضوع میں اس کا شوق پروان چڑھتا گیا۔

گو کہ وہ مذہبی ماحول میں پروان چڑھا تاہم اُس کے والد نے کبھی اُس پر مسجد جانے کے لیے زور نہیں ڈالا۔ وہ بھی ایک آزاد منش بچہ تھا اور آزادی کی راہ میں آنے والی رکاوٹوں سے پریشان ہو جاتا تھا۔ اسی آزادی نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ مذہب میں آزادی کا عنصر اور لچک موجود ہے مگر لوگ اسے سمجھ نہیں سکے یا شاید نہ سمجھنے کا ناٹک کرتے ہیں۔ وہ اکثر سوچتا کہ اس رویّے کا کیا سبب ہے لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملتا۔

پڑھنے لکھنے کے شوقین کم سن نجیب کو کئی لوگوں نے متاثر کیا۔ آغاز میں اُسے حافظ نجیب کے کام نے گرویدہ بنا لیا۔ بائیس کے قریب ناول لکھنے والے اس ادیب نے نجیب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ وہ اسکول کے زمانے میں حافظ نجیب کی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔

مطالعاتی سفر آگے بڑھا تو خیالات میں پختگی آتی گئی۔ ہائی اسکول کے زمانے میں طٰہٰ حسین اُس کے ذہن پر حاوی رہا۔ عرب دنیا میں جدیدیت کی تحریک چلانے والے اس دانشور کی تحریروں نے نجیب کو خاصا متاثر کیا۔ کالج کے

زمانے میں نجیب سلامہ موسیٰ کی تحریروں میں گم رہا۔ سلامہ "المجلہ" اور "الجدید" جیسے معروف جریدوں کے مدیر تھے۔

☆☆☆

کم سن نجیب یہ نہیں جانتا تھا کہ آنے والے برسوں میں وہ بھی مرکزِ نگاہ بن جائے گا۔ وہ تو اس بابت بھی لاعلم تھا کہ 52ء میں اُس کا ملک انقلاب کے تجربے سے گزرے گا، مستقبل میں وہ گلوبلائزیشن کا ذائقہ چکھے گا، اور اپنی موت سے قبل 9/11 کے بعد کی دنیا میں بھی سانس لے گا۔

مصر میں آنے والے 1919ء کے انقلاب نے نجیب کی شخصیت اور سوچ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ مصر اور سوڈان پر برطانوی تسلط کے خلاف شروع ہونے والی اس تحریک نے پوری ریاست کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس تحریک میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے مصریوں اور سوڈانیوں نے بھرپور حصہ لیا تھا۔ "وفد پارٹی" کے انقلابی قائد سعد زغلول اور دیگر ارکان کی جلاوطنی کے حکم نے عوام کو غم و غصے سے بھر دیا تھا اور وہ سڑکوں پر نکل آئے تھے۔

اسی تحریک کے نتیجے میں 1922ء میں برطانیہ کی جانب سے مصر کے لیے یک رخی آزادی کا اعلان کرتے ہوئے 1923ء میں نئے آئین کا اطلاق کر دیا گیا لیکن برطانیہ نے سوئز کنال کے علاقے سے اپنی فوج واپس بلوانے اور مصر کی سوڈان پر مکمل اختیاری شناخت لوٹانے سے انکار کر دیا تھا۔ اسی سبب برطانیہ اور مصر کے رشتے میں تلخی برقرار رہی جس کا نتیجہ 1952ء کے انقلاب کی صورت سامنے آیا۔

1919ء کی انقلابی تحریک کے وقت گو کہ نجیب سات سالہ بچہ تھا، تاہم مشاہدات اُس کے ذہن میں زرخیز بیج بو رہے تھے۔ اپنے گھر کی کھڑکی میں بیٹھ کر اس نے مظاہرین کے خلاف برطانوی فوجیوں کو لاٹھی چارج کرتے، تشدد کرتے، یہاں تک کہ اندھا دھند فائرنگ کرتے بھی دیکھا۔ بعد کے زمانے میں اُس نے خود بھی یہ تسلیم کیا کہ 1919ء کے انقلاب نے اُس کے بچپن کو شدید متاثر کیا۔ وہ اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا، "میں اُس تحریک سے نہ صرف متاثر ہوا، بلکہ اُس سے جذباتی طور پر وابستہ ہو گیا۔ جس شخص کو بھی میں جانتا تھا وہ معتدل مزاج سیاسی جماعت وفد پارٹی کا سپورٹر تھا اور برطانوی نوآبادیاتی نظام سے آزادی چاہتا تھا۔"

نجیب وفد پارٹی کے مرکزی قائد سعد زغلول کا حمایتی تھا۔ اُس سرگرمی کو وہ اپنی زیست کی اہم ترین کاوش تصور کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ سیاست سے جڑا رہا لیکن کبھی باقاعدہ کسی گروہ یا جماعت کا رکن نہیں بنا۔ دراصل ایک نکھاری کی حیثیت سے وہ مکمل آزادی کا خواہش مند تھا۔ وہ اکثر خود سے کہا کرتا تھا "اگر میں کسی جماعت سے وابستہ ہو گیا، تو محدود ہو جاؤں گا۔"

☆☆☆

ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ شاہ فواد یونیورسٹی کا حصہ بن گیا جو اب قاہرہ یونیورسٹی کے نام سے جانی جاتی ہے۔ نوجوان نجیب کا مضمون فلسفہ تھا۔ اس موقعے پر نجیب کو نظر کو سمجھنے کا نیا زاویہ ملا۔ 1934ء میں اُس نے گریجویشن کی سند حاصل کی۔

وہیں اُس کی لیلیٰ زیدان سے ملاقات ہوئی جو نجیب سے فلسفیانہ موضوعات پر خوب مباحثے کرتی تھی۔ اُس سندری کی آنکھیں گہری اور سیاہ تھیں۔

دونوں کا مشترکہ دوست احمد زکی اکثر اُسے ٹہوکے دیتے ہوئے کہتا "سنبھل کر جناب، کہیں یہ ناگن آپ کی تپسیا نہ توڑ دے!"

جواب میں نجیب مسکرا دیتا۔

گو کہ اُس نے سترہ سال کی عمر میں لکھنا شروع کر دیا تھا لیکن ادب کی دنیا میں قدم رکھنا کسی طور آسان نہیں تھا۔ اس کے لیے بڑی قربانی کی ضرورت تھی کہ ادیبوں کے لیے مالی استحکام کا حصول اس زمانے میں انتہائی مشکل تھا۔ نجیب نے خاصا وقت سوچ بچار میں صرف کیا اور بالآخر فیصلہ لے لیا۔

حالانکہ لیسلی نے اُسے خاصا سمجھایا۔ "کہاں کا رخ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں جناب! ادبی دنیا؟ بھئی وہاں تو جل دھرنے کو جگہ نہیں، بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دیتی ہیں۔ میرا تو یہی مشورہ ہے کہ ادبی حلقوں سے اپنی شناخت کو محفوظ ہی رکھو۔"

"اور تم سے۔۔۔؟" نجیب اُس کی آنکھوں میں جھانکتا تو وہ جھینپ کر اسے پیچھے دھکیل دیتی۔

اب وہ کہانیاں لکھنے لگا تھا مگر 1929ء تک اُس کی کہانیوں کو مسترد کیا جاتا رہا۔ "المجلہ" کے ایڈیٹر سلامہ موسیٰ سے نجیب کی ملاقات رہتی تھی جسے اس نوجوان میں بہت صلاحیت نظر آتی تھی۔ سلامہ اکثر نجیب سے کہا کرتا تھا، نوجوان تم میں قابلیت ہے مگر ابھی تمہیں مزید محنت کرنی ہوگی!

سلامہ موسیٰ نے نجیب کو تحریر بہتر کرنے کے لیے کئی مفید مشورے دیے جس کے بعد اس نوجوان نے موضوعات کے چناؤ میں خاص احتیاط برتنی شروع کر دی۔

ستمبر 1939ء میں جب دوسری جنگِ عظیم کے سیاہ بادل دنیا پر چھا چکے تھے، نوجوان نجیب کو ایک تحفہ ملا۔ اُس کی کہانی

"عبث الاقدار" شائع ہو گئی تھی۔ اُس وقت وہ انتہائی مسرور تھا۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن یہی کام اس کی روزی روٹی بن جائے گا۔ پہلی تحریر کی اشاعت ایک بڑی کامیابی تھی مگر ابھی طویل سفر باقی تھا۔

کہانی کی اشاعت کے بعد نجیب کا ایک دوست جو خود بھی ایک لکھاری تھا، اُس سے ملنے آیا۔

"واہ میرے عزیز، شان دار!" اُس نے بغل گیر ہوتے ہوئے نجیب کو مبارک باد دی۔ پھر اُسے اپنے بھائی کی بابت بتایا، جو ایک پرنٹنگ پریس سے وابستہ تھا۔ اُس نے مصنفین کی ایک چھوٹی سے تنظیم بنا رکھی تھی۔ اندھے کو کیا چاہیے، دو آنکھیں! نجیب اُس گروہ کی نشستوں میں شرکت کرنے لگا۔ ان نشستوں کا اس پر بہت اثر پڑا۔ اس کی تحریروں کی اشاعت میں تسلسل آ گیا۔ یوں 1943ء کے بعد اس فن کار نے مصر کے ادبی حلقوں میں شناخت حاصل کر لی۔

نجیب کو ابتدائی آٹھ کہانیوں کا کوئی معاوضہ نہیں ملا تھا مگر اسے اس بات کا غم نہیں تھا، وہ مسرور تھا کہ دھیرے دھیرے وہ ادبی دنیا میں قدم جما رہا ہے۔ کبھی کبھار وہ سوچا کرتا تھا کہ کیا فقط ادب سے حاصل ہونے والی آمدنی سے گزر بسر ہو سکتی ہے اور کیا وہ ایک دن اس قابل ہو جائے گا؟ پھر وہ اپنی سوچ پر مسکرا دیتا۔

وہ سائنس اور سوشل ازم کی جانب مائل تھا۔ اس ضمن میں سلامہ موسیٰ کی فکر نے اُسے متاثر کیا تھا۔

دراصل 1884ء میں لندن میں ایک ایسی اشتراکی سوسائٹی کی بنیاد رکھی گئی تھی جو معتدل اشتراکیت پر یقین رکھتی تھی اور ایسی تبدیلی کی حامی تھی جو کسی انقلابی اقدام کے بغیر بہ تدریج رواج پذیر ہو۔ 1887ء میں پیدا ہونے والا سلامہ موسیٰ اُس سوسائٹی کا حصہ رہا۔ سلامہ کو بیسویں صدی کے اوائل میں مصر میں بہ طور صحافی اور مصلح اہم مقام حاصل تھا۔ ایک عیسائی گھرانے میں پیدا ہونے والے موسیٰ کو سائنس اور ثقافت میں گہری دلچسپی تھی، انسانی فلاح و بہبود اور انسانی ترقی کے لیے اُس کے پیش کردہ نظریات چند حلقوں میں قابلِ تعریف اور چند میں متنازع تصور کیے جاتے تھے۔ سلامہ کا تعلق دانشوروں کے اس طبقے سے تھا جو عربی اور اس کی گرامر کی سادہ کاری کے حامی تھے اور مصر میں بولی جانے والی عربی کو جدید مصر کی سرکاری زبان کا درجہ دلوانے کے لیے سرگرم تھے۔

ایک دن نوجوان نجیب نے اس دانشور سے انتہائی احترام کے ساتھ سوال کیا، "جناب اپنی اس تحریک پر مجھ جیسے کم علم کے لیے کچھ روشنی ڈالیں۔"

سلامہ مسکرایا۔ "نوجوان، تم بہت ترقی کرو گے۔ خیر، سنو۔ معاملہ یہ ہے کہ عربی زبان صدیوں سے یکساں ہے اور مصر کا بڑا طبقہ ناخواندہ ہے۔ یہ دو عوامل مجھے اور دیگر مفکرین کو اس بات پر متحرک کرتے ہیں کہ ہم عام فہم زبان لکھنے کے خیال کی وکالت کریں۔"

موسیٰ نے سگریٹ کا گہرا کش لیا۔ نجیب ہمہ تن گوش تھا۔ اُس نے مزید کہا، "اس ضمن میں ہمیں شدید تنقید کا بھی سامنا رہا اور یاد رکھو، اگر تم اپنے خیالات کا بے لاگ اظہار کرنے کے خواہش مند ہو تو تنقید اور مخالفت کے لیے تیار رہو۔"

اس دانشور کی فکر نے نجیب کو نئی راہ سجھائی۔

سلامہ موسیٰ ہی نے نجیب محفوظ کا پہلا ناول شائع کیا۔ نجیب کو اُس کی صحبت میں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ وہ خود سوچتا تھا کہ اِس شخص کے طفیل اُس کا سائنس، سوشل ازم اور برداشت کے فلسفے پر... یقین پختہ ہوا ہے۔

اب اُس نے پیشہ ور رائٹر کی حیثیت سے صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ اور اس کی تحریریں "الاہرام"، "الہلال" اور "الرسالہ" جیسے مقبول اخبارات و رسائل میں شائع ہونے لگیں۔

☆☆☆

اُس زمانے میں دنیا کے دیگر ترقی پذیر ممالک کی طرح مصری ادیبوں کے لیے بھی دنیاوی آسائشوں کا حصول جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ بے چارے ادیب ملازمتیں کرتے اور اپنا گھر چلاتے۔ نجیب کو معاملے کی سنگینی کا بہ خوبی اندازہ تھا سو اُس نے بھی ملازمت کرنے کا فیصلہ کیا۔

ابتدا نجیب نے وزارتِ مذہبی امور میں کیریئر بنانے کی کوشش کی لیکن جلد ہی اُسے وزارتِ ثقافت میں دھکیل دیا گیا جہاں اُس کے پاس فلم انڈسٹری کے معاملات تھے۔ وزارتِ مذہبی امور سے اُس کی علیحدگی کا بنیادی سبب اُس کے خیالات تھے۔ اُس وقت یہ بات مشہور تھی کہ وہ خدا سے انکاری ہو گیا ہے، کمیونسٹ ہے۔ اور بھی کئی الزامات لگے، الغرض جتنے منہ اتنی باتیں!

گو کہ وہ اس موضوع پر کھلے عام گفتگو کرنا پسند نہیں کرتا تھا لیکن لوگ اس کے بارے میں یہی خیال کرتے تھے، سو اعلیٰ عہدے داروں نے مناسب جانا کہ اُسے وزارتِ مذہبی امور سے علیحدہ کر دیا جائے۔

ایک دن اُس کے ایک دوست مصطفیٰ رشید نے جو فلمی گیت نگار تھا، نجیب سے سوال کیا۔ "برادر، یہ اونچی چھت

والا کمرا جو سگریٹ کے دھوئیں سے بھرپور کوئی اداس سا اسٹور روم لگتا ہے، جہاں شیلفوں میں فائلیں سکون کا مزہ لے رہی ہیں، تمہیں بور نہیں کرتا؟ دوست، تم سرکاری ملازمین تو نہایت معمولی کام بھی انتہائی سنجیدگی کے ساتھ انجام دیتے ہو؟''

نجیب نے سر اٹھا کر جواب دیا۔ ''جناب، بور تو میں تب ہوتا ہوں، جب مجھے وقت ملے۔ میں تیزی سے اپنا کام نمٹاتا ہوں۔ اس دوران نئے نئے خیالات کو بھی اپنے ذہن میں در آنے دیتا ہوں اور شام کو قلم لے کر بیٹھ جاتا ہوں، تاکہ انہیں قلم بند کر سکوں۔''

''خوب، جب تو تم خوب ترقی کرو گے!'' مصطفیٰ رشید نے قہقہہ لگایا۔

اور اُس نے سول سروس میں واقعی خوب ترقی کی، دراصل وہ جم کر کام کرنے والا شخص تھا، اس میدان میں وہ اپنے والد کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا۔ چند برس اس نے بہ طور حکومتی اہل کار زمین کے لین دین کے معاملات کی بھی دیکھ ریکھ کی۔ گو کہ یہ کام اس کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا تھا، لیکن وہ اس تجربے سے لطف اندوز ہوا۔ اس نے ڈائریکٹر سینر شپ کی حیثیت سے بیورو آف آرٹ میں طویل عرصے تک ذمے داریاں نبھائیں۔ بعد میں سنیما کی ترقی کے لیے قائم کردہ فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے معروف رہا۔ اُس زمانے میں وہ معروف روزنامے ''الاہرام'' کے معاون مدیر کی حیثیت سے بھی کام کر رہا تھا۔ ملازمت کے زمانے میں وہ رات کے اوقات میں لکھا کرتا تھا۔

1969ء میں وہ وزارتِ ثقافت سے بہ طور کنسلٹنٹ وابستہ ہوگیا، اور وہیں سے 1972ء میں ریٹائر ہوا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ادبی سرگرمیوں میں کسی نہ کسی طور شامل رہا۔ اُس نے اپنے اوقات مناسب انداز میں تقسیم کر رکھے تھے۔ صبح آٹھ سے دوپہر دو بجے تک نجیب پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں اُلجھا رہتا۔ چار بجے سے سات بجے تک وہ لکھنے میں جتا رہتا۔ اور سات سے رات دس تک وہ پڑھتا۔ یہی اُس کا شیڈول تھا، جس پر اس نے ریٹائرمنٹ کے بعد سختی سے عمل کیا، ماسوائے جمعے کے!

☆☆☆

دوسری جنگِ عظیم کے اختتام پر جب مصر کی قدیم فضا پر سناٹا طاری تھا، اس قلم کار نے ایک دن اپنے دوست احمد ذکی کو یوں مخاطب کیا۔ ''میں عجیب و غریب مقام پر کھڑا ہوں، ایک جانب مصر کی ہزاروں سالہ قدیم تاریخ ہے، جس سے میں کنواری لڑکیوں کی طرح عشق کرتا ہوں اور دوسری جانب ایٹمی دھماکے کے نتیجے میں جنم لینے والا سیاہ، مکروہ بادل جو زندگی کو تیزی سے نگل رہا ہے!''

احمد ذکی نے سگریٹ کا کثیف دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''مصر میں بھی صورتِ حال اچھی نہیں۔ سوچتا ہوں کہ اپنے سوشلسٹ نظریات سے کنارہ کشی اختیار کر لوں کیونکہ یہ سارا کھٹراگ سرمایہ داروں کا ہے جنہیں شکست دینا ممکن نہیں۔ سنو نجیب، تم خواہ رہنا، آج سے میں سوشلسٹ نہیں ہوں!'' یہ کہہ کر اُس نے آنکھ ماری اور نجیب نے قہقہہ لگایا۔

وہ اپنے ساتھی ادیبوں عدیل کامل اور احمد ذکی کے ساتھ قاہرہ کے ''چالا برج'' کے نزدیک لان میں بیٹھ کر مباحثے کرتا تھا۔ وہ گھنٹوں زندگی اور موجودہ ادبی سرگرمیوں کی بے ثباتی پر گفتگو کرتے۔ وہ اپنے اُس حلقے کو طنزاً ایک ذرا وقار اور منحوس حلقہ کہا کرتا تھا، کیوں کہ ایٹمی دھماکے کے بعد قنوطی ہوتی جا رہی تھی۔

50ء کی دہائی میں اُس نے صوفی ازم کا تجربہ کرنے کا فیصلہ کیا، وہ مابعد الطبیعیات کے اُن سوالوں کا جواب حاصل کرنا چاہتا تھا جن کا جواب سائنس دینے سے قاصر تھی۔

اُس زمانے میں شہر میں ابھرتے ہوئے ادیبوں کے اس ناپسندیدہ گروہ کا چرچا تھا جن کی بابت سن چلے نوجوان قہوہ خانوں میں طویل گفتگو کرتے اور لڑکیاں دروازوں کے پیچھے اُن کا تذکرہ کرتیں۔ اس گروہ میں نجیب کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ یہ 45-44ء کا ذکر ہے۔ دراصل اپنے ساتھی ادیبوں مصطفیٰ محمد، احمد بھابا اور محمد افیف وغیرہ کے ساتھ مل کر اُس نے ایک گروہ بنا لیا تھا جو آرٹ اور سیاسی صورتِ حال پر بحث کرتا اور روایت شکنی کی حمایت کرتا تھا۔ اس گروہ کا حلقۂ اثر پھیلتا جا رہا تھا۔ نجیب تفریحاً اُسے جتھے بازوں یا تخریب کاروں کا گروہ کہا کرتا تھا۔

معروف اداکار احمد مظہر بھی اُس گروہ کا حصہ تھا۔ ابتدا میں وہ محمد افیف کے گھر ملا کرتے تھے۔ پھر وہ غزہ کے ''ہرم'' کے نزدیک ''صحارا سٹی'' نامی ایک مقام پر نشستیں منعقد کرنے لگے۔ بعد کے زمانے میں اس گروپ کی میٹنگز فلمی ہدایت کار توفیق صالح کے ہاں ہونے لگیں۔ صالح کے دسویں منزل کے فلیٹ سے نیل کا نظارہ بہت ہی شان دار لگتا تھا جس سے نجیب خاصا محظوظ ہوتا۔ وہ نیل پر نظریں لگائے رکھتا اور خود کو بہتے پانی کا حصہ تصور کرتا۔

''پانی ساکن ہے، اُسے تکنا چھوڑ دو۔'' توفیق صالح آواز لگاتا۔

''یہاں تاریخ حرکت کرتی ہے۔'' نجیب جواب دیتا۔ اس کی نظریں نیل ہی پر ٹکی رہتیں۔

لیلیٰ زیدان جواب وزارتِ خارجہ میں مترجم تھی وہ بھی اس محفل میں شرکت کرتی جس کی آنکھیں نجیب کو نیل کے مانند تاریخی اور قدیم معلوم ہوتیں۔

گو کہ ایک زمانے میں یہ گروہ خاصا پھیل گیا تھا لیکن بعد میں مصروفیات اور نظریات کی قوت نے اسے توڑ دیا۔

☆☆☆

سیاست نے نجیب کی تحریروں پر اَن مٹ نقوش چھوڑے۔ وہ خود بھی اپنے قارئین سے کہا کرتا تھا ''میری ہر تحریر میں آپ کو سیاسی عنصر ملے گا، شاید میری کہانیاں محبت اور اس جیسے دیگر مقبول موضوعات کو نظر انداز کر دیتی ہوں لیکن میں سیاست کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔''

اس نے اپنی بیشتر تحریروں میں چاہے وہ ناول ہوں یا افسانے قوم پرستی پر بات کی۔ اور جنگِ عظیم کے بعد کے زمانے میں وفد پارٹی کے لیے خصوصی ہمدردی کا اظہار کیا۔

سوشلسٹ اور جمہوری نظریات نے نوجوانی میں اُسے خاصا متاثر کیا۔ اس کے ابتدائی ناول ''خان الخلیلی'' اور ''القاہرۃ الجدید'' میں ترقی پسند نظریات کا عکس بڑا ہی واضح دکھائی دیتا ہے۔ بعد کی تحریروں میں بھی جا بہ جا ترقی پسندی کے نشانات ملتے ہیں۔ گو کہ وہ ترقی پسند نظریات پر یقین رکھتا تھا لیکن اُس نے کبھی یہ نہیں کہا کہ وہ مارکسٹ ہے۔

ایک جانب جہاں وہ سوشلزم اور جمہوریت پر یقین رکھتا تھا، وہیں مذہبی انتہا پسندی کو بھی شدید تنقید کا نشانہ بنایا کرتا تھا۔ اپنے ابتدائی ناولوں میں اُس نے ترقی پسند نظریات کے فوائد پر روشنی ڈالی اور مذہبی انتہا پسندی کے نقصانات کا خاصہ کیا۔ وہ برابر بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی مصر کی معروف سیاسی جماعت ''الاخوان'' کو تنقید کا نشانہ بنایا کرتا۔

اس جماعت کی بنیاد 1928ء میں ایک استاد حسن البنا نے رکھی تھی جس نے تیزی سے مقبولیت حاصل کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نجیب شعور کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تھا۔ اس نے ''الاخوان'' کی ترقی کا مشاہدہ کیا، اس کی پالیسی کا تجزیہ کیا اور اس کے پروگرام کو اپنے خیالات سے متصادم پایا۔

وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اس کی نوجوانی کے زمانے میں جو طاقتیں مصر میں سرگرم تھیں، ان میں سے ''الاخوان'' اس کے لیے ناپسندیدہ ترین تھی۔

محظوظ کی نوجوانی میں سید قطب سے بھی سلام دعا رہی۔ 1906ء میں پیدا ہونے والے سید قطب نے ایک مصنف، ماہرِ تعلیم، شاعر اور مصلح کے طور پر شناخت حاصل کی۔ 50 اور 60 کی دہائی میں انہیں 'الاخوان' سے وابستہ دانشور کے طور پر جانا جانے لگا۔ انہوں نے 24 کے قریب کتابیں لکھیں جن میں ناول بھی شامل تھے۔ انہوں نے اسلام کے سماجی و سیاسی کردار کو موضوع بنایا۔

ادبی دنیا سے اپنے سفر کا آغاز کرنے والے قطب وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے 40 کی دہائی میں نجیب میں چھپا ہوا ہنر پہچانا اور اس کی حوصلہ افزائی کی۔ یہ بات دلچسپ تھی کہ نجیب کا پرانا شناسا ایک ایسی جماعت کا حصہ تھا جسے وہ سخت ناپسند کرتا تھا۔ نجیب خود بھی اس بات پر غور کرتا اور حالات کی بے ثباتی پر مسکرا دیتا۔ 60 کی دہائی میں جب قطب زیرِ علاج تھے، نجیب اُن کی عیادت کے لیے اسپتال گیا۔ 1972ء میں شائع ہونے والے اپنے ناول ''آئینے'' میں، جس کا موضوع اس کی اپنی زندگی تھی، اس نے سید قطب کی بڑی منفی تصویر پیش کی۔

☆☆☆

1952ء تک محمد علی پاشا کے خاندان نے مصر پر حکومت کی۔ سلطان گو کہ موجود تھا لیکن برطانوی سامراج میں اُس کی حیثیت کٹھ پتلی سی تھی۔ حالات انقلاب کے لیے ساز گار تھے اور 1952ء میں ایسا ہی ہوا۔ انقلاب نے مصر کے بے اختیار شاہ کو اکھاڑ پھینکا۔

جمال عبدالناصر کی تحریک پر آنے والے 1952ء کے اُس انقلابی اقدام سے نجیب خوش تھا اس تحریک نے بادشاہت کا خاتمہ کیا تھا۔ وہ پُر امید تھا اور یقین رکھتا تھا کہ اُس مشق کے نتیجے میں جمہوریت کو فروغ حاصل ہوگا لیکن نجیب کے نزدیک بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔

جلد ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوگیا اور اُس کی امیدیں دم توڑ گئیں۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اس انقلاب نے فقط تبدیلی کا واہمہ پیدا کیا تاہم تبدیلی نہیں آئی۔ 18 جون 1953ء کو جمہوری مصر کا اعلان ہوا۔ نجیب کے ہمنام جنرل محمد نجیب پہلے صدر تھے مگر ایک سال بعد ہی انقلاب میں کلیدی کردار ادا کرنے والے جمال عبدالناصر نے عہدہ سنبھال لیا۔

جمال عبدالناصر کے دور کو اس نے کبھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جس کا سبب آزادی اظہار پر عائد اُن کہی پابندیاں تھیں۔ اس زمانے میں اسے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے لوگ اب دیواروں سے بھی ڈرنے لگے ہیں۔

کبھی کبھار وہ نیل کے کنارے پر تیرتے کشتی گھروں کا رخ کرتا جہاں نوجوان حقے کی نے منہ میں لیے دنیا و مافیہا

سے بے نیاز نشے میں دھت گھنٹوں گزارتے تھے۔

''اس حقے میں کیا جادو ہے؟'' ایک دن اُس نے فلم نگری کے ایک اداکار رجب علی سے سوال کیا۔

رجب نے چند ساعت اپنی سرخ آنکھیں اُس پر لگائے رکھیں پھر پائپ آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''لفظوں کے جادو گر، اسے منہ میں دبالو اور ایک گہرا سانس لو۔ تمہیں ان تمام سوالوں سے نجات مل جائے گی جو تمہیں پریشان رکھتے ہیں۔''

نجیب نے مسکراتے ہوئے شکریہ ادا کردیا۔

اُس کا پرانا شناسا انیس سعید درمیان میں کود پڑا۔ اُس نے حقہ اپنی طرف کرلیا اور نجیب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''دوست، اس وقت ہر کوئی ڈرا ہوا ہے۔ ہم کیفے میں بیٹھتے ہیں اور آپس میں بات کرنے سے بھی اجتناب برتتے ہیں۔ کیا تمہارے ساتھ یہ معاملہ نہیں؟''

نجیب نے گہرا سانس لیا اور خشک میوہ جات کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''بے شک ہم گھروں میں بات کرنے سے ڈرتے ہیں، میں اپنے بچوں سے انقلاب سے پہلے کے حالات پر بات کرتے ہوئے اجتناب برتتا ہوں۔ سوچتا تھا کہ کہیں وہ اسکول جا کر کچھ ایسا ویسا نہ کہہ دیں جس کا غلط مطلب لیا جائے۔''

''ایسا ہی ہے!'' رجب نے نعرہ لگایا اور حقہ اپنی طرف کرلیا۔ ''بہتر ہے کہ گہرا سانس سینے میں اتار لو!''

جواب میں نجیب مسکراتا رہا۔

تبھی کشتی گھر زور سے ہلا۔

''کوئی نیا مہمان ہے۔'' انیس سعید بولا اور سب کی نظریں دروازے کی جانب اٹھ گئیں، تھکی ہوئی لیلیٰ زیدان اندر داخل ہوئی۔

رجب نے نعرہ لگایا۔ ''وصل گیا ہجر کا دن، آ بھی گئی وصل کی رات!''

لیلیٰ نجیب کو دیکھ کر کھل اٹھی تھی۔ وہ گرمجوشی سے اس سے ملی۔ حقہ لیلیٰ کے سامنے پیش کیا گیا، اس نے نجیب کو بھی دعوت دی۔ نجیب نے اس کی گہری آنکھوں کے احترام میں حقے کا پائپ تھام لیا۔ رجب انیس کو دیکھ کر آنکھ مارتا ہے کہ کشتی گھر ایک بار پھر ہچکولے کھانے لگا۔

''نیا مہمان آرہا ہے۔'' انیس نے پھر نعرہ لگایا۔

نجیب کا کئی بار کشتی گھر جانا ہوا، جہاں اس کی عجیب و غریب افراد سے ملاقات رہتی۔

انور سادات کے زمانے میں جبر میں کمی ضرور ہوئی، تاہم حالات کلی طور پر بہتر نہیں ہوئے۔ کئی برس بعد حسنی مبارک پر بھی نجیب نے تنقید کی، تاہم رویہ نرم رہا۔ وہ کہا کرتا تھا ''گو کہ اُس کا پیش کردہ آئین جمہوری نہیں، لیکن وہ نسبتاً جمہوری آدمی ہے۔ اب ہم اپنی رائے زیادہ آزادی سے پیش کرسکتے ہیں۔ میڈیا بڑی حد تک آزاد ہے۔ ہم اپنے گھروں میں بیٹھ کر آزادی سے بات کرسکتے ہیں۔''

نجیب ساری زندگی مزید تبدیلیوں کا خواہش مند رہا۔ ایسی تبدیلیاں جو ماحول سے انتہا پسندی کا خاتمہ کرسکیں۔ وہ آئین میں ترمیم کا بھی خواہش مند تھا۔

قاہرہ سے اُسے عشق تھا۔ وہ اُس کی گلیوں میں مٹرگشت کرتے ہوئے اکثر سوچا کرتا تھا کہ کیا اُس کا معاشرہ مکمل جمہوریت کے لیے تیار ہے؟

وہ دیکھتا تھا کہ عوام روزی روٹی کے معاملات میں الجھے ہوئے ہیں۔ وہ بھیڑ سے الگ ہو کر ایک کونے میں کھڑا ہوجاتا اور غور کرتا۔ ہر چہرے کو تکتا۔

وہ دیکھتا ایک عورت اپنے بچے کا ہاتھ تھامے بازار سے گزر رہی ہے۔ بچے کی نظریں بازار کی روشنیوں پر ٹکی ہیں اور عورت کا جدید طرز کا اسکارف نیچے کھسک رہا ہے۔ ایک پکی عمر کا شخص سبزیاں خرید رہا ہے، ایک نوجوان جدید مغربی لباس زیب تن کیے کھڑا سامنے والی عمارت کی کھڑکی کو تک رہا ہے جس کے پیچھے اُس کی محبوبہ موجود ہے۔

یہ سب دیکھ کر وہ سوچتا، کیا یہاں لوگوں کے پاس یہ سوچنے کے لیے وقت ہے کہ جمہوریت کیا ہے؟

☆☆☆

شادی کے بارے میں نجیب عجیب فلسفے کا حامل تھا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ وہ جس نظریے کا حامل تھا، اس پر اس نے عمل نہیں کیا۔ دراصل ادب ہی اس کا پہلا عشق تھا جسے وہ بھرپور وقت دینا چاہتا تھا۔ اس نے نوجوانوں کی طرح اپنے پہلے عشق کو سرسری اہمیت نہیں دی بلکہ اپنا تن من دھن سب اُس کی نذر کردیا۔

وہ 43 سال کی عمر تک کنوارا ہی رہا۔ وہ خیال کرتا تھا کہ شادی کے بعد اُس کی بیوی اور ادب دونوں حاسد محبوباؤں کا روپ دھار لیں گے اور اُس کی جان کو آجائیں گے۔

وہ اپنی دوست لیلیٰ سے اکثر کہا کرتا تھا، ''شادی کے بعد میں عملی طور پر بیوی بچوں میں پھنس جاؤں گا اور مصروفیات کے دنوں میں جب ادب نامی محبوبہ میرے پیچھے دوڑے گی تو میں 'مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ!' کہہ کر دامن چھڑایا کروں گا۔ میں تو ملازمت اور

لکھنے پڑھنے کے معاملات میں بہت الجھا ہوا ہوں۔ دن میں ایک سرکاری ملازم ہوں اور شام میں ادیب! میرے دن رات تو مصروفیات سے بھرپور ہیں۔"

لیلیٰ جو تیزی سے ادھیڑ عمری کی جانب بڑھ رہی تھی، جواب میں مسکرا دیتی۔ آخر وقت تک وہ پُرامید رہی مگر 1954ء میں نجیب نے ایک مصری خاتون سے شادی کر لی۔ تمام دوست شادی میں شریک ہوئے۔ سب نے خوب بلا گلا کیا، جب کہ نجیب سنجیدگی کا مظاہرہ کرتا رہا۔ اُس موقعے پر لیلیٰ نے اسے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا "عزیز آج سنجیدہ نظر آنے کی ضرورت نہیں اور اپنی بیگم کو میری بابت بتا دینا، کہیں کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو جائے!"

شادی کے بعد نجیب نے بیوی کو بھرپور پیار دیا۔ دونوں کے درمیان چھوٹے موٹے جھگڑے ضرور ہوئے، لیکن طلاق کی نوبت نہیں آئی۔

اس محبت کا ثمر دو بیٹیوں کی صورت میں سامنے آیا۔ وہ اپنے گھر میں بیوی اور بیٹیوں کے ساتھ رہتا۔ وہ لوگوں سے ملنے سے اجتناب برتتا تھا اور یہ پسند نہیں کرتا تھا کہ لوگ اُس کی ذاتی زندگی میں مداخلت کریں۔

☆☆☆

1938ء میں اُس کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "ہمس الجنون" (The Whisper of Madness) شائع ہوا جسے بہت سراہا گیا۔

اگلے ہی برس اُس کا پہلا ناول "عبث الاقدار" (Mockery of the Fates) منظرِ عام پر آیا۔ 1943ء میں منظرِ عام پر آنے والا "رادوپیس" اور 1944ء میں شائع ہونے والا "کفاح طیبۃ" (The Struggle of Thebes) تاریخی پس منظر کے حامل تھے جو بہت مقبول ہوئے۔ یہ نجیب کی جانب سے اعلان کردہ مصر کے متعلق تین تاریخی ناولوں کی سیریز کا حصہ تھے مگر بدقسمتی سے یہ منصوبہ کبھی مکمل نہیں ہو سکا۔

نجیب 1771ء میں جنم لینے والے اسکاٹ لینڈ کے ممتاز تاریخی ناول نگار، سر والٹر اسکاٹ کے کام سے بہت متاثر تھا اور خواہش مند تھا کہ وہ کتابوں کی ایک سیریز میں مصر کی تاریخ رقم کرے، تاہم ابتدائی چند کوششوں کے بعد اُس کی دلچسپی کا محور بدل گیا۔ اب "حال" اس کی توجہ کا مرکز تھا اور وہ اسی بابت کام کرنا چاہتا تھا۔ اس نے عام افراد اور ان کے مسائل کو موضوع بنانے کا فیصلہ کیا۔

اُس کا نمایاں ترین کام پچاس کی دہائی میں سامنے آیا۔ 56ء سے 57ء کے درمیان "ثلاثیۃ القاہرۃ" یعنی Cairo Trilogy کے سلسلے کے تین ناول منظرِ عام پر آئے جو مجموعی طور پر ڈیڑھ ہزار صفحات پر مشتمل تھے۔ تین حصوں میں منظرِ عام پر آنے والا یہ ناول 1952ء کے انقلاب سے قبل مکمل کیا گیا تھا۔ پہلا حصے کا نام "بین القصرین" (Palace Walk)، دوسرے کا "قصر الشوق" (Palace of Desire) اور تیسرے کا "السکریۃ" (Sugar Street) تھا۔ ان تینوں ناولوں کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا۔

نجیب نے اس ناول میں قاہرہ کے ان حصوں کی کہانی بیان کی ہے، جہاں وہ پروان چڑھا۔ اس میں اس نے اپنے قبیلے کے سردار السید احمد عبدالجواد کی زندگی کی منظر کشی کی اور اپنے خاندان کی تین نسلوں کے حالات بیان کرتے ہوئے جنگِ عظیم اول سے 1950ء تک کے معاشرے کے عمیق نفسیاتی تجزیے کیے اور اس نے اس مثلثیات (ٹرائلوجی) کو ایک شاہ کار کی شکل دی۔ نجیب نے تین حصوں پر مشتمل یہ ناول مکمل کرنے کے بعد چند برس کے لیے لکھنا ترک کر دیا۔ وہ حکومتی اقدامات سے مایوس تھا۔

1959ء میں اس نے دوبارہ قلم اٹھایا اور اُس کے ناول، افسانے، صحافتی یادداشتوں پر مشتمل کتب منظرِ عام پر آئیں۔

1966ء میں منظرِ عام پر آنے والا "ثرثرۃ فوق النیل" اُس کا مقبول ترین ناول تھا جس کا انگریزی میں "Adrift on the Nile" اور اردو میں "آبِ نیل پہ آوارگی" کے نام سے ترجمہ ہوا۔ بعد ازاں اس ناول کو فلم کی شکل دی گئی اور اس میں اپنے وقت کے نمایاں ترین اداکار جلوہ گر ہوئے۔ یہ پوری سرگزشت صدر انور سادات کے زمانے میں سرانجام دی جا رہی تھی۔ فلم میں سابق صدر جمال عبدالناصر کے زمانے میں مصری معاشرے میں پائی جانے والی گراوٹ کو موضوع بنایا گیا تھا۔ اس خیال کے تحت کہ یہ فلم سابق صدر کے چاہنے والوں کے جذبات مجروح کر سکتی ہے، اس پر پابندی عائد کر دی گئی۔

نجیب کا ادبی سفر جاری رہا۔ اس کے ہاں کرداروں کی تشکیل اور خیالات کو اس انوکھے انداز میں پیش کیا جاتا تھا کہ پڑھنے والا خود کو تحریر کی روانی میں بہتا ہوا پاتا۔ اس کے متنوع موضوعات بھی نوجوانوں کے لیے باعثِ کشش تھے۔ وہ سوشل ازم، ہم جنس پرستی اور مذہب جیسے دقیق اور شجرِ ممنوعہ تصور کیے جانے والے موضوعات پر بھی بے خوف ہو کر قلم اٹھا لیتا۔ سچ تو یہ ہے کہ نجیب نے چند ایسے مسائل پر قلم اٹھایا، جن کی بابت ماضی میں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

بعد کے ناولوں میں اس نے یہ خیال پیش کیا کہ انسانیت ایک نئی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے، اور اب مذہب یا خدا کا

تصور عام انسان کے لیے نئے معنی کے ساتھ سامنے آ رہا ہے۔ 1961ء میں منظرِ عام پر آنے والے اس کے مشہور زمانہ ناول "اللص والکلاب" (چور اور کتے) میں وہ ہمارے کسی سوچ کے پار اک ایسے چور کے عقائد کی بابت بات کرتا ہے جو چند برس قبل جیل سے رہا ہو کر آیا ہے۔

1967ء میں ناول "میرامار" منظرِ عام پر آیا، جس میں اس نے تکنیک کا شان دار تجربہ کیا۔ اس میں ایک سے زائد واحد متکلم کہانی بیان کرتے ہیں۔ کہانی بیان کرنے والے چار افراد شوشلسٹ ہیں جبکہ ایک جمال عبدالناصر کا پیروکار ہے، جو الگ سیاسی نظریہ رکھتا ہے۔ درمیان میں ایک پُرکشش ملازمہ ہے۔ یوں یہ عجیب و غریب اور تجربات سے بھرپور کہانی آگے بڑھتی ہے۔

1981ء میں شائع ہونے والے ناول "لیالی الف لیلۃ" (In Arabian Nights and Days) اور 1983ء میں منظرِ عام پر آنے والے "رحلۃ ابن فطومۃ" (The Journey of Ibn Fatouma) میں اس نے عرب کے روایتی داستان گو کے انداز میں کہانی کو بیان کیا اور ایک کامیاب تجربہ کیا۔

نجیب کے ناولوں کی تعداد 50 ہے۔ اُس نے 350 کے قریب کہانیاں (یا افسانے) لکھے، فلموں کے اسکرپٹ کی تعداد بھی درجن کے قریب ہے۔ بیش تر ناول اخبار "الاہرام" میں قسط وار شائع ہوئے اور یوں اُن کی رسائی میں اضافہ ہوا۔ اس کی کئی کہانیوں اور ناولوں کو فلموں کا موضوع بنایا گیا۔ وہ اشاعتی ادارے "دار المعارف" کے بورڈ کا رکن بھی رہا۔ "چوائسز آف ڈیو" کے عنوان سے وہ ہفتہ وار کالم لکھا کرتا تھا جو نوجوانوں میں بہت مقبول تھے۔ گو نوبل انعام حاصل کرنے سے قبل ہی اُس کے تخلیق کردہ ادب نے مغرب تک رسائی حاصل کر لی تھی۔

☆☆☆

کہانی "زعبلاوی" کے انگریزی میں ترجمے کے بعد اُسے بین الاقوامی ادب، خصوصاً مغرب میں شناخت ملی۔ اس کہانی کا اسے اچھا معاوضہ بھی ملا۔ 1947ء میں لکھا جانے والا ناول "زقاق المدق" انگریزی کے قالب میں ڈھالا جانے والا اُس کا پہلا ناول تھا، جو Midaq Alley کے نام سے شائع ہوا۔ البتہ اُس کا نجیب کو معاوضہ نہیں ملا، بے چارہ مترجم بھی خالی ہاتھ رہا۔

بعد میں اس ناول پر ایک میکسیکن فلم بنائی گئی جس میں معروف اداکارہ سلما ہائک نے مرکزی کردار ادا کیا۔ 1970ء کے بعد اس ناول کا دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا۔

اس تخلیق کار کے ناولوں کی بین الاقوامی سطح پر پذیرائی کا سبب اس کے تجربات تھے جس کی مدد سے وہ مشرق و مغرب کے اشتراک سے جنم لینے والی ادبی و ثقافتی کیفیات اور مسائل بیان کرتا ہے۔ اس کے بیش تر کرداروں کا تعلق قاہرہ سے ہوتا اور بہ ظاہر عام سے معلوم ہونے والے یہ افراد جدیدیت سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے جس کے نتیجے میں غیر معمولی صورتِ حال سامنے آتی۔ یہی تجربات مغرب کی توجہ کا مرکز بنے۔

☆☆☆

عمر کے ساتھ ساتھ نجیب کی سرگرمیاں محدود ہوتی گئیں، تاہم اس نے خود کو نوجوان طبقے سے وابستہ رکھنا ضروری سمجھا۔ وہ جمعے کی شام ..... "قصر نیل" میں ہونے والے سیشن میں ضرور شرکت کرتا جس میں نووارد لوں کے ساتھ ساتھ پرانے ادیب اور شعرا بھی شرکت کرتے تھے۔ دراصل 1971ء میں ریٹائر ہونے کے بعد نجیب گھر والوں اور دوستوں کو زیادہ وقت دینے لگا تھا۔

اُن سیشنز میں معاشرے اور ادیب کا رشتہ اکثر و بیش زیرِ بحث آتا۔

قاہرہ کی ایک رنگین شام میں جب نوجوان ادیبوں کی جانب سے اُس کے اعزاز میں خصوصی محفل منعقد کی گئی تھی اُس سے معاشرے کے حقوق کے بارے میں ایک سوال کیا گیا۔ جواب میں اُس نے کہا، "ہر معاشرے کے کچھ عقائد اور قوانین ہوتے ہیں، جن کی وہ حفاظت کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ وقتاً فوقتاً ایسے افراد سامنے آتے رہتے ہیں جو تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ میرے خیال میں معاشرے کو اپنے عقائد کی حفاظت کا حق ہے، بالکل اسی طرح جیسے انفرادی حیثیت میں ایک شخص اختلافِ رائے کا اظہار کر سکتا ہے۔"

اُسی محفل میں جب اُس سے ادیب کی ذمے داری کی بابت سوال کیا گیا، تو اُس نے توقف کے بعد جواب دیا، "دیکھیں اگر ایک ادیب اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ معاشرے کے عقائد اب نقصان دہ ثابت ہو رہے ہیں، تو اس پر لازم ہے کہ وہ آواز اٹھائے۔ تاہم اسے قیمت چکانے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اگر وہ بے باک ہے، تو قیمت چکانی پڑے گی۔" یہ کہنے کے بعد اس نے چند لمحوں کا وقفہ کیا جس میں اُس نے خود سے سوال کیا، "کیا میں نے بھی آواز اٹھانے کی قیمت چکائی؟"

پھر لمحہ موجود میں پلٹتے ہوئے اُس نے کہا، "اگر آپ قیمت چکانے کو تیار نہیں، تو خاموش رہ سکتے ہیں۔ تاریخ ایسے

لوگوں سے بھری پڑی ہے جنہوں نے قید و بند کی صعوبتیں سہیں، مارے گئے۔ تو یہی طریقے ہے، آپ چاہیں تو خاموش رہ سکتے ہیں۔"

نجیب کے جواب سے سوال کرنے والا تو مطمئن ہو گیا اور نجیب گہری سوچ میں گم رہا۔

☆☆☆

اب وہ ایک ایسے مصر کا حصہ تھا جو دھیرے دھیرے جمہوریت کا سفر طے کر رہا تھا۔ برطانوی سامراج کا سورج غروب ہو چکا تھا اور امریکی سامراج اپنے عروج پر تھا۔ ترقی پذیر ممالک کو ایک نئے نوآبادیاتی نظام کا سامنا تھا۔ اُس زمانے میں اسے ماضی کا تجزیہ کرنے کا خاصا موقع ملا۔

☆☆☆

نجیب کی بیوی اکثر یہ کہا کرتی تھی کہ وہ نوبیل انعام کا حق دار ہے اور عربی ادب کے لیے اُس نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، تاہم نجیب سوچا کرتا تھا کہ نوبیل ایک مغربی اعزاز ہے جس کے حوالے سے ضرور جانب داری کا مظاہرہ کیا جاتا ہوگا۔

"وہ کبھی مشرق، خصوصاً عرب دنیا سے تعلق رکھنے والے ادیب کو منتخب نہیں کریں گے!" وہ اکثر کہا کرتا تھا۔

اُس برس یہ افواہ گردش کر رہی تھی کہ نوبیل انعام کے لیے عربی کے دو ادیب، مصر سے تعلق رکھنے والے یوسف ادریس اور شام سے تعلق رکھنے والے یوڈونس کو نامزد کیا گیا ہے۔ نجیب نہیں جانتا تھا کہ اس کا نام بھی زیرِ غور ہے۔

اُس صبح وہ اخبار "الاہرام" کے دفتر میں تھا۔ وہ ایک عام سا دن تھا اور اُسے کسی غیر متوقع واقعے کی توقع نہیں تھی۔

وہ مخصوص وقت پر دفتر سے نکلا اور گھر کی جانب چل دیا۔ اگر وہ اس روز مزید آدھے گھنٹے دفتر میں رک جاتا تو یہ جان جاتا کہ اُسے چن لیا گیا ہے۔

گھر آ کر اُس نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ اُس وقت تک اخبار کے دفتر میں یہ خبر پہنچ چکی تھی کہ نجیب کو ادب کے نوبیل انعام کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے۔ وہاں خوشی کا سماں تھا۔ ساتھی اُسے اِس خوش خبری کی بابت جلد از جلد مطلع کرنا چاہتے تھے۔ دوسری جانب نجیب قیلولے میں مصروف تھا۔

فون کی گھنٹی بجی، اس کی بیوی نے فون اٹھایا۔ یہ خبر سنتے ہی کہ اُس کے مجازی خدا کو نوبیل انعام دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے، وہ مسرت سے چیخ اٹھی۔

وہ بھاگی بھاگی بستر تک گئی کہ نجیب کو جگائے۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے جاگا اور اُس کی بیوی نے ہانپتے ہوئے اُسے یہ خوش خبری سنائی۔

نجیب کو محسوس ہوا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو، پھر سوچا، "شاید میری بیوی اپنے بوڑھے شوہر سے مذاق کرنے کے موڈ میں ہے۔"

اُس نے چادر کھینچ لی۔ "مجھے سونے دو!"

جھنجلا کر اُس نے نجیب کو فون ریسیو کرنے کے لیے کہا۔ نجیب نے انگڑائی لیتے ہوئے ریسیور کان سے لگایا۔ دوسری طرف کوئی کہہ رہا تھا۔ "مبارک ہو، مبارک ہو!"

نجیب نے غور کیا، یہ اس کے پرانے ساتھی جناب ہاشم تھے اور یہ صاحب اکثر نجیب سے مذاق کیا کرتے تھے۔

"تو تم ایک بوڑھے ادیب کی ٹانگ کھینچنا چاہتے ہو میاں، خوب!" نجیب نے کہا۔

دوسری جانب اُس کا رفیق مبارک باد دیتا رہا۔ بالآخر فون کا ریسیور رکھ دیا گیا۔ نجیب مڑا تو اُس کی بیوی سامنے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سوال تھا۔ نجیب کو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے دالان کی جانب چل دیا۔

اسی اثنا میں دروازے کی گھنٹی بجی۔ اس وقت نجیب شب خوابی کے لباس میں تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ یہ ضرور کوئی صحافی ہوگا لیکن دروازے کی دوسری طرف سویڈن کا سفیر تھا۔ یوں نجیب کو یقین آیا کہ اُسے نوبیل انعام سے نوازا جا رہا ہے۔

مسلم دنیا، خصوصاً عرب دنیا نے اُس پر بہت مسرت کا اظہار کیا۔ نجیب کے ادبی مخالفین بھی خوش تھے، تاہم نظریاتی مخالفین ناراض ہی رہے۔ البتہ نجیب کو نہ کسی کی خوشی کی پروا تھی نہ ہی ناراضی کی!

اُس سے قبل عربی ادب کا علم بلند کرنے والے ادیبوں مثلاً طٰہٰ حسین اور سلامہ موسیٰ سے وہ اِن معنی میں مختلف تھا کہ اُن کی طرح اِس نے بیرونِ ملک تعلیم حاصل نہیں کی۔ اگرچہ اُس کے بعد آنے والوں کا بھی یہی چلن رہا اور بیرونِ ملک تعلیم کو بہت اہمیت دی جاتی رہی، تاہم نجیب اِس معاملے میں یکسر مختلف تھا۔ گو کہ اُس نے کئی غیر ملکی دورے کیے، نوجوانی میں تو اُسے سیر و تفریح کا جنون کی حد تک شوق تھا، تاہم اُس نے باہر کی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ قوم پرستی کے سبب اِس ضمن میں اجتناب برتتا رہا۔ وہ تو علم کا متلاشی تھا، تاہم کبھی حاجت ہی نہیں ہوئی۔

اُس نے مغرب سے، مغربی ادیبوں کے ذریعے شناسائی حاصل کی۔ اُسے عرب کا "بیلزیک" کہا جاتا تھا۔ 1799ء میں فرانس میں پیدا ہونے والے بیلزیک کو ناول نگار کی حیثیت

سے یورپ میں نمایاں مقام حاصل رہا۔

☆☆☆

کرداروں کی تشکیل اور کہانیوں کی بُنت کے لیے نجیب کا طریقہ واضح تھا۔ وہ جب دوستوں سے ملتا، تو اُن معاملات، موضوعات یا افراد پر بات کرتا جن سے وہ اُس روز یا اُس ہفتے متاثر ہوا ہوتا۔ گھر، درس گاہ، دفتر، سڑک اور بازار میں جن سے آنے والے عام افراد کے عام واقعات اُس کا بنیادی موضوع تھے۔ جو واقعات اُسے زیادہ متاثر کرتے اور تفصیلی بحث کے متقاضی ہوتے، انہیں وہ ناولوں کا موضوع بناتا۔

قصر نیل میں ہونے والے ایک سیشن میں اپنے طریقِ کار کی مزید وضاحت کرتے ہوئے نجیب نے کہا تھا، "چند روز قبل قاہرہ میں ایک واقعہ پیش آیا، ایک شخص نے تین افراد کو قتل کر دیا۔ مقتولین میں دو میاں بیوی اور ایک ملازم شامل تھا۔ اب اگر میں اس موضوع کا چناؤ کرتا ہوں، تو خوب غور و فکر کے بعد پہلے یہ فیصلہ لوں گا کہ اس کہانی کو کس پہلو سے بیان کروں۔ آیا شوہر کے نقطۂ نظر سے یا بیوی کے زاویۂ نگاہ سے؟ ممکن ہے کہ میں ملازم یا مجرم میں سے کسی ایک کا انتخاب کروں۔ نیز، میں جس کا بھی چناؤ کروں گا، میری ہم دردی اُسی کے ساتھ ہوگی۔ میں اُس کی بابت زیادہ سے زیادہ غور کروں گا، اور پھر ایک کہانی پیش کروں گا۔"

افسانوں کے معاملے میں وہ ہمیشہ اپنے دل کی آواز پر بھروسا کرتا اور الفاظ کو وجدانی کیفیت کے تحت اترنے دیتا۔ البتہ دقیق موضوعات، خصوصاً تاریخی ناولوں کے لیے وہ باقاعدہ ریسرچ کرتا۔ تین حصوں پر مشتمل قاہرہ کی کہانی (ٹرالوجی) کے لیے بھی اُس نے خاصی تحقیق کی۔ اُس نے اپنے ہر کردار کی ایک فائل بنا رکھی تھی، جس میں اُس کی خصوصیات اور سرگرمیات کی بابت وہ نوٹ بناتا رہتا۔

کبھی کبھار یوں ہوتا کہ کسی کہانی میں پیش آنے والا واقعہ ایک نئے کردار کو جنم دیتا۔ نجیب اُس فوم مولود کی بڑی محبت سے پرورش کرتا، اگر ضرورت پیش آتی تو اُسے فنا بھی کر دیتا۔ کبھی کبھار وہ کرداروں سے بھی اپنی کہانی کا آغاز کرتا، اسے یقین تھا کہ کردار کی تشکیل دراصل کہانی کی تخلیق کی جانب پہلا قدم ہے۔

اس کی تحریر کئی بار تبدیلی کے عمل سے گزرتی۔ وہ نظر ثانی کے دوران کافی کچھ کاٹ دیتا۔ کئی صفحات دوبارہ لکھتا۔ لکھنے کے معاملے میں وہ کلیوں سے بے پروا ہو جاتا، کبھی کبھار سگریٹ کی پشت پر بھی لکھ جاتا۔ اکثر نظرِ ثانی کے دوران کہانی یک سر بدل جاتی، پھر وہ کہانی دوبارہ لکھتا۔ ایک بار کہانی مکمل کر کے جب وہ پبلشرز کو بھیج دیتا تو باقی صفحات کو پھاڑ دیتا۔

اس کے خیر خواہ کہا کرتے تھے کہ کہانی یا ناول مکمل کرنے کے بعد پرانے نوٹس کو یوں ضائع کر دینا درست نہیں، انہیں سنبھال کر رکھا کرو، تاکہ تم پر تحقیق کرنے والوں کو تمہارا کام سمجھنے میں آسانی رہے، لیکن اس منفرد تخلیق کار نے کبھی اس بات کی چنداں پروا نہیں کی۔ وہ مسکراتے ہوئے کہتا اگر میں تمام پرانے کاغذات سنبھالتا پھروں، تو میرا گھر کچرا کنڈی بن جائے!

نوبیل انعام حاصل کرنے والے اِس تخلیق کار کو جب پرانے دن یاد آتے تھے تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔ وہ جانتا تھا کہ ناول اور افسانے، ادب کی یہ دونوں ہی اصناف عربی ادب میں باہر سے آئی ہیں، یہ اس زبان کے ادب کا ورثہ نہیں جس میں وہ اپنے خیالات کے اظہار کا متمنی ہے۔ اسے احساس تھا کہ ناول اور افسانے کی اصناف مغرب سے آئی ہیں لیکن اس کا مطالعہ و مشاہدہ اسے یہ یقین دلا چکا تھا کہ عربی ادیبوں نے ان اصناف کو قبول کر کے اپنا بنا لیا ہے۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں عرب دنیا میں مغربی ادب کے کئی معیاری تراجم ہوئے جن کی مدد سے نئے لکھنے والوں کو خاصا فائدہ ہوا، انہوں نے اس اسلوب میں بات کہنے کی کوشش کی اور کامیاب رہے، تاہم انہوں نے کہانی اور زبان کو اپنے معاشرے سے بھی منسلک رکھا۔ اس میدان میں کامیاب ہونے والوں میں نجیب سرِفہرست رہا۔

نجیب کو تصوف سے گہری دلچسپی تھی۔ اس کے ناول اللص والکلاب (چور اور کتے) میں ایک شیخ نامی کردار بھی تھا جو ایک صوفی تھا۔ یہ کردار بھی موضوعِ بحث بنا۔ نجیب کا موقف تھا کہ اسے تصوف میں دلچسپی ہے، یہ ایک خوب صورت شے ہے، تاہم صوفی زندگی کو رد کر دیتے ہیں اور عام انسان زندگی سے جڑے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہی بنیادی فرق ہے۔ وہ شاعری کے مانند روحانیت سے بھی محظوظ ہوتا تھا لیکن اسے مسائل کا حل یا جواب تصور نہیں کرتا تھا۔

اُس کے نزدیک زندگی ایک حقیقت ہے، اُسے رد کرنا درست نہیں لیکن تصوف میں اُس کی دلچسپی قائم رہی۔

☆☆☆

نجیب نے مصر کے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی عورت کو بھی موضوع بنایا اور اُس کے مسائل کی نشاندہی کی۔ وہ اس

بابت فکر مند تھا کہ مصر کے حبس زدہ ماحول میں عورتوں کو شدید پریشانی کا سامنا ہے۔ مردوں کے اس معاشرے میں وہ امید سے محروم ہیں اور اُن کے پاس وسائل نہیں ہیں۔

آزادی اس کا پسندیدہ موضوع رہا۔ بادشاہت، نو آبادیاتی نظام اور جبر سے آزادی کے لیے اُس نے ہمیشہ آواز اٹھائی۔ وہ اس پیغام کو عام کرنے کا خواہش مند تھا اور اس نے ایسا ہی کیا۔

نوبیل انعام ملنے کے بعد کئی غیر ملکی صحافیوں نے اُس کے دروازے پر دستک دی۔ وہ عرب ادب کے اس درخشاں ستارے سے ملنے کو بے تاب تھے۔ یوں انٹرویوز کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔

ایک انٹرویو کے دوران برطانوی صحافی جارج ملٹن نے اُس سے سوال کیا تھا۔ ''ناقدین کے مطابق آپ کی کہانیوں میں ہیرو نہیں ہوتے، فقط کردار ہوتے ہیں!''

نجیب نے نگار کا گہرا کش لیا اور جواب دیا۔ ''میں اس نکتے کو تسلیم کرتا ہوں۔ دیکھیں، میں تنقیدی زاویے سے اپنے معاشرے کا جائزہ لینے کے بعد ہی کہانی کا چناؤ کرتا ہوں۔ مجھے معاشرے میں عام افراد دکھائی دیتے ہیں جن میں ہیرو والی کوئی خاصیت کوئی قابلیت نہیں ہوتی۔''

وہ خود کو ادب سے محبت کرنے والا ایک خاص شخص تصور کرتا تھا۔ اسے اپنے کام سے عشق تھا، دولت اور شہرت اس کی نظر میں ثانوی حیثیت رکھتی تھیں۔ اس نے کبھی دولت اور شہرت کی اہمیت سے انکار نہیں کیا، تاہم کبھی ان کے پیچھے نہیں دوڑا۔ چونکہ اسے لکھنے کے عمل سے اُنس تھا۔

کسی زمانے میں وہ فقط لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتا تھا۔ تاہم عمر کے ایک حصے میں وہ امراضِ چشم کا شکار ہوگیا جس کے بعد اُس کے لیے سوسم گرما میں مطالعہ کرنا مشکل ہوگیا۔ اُس نے اسے خدا کا فیصلہ تصور کیا۔ یوں سال کے بارہ میں سے تین ماہ اس نے اپنے دوستوں کے لیے وقف کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

☆☆☆

گو کہ نجیب تنازعات میں الجھنا پسند نہیں کرتا تھا لیکن جب بات حق کی ہو تو وہ اڑ جاتا، اور تنقید و مخالفت کے باوجود اپنے موقف پر ڈٹا رہتا۔ اس کا اسے نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ اس نے اسرائیل سے ہونے والے کیمپ ڈیوڈ امن معاہدے کی بھی کھلے عام حمایت کی اور یہ حمایت اسے بہت بھاری پڑی۔ چند ہم عصر اُس کی حمایت کو کچی محفلوں میں درست خیال کرتے ہوئے یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اُسے یوں عوام میں یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی اور یہ حمایت درحقیقت ایک 'حماقت' ہے۔

انہوں نے نجیب کو بھی سمجھایا، حق گوئی و بے باکی سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے موقف سے پیچھے نہیں ہٹا جس کا خمیازہ اُسے بھگتنا پڑا۔ کئی عرب ممالک نے اس کی روایت شکن تحریروں کو رد کرتے ہوئے ان پر پابندی عائد کر دی۔ وہ نوبیل انعام کے حصول تک کئی ممالک میں ''بین'' رہا۔ وہ اپنے بستر پر دراز اکثر سوچا کرتا تھا کہ اگر اُسے نوبیل انعام نہیں ملتا تو شاید قدامت پسند عرب معاشرے میں اُس پر طویل عرصے تک پابندی برقرار رہتی۔

جب نجیب کا متنازع ناول The Children of Gabelawi (اولادِ جبلاتنا) منظرِ عام پر آیا تھا، اس وقت وہ خود شعبہ برائے آرٹسٹک سینسر شپ کا صدر تھا۔ اس موقعے پر شعبہ برائے ادبی سینسر شپ کے صدر نے نجیب کو مشورہ دیا۔ ''میاں، اس ناول کو کتابی شکل میں کم از کم مصر میں شائع نہ کرنا، لوگ مشتعل ہیں، پھر 'جامعہ الازہر' کی ناراضی کا بھی خدشہ ہے۔''

ناصر کے زمانے میں یہ کتاب زیرِ عتاب آئی لیکن اس کی شہرت پھیل چکی تھی اور لوگ اسے اسمگل کرکے مصر لایا کرتے تھے۔

چند حلقوں کا خیال تھا کہ نجیب نے جان بوجھ کر اشتعال انگیز ناول لکھا۔ اس سے متعدد بار یہ سوال کیا گیا اور اس نے ہر بار ایک ہی جواب دیا کہ اُس کے نزدیک سائنس کا مصر کے جدید معاشرے میں ایک مقام ہے، یہ مذہب سے متصادم نہیں۔ اگر سائنس کو رد کیا جائے گا تو عام آدمی کو بھی رد کر دیا جائے گا۔ نجیب کے خیال میں وہ لوگ جو کہانی پڑھنے کی تربیت نہیں رکھتے، اس ناول کو سمجھ نہیں سکے جس کا نتیجہ فتووں کی صورت سامنے آیا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا، ''وہ ایک علامتی تحریر تھی جسے نہیں سمجھا گیا۔''

یہ ناول 1959 میں قاہرہ سے نکلنے والے روزنامہ 'الاہرام' میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ اُس پر شدید تنقید ہوئی، خصوصاً مذہبی حلقوں نے نجیب کو آڑے ہاتھوں لیا جس کے بعد اُس کی کتابی شکل میں اشاعت پر پابندی عائد کروی گئی۔ مصر میں پابندی تھی اور یہی معاملہ بیش تر عرب ممالک کا تھا۔ سو یہ 1967 میں پہلی بار لبنان سے شائع ہوا۔ اسے 1981 میں Philip Stewart نے انگریزی کے قالب میں ڈھالا۔ بعد میں Peter Theroux نامی ایک شخص نے اسے دوبارہ شائع کیا۔ اس ناول پر مغرب میں خاصی بحث ہوئی۔

نجیب کی شہرت نے کئی دشمن پیدا کردیے۔ معروف مذہبی عالم شیخ عمر عبدالرحمان نے اُس کے خلاف فتویٰ بھی

صادر کیا۔ اس ناول کی کہانی تین وحدانیت پرست ابراہیمی مذاہب یعنی اسلام، عیسائیت اور یہودیت کے گرد گھومتی ہے۔ اس میں مختلف پیغمبروں کی زندگیوں کو علامتی انداز میں موضوعِ بحث بنایا گیا اور آخری حصے میں سائنس پر بات کی گئی ہے۔ یہ ناول قسط وار شائع ہونے کے بعد ہی موضوعِ بحث بن گیا تھا، تاہم وقت کے ساتھ ساتھ لوگ اُسے بھول گئے لیکن سلمان رشدی کی کتاب کی اشاعت کے بعد ایک بار پھر اس پر بات ہونے لگی۔

اپنی روشن خیالی، جسے بہت سے افراد حدود سے تجاوز اور الحاد تصور کرتے تھے نجیب کو مہنگی پڑی لیکن اس نے اپنے طریقے پر چلنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اسے انتہا پسندوں کی جانب سے قتل کی دھمکیاں بھی ملیں، تاہم وہ پسپا نہیں تھا۔ وہ اور اُس کے کئی ہم عصر انتہا پسندوں کی ہٹ لسٹ پر تھے۔ وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا، ''دیکھتے ہیں، تم میں سے کون پہلے جاتا ہے!''

☆☆☆

یہ اس زمانے کی بات ہے جب گستاخِ رسول سلمان رشدی کا ناول ''شیطانی آیات'' زیرِ بحث تھا، اس لعین کے خلاف آیت اللہ خمینی کا فتویٰ جاری ہو چکا تھا۔ نجیب نے اس موقعے پر انتہا پسندانہ ردِعمل کو نامناسب قرار دیا۔

اس کے بیان نے کھلبلی مچادی۔ ایک عرب ادیب کی جانب سے رشدی کی جزوی حمایت کی بھی توقع نہیں کی جارہی تھی، کُجا کہ نجیب نے اُس کی حمایت نہیں کی تھی فقط یہ کہا تھا کہ وہ آزادیِ اظہار کا حامی ہے، اگر کسی شخص یا طبقے کو کسی ادیب سے اختلاف ہے تو اس کا جواب بہ ذریعہ تحریر ہی دیا جائے۔ اس نے ایران کے روحانی پیشوا آیت اللہ خمینی کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ بعد میں وہ 80 دانشوروں کے اُس گروہ میں شامل ہوگیا جو یہ کہتے تھے کہ اسلام کو کفر کا ارتکاب کرنے والے شخص کے مقابلے میں ادیب کے قتل کے فتوی نے زیادہ نقصان پہنچایا۔

جب آپ اتنے حساس موضوعات پر اس قدر بے باکی سے بات کرتے ہیں، تو آپ کو نتائج بھی بھگتنے پڑتے ہیں۔ گستاخِ رسول رشدی کے ناول کی اشاعت اور نجیب کے بیان کے بعد مخالفین کو گڑے مُردے اکھاڑنے کا موقع مل گیا، اور اُس کا 1959 میں شائع ہونے والا متنازع ناول Children of Gabelawi ایک بار پھر موضوعِ بحث بن گیا۔

گو کہ عرب کے اس معروف تخلیق کار نے ابتداً آزادیِ اظہار کے نقطۂ نگاہ سے لعین رشدی کی حمایت کی تھی لیکن وہ گستاخانہ ناول پڑھنے کے بعد اُس کے خیالات میں خاصی

بہترین تحفہ

ہم ابو سے جیل میں کئی مرتبہ ملنے گئے۔ ہم یہاں سے خوب بن ٹھن کر جاتے۔ وہاں ابو بھی ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک، ملاقاتی کمرے میں آتے جاتے۔ ملاقات کے اختتام پر جی چاہتا تھا کہ جیل کی سلاخیں توڑ کر یا تو انہیں ساتھ لے جاؤں یا ان کے ساتھ خود بھی جیل کے اندر چلی جاؤں مگر میں نے امی سے یہ کبھی نہیں کہا، میری آٹھویں سالگرہ پر ابو نے جیل سے مجھے ایک نظم بھیجی اور لکھا کہ میرے پاس بجز اس نظم کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس سے بڑھیا تحفہ مجھے آج تک نہیں ملا۔ پھر ایک شام ابو لوٹ آئے۔ ہم سب فرطِ جذبات سے جیسے پاگل ہوگئے تھے۔ ابو بھی بہت EXCITED تھے۔ میں نے ابو سے کہا ''اب آپ توبہ کریں اور کبھی جیل نہ جائیں۔'' کہنے لگے ''بھئی ہم خود تو نہیں گئے تھے نا، وہ لے گئے تو ہم چلے گئے۔''

فیض احمد فیض کی بیٹی منیزہ ہاشمی کی یادداشتوں سے

تبدیلی آئی۔ دراصل جس زمانے میں وہ کتاب منظرِ عام پر آئی تھی، نجیب اپنی بینائی کا بڑا حصہ کھو چکا تھا، خود پڑھنا ممکن نہیں تھا، سو کسی اور نے اُسے وہ کتاب ورق بہ ورق پڑھ کر سنائی۔ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ رشدی (لعین) نے افسوس ناک حرکت کی ہے۔ بعد کے زمانے میں متعدد انٹرویوز میں نجیب نے اپنا یہ موقف پیش کیا اور واضح طور پر کہا کہ رشدی کو ایسی شرم ناک حرکت نہیں کرنی چاہیے تھی۔

☆☆☆

خطرات کے پیشِ نظر نجیب کو پولیس پروٹیکشن دی گئی۔ وہ محافظوں کے ساتھ گھومتا پھرتا تھا، تاہم اسے یہ پسند نہیں تھا۔ ''تم ایک بوڑھے کو تنہا کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟'' وہ کبھی کبھار اپنے محافظوں سے دریافت کرتا جو جواب میں مسکرا کر اپنی عقابی نگاہوں سے اردگرد کا جائزہ لیتے رہتے۔

وہ ایک آزاد شخص تھا، اور مختلف مواقع پر اس ضمن میں اپنے دکھ کا اظہار کرتا رہتا تھا۔ وہ اکثر سوچا کرتا تھا ''اب میں بوڑھا ہوگیا ہوں، کسی بھی صبح یہ اطلاع آسکتی ہے کہ ضعیف العمر ادیب اس دنیا میں نہیں رہا، ایسے میں کون مجھ پر حملہ کرنے کی زحمت کرے گا؟''

لیکن وہ غلط تھا!

1994 میں جب وہ 82 برس کا تھا، ایک روز قاہرہ میں اس کے گھر کے باہر دو افراد نے چاقو سے وار کرکے اُسے شدید

زخمی کر دیا۔ اس واقعے نے مصر کو دہلا دیا۔ دراصل عام افراد بھی یہ توقع نہیں کر رہے تھے کہ اس قریب المرگ شخص پر حملہ کرنے کی ضرورت محسوس کی جائے گی۔ خوش قسمتی سے وہ حملے کے باوجود زندہ رہا۔

''میاں، جان بچی سو لاکھوں پائے۔ اب اپنی زبان کو لگام دینا سیکھ لو!'' وہیل چیئر پر عیادت کے لیے آنے والے محمد لطیف نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''صحیح بات ہے، جان ہے تو جہان ہے!'' موقعے پر موجود احمد وکی نے ٹکڑا لگایا، جو خود بھی دو بار ہارٹ اٹیک کی اذیت بھگت چکا تھا۔

اُس کا سیدھا ہاتھ شدید متاثر ہوا تھا۔ اس واقعے کے بعد نجیب کے لیے لکھنا خاصا مشکل ہو گیا، وہ ایک دن میں فقط چند منٹ لکھ پاتا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا ''کسی زمانے میں میں بلا امکان لکھا کرتا تھا اور لکھنے کی نشست کئی گھنٹے طویل ہوتی تھی لیکن اب یہ ممکن نہیں تھا۔''

یوں اس کے کام کی رفتار کم ہوتی گئی۔ یہ صورت حال اس کے مداحوں کے لیے بہت کرب ناک تھی۔ مغربی دنیا بھی اس کی تحریروں سے لطف اندوز ہونے کی آرزومندی، تاہم یہ کام مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔

بالآخر 2006ء کے اوائل میں اس کا آخری ناول منظرِ عام پر آیا، جس کا پیش لفظ مصر کی معروف شخصیت احمد کمال نے لکھا۔

☆☆☆

بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ جہاں عوارض اور مشکلات بڑھتی گئیں، وہیں اعزازات میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ وہ نوبیل انعام یافتہ ادیبوں کی فہرست میں طویل ترین عمر پانے والا ادیب تصور کیا جاتا تھا۔ نوبیل انعام سے ہٹ کر، ادب کی دنیا میں بھی اُس کی طویل العمری اعزاز بنی۔ وہ ''برٹرینڈ رسل'' اور ''ہال ڈور لیکسنیس'' کے بعد طویل عمر پانے والے تیسرے ادیب کے طور پر بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور اعزاز بھی تھا، جو نجیب کے نزدیک اُس کی بڑھتی عمر کے طفیل بننے والے ریکارڈز سے زیادہ اہم تھا۔ اپنی موت تک وہ عربی کا واحد ادیب تھا جسے نوبیل انعام ملا۔

امراضِ چشم ایک طویل عرصے سے اُس کے ساتھ تھا جس کے سبب وہ پڑھنے لکھنے کے معاملے میں انتہائی محدود ہو گیا تھا۔ بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں وہ کتاب پڑھنے کے لیے دوسروں کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا تھا جو بلند آواز میں پڑھتے اور نجیب آنکھیں موندے انہیں سُنتا رہتا۔

اپنی موت سے چند برس قبل وہ مکمل طور پر اپنی بینائی سے محروم ہو گیا۔ اگرچہ اُس نے کسی نہ کسی صورت لکھنا جاری رکھا لیکن بعد میں اسے قلم پکڑنے میں بھی شدید مشکل پیش آنے لگی تھی۔ اسی سبب کافی ہاؤس میں دوستوں سے ہونے والی ملاقاتوں میں وقفے آنے لگے۔ دوست اُس کی بابت فکر مند تھے لیکن اس ضمن میں وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ بعد میں وہ گردوں کے امراض میں بھی مبتلا ہو گیا۔

دھمکیوں کے بعد لفظوں کا یہ جادوگر باڈی گارڈز کے نرغے میں آ گیا، جن کی موجودگی، اس کی ناپسندیدگی کے باوجود، اُس کی جان کی حفاظت کے لیے از حد ضروری تھی لیکن اب حالات پہلے جیسے نہیں رہے تھے۔ اُس کا آبائی شہر قاہرہ بھی اب پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔

اُسی زمانے میں اُسے ایک نیا دوست ملا۔ یہ معروف وکیل نبیل حبیب تھا۔ آخری ایام میں نجیب محفوظ نے حبیب ہی کے ہاں قیام کیا۔ دونوں دوستوں کا بیش تر وقت دفتر میں گزرتا تھا۔ نجیب نے اپنے دوست کی لائبریری سے بھی خوب استفادہ کیا۔

قاتلانہ حملے کے بعد گو کہ نجیب کی سرگرمیاں خاصی محدود ہو گئی تھیں لیکن اُس کا دوست ساتھ رہا، اُس وقت تک جب تک اِس تخلیق کار کو موت نے نہیں آ لیا۔

جولائی 2006ء میں نجیب کے سر میں شدید چوٹ آئی، وہ بیمار پڑ گیا۔ اس بیماری نے اگست تک اسے عذاب میں مبتلا رکھا اور قاہرہ اسپتال میں اُس کی موت کے بعد ہی ساتھ چھوڑا۔

موت کے بعد اِس عظیم تخلیق کار کو مکمل احترام کے ساتھ سپردِ خاک کیا گیا۔ اُس کی تدفین کی تقریب حکومتی سطح پر ہوئی۔ زندگی کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والی معروف شخصیات کے علاوہ اعلیٰ عہدے پر فائز حکومتی اہل کار بھی شریک ہوئے۔ نمازِ جنازہ قاہرہ میں ادا کی گئی۔ اُس موقعے پر تمام بڑے ادیبوں نے اُسے خراجِ تحسین پیش کیا۔

نجیب محفوظ خواہش مند تھا کہ اُس کی تدفین میں مصر کے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد شریک ہوں، خصوصاً غریب طبقہ اُس کا ضرور حصہ بنے، تاہم اُس کی یہ آرزو پوری نہیں ہو سکی۔ تدفین میں شرکت کے لیے آنے والے عام افراد کو مصری حکومت کے رویّے کے باعث شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا، جس پر سیکڑوں سوگواروں نے شدید احتجاج کیا جو قاہرہ کے عشق میں مبتلا تاریخ کے اِس مسافر کا آخری دیدار کرنے کے متمنی تھے جسے آج عربی ادب کا چہرہ تصور کیا جاتا ہے، جو اپنے پڑھنے والوں کو ایک ہی پیغام دینا چاہتا تھا:

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے!

سرزمینِ ہند، ارض کا افتخار اور مرجع ضیاء و انوار ہے۔ بڑے بڑے باجبروت شہنشاہوں، فرماں رواؤں کا مسکن ہونے کا شرف اسی دھرتی کو حاصل رہا۔ اس نے انسان کے عروج کا سورج طلوع ہونے، اس کے نصف النہار پر آنے اور پھر غروب ہونے کا عبرت ناک نظارہ بھی کیا۔ بہت سی سلطنتیں، قلم رویں، حکومتیں اور بادشاہتیں اس کے وقار کا اثاثہ رہیں۔

عظیم تر مغلیہ سلطنت، اسی سرزمین کا غرور اور مسلمانوں کی شاندار روایات کی مظہر تھی۔

آسمانِ ہند نے اسی سرزمین پر ساڑھے تین سو سال تک مغلیہ شہنشاہوں کو سریر آرائے سلطنت دیکھا۔ ظہیر الدین محمد بابر، نصیر الدین محمد ہمایوں، جلال الدین محمد اکبر، نور الدین محمد جہانگیر، شہاب الدین محمد شاہجہاں، ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر اور ان کے جانشینوں کا عروج و زوال دیکھا۔

انہیں دھرتی کے سینے کو اپنی محنتوں کے نذرانوں سے سجاتے اور محبتوں سے سینچتے دیکھا۔

آسمانِ ہند، ہمایوں اور حمیدہ بیگم، جہانگیر اور نور جہاں، شاہ جہاں اور ممتاز محل کی انمول چاہتوں اور بے غرض محبتوں کا گواہ بھی رہا۔

آسمانِ ہند نے زمین کی کوکھ سے عجوبۂ عالم تاج محل کا ظہور ہوتے دیکھا جسے بائیس ہزار سے زائد صناعوں نے اپنی شب و روز کی محنتوں سے تراشا۔

تاج محل، جسے آج بھی محبتوں کی علامت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، شہنشاہ شہاب الدین محمد شاہجہاں اور اس کی محبوب ملکہ ارجمند بانو عالیہ ممتاز محل کی لافانی چاہتوں کی حسین یادگار ہے۔

تاج محل بنوانے والے 1628ء سے 1658ء تک السلطان الاعظم والخاقان المکرم ابوالمظفر شہاب الدین محمد

تاریخ کے صفحات میں گم ایک عبرت اثر داستان

ذوالفقار ارشد گیلانی

تاج محل

کلفتِ زیست نے یادوں کا چولا پہنا تو محبت کی ایک انمول نشانی نے جنم لیا جو آج بھی محبت کی عظمت کی خاموش نوا بن کر عجوبۂ عالم کے طور پر مشہور ہے۔ وہ صرف گارے چونے اور پتھر سے بنی عمارت نہیں، تاریخ کا ایک حسین باب ہے جو اپنے سینے میں محبوب کی محبت، بیٹوں کی نفرت اور درباریوں کی سازش کا ثبوت بھی ہے۔

صاحب القرآن ثانی' شاہ جہاں اول' بادشاہ غازی ظل اللہ' فردوس آشیانی کی حیثیت سے بلاشرکت غیرے ہندوستان پر حکومت کرنے والے شہاب الدین محمد شاہجہاں کا شمار عظیم مغل فرماں رواؤں میں ہوتا ہے۔ ظہیر الدین محمد بابر' نصیر الدین محمد ہمایوں' جلال الدین محمد اکبر اور نور الدین محمد جہانگیر کے بعد مغلیہ سلسلے کا یہ پانچواں بادشاہ' نومبری میں اپنے دادا اکبر اعظم کا بے حد چہیتا تھا۔

شاہجہاں کی صلاحیتوں کی وجہ سے اوائل شباب میں ہی اسے جہانگیر کا جانشین سمجھ لیا گیا تھا' چنانچہ 1627ء میں اپنے والد کے انتقال پر وہی تخت نشین ہوا۔ اس کا شمار بلا مبالغہ عظیم مغلوں میں کیا جاتا ہے جبکہ اس کے عہد کو مغلوں کا سنہرا دور کہا جاتا ہے۔ اپنے دادا اکبر کی طرح وہ بھی اپنی سلطنت کو وسعت دینے کا خواہش مند تھا۔ اس کے عہد کی اہم فوجی مہمات میں سلطنت احمد آباد کی جارحی (1636ء)' قندھار میں ایرانیوں کے ہاتھوں شکست (1653ء) اور دکن کے شہزادوں کے خلاف دوسری جنگ (1655ء) شامل ہیں۔ 1658ء میں وہ بیمار ہوگیا تو اس کے بیٹے اورنگ زیب نے اسے قلعہ آگرہ میں نظر بند کردیا جہاں وہ 1666ء میں اپنی موت تک قید رہا۔

اس کے عہد کو مغلیہ طرز تعمیر کا عہد زریں بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے کئی شاندار اور یادگار عمارتیں تعمیر کرائیں جن میں سے اپنی بیوی ارجمند بانو بیگم (ممتاز محل) کے لیے تعمیر کرائے جانے والے تاج محل نے عالمی شہرت حاصل کی۔ آگرہ کی موتی مسجد' دہلی کی جامع مسجد اور دہلی محل کا شمار بھی اس کے عہد کی نادر تعمیرات میں ہوتا ہے۔ تخت طاؤس' جس کی مالیت عہد جدید میں کروڑوں ڈالرز بتائی جاتی ہے' بھی اسی سے منسوب ہے۔ اس نے شاہ جہاں آباد کی بنیاد رکھی جسے فی زمانہ پرانی دلی کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے دہلی کے قلعے میں دیوانِ عام' دیوانِ خاص اور لاہور میں شالیمار باغ بھی تعمیر کرایا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے ہاتھوں تعمیر ہونے والے دہلی محل کا شمار اپنے دور کی خوبصورت ترین عمارتوں میں ہوتا تھا۔

شاہجہاں 5 جنوری 1592ء کو شہاب الدین محمد خرم کی حیثیت سے لاہور میں پیدا ہوا۔ وہ شہنشاہ نور الدین محمد جہانگیر کا تیسرا اور چہیتا بیٹا تھا۔ اس کی ماں ملکہ مان متی' ایک راٹھور راجپوت شہزادی تھی۔ اس کا نام خرم' دادا شہنشاہ اکبر نے تجویز کیا' جس کے معنی خوشی سے بھرپور کے ہیں۔

ابتدائی عمر میں ہی اس کے جوہر کھل کر سامنے آنے شروع ہوگئے اور اس نے ماہر اساتذہ کی زیر نگرانی تعلیم کے ساتھ ساتھ فنِ حرب میں بھی کمال حاصل کیا۔ بعد ازاں اس نے مختلف مہمات میں اپنے والد کی فوجوں کی کمان کی اور ایک زیرک سپہ سالار کی حیثیت سے اپنی شجاعت اور مہارت کا لوہا منوایا۔ اس نے 1615ء میں میواڑ' 1617ء اور 1621ء میں دکن اور 1618ء میں کانگڑہ کی جنگوں میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔

اپنے والد کے عہد میں بیشتر سرحدی معاملات اس نے طے کیے۔ سولہ برس کی عمر میں ہی اس نے فنِ تعمیر کے حوالے سے اس وقت اپنا شوق منوایا جب اس نے باہر کے قلعہ کا حسن میں اپنی رہائش گاہ تعمیر کرائی اور آگرہ قلعہ کی بعض عمارتوں کا ازسرِنو ڈیزائن کیا۔

1607ء میں اس کی منگنی ایک ایرانی امیر کی چودہ سالہ بیٹی ارجمند بانو بیگم سے کردی گئی جس کے بعد یہی دل کش اور نازک اندام لڑکی اس کی زندگی کی پہلی اور آخری خواہش بن گئی۔ ایک دوسرے کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے چاہنے کے باوجود دونوں کو ایک ہونے میں پانچ سال لگے اور 1612ء میں ان کی شادی ہوئی۔

شادی کے بعد شہزادہ خرم کو اندازہ ہوا کہ ارجمند بانو اپنی نوعیت کی ایک ہی لڑکی اور اپنی ہم عمر امیر زادیوں سے مختلف اور منفرد ہے چنانچہ اس نے اپنی نو بیاہتا کو ممتاز محل یعنی محل میں سب سے اعلیٰ کا خطاب دیا۔

خرم نے اکبر آبادی محل اور قندھاری محل نامی دو خواتین سے بھی شادیاں کیں لیکن ان میں سے کوئی بھی عورت ممتاز محل جیسی عزت اور محبت حاصل نہ کرسکی۔ تمام سوانح نگار اور مورخین اس امر پر متفق ہیں کہ خرم کچھ اس طرح ارجمند کی محبت میں گرفتار تھا کہ اس نے سوائے ایک ایک بچہ پیدا کرنے کے' اپنی پہلی دو بیویوں سے ازدواجی تعلقات جاری رکھنے میں کسی دلچسپت کا اظہار نہ کیا۔

مغلیہ دربار کا سرکاری مورخ قزوینی تصدیق کرتا ہے کہ خرم کو دوسری بیویوں سے سوائے اس کے اور کوئی دلچسپی نہ تھی کہ وہ اس کے نکاح میں تھیں۔ شہزادی حضور' ارجمند بانو کے لیے شہزادہ حضور جو شدید محبت' لگاؤ' حمایت اور توجہ رکھتے تھے وہ دنیا کی کسی اور عورت کے لیے نہیں تھی۔

مغل بادشاہت میں چونکہ ولی عہدی صرف کسی بادشاہ کا بیٹا ہونے سے مشروط نہیں تھی اور نہ ہی دولت وقوت کسی کو ورثے میں ملتی تھی اس لیے مغل شاہزادے' دربار میں اپنی اہمیت ثابت کرنے کے لیے جنگی مہمات کا سہارا لیتے تھے۔

احوال زنداں

فیض صاحب لاہور سینٹرل جیل میں تھے۔ ایک دن درد دل کی جگہ ان کے دانت میں بے پناہ درد اٹھا۔ کہنے لگے ''صبح ہمیں پولیس کی گاڑی میں کارڈ کے ساتھ ڈینٹل اسپتال لایا گیا۔ لاہور شہر کے گلی کوچوں سے گزرے۔ تازہ ہوا کو بار بار انہیل کیا۔ خوانچے والے، تانگے والے، ریڑھے، بیل گاڑیاں سب پیچھے رہ گئے یاروں کی طرح میرے قریب سے گزرے۔ بہت مزہ آیا۔ پھر یہ معمول ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب ہمیں روز بلوا لیتے۔ ہمارے دانت میں کوئی دوا لگا دیتے اور دوسرے دن پھر بلوا لیتے۔

ایک دن نہ جانے کیوں جیل والوں کے پاس گاڑی نہیں تھی۔ جیلر نے معذرت کی، آج گاڑی نہیں ہے۔ ہم بضد کہ ہمیں ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔'' جیلر نے کہا ''فیض صاحب، پھر صورت یہی ہے کہ آپ تانگے میں جائیں مگر آپ کو ہتھکڑی پہننی پڑے گی۔''

اس سے اکثر نہ صرف بغاوتیں جنم لیتی تھیں بلکہ تخت نشینی کے لیے جنگیں بھی ہوتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ شہزادہ خرم کے ابتدائی دنوں میں مغل دربار کی سیاسی صورتِ حال نہایت پیچیدہ اور گمبھیر تھی۔

1611ء میں اس کے والد یعنی شہنشاہ جہانگیر نے ایرانی امیر اور بنگال کے صوبے دار علی قلی خان کی بیوہ نور جہاں سے شادی کرلی جو بے حد تیزی سے نہ صرف جہانگیر کے دل ودماغ پر حاوی ہوگئی بلکہ دربار پر اس کا اثر ورسوخ یہاں تک بڑھ گیا کہ اپنے بھائی آصف خان کے ساتھ مل کر وہ سلطنت کے معاملات بھی چلانے لگی۔ ارجمند بانو آصف خان کی بیٹی تھی چنانچہ شہزادہ خرم سے اس کی شادی سے دربار میں اس کی حیثیت مزید مضبوط ہوگئی۔

1617ء میں دکن کے لودھیوں کے خلاف مہم نے ایک جانب مغل بادشاہت کی جنوبی سرحدوں کو مضبوط کردیا تو دوسری جانب مشکور باپ نے اپنے بہادر بیٹے کو شاہجہاں بہادر یعنی آقائے ارض کا خطاب عطا کیا جس سے اس کی ولی عہدی کی توثیق ہوگئی مگر اس کے ساتھ ہی درباری سازشوں میں اس وقت تیزی آگئی جب نور جہاں نے اپنے پہلے شوہر سے پیدا ہونے والی بیٹی لاڈلی کی شادی خرم کے چھوٹے بھائی شہریار سے کرکے تخت کے دعوے دار کی حیثیت سے اپنے داماد کی حمایت شروع کردی۔ آصف خان نے بہن کا ساتھ دیا' جس کے نتیجے میں 1612ء میں خرم نے اپنے والد کے خلاف کھلی بغاوت کردی۔

1626ء میں جہانگیر کی فوجوں نے بغاوت کچل دی اور خرم کو غیر مشروط ہتھیار ڈالنے پڑے لیکن 1627ء میں جہانگیر کے انتقال پر خرم ہی شاہ جہاں کے لقب سے مغل سلطنت کے تخت پر بیٹھا۔

ممتاز محل نے اپنے شوہر سے محبت اور وفاداری کا ثبوت اس طرح دیا کہ تواتر سے ماں بننے کے باوجود اس نے اپنے شوہر کی تمام ابتدائی جنگی مہمات میں اس کے ساتھ ہندوستان کے طول وعرض کا سفر کیا۔ مورخین کا کہنا ہے کہ ممتاز اپنے شوہر کی انتہائی وفادار' قابلِ اعتماد ساتھی اور مستقل ہمراہی تھی۔ مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ ایک ایسی مکمل بیوی تھی جسے اپنے شوہر کی طاقت وقوت سے کوئی غرض تھی نہ اس کے اپنے کوئی سیاسی مفادات تھے' بالفاظ دیگر وہ ان معاملات میں اپنی پھوپو نور جہاں کے مکمل برعکس تھی۔

تاریخ نگار اس کے والد جہانگیر کے عہد کو پُرامن قرار دیتے ہیں لیکن اس کے آخری دنوں میں مغل سلطنت کو کئی خطرات کا سامنا کرنا پڑا۔ شاہ جہاں کا عہد اس کے بالکل برعکس تھا۔ اس نے احمد نگر میں ایک بغاوت کو کچلا' اسی طرح اس نے بنگال پر پرتگیزیوں کا زور توڑا' مغرب اور شمال مغرب میں درہ خیبر کے پار بلخ اور بدخشاں کی راجپوت بادشاہتوں کا خاتمہ کیا۔

شاہ جہاں کی فوجی مہمات کے نتیجے میں شاہی خزانے کو بھاری بوجھ برداشت کرنا پڑا اور اس کے عہد میں سلطنت ایک بہت بڑی فوجی مشین بن کر رہ گئی تھی۔ اس کے امرا اور فوجی سپہ سالار عوام سے زیادہ سے زیادہ ٹیکس لینے میں لگے رہتے تاکہ بڑھتے ہوئے جنگی اخراجات سے نمٹا جاسکے۔

لیکن دوسری طرف اس کا دورِ عام طور پر استحکام کا زمانہ بھی تھا۔ انتظامیہ کو مرکزیت دی گئی اور درباری امور کو باضابطہ بنایا گیا۔ تاریخ نویسی اور دیگر فنونِ لطیفہ کو ترقی دی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ مغل سلطنت نے اپنی وسعت و ترقی کا سفر جاری رکھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ شاہجہاں کے آخری دنوں میں شاہی زوال کے آثار بھی دیکھے گئے۔

اس کے سیاسی اقدامات کی بدولت لاہور' دہلی' آگرہ اور احمد آباد بڑے تجارتی مراکز کی حیثیت سے ابھرے جو سڑکوں اور آبی راستوں کے ذریعے بندرگاہوں اور ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے 1640ء میں دارالسلطنت آگرہ سے دہلی منتقل کیا اور شاہ جہاں آباد نام کا نیا شہر بھی آباد کیا۔ یہیں اس کی بیٹی جہاں آرا بیگم نے چاندنی چوک کی بنیاد رکھی جسے آج بھی دہلی شہر میں بے حد اہمیت حاصل ہے۔

شاہ جہاں کے عہد میں مغلوں کا فنِ تعمیر بھی اپنے بامِ عروج کو پہنچا۔ اس میں دو رائے نہیں کہ شاہجہاں' شاندار عمارتوں کی تعمیر کا بے حد شوقین تھا۔ اس نے آگرہ میں اپنی محبوب بیوی ممتاز محل کے لیے افسانوی تاج محل تعمیر کرایا۔ اس کے عہد کی دوسری تعمیرات میں دہلی کی جامع مسجد اور لال قلعہ' آگرہ قلعے کے کچھ حصے' لاہور کی مسجد وزیر خان' موتی مسجد' لاہور کا شالامار باغ' لاہور قلعے کے بعض حصے (خاص طور پر شیش محل اور نولکھا پویلین) شامل ہیں۔ گجرات کی شاہ جہاں مسجد اور اس کے والد یعنی جہانگیر کا مقبرہ' جس کی تعمیر کی نگرانی اس کی سوتیلی والدہ ملکہ نور جہاں نے کی' شامل ہیں۔

روایات میں ہے کہ شاہ جہاں' تاج محل کے مقابل دریائے جمنا کے دوسرے کنارے اپنے لیے سنگ سیاہ سے اسی طرح کا ایک شاندار مقبرہ تعمیر کرانے کا خواہش مند تھا لیکن اس کے تاریخی شواہد دستیاب نہیں۔

جانشینی کے سلسلے میں شاہ جہاں کو اس وقت مکافاتِ عمل کا سامنا کرنا پڑا جب 1657ء میں وہ بیمار ہوا اور اس کے بیٹے اورنگ زیب نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس نے ولی عہد سلطنت اور اپنے بھائی شہزادہ دارا شکوہ کو سرِعام پھانسی دے دی۔ اس کے باوجود کہ شاہ جہاں مکمل طور پر صحت یاب ہو گیا' اورنگ زیب نے اسے حکمرانی کے لیے نااہل قرار دے کر آگرہ کے قلعے میں نظر بند کر دیا۔

شاہجہاں کی بڑی بیٹی اور اورنگ زیب کی بہن شاہ زادی جہاں آرا بیگم صاحب نے آٹھ سالہ نظر بندی میں رضاکارانہ طور پر اپنے والد کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔

جنوری 1666ء میں شاہجہاں شدید بیمار ہو گیا۔ سخت قسم کے ڈائریا کی وجہ سے وہ اس قدر کمزور ہو گیا کہ بستر سے اٹھنے کے قابل بھی نہ رہ گیا۔ 22 جنوری کو اس نے حرم کی خواتین خصوصاً خاص اپنی بیوی ملکہ اکبر آبادی محل کو جہاں آرا کا خیال رکھنے کی وصیت کی۔

31 جنوری 1666ء کو اس نے کلمہ طیبہ اور چند قرآنی آیات کی تلاوت کی اور اپنی جان' جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ جہاں آرا کی خواہش تھی کہ شاہ جہاں کا جلوس جنازہ شاہانہ انداز میں نکالا جائے جس میں شاہ کی میت اسی طرح سلطنت نے اٹھا رکھی ہو جبکہ آگرہ کے معزز شہری اس کے ہمراہ ہوں اور غریبوں اور ضرورت مندوں میں طلائی اور نقرئی سکے تقسیم کیے جائیں لیکن اورنگ زیب نے اس کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ میت کو اسلامی طریقے سے غسل دیا گیا۔ صندل کی لکڑی سے بنے تابوت میں اسے تاج محل لے جایا گیا اور اس کی محبوب بیوی ممتاز محل کے پہلو میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

مغربی مصنفین نے شاہجہاں کی نجی زندگی کے کئی پہلوؤں کو متنازعہ قرار دیا ہے۔ اپنے آباؤ اجداد کی طرح شاہ جہاں کے حرم میں کئی بیویاں' داشتائیں اور رقاصائیں شامل تھیں۔ کئی مغربی مصنفین نے اس کا یہ طور خاص تذکرہ کیا ہے۔

نکولاؤ مینوکی نے لکھا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ شاہجہاں واحد شوق اپنے جذبات کی تسکین کے لیے خوبصورت عورتیں جمع کرنا تھا اور اس مقصد کے لیے اس نے اپنے دربار میں مستقل بنیادوں پر ایک میلے کے انعقاد کا سلسلہ شروع کیا۔ اس میلے میں خواتین کے علاوہ کسی کو شرکت کی اجازت نہیں تھی۔ میلے میں شمولیت کے لیے امیر یا غریب خواتین کی کوئی قید نہیں تھی تاہم ان کا خوبصورت ہونا بے حد ضروری تھا۔ جب اسے آگرہ قلعے میں قید کیا گیا تو اورنگ زیب نے اسے اپنی تمام رقاصائیں اور گلوکارائیں ساتھ رکھنے کی اجازت دے دی۔

شاہ جہاں کو پہلے درجے کا افیونچی بھی قرار دیا گیا ہے۔ مینوکی یہ بھی لکھتا ہے کہ بہت زیادہ بوڑھا ہونے کے باوجود بھی جسم کے لیے شاہ جہاں کی بھوک اور رغبت کبھی کم نہ ہوئی۔

بعض ذرائع کے مطابق شاہ جہاں نے مجموعی طور پر سات شادیاں کیں۔ اس کی بیویوں کے نام اکبر آبادی محل (وفات 1677ء) قندھاری محل (پیدائش 1594ء، شادی 1609ء) ارجمند بانو' ممتاز محل (پیدائش 1593ء، شادی 1612ء' وفات 1631ء) سیونہ بیگم صاحبہ (شادی 1617ء) موتی بیگم صاحبہ' قدسیہ بیگم صاحبہ' فتح پوری

صاحبہ (وفات بعد از 1666ء) سرہندی بیگم (وفات بعد از 1650ء) شریمتی من بھاوتی بالی جی الہ آبی صاحبہ (شادی 1629ء) کے نام لیے جاتے ہیں۔

تاج محل کی تعمیر اور تشکیل فرماں روا شہاب الدین محمد شاہجہاں کی چہیتی بیوی' ارجمند بانو کو تاریخ میں ممتاز محل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ممتاز محل کے معنی محل کی محبوب اور چنیدہ کے ہیں۔

ممتاز محل اپریل 1593ء میں آگرہ میں پیدا ہوئی۔ وہ ایک ایرانی امیر اور شہنشاہ نورالدین محمد جہانگیر کی ملکہ بننے والی نور جہاں کے بھائی ابوالحسن آصف خان کی بیٹی تھی۔

10 مئی 1612ء کو انیس سال کی عمر میں اس کی شادی شہزادہ خرم سے کر دی گئی جو بعد میں شاہ جہاں اول کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ وہ اپنے شوہر کی تیسری لیکن سب سے چہیتی بیوی تھی۔ ممتاز محل کا انتقال 17 جون 1631ء کو دکن میں برہان پور موجودہ مدھیہ پردیش کے مقام پر اپنے چودھویں بچے' گوہر آرا بیگم نامی بیٹی کی پیدائش کے دوران ہوا۔

بعض مورخین کے مطابق 1607ء میں' جب وہ محض چودہ سال کی تھی' اس کی منگنی شہزادہ خرم سے کر دی گئی تاہم کچھ تاریخ نگار اس منگنی کی تصدیق نہیں کرتے۔ منگنی کے بعد ہی وہ اس کی واحد اور زندگی کی اکلوتی محبت کی حیثیت اختیار کر گئی لیکن شادی کے لیے انہیں پانچ سال انتظار کرنا پڑا بالآخر شاہی جوتشیوں کی جانب سے ایک سعد تاریخ کے انتخاب کے بعد 1612ء میں ان کی شادی کر دی گئی۔ انہوں نے ایک خوش گوار زندگی کا آغاز کیا۔

مورخین کے مطابق شہزادہ خرم نے ارجمند بانو کو اپنے حرم کی جملہ خواتین میں محبوب اور ممتاز پایا اور ٹوٹ کر اس سے محبت کی۔ جس کا ارجمند نے بھی بھرپور جواب دیا۔ اسی لیے شاہ جہاں نے اسے ممتاز محل کے خطاب سے نوازا۔ تواریخ میں شہزادہ خرم کی مزید بیویوں کا ذکر بھی ہے لیکن جو دلچسپی اسے ممتاز سے تھی وہ دنیا کی کسی اور عورت میں نہیں تھی۔

ممتاز محل نے اپنے شوہر کے ساتھ محبتوں سے بھرپور ازدواجی زندگی گزاری۔ کہتے ہیں کہ وہ بے حد وجاہت خوبصورت تھی چنانچہ شاعروں نے اس کی حیات میں بھی اس کے حسن جہاں سوز' رحم دلی اور عزت و وقار کے بارے میں ان گنت قصائد لکھے۔ شاہ جہاں' اس پر اس قدر اعتماد کرتا تھا کہ شاہی مہر "مہر افزا" بھی اس کے پاس ہوتی تھی۔

اپنی پھوپو' سوتیلی ساس اور شہنشاہ جہانگیر کی ملکہ نور جہاں کے برعکس اس نے نہ تو کوئی سیاسی مفادات تھے اور نہ ہی اس نے کبھی درباری معاملات میں اپنے شوہر پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی۔ اس کا شوہر اس کی تمام خواہشات پوری کرتا لیکن اس نے سوائے غریبوں کی مدد کے کبھی اپنی اس حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔

درباری مورخین نے ان کے پُرجوش ازدواجی تعلق کا بہ طور خاص تذکرہ کیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ انیس سالوں میں شاہجہاں کے تیرہ بچوں کی ماں بنی جبکہ چودھویں بچے کی پیدائش کے دوران عین عالمِ شباب میں اس کی موت واقع ہوئی۔

کہا جاتا ہے کہ وہ ہاتھیوں کی لڑائی اور جنگی کھیل تماشے دیکھنے کی بے حد شوقین تھی۔ مغلوں کے ہاں یہ عام تھا کہ طبقۂ امرا کی خواتین تعمیرات میں بھی دلچسپی رکھتی تھیں چنانچہ ممتاز محل نے بھی آگرہ میں لب دریا واقع باغ میں کچھ وقت گزارا۔

1631ء میں اپنے انتقال کے وقت بھی وہ اپنے شوہر کے ہمراہ تھی جو اُن دنوں ضلع مرتفع دکن میں باغیوں کے خلاف ایک مہم میں مصروف تھا۔ ممتاز محل کو عارضی طور پر زین آباد نامی ایک باغ میں دفن کیا گیا جسے شاہ جہاں کے چچا دانیال نے دریائے تاپتی کے کنارے تعمیر کرایا تھا۔

ممتاز محل نے انیس سال شاہ جہاں کے ساتھ گزارے اور اس کے سولہ میں سے چودہ بچوں کی ماں بنی۔

اس کے بطن سے جن بچوں نے جنم لیا' ان کے نام یہ ہیں۔

حور النساء بیگم..... 1613ء بہ مطابق 1022ھ

جہاں آرا بیگم..... 2 اپریل 1614ء بہ مطابق 21 صفر 1023ھ

دارا شکوہ..... 30 مارچ 1615ء بہ مطابق 29 صفر 1024ھ

شاہ شجاع..... 3 جولائی 1616ء بہ مطابق 18 جمادی الثانی 1025ھ

روشن آرا بیگم..... 3 ستمبر 1617ء بہ مطابق 2 رمضان 1026ھ

اورنگ زیب..... 3 نومبر 1618ء بہ مطابق 15 ذی قعدہ 1027ھ

سلطان امید بخش..... اکتوبر 1619ء بہ مطابق شوال 1028ھ

شہزادی ثریا بیگم..... 10 جون 1621ء بہ مطابق 20 رجب 1030ھ

ایک بیٹا..... 25 اگست 1623ء بہ مطابق 1032ھ

مراد بخش..... 18 اکتوبر 1624ء بہ مطابق 25 ذی الحجہ 1033ھ

لطف اللہ..... 4 نومبر 1626ء بہ مطابق 14 صفر 1036ھ

سلطان دولت افزا..... 9 مئی 1628ء بہ مطابق 5 رمضان 1037ھ

حسن آرا بیگم..... 23 اپریل 1630ء بہ مطابق 10 رمضان 1039ھ

ایک بیٹی..... 17 جون 1631ء بہ مطابق 17 ذی قعد 1040ھ

کہا جاتا ہے کہ ممتاز محل نے بستر مرگ پر اپنے شوہر سے اس آخری خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اس کی موت کے بعد ان کی محبت کی شاندار یادگار تعمیر کی جائے۔ اس نے اپنے شوہر سے یہ فرمائش بھی کی کہ وہ اس کے بعد کوئی اور شادی نہ کرے اور محبت سے معمور اور جذبات سے سرشار بادشاہ نے وعدہ کرنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی۔

مورخین نے ملکہ ممتاز محل کے انتقال پر شہنشاہ شاہ جہاں کے غیر معمولی ردِعمل اور سوگ کا بہ طور خاص ذکر کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ملکہ کی موت پر بادشاہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا جبکہ کتابوں میں ہے کہ شاہ نے ملکہ کی موت کا ایک سال تک گوشہ تنہائی میں سوگ منایا تھا۔ جب وہ دوبارہ نمودار ہوا تو اس کے سر کے تمام بال سفید ہو چکے تھے' کمر جھک گئی تھی اور چہرہ سوجا ہوا تھا۔ شاہ جہاں اور ملکہ ممتاز محل کی بڑی بیٹی شہزادی جہاں آرا بیگم نے اپنے والد کو اس کیفیت سے باہر نکالنے میں اہم کردار ادا کیا۔

ملکہ ممتاز محل کے ذاتی خزانے کی مالیت ایک کروڑ روپے تھی جس کا نصف شاہ جہاں نے شہزادی جہاں آرا اور باقی دیگر بچوں کو دیا۔

ملکہ ممتاز محل کو برہان پور میں عارضی طور پر سپردِ خاک کیا گیا لیکن شاہ جہاں نے اس شہر کو بھی اپنی چہیتی بیوی کی آخری آرام گاہ کے طور پر قبول نہ کیا۔ دسمبر 1631ء میں ملکہ ممتاز محل کے جسدِ خاکی کو ایک طلائی تابوت میں آگرہ منتقل کر دیا گیا۔ اس شاہی جنازے کے جلوس کی نگرانی کے فرائض ملکہ ممتاز کے بیٹے شاہ شجاع کے ذمے تھے۔

آگرہ میں دریائے جمنا کے کنارے اسے ایک چھوٹی سی عمارت میں دفن کیا گیا۔ شاہ جہاں اپنی مہم کی تکمیل کے لیے برہان پور میں ہی رکا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے وہیں اپنی بیوی کے لیے ایک شاندار مقبرہ اور اس سے متحل باغ تعمیر کرنے کی منصوبہ بندی کر لی تھی لیکن اس کی چہیتی ملکہ آخری آرام گاہ مکمل ہونے اور اس کی مستقل تدفین میں مزید بیس برس لگ گئے۔

اور..... آج تاج محل صرف ملکہ ممتاز محل کی ابدی آرام گاہ ہی نہیں بلکہ روئے زمین پر اصول محبتوں اور بے لوث چاہتوں کی نشانی بھی ہے۔

تاج محل کو باضابطہ طور پر 2007ء میں عجائب دنیا کے سات عجائبات میں شامل کیا گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لافانی تعمیر کے دن سے ہی یکتائے روزگار رہا ہے۔ اسے دیکھ کر ہر شخص یہ احساس ہوتا ہے کہ.....

حریم دور کے جھگڑے وہ سمجھے جس کو فرصت ہو
یہاں حدِ نظر تک صرف عنوانِ محبت ہے

تاج محل صرف محبت کی علامت ہی نہیں خوبصورتی اور دل کشی کا نادر نمونہ بھی ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس عمارت کے جمالیاتی حسن کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

تاج محل کے نام کے حوالے سے مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ نام ممتاز محل سے منسوب ہے جبکہ انگریزی میں اس کا ترجمہ CROWN PALACE کیا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ فارسی زبان کا لفظ ہے جو اس دور میں مغلوں کی سرکاری اور درباری زبان تھی۔

بعض ذرائع کا کہنا ہے کہ تاج محل کا نام اسی بستی کے نام پر رکھا گیا ہے جو یہاں دفن ہے۔ شاہ جہاں کی بیوی کا اصل نام ارجمند بانو تھا لیکن بادشاہ بننے کے بعد شاہ جہاں نے اسے ممتاز محل کا خطاب دیا۔ لفظ ''تاج'' درحقیقت ممتاز کا ہی مخفف ہے جس کے ساتھ محل کا اضافہ کر دیا گیا۔

متعصب ہندو جو ہر مسلمان بادشاہ کے تعمیراتی شاہ کار کو ہندو ثقافت کی باقیات قرار دینے میں ایک لمحہ ضائع نہیں کرتے' اس بات پر مُصر ہیں کہ تاج محل کا نام بھی ہندو دیوتا شیو کے مندر ''تیجو مہالیا'' کے نام سے مستعار لیا گیا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ شاہ جہاں نے اس مندر پر قبضہ کر کے اسے اپنی بیوی کا مقبرہ بنا دیا اور اسے تاج محل کی شکل دے دی۔

بھارتی ریاست اتر پردیش کے شہر آگرہ کے مضافات میں دریائے جمنا کے کنارے مکمل طور پر سنگِ مرمر کا شاہکار اور تاج یا تاج محل کے نام سے پکاری جانے والی اس عمارت کی تعمیر کا آغاز 1631ء میں ہوا اور اس کی تکمیل میں بائیس سال سے زائد کا عرصہ لگا۔ بعض تاریخ نگاروں نے اس کا سنِ تعمیر 1653ء تحریر کیا ہے تاہم کہا جاتا ہے کہ تاج محل کا تعمیراتی کام اس کے بعد بھی جاری رہا۔

خالص اسلامی اور ایرانی انداز میں تعمیر ہونے والی دنیا کی اس خوب صورت ترین عمارت پر بیس کروڑ روپے یعنی اڑسٹھ ہزار امریکی ڈالرز لاگت آئی۔ استعمال ہونے والا سنگِ مرمر بھارت کے علاوہ جنوبی ایشیا کے مختلف حصوں سے منگوایا گیا۔ بیس سے بائیس ہزار افراد نے اپنی صلاحیتیں ایک سو چوبیس شکل دینے میں دن رات کی پروا کیے بغیر صرف کیں جبکہ ایک ہزار سے زائد ہاتھی عمارتی سامان کو تاج محل کی جگہ تک پہنچانے کے لیے استعمال کیے گئے۔

تاج محل کی اہمیت اور شہنشاہ شاہ جہاں کی اس سے دلچسپی کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی اندرونی سجاوٹ اور تزئین و آرائش میں اٹھائیس مختلف اقسام کے زرد جواہر استعمال کیے گئے۔

محبت کی یہ علامت آج سات عجائباتِ عالم کے علاوہ یونیسکو ورلڈ ہیریٹیج سائٹس میں شامل ہے۔

تاج محل کی مرکزی عمارت ایک وسیع و عریض باغ کے آخری سرے پر واقع ہے جبکہ تاج محل کمپلیکس پانچ حصوں پر مشتمل ہے جنہیں دروازہ' باغیچہ' مسجد' نقار خانہ اور روضہ کے نام دیے گئے ہیں۔

تاج محل کا داخلی دروازہ' عظیم الشان گنبد والی مرکزی عمارت کے ساتھ طویل نہر کے آخری سرے پر واقع ہے۔ تاج محل کی عمارت کے ایک جانب مسجد ہے جبکہ دوسری جانب غالباً عمارت میں توازن پیدا کرنے کے لیے نقار خانہ تعمیر کیا گیا ہے۔

تاج کی مرکزی عمارت ایک بلند چبوترے پر بنائی گئی ہے' جس کے چاروں کونوں پر چوکور چبوترے موجود ہیں۔ عمارت کو اس طرح تعمیر کیا گیا ہے کہ اس کے تمام حصے مرکزی عمارت سے متصل اور منسلک ہونے کے باوجود الگ اور علیحدہ شناخت کے حامل نظر آئیں۔

تاج محل کے ڈیزائن' لے آؤٹ اور تعمیر میں جیومیٹری اور ریاضی کے اصولوں کو مکمل طور پر مدِنظر رکھا گیا ہے۔ اس کے چاروں میناروں کی بلندی 162.5 فٹ رکھی گئی ہے تاکہ اس کا 58 فٹ قطر اور 213 فٹ کی بلندی کا حامل عظیم الشان گنبد اور اس کے ساتھ متصل چار چھوٹے گنبد واضح اور منفرد نظر آئیں۔

تاج محل کے اس وسیع گنبد کے نیچے شاہ جہاں اور ممتاز محل کی قبریں ہیں۔ دونوں قبریں تہ خانے میں ہیں اور ان کے عین اوپر مرکزی دالان میں نقلی تعویذ بنائے گئے ہیں جو مغلیہ مقابر کا منفرد انداز رہا ہے۔ اس دالان میں روشنی کے لیے سنگِ مرمر کی جالیاں نصب کی گئی ہیں۔

اس عمارت میں شاید ایک کے سوا کوئی مستقم نہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ واحد مستقم بھی اسی شخصیت کا پیدا کردہ ہے جو اس شاندار عمارت کا معمار ہونے کے ناتے اسے روئے زمین پر سب سے منفرد اور دل کش بنانے کا خواہش مند تھا۔

تاج محل ایک ہستی یعنی ممتاز محل کی قبر کے لیے ڈیزائن کیا گیا تھا لیکن بعد میں شہنشاہ اورنگ زیب کے حکم پر شہنشاہ شاہ جہاں کو بھی اس کی محبوب بیوی کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ گو اس تدفین میں خود شاہ جہاں کی خواہش کا کوئی عمل دخل نہ تھا لیکن یہ بھی طے ہے کہ اس سے تاج محل کا تعمیراتی حسن اور امتزاج عدم توازن کا شکار ہوا۔

تاج محل کی چھت کی اندرونی جانب کو سجانے کے لیے خطاطی کا سہارا لیا گیا ہے۔ قرآن مجید کی آیاتِ کریمہ کو سنگِ مرمر پر زبرجد یا سنگِ یشب کی مدد سے کندہ کیا گیا ہے۔ انیس ایرانی نژاد خطاط امانت خان نے خطِ ثلث میں تحریر کیا ہے۔ ایسی کئی سلوں پر امانت خان نے اپنے دستخط بھی ثبت کیے ہیں۔

تاج محل میں جن سورتوں کی آیات کندہ کی گئی ہیں ان کے نام یہ ہیں۔

سورہ 91..... سورۃ الشمس
سورہ 112..... سورۃ الاخلاص
سورہ 89..... سورۃ الفجر
سورہ 93..... سورۃ الضحیٰ
سورہ 95..... سورۃ التین
سورہ 94..... سورۃ الم نشرح
سورہ 36..... سورۃ یاسین
سورہ 81..... سورۃ التکویر
سورہ 82..... سورۃ الانفطار
سورہ 84..... سورۃ الانشقاق
سورہ 98..... سورۃ البینۃ
سورہ 67..... سورۃ الملک
سورہ 48..... سورۃ الفتح
سورہ 77..... سورۃ المرسلٰت
سورہ 39..... سورۃ الزمر

تاج محل کا دروازہ 93 فٹ بلند ہے اور یہ 1632ء سے 1638ء کے دوران پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ یہ تاج محل کے پانچ اہم حصوں میں سے ایک ہے۔ ہندوانی تصورات سے متاثر یہ عظیم الشان دروازہ محراب کی صورت' اصل عمارت کی نصف بلندی تک اونچا ہے۔ اسے سنگِ سیاہ سے تعمیر کیا گیا ہے اور اس پر مختلف قرآنی آیات کندہ ہیں۔ دروازے کے

اندرونی سمت کئی طاق ہیں جن میں پھول پتیاں اور نقش ونگار بنائے گئے ہیں۔ ان میں زیادہ تعداد کنول کے پھولوں کی ہے جنہیں سنگِ مرمر پر قیمتی پتھروں کی مدد سے تراشا گیا ہے۔

دروازے کو مزید خوبصورت بنانے کے لیے بڑے طاق کی بالائی سمت' آنسو کا سفید قطرہ تراشا گیا ہے جس میں سرخ رنگ کا ایک ترشول بھی بنایا گیا ہے۔ سامنے کی سمت واقع یہ بلند دروازہ' تاج محل کی تعمیر کے دوران بھی داخلے کا مرکزی ذریعہ تھا۔

ہندو مصنفین اور ماہرین کا دعویٰ ہے کہ دروازے میں بنے ہوئے تمام طاق ہندوانی طرز کے ہیں۔ یہ تمام طاق' پھول' بیلیں اور پتیاں' پیچ دار انداز میں محض خوبصورتی کے لیے بنائی گئی ہیں اور ان میں جیومیٹری یا ریاضی کے اصولوں کا کوئی عمل دخل نہیں۔ سرخ رنگ کا کنول کا پھول ہندو دیوتا برہما کا امتیازی نشان ہے اس لیے ان ماہرین کا کہنا ہے کہ تاج محل کی تعمیر پر ہندوانی رنگ غالب ہے۔

تاج محل کا دوسرا اہم ترین حصہ مسجد ہے جسے تاج کی مغربی سمت سرخ پتھر سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اسے چونکہ نماز کے لیے بنایا گیا تھا اس لیے قدرتی طور پر اس کا رخ مغرب کی جانب ہے۔ مسجد کے کنوئیں کی نزدیکی چار دیواری کے ساتھ ایک چھوٹا سا عملی احاطہ ہے جہاں مرکزی روضے میں تدفین سے پہلے ملکہ ممتاز محل کا جسد خاکی رکھا گیا تھا۔ مسجد کے چار بہشت پہلو مینار اور تین شاندار گنبد ہیں۔

مسجد کا چمک دار فرش ایسے مواد سے بنایا گیا ہے جو بہ ظاہر سرخ ریشم جیسا ہے اور اس میں پانچ سو اناسی نمازیوں کی گنجائش ہے۔ مسجد کی اندرونی سمت اللہ تعالیٰ کے اسمائے ربانی اور قرآنی آیات کی خطاطی کی گئی ہے۔ اس کے عین مقابل اس مسجد کی ایک جوابی نقل بھی تعمیر کی گئی ہے لیکن اس میں کبھی نماز ادا نہیں کی گئی۔

اصل تاج محل ملکہ ممتاز محل کا وہ روضہ ہے جو مرکزی داخلی دروازے سے نو سو فٹ کے فاصلے پر تاج کے دلکش اور دلفریب باغ کے مقابل دو سو فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ تاج کے نیچے سرخ پتھر سے بنا وسیع و عریض چبوترہ ہے جسے ہموار زمین کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے اوپر سنگِ مرمر کی ایک اور شہ نشین ہے جس پر اس عظیم الشان مقبرے کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ سنگِ مرمر کے اس چبوترے کے چاروں کونوں پر 138 فٹ بلند مینار ہیں جن کے قبوں میں آٹھ آٹھ کھڑکیاں ہیں۔

تاج محل کا اندرونی حصہ بھی بیرونی حصے سے کم خوبصورت نہیں۔ تمام اندرونی ایوانوں کو بھی شاندار اور بے مثال خطاطی سے سجایا گیا ہے۔ مقبرے کے تمام اندرونی زاویے ہشت پہلو اور یکساں سائز کے ہیں۔ دیوار دو منزلہ کے نچلے حصوں پر علیحدہ قسم کا پلاستر کیا گیا ہے اور انہیں بھی دلکش بیل بوٹوں کے علاوہ کنول کے پھولوں سے سجایا گیا ہے۔

روضے کا وسطی کمرا باقی کمروں سے نسبتاً بلند ہے۔ اس سے متصل لیکن قدرے نیچے چار مزید ہشت پہلو کمرے موجود ہیں جو یقینی طور پر شاہی خاندان کے دیگر افراد کی قبروں کے لیے بنائے گئے تھے۔ وسطی کمرے میں پہلو بہ پہلو دو قبریں ہیں جن میں سے ایک شہنشاہ شہاب الدین شاہ جہاں اور دوسری ملکہ ممتاز محل کی ہے۔ شاہ جہاں کی قبر اپنی محبوبہ کی قبر کے بائیں جانب اور قدرے بلند ہے۔ دونوں قبروں کے تکیے فارسی زبان میں تحریر کیے گئے ہیں جبکہ ممتاز محل کی قبر پر بعض قرآنی آیات بھی کندہ ہیں۔

وسطی کمرے کی چھت کے ساتھ ایک نفیس فانوس آویزاں ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ اسے جلانے کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ قبروں کے اطراف میں بھی سنگِ مرمر کی نازک جالیاں نصب ہیں جن میں قیمتی پتھر جڑے گئے تھے۔

تاج محل کمپلیکس کی ایک اور اہم عمارت نقار خانہ ہے۔ تاج محل کی مسجد کے عین سامنے تاج کی مشرقی جانب ایک یادگار واقع ہے جسے جڑواں مسجد بھی کہا جاتا ہے۔ سرخ پتھروں سے بنی اس عمارت کو نقار خانہ' تاج محل ریسٹ ہاؤس یا ''جواب'' کے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ مسجد کے برعکس اس کا رخ خانہ کعبہ کی طرف نہیں۔ اسے عین مسجد سے مشابہ تعمیر کیا گیا ہے لیکن آج تک اس میں کبھی نماز ادا نہیں کی گئی اور نہ ہی تاج محل کے ساتھ اس کی تعمیر کے .... مصرف کے بارے میں کوئی اندازہ لگایا جا سکا ہے۔

تاہم بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسے محض تاج محل میں یکسانیت اور توازن پیدا کرنے کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے در و دیوار پر بھی سنگِ مرمر سے نقش ونگار بنے ہوئے ہیں۔ مسجد اور نقار خانے کے درمیانی حصے کا فرش اس قدر شفاف ہے کہ اس میں پورے تاج محل کا عکس دکھائی دیتا ہے۔

تاج محل کا پانچواں اور آخری اہم ترین جزو اس کے باغات ہیں۔ ایرانی انداز میں بنے ہوئے وسیع باغ کو چار مساوی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن کے وسط میں دو نہریں بہتی ہیں۔ کیاریوں کی مجموعی تعداد سولہ ہے جن میں سدا بہار پھولوں کے علاوہ بعض پھل دار درخت بھی لگائے گئے ہیں۔ تاج محل کا باغ داخلی دروازے سے تاج کی بنیادوں تک

پھیلا ہوا ہے۔

پھولوں' پھلوں' پرندوں' پتوں اور توازن و یکسانیت کے ساتھ باغ لگانے کا ایرانی انداز ہندوستان میں شہنشاہ ظہیرالدین بابر نے متعارف کرایا تھا۔ ان باغات کو ریاضی کے اصولوں کے تحت آباد کیا گیا اور ان میں قدرتی منظر کشی کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ تاج بھی ایسے ہی باغات کا تسلسل ہے کیونکہ اس میں بھی استعمال کیا جانے والا سب سے اہم عنصر چار کا ہندسہ ہے۔

چار کا عدد' اسلام میں بھی نہایت اہم حیثیت کا حامل ہے چنانچہ تاج محل کے باغ کو بھی چار باغ کی ترکیب پر ہی لگایا گیا۔ باغ چار حصوں میں تقسیم ہے اور ان کے وسط میں سنگ مرمر کی دو نہریں ہیں جن میں جگہ جگہ فوارے نصب ہیں۔ ہر حصے کو مزید سولہ باغیچوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کے لیے پتھر کی روشیں تعمیر کی گئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں ہر باغیچے میں چار سو پودے لگائے گئے تھے۔

باغ میں لگائے جانے والے بے پھل پودے' موت اور پھل دار درخت' زندگی کی علامت تھے اور انہیں لگانے میں بھی ایک خاص ترتیب کو مدنظر رکھا گیا تھا۔ تاج محل' باغ کے بجائے اس کے شمالی کونے پر ہے کیونکہ باغ کے وسط میں تاج اور مرکزی داخلی دروازے کے درمیان' ایک بلند حوض ہے جس کے پانی میں پورے تاج محل کا عکس نظر آتا ہے۔

تاج محل کو پانی کی فراہمی کا نظام بھی کسی عجوبے سے کم نہیں۔ ماہرین تعمیرات نے اس نظام کو نہایت مہارت اور ہنرمندی سے ڈیزائن کیا ہے۔ تاج محل کا پانی دریائے جمنا سے کھینچا جاتا ہے اور اسے کئی زیر زمین پائپوں کے ذریعے تاج تک لایا جاتا تھا۔ دریا سے پانی کھینچنے اور وہاں سے اسے بڑے بڑے اسٹوریج ٹینکس میں منتقل کرنے کے لیے پور (بیلوں کے ذریعے رسی اور مشکیزے سے پانی بھرنا) کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس تالاب سے پانی نکالنے کے لیے تیرہ مزید پور استعمال کیے جاتے تھے۔ یہاں سے ایک بالائی پائپ لائن کے ذریعے پانی کو ایک اور تالاب میں پہنچایا جاتا تھا۔ اس تالاب سے پانی نکالنے کا کام مزید چودہ پور انجام دیتے۔ ایک اور ذیلی نہر کے ذریعے یہ پانی تین تالابوں میں منتقل کیا جاتا۔ ان میں سے آخری تالاب کے پائپ اس کی مشرقی دیوار میں نصب تھے۔ یہی پائپ زمین کے نیچے سے تاج میں داخل ہوتے۔ ان میں سے ایک مسجد کے فواروں کو پانی فراہم کرتا جبکہ شمالاً جنوباً نہر اور کنول کے پھول سے مشابہ بڑے حوض کو تانبے کے پائپوں کے ذریعے پانی پہنچایا جاتا۔

فواروں میں پانی کے دباؤ کو یکساں رکھنے کے لیے فوارے کے پائپ کے نیچے تانبے کا ایک برتن لگایا گیا۔ پانی پہلے اس برتن میں جمع ہوتا اور پھر ایک ساتھ فوارے کے تمام سوراخوں سے باہر نکلتا۔ تمام پائپوں کو زمین کے اندر بچھایا گیا تھا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ طویل عرصہ گزرنے کے باوجود تاج محل کو پانی فراہم کرنے والے تمام آلات نہ ہوتے آج بھی موجود بلکہ قابل استعمال ہیں۔

روایت ہے کہ ہر حسن' اپنے اندر درجنوں داستانیں سموئے ہوتا ہے۔ حسین و جمیل تاج محل کے ساتھ بھی یہی صورت درپیش ہے۔ تاج کے ساتھ بھی کئی افسانے اور کہانیاں وابستہ ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی تاریخی اعتبار سے درست ثابت نہ ہوسکی البتہ ان سے لوگوں کے تجسس میں اضافہ ضرور ہوا ہے اور وہ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں۔

سب سے زیادہ زبان زدِ عام افسانہ سیاہ تاج محل کا ہے۔ یہ وہ تاج محل ہے جسے موجودہ تاج محل کی طرز پر ہو بہو اس کی نقل کی صورت دریائے جمنا کے دوسرے کنارے اس کے عین مقابل تعمیر کیا جانا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ جہاں نے یہ مقبرہ اپنے لیے تعمیر کرانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اسے سیاہ تاج محل کا نام دیا جانا تھا کیونکہ اسے موجودہ تاج محل کے سنگ سفید کے برعکس سنگ سیاہ سے تعمیر کیا جانا تھا۔ اس افسانے کو بیان کرنے والوں کا استدلال یہ ہے کہ اسے محض اس وجہ سے تعمیر نہ کیا جاسکا کیونکہ شاہ جہاں کے بیٹے اورنگ زیب عالمگیر نے اسے معزول کرکے قید میں ڈال دیا تھا۔

بعض لوگوں نے سیاہ تاج محل کی موجودگی کی گواہی بھی دی ہے چنانچہ بہت سے ذہنوں میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا سیاہ تاج محل کا واقعی کوئی وجود تھا۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ دریا کے پار سیاہ پتھروں کے ایک عمارتی ڈھانچے کے کھنڈر پائے گئے ہیں۔ بعد کی تحقیق سے ثابت ہوا کہ یہ وہ سنگ مرمر تھا جو تاج محل کی تعمیر میں استعمال نہ ہوسکا اور بے کار پڑا رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کی رنگت سیاہ ہوگئی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ استعمال شدہ سنگ مرمر تھا لیکن اس کی رنگت سفید نہ تھی چنانچہ بعد میں گہری ہوکر یہ سیاہی میں تبدیل ہوگئی۔

کچھ ذرائع یہ توجیہہ پیش کرتے ہیں کہ مغلیہ باغ اور اس سے متصل باغیچے ہمیشہ کراس کی صورت بنتے تھے اور یہ جمع نشان اسی صورت مکمل ہوتا تھا جبکہ اس میں دریا پار کے کھنڈر بھی شامل کیے جاتے۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ دریا کے کھنڈر بھی تاج محل کمپلیکس کا حصہ تھے اور تاج کے باغات دریا کی دوسری جانب بھی پھیلے ہوئے تھے لیکن دیکھ بھال نہ ہونے کے باعث یہ کھنڈر میں تبدیل ہوگئے۔

تاج محل کے بارے میں ایک اور کہانی یہ ہے کہ دنیا میں محبت کی یہ منفرد اور شاندار یادگار رفتہ رفتہ زمین میں دھنس رہی ہے۔ دریائے جمنا کے عین کنارے واقع اس بھاری بھرکم عمارت کی تعمیر میں ہر ممکن احتیاط مدنظر رکھی گئی اور ماہرین نے اس کی پائیداری کے لیے تمام اقدامات کیے تھے۔ ماہرین تعمیرات نے اس کے ہزاروں ٹن وزن کو مخصوص انداز میں نہ صرف تقسیم کیا بلکہ تعمیر کے لیے مضبوط ترین سامان بھی استعمال کیا لیکن اسے کیا کہیے کہ تمام تر احتیاط کے باوجود تعمیر کے محض چار سال بعد ہی اس کے کچھ حصوں میں بعض خفیف سی دراڑیں پائی گئیں۔

جب اورنگ زیب کو تحریر کردہ خطوط کے ذریعے ان کی بابت بتایا گیا تو اس نے اس کی فوری مرمت کے احکامات جاری کیے۔ 1810ء میں ایک مرتبہ پھر تاج محل میں بعض دراڑوں کا انکشاف ہوا۔ اس بار ان کی نوعیت زیادہ خطرناک اور سنجیدہ تھی۔ چنانچہ یادگار کے تحفظ اور اس کی تزئین و آرائش کے لیے باقاعدہ ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔

انکشاف ہوا کہ تاج محل کی شمالی جانب جنوبی سمت کی نسبت تقریباً دو انچ دریا کی طرف جھک گئی ہے۔

تاج کا بیرونی حصہ تو محفوظ تھا لیکن اس کی دوسری منزل اور شمالی طرف کے تہ خانوں میں دراڑوں کا پتا چلا۔ ماہرین کے مطابق ان ہلکی سی دراڑوں کی دو وجوہات ہوسکتی تھیں۔ ممکن ہے کہ تاج میں استعمال ہونے والے بھاری سنگ مرمر کی وجہ سے اس کی سلوں کو آپس میں پیوست کرنے والا چونا دب گیا ہو اور تاج دریا کی سمت جھکنے لگا ہو۔ دھنستے ہوئے تاج کو اس وقت زیادہ شہرت ملی جب کمزور حصوں سے اس کا وزن منتقل کرنے اور بانٹنے کی تجویز پیش کی گئی۔

اسی طرح تمام تر خوبصورتی' دلکشی اور انفرادیت کے باوجود مصنفین اور محققین تاج محل کے عدم توازن کو نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ عدم توازن شاہ جہاں کی قبر کے باعث پیدا ہوا۔ عدم توازن کا یہ افسانہ شاہ جہاں کی موت اور اورنگ زیب کے احکامات پر تاج محل میں اس کی تدفین سے منسلک کیا جاتا ہے۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ اورنگ زیب نے شاہ جہاں کا علیحدہ مقبرہ تعمیر کرانے کے بجائے جان بوجھ کر اسے تاج محل میں ارجمند بانو کے پہلو میں سپرد خاک کردیا اور یہ صرف اور صرف تاج محل کی خوبصورتی کو داغ دار کرنے اور اس کے توازن کو بگاڑنے کے لیے کیا گیا۔

اس بارے میں یہ استدلال پیش کیا جاتا ہے کہ اسلام میں زندگی اور موت کے حوالے سے نمود و نمائش کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ اورنگ زیب چونکہ ایک کٹر مذہبی شخص تھا اس لیے اس نے قرآنی تعلیمات کے عین مطابق جاہ و حشم کی حوصلہ شکنی کی۔ اسی وجہ سے اپنے والد کی طرف سے اپنی بیوی کا مقبرہ تعمیر کیے جانے کو اس نے کبھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھا۔ چنانچہ جب شاہ جہاں کا انتقال ہوا تو اس نے یہ سوچے بغیر کہ اس سے مقبرے کی خوبصورتی متاثر ہوگی' بادشاہ کی یہیں تدفین کے احکامات دیے۔ یہی وجہ ہے کہ تاج محل کا اندرونی حصہ قدرے غیر متوازن ہے۔

تاج محل سے وابستہ کہانیوں میں سے ایک' اس کے راجپوت محل ہونے سے متعلق بھی ہے۔ بہت سے لوگ خصوصاً ہندو بنیاد پرست اس امر پر یقین رکھتے ہیں کہ تاج محل' شاہ جہاں نے تعمیر نہیں کرایا۔

ان کا پختہ خیال ہے کہ یہ ایک راجپوت محل تھا جسے چوتھی صدی عیسوی میں تعمیر کرایا گیا تھا۔ شاہ جہاں نے اس پر قبضہ کرلیا اور ضروری تبدیلیوں کے ساتھ اسے تاج میں تبدیل کردیا۔ ان میں سے ایک نئی دہلی کا پروفیسر پی این اوک ہے جس نے اپنی کتاب میں اس خودساختہ دعوے کا باقاعدہ تذکرہ کیا ہے لیکن اس امر کے تاریخی شواہد دستیاب نہیں کہ تاج محل کبھی کوئی راجپوت محل تھا۔ (یاد رہے کہ پروفیسر اوک کی تمام کتابیں صرف اور صرف مسلم دشمنی پر مبنی ہیں۔ وہ ایک کٹر ہندو مہا سبھائی کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے)

اسی طرح متعصب ہندوؤں کا ایک ٹولا تاج محل کو ہندو دیوتا کا قدیم مندر قرار دیتا ہے۔ ان کے مطابق آج کا تاج محل' عہد قدیم میں شو دیوتا کا مندر تھا' اس کا نام "تیجو مہلائیا" تھا لیکن شاہ جہاں نے اس پر قبضہ کرکے اسے تاج محل کی شکل دے ڈالی۔ شاید اس دعوے کی وجہ یہ رہی ہو کہ تاج محل کا نام اس قدیم مندر کے نام سے مشابہ ہے۔

اس دعوے کا سب سے بڑا پرچارک بھی پروفیسر پی این اوک ہی ہے جس نے اپنی تصنیف تاج محل' دی ٹرو اسٹوری میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ممتاز محل یہاں دفن ہی نہیں۔ اس کے مطابق تاج محل کے بارے میں زبان زدِ عام افسانے' محض اس کی اصلیت اور حقیقت کی پردہ پوشی کے لیے گھڑے گئے ہیں۔ اپنے دعوے کو سچ ثابت کرنے کے لیے اس نے عدالت میں درخواست دائر کی کہ تابوت کھولا جائے اور تاج

کی نچلی بنیادوں کی کھدائی کی جائے لیکن عدالت نے اس کی درخواست مسترد کر دی۔

جس دور میں برصغیر پر انگریزوں کی حکمرانی تھی۔ ایک افواہ زور و شور سے پھیلائی گئی کہ تاج محل کو منہدم کیا جا رہا ہے۔ اکثر و بیشتر انگریز گورنر لارڈ ولیم بنٹنک کے حوالے سے کہا گیا کہ وہ تاج محل گرانے کا منصوبہ بنائے بیٹھا ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ مقبرے میں استعمال ہونے والا سنگ مرمر نکال کر نیلام کر دیا جائے۔ یہاں تک کہا گیا کہ تاج محل کے انہدام کے لیے ایک مخصوص گروہ بھی تیار کر لیا گیا۔

لیکن بعد ازاں یہ منصوبہ ترک کر دیا گیا اور اس کی وجوہات یہ بیان کی گئیں کہ گورنر آف انڈیا لارڈ ولیم بنٹنک کے پاس اس مقصد کے لیے مناسب فنڈز دستیاب نہ تھے۔ ان افواہوں کے برعکس لارڈ بنٹنک کے سوانح نگار جان روسیلی کا کہنا ہے کہ یہ کہانی محض اس لیے گھڑی گئی کہ لارڈ بنٹنک قلعہ آگرہ کے فالتو سنگ مرمر کو فروخت کرنے کا خواہاں تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انگریزوں کی جانب سے تاج محل گرائے جانے کے منصوبے کی کبھی واضح طور پر تردید نہیں کی گئی۔

تاج محل سے منسوب افسانوں کے برعکس اس کہانی میں حقیقت بہرحال موجود ہے کہ تاج محل میں بڑے پیمانے پر چوری کی وارداتیں ہوئی ہیں اور بہت سی ایسی اشیا اب وہاں موجود نہیں جو کبھی اس نابغۂ روزگار عمارت کا حصہ ہوا کرتی تھیں۔ یہ درست ہے کہ بہت سی قیمتی اشیا وہاں سے ہٹالی گئی تھیں لیکن چوریوں کا معما اب تک حل نہیں ہو سکا۔ تاج محل کی وہ اشیا جن کے بارے میں شبہ ہے کہ انہیں چرایا جا چکا ہے' ان میں درج ذیل قیمتی زر و جواہر بھی شامل تھے۔

ایک طلائی پردہ جس نے تاج محل کے پورے گنبد یا اس کے بڑے حصے کو گھیر رکھا تھا۔

ایک طلائی جالی' جو ممتاز محل کی قبر کے چاروں جانب نصب تھی۔

کثیر تعداد میں ہیرے جو ملکہ ممتاز محل کے تابوت میں جڑے ہوئے تھے۔

موتیوں کی چادر' جسے ممتاز محل کی قبر کے تعویذ پر ڈالا گیا تھا۔

مکمل طور پر زبرجد سے تیار کردہ داخلی دروازہ۔

مقبرے کے اندرونی حصے میں بچھے ہوئے درجنوں نادر اور قیمتی قالین۔

مقبرے کے مختلف کمروں میں لگے ہوئے طلائی فانوس۔

تاج محل کی دیواروں میں جا بہ جا پیوست قیمتی پتھر۔

بعض سنگ دلوں نے تاج محل کے حوالے سے ایک ناقابل یقین روایت یہ بھی بیان کی ہے کہ تاج محل کے معماروں کی جان لے لی گئی تھی۔ بغیر کسی تاریخی تصدیق کے یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ شاہ جہاں نے تاج محل کی تعمیراتی اور دیگر کام کرنے والے کاریگروں اور معماروں کے ہاتھ قلم کرا دیے تھے تاکہ وہ اس کے بعد اس طرح کی اور خوب صورت عمارت تعمیر نہ کر سکیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے فنکاروں اور ہنرمندوں کی آنکھیں تک نکلوالی تھیں تاکہ تاج محل کے بعد وہ اس جیسی کوئی اور خوبصورت عمارت دیکھ نہ سکیں۔

لیکن آج تک ان بے سروپا خرافات کی کسی بھی ذریعے سے تصدیق نہیں ہو سکی۔

مغلوں کے ہاں دستور یہ تھا کہ وہ قبریں خفیہ رکھنے کے لیے اصل تابوت تہ خانوں میں دفناتے تھے اور ان کے راستے چاروں جانب سے بالکل بند کر دیتے تھے۔ ان کے اوپر قبروں کے دو علیحدہ علیحدہ تعویذ بنائے جاتے تھے تاکہ عام لوگ اسی غلط فہمی کا شکار رہیں کہ اوپری تعویذ نقل اور نچلا تعویذ اصل ہے حالانکہ اصل قبر ان سے بھی نیچے کسی تہ خانے میں ہوتی تھی جسے مکمل طور پر بند کر کے لوگوں کی رسائی وہاں تک ناممکن بنا دی جاتی تھی۔

شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر اور اعتماد الدولہ کا روضہ جیسے مقابر میں اوپر نیچے تین تین قبریں بنی ہوئی ہیں۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ تاج محل میں اسی تکنیک کو اپنایا گیا ہے۔

خیال ہے کہ ملکہ ممتاز محل اور شاہ جہاں کی قبریں بھی زمین کے اندر کسی خفیہ تہ خانے میں پوشیدہ ہیں جن کے بارے میں کسی کو کوئی علم نہیں جبکہ اوپر کے تہ خانے اور مرکزی روضے میں بنی ہوئی قبریں محض خالی تعویذ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تاج محل کے موجودہ تہ خانوں میں بھی ایسے دروازے موجود ہیں جو مزید گہرائی میں اترتے ہیں لیکن انہیں مستقل طور پر بند کر دیا گیا ہے اس لیے اس بات کا کبھی علم نہیں ہو سکتا کہ ان دروازوں کے عقب میں ملکہ اور بادشاہ کی اصل قبریں ہیں یا نہیں۔

تاج محل سے اور بھی بہت سی روایات اور افسانے وابستہ ہیں لیکن اس عمارت کی سب سے اہم روایت یہ ہے کہ یہ بہ ذات خود محبت کا ایک افسانہ ہے۔ ایک ایسا رنگین افسانہ جس کا آغاز تو ہے لیکن انجام کوئی نہیں۔

قسط نمبر 194

فلمی لیلیٰ

علی سلیمان آفاقی کی یادداشتیں

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادر روزگار خیال ہی نظر آتے ہیں جو نصف صدی سے علم و ادب' صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روز اول کی طرح تازہ دم بھی ان کے ذہن رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہو نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے' اپنی نمایاں حیثیت کی نشان اس کی پیشانی پر ثبت کر دیے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا دید و شنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے

ادب و صحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستاں در داستاں سرگزشت

ابتدا اس ماہ آئے ہوئے دو معلوماتی خطوط سے کرتا ہوں۔ مردان سے خالد شہابی صاحب لکھتے ہیں۔ ''آپ نے گزشتہ ماہ بالی وڈ میں بنائی جانے والی ہالی وڈ کی فلموں کے بارے میں لکھا تھا۔ دراصل یہ سلسلہ تو بلیک اینڈ وائٹ فلموں کے زمانے سے جاری ہے۔ میں نے کیبل پر ایک انگریزی فلم Happened One Night دیکھی تو یاد آیا کہ 1951ء میں انڈیا میں ایک فلم ''نادان'' بنی تھی جو کہ اس فلم کا ہو بہو

چربہ تھی۔ نادان میں مدھوبالا، دیوآنند، مبارک وغیرہ نے کام کیا تھا۔ اس کے ہدایت کار ہیرا مل اور موسیقار سجاد تھے۔ فلم کی موسیقی تو بہت اچھی تھی مگر منظر نامہ اور مکروہ ہدایت کاری کے باعث یہ زیادہ کامیاب نہ ہوسکی۔ 1956ء میں اسی کہانی کو "چوری چوری" کے نام سے بنایا گیا جس میں نرگس اور راج کپور مرکزی کردار تھے۔ شنکر جے کشن اس کے موسیقار تھے۔ یہ فلم کامیاب ہوئی تھی۔ تیسری بار اسی کہانی پر 1991ء میں سپنوں بھت نے فلم "دل ہے کہ مانتا نہیں" بنائی تھی جس میں پوجا بھٹ، عامر خان، انوپم کھیر نمایاں اداکار تھے۔ یہ فلم بھی فلاپ ہوگئی تھی۔

آج کے دور میں لوگ پرانی فلمیں دیکھتے اور پسند کرتے ہیں۔ پاکستان میں بھی بہت اچھی فلمیں بنائی گئی ہیں جنہیں لوگ دیکھنا چاہتے ہیں مگر بدقسمتی سے ان کے پرنٹ اور اچھے ویڈیو موجود نہیں ہیں ورنہ آج کل کی نسل پرانی بھارتی اور پاکستانی فلموں کا موازنہ کرسکتی تھی۔

پشاور سے شوکت رحمٰن خٹک نے علالت کے باوجود برصغیر کی معروف اداکارہ ممتاز شانتی کے بارے میں ایک معلوماتی خط ارسال کیا ہے۔ ان کی صحت کی دعا کے ساتھ خط کا مطالعہ کیجئے۔

"دلنواز آنکھیں، چبھتی ہوئی پلکیں، خوبصورت گالوں اور نازک جسم والی ممتاز شانتی 1922ء میں ڈنگ ضلع گجرات میں پیدا ہوئیں۔ اصلی نام ممتاز بیگم تھا۔ بچپن میں یتیم ہوگئیں۔ ممتاز کو ان کے چچا برکت نظامی نے پالا پوسا۔ انہوں نے کم عمری ہی میں اس بچی کو رقص اور موسیقی کی تربیت دی۔ وادیٔ شباب میں قدم رکھتے ہی ممتاز اپنے چچا برکت نظامی کی ڈانس پارٹی میں شامل ہوکر شہر شہر رقص کا مظاہرہ کرنے لگیں۔ اسی دوران میں ممتاز کی زندگی میں ایک نوجوان شاعر ولی محمد داخل ہوا۔ اس نے ممتاز کو ان کے چچا کے چنگل سے چھڑا کر ممتاز کے دل میں جگہ بنائی۔ کچھ عرصہ بعد دونوں نے شادی کرلی۔ 1940ء میں ممتاز اور ولی محمد کلکتہ چلے گئے جہاں ولی صاحب نے پہلی بار ممتاز کو پنجابی فلم "سوہنی کمہارن" میں ممتاز شانتی کے نام سے بطور ہیروئن پیش کیا۔ یہ فلم لاہور میں بنائی گئی تھی۔ اس فلم کے بعد ممتاز شانتی نے اپنی ڈانس پارٹی بنائی اور سندھ و پنجاب کے شہروں میں رقص کا مظاہرہ کرنے لگیں۔ ان ہی دنوں اپنی ڈانس پارٹی کے ہمراہ پشاور آئیں جہاں ممتاز نے پشاور کے تصور محل سنیما کے اسٹیج پر اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ پشاور میں قیام کے دوران میں ایک رات ممتاز شانتی کو ایک ولی اللہ نے بشارت دی کہ تصور محل سنیما کے ساتھ خالی پلاٹ میں اس کا جسد خاکی دفنا ہے۔ تلاش کر کے قبر کی صورت دے دو۔ ممتاز شانتی کے کہنے پر تلاش شروع ہوئی اور خستہ حال قبر مل گئی۔ ممتاز شانتی نے اپنے پیسوں سے وہاں ایک شاندار مقبرہ بنایا۔ پشاور کے لوگ یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ یہ مزار اب تک اپنی جگہ قائم ہے۔ اب بھی لوگ جمعرات کی رات کو اس مقبرے پر پھول چڑھاتے ہیں اور دیے جلاتے ہیں۔ ممتاز شانتی کو اپنے شوہر کی معرفت فلم قسمت میں اشوک کمار کے مقابل ہیروئن کا چانس ملا۔ اس فلم نے بہت شہرت حاصل کی۔ اس فلم کے گانے "دھیرے دھیرے آ بادل، دھیرے دھیرے، میرا بلبل سو رہا ہے شور نہ مچا۔"

"گھر گھر میں دیوالی ہے، میرے گھر میں اندھیرا ہے"

یہ گانے بے حد مقبول ہوئے۔ فلم "قسمت" اشوک کمار کی کامیاب ترین فلموں میں شمار ہوتی ہے اور صرف ایک سنیما گھر میں سو ہفتے سے زیادہ چلی تھی۔ قسمت کے بعد "سوال، بگلی دنیا، دھرتی، پجاری، دیوانی، بدلتی دنیا، لیڈی ڈاکٹر، چاند چکور، گھر کی عزت، زمانے کی ہوا" ممتاز شانتی کی کامیاب ترین فلمیں ہیں۔ 1946ء میں ولی صاحب نے پنجاب فلم کمپنی کے اشتراک سے ممتاز شانتی کو ہیروئن لے کر "دیکھو جی، نیکی، بدامنی، ہیرا رانجھا، بیوی، زمانے کی ہوا" نامی فلمیں بنائیں۔ 1954ء میں ممتاز شانتی اپنے شوہر ولی صاحب کے ہمراہ مستقل طور پر پاکستان آگئیں۔ پاکستان آنے کے بعد ممتاز شانتی نے فلموں میں کام نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور مرتے دم تک وہ اپنے اس عہد پر قائم رہیں حالانکہ ولی صاحب نے لاہور میں تین فلمیں بنائیں۔ "گڈی گڈا، سوہنی کہارن، سکن منی" یہ تینوں فلمیں پنجابی میں بنی تھیں۔ ممتاز شانتی نے کامیاب ہیروئن کے ساتھ کامیاب گرہستن اور خدمت گار بیوی کا کردار بھی خوب نبھایا۔ 1960ء کے لگ بھگ فلموں کی یہ شہزادی اللہ کو پیاری ہوگئی۔

فلم گھر کی عزت میں دلیپ کمار ممتاز شانتی کے مقابل ہیرو تھے جبکہ دیگر اداکاروں میں جیون، گوپ، گلاب اور سلمان عرف سلو شامل تھے۔ گھر کی عزت کی موسیقی گوبندرام نے ترتیب دی تھی۔ ہدایت کار وریانی تھے۔ اپنے دور کے کاروباری اور عوامی لحاظ سے "گھر کی عزت" شہرت یافتہ فلم تھی۔"

شوکت رحمٰن خٹک مزید لکھتے ہیں "فلمی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے میں نے ریڈیو پاکستان میں نام پیدا کرنے کی

کوشش کی مگر قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔ پشاور کا موجودہ ریڈیو اسٹیشن گنی کناروں پر محیط ایک شاندار عمارت کی حیثیت رکھتا ہے جس میں موجودہ جدید ترین آلات نصب ہیں مگر میں جس ریڈیو اسٹیشن کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اگرچہ وہ عظیم الشان خیبر روڈ پر واقع تھا مگر نہایت مختصر، چند دفتری کمرے اور مختصر سامان۔ ریڈیو پاکستان پشاور کی عمارت 1935ء میں مختص ہوئی۔ افتتاح گورنر سرحد نے کیا تھا۔ اسلم خٹک پہلے سربراہ مقرر ہوئے۔ ابتدا میں صرف تین کمرے تھے۔ ایک کمرے میں ریڈیو اسٹیشن کی مشین نصب تھی جبکہ دوسرے کمرے ٹاٹ اور بوریوں سے ڈھک دیے گئے تھے۔ تیسرے کمرے میں کارکنوں، ڈراما آرٹسٹوں کے بیٹھنے کی جگہ بنائی گئی تھی۔ 1935ء میں اسلم خٹک کا مشہور پشتو ڈراما "خون کا جام" نشر ہوا۔ بعد میں قمر علی سرحدی کا اردو ڈراما "قتل" نشر ہوا۔ پشاور روڈ پر چغلپورہ گاؤں میں 10 کلوواٹ کا ٹرانسمیٹر نصب کیا گیا۔"

☆☆☆

زیادہ دیر زندہ رہنے کے فائدے بھی ہیں اور نقصانات بھی۔ اگر اللہ مہربان ہو اور بڑھاپے میں بھی انسان کو چلنے پھرنے اور کام کرنے کی توفیق ہو، کوئی زیادہ سنگین بیماری نہ ہو، اولاد فرماں بردار اور خدمت گزار ہو تو پھر ایسے خوش نصیبوں کے لیے بڑھاپا ایک نعمت ہے، اس لیے کہ وہ اپنی مصروفیات سے فارغ ہو چکے ہوتے ہیں، نواسہ نواسی اور پوتا پوتی کے بچپن سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ایسے خوش قسمت لوگ جو جسمانی یا مالی طور پر معذور نہیں ہوتے اور ایک بھرے پُرے خاندانی ماحول سے لطف اندوز ہوتے ہیں ان کے لیے بڑھاپا ایک نعمت ہے۔

دیکھیے، اللہ نے جو نظام بنایا ہے، خواہ وہ انسانوں کے لیے ہو یا حیوانوں اور چرند پرند کے لیے یا عناصر قدرت کے لیے، وہ ایک باضابطہ نظم کے تحت چلتا رہتا ہے۔ اس میں کوئی خلل نہیں پیدا ہوتا جیسا کہ انسان کی بنائی ہوئی اشیا میں ہو جاتا ہے۔ قدرت موسموں کو، فصلوں کو، انسانوں اور بے زبان جانوروں، پرندوں اور آبی حیات سے تعلق رکھنے والی مخلوق کو ایک منظم لگے بندھے نظام کے تحت چلاتی رہتی ہے۔ اگر ان میں کوئی تبدیلی پیدا بھی ہوتی ہے تو وہ بھی حضرت انسان کی وجہ سے، مثلاً گلوبل وارمنگ کے باعث دنیا میں موسمی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ ان کا سبب قدرت نہیں بلکہ وہ صنعتی، سائنسی ایجادات ہیں جن کی وجہ سے انسانوں کی صحت

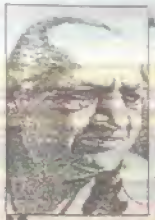

بڑے شاعر کا بڑا معاوضہ

فیض احمد فیض کام بہت کرتے تھے۔ ان کا مصرع ہے ب کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا" ان کو کام سے بھی عشق تھا اور عشق سے بھی کام تھا۔ وہ لکھنے پڑھنے کے کام میں بہت مشقت کرتے تھے مگر اس مشقت کا ان کو مالی فائدہ اتنا نہ ہوا جتنا ہونا چاہیے تھا۔ سرفراز اقبال نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ کتنے امیر تھے؟ اور وہ مالی مشکلات سے کیسے نبرد آزما رہتے تھے۔ یاد آیا کہ ایک دفعہ بتا رہے تھے کہ تقریباً پچاسی برس کی علمی مشقت میں جتنی رقم ہاتھ لگی اس کا اگر حساب لگایا جائے تو دو سو روپے ماہوار کی اوسط بنتی ہے' یہ تھا "بڑے شاعر کا بڑا معاوضہ" ان کی گزر بسر، ایڈیٹری، پروفیسری اور گنڈے دار ملازمتوں سے ہوتی تھی۔

ڈاکٹر ایوب مرزا کی کتاب "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" سے ایک اقتباس

اور عناصر فطرت میں تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ قدرت کے بنائے ہوئے نظام سے انحراف کریں گے یا اس کی خلاف ورزی کریں گے اور اس میں مداخلت کریں گے تو اس کے نتائج بھی بھگتیں گے۔ موسمی تبدیلیوں، زلزلوں، طوفانوں، سیلابوں کی بڑھتی ہوئی لہر کا سبب بھی انسانی ایجادات ہی ہیں۔ یہ دراصل قدرت کی طرف سے یہ وارننگ ہے کہ اگر خدا کے بنائے ہوئے اصولوں کی خلاف ورزی کرو گے اور بذات خود خدا بن جانے کی کوشش کرو گے تو پھر اس کے نتائج بھی خود ہی بھگتو گے۔

ہمارے خیال میں زیادہ دیر تک جینے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ انسان کو اپنے بہترین دوستوں، عزیزوں، رشتے داروں کو دنیا سے جانے کا دکھ اٹھانا پڑتا ہے۔ اچھے دوست تو قسمت سے ہی ملتے ہیں جو ہم مزاج اور ہم ذوق بھی ہوں، جن کی صحبت میں آپ لطف اٹھا سکتے ہوں ورنہ انسانوں سے تو دنیا بھری پڑی ہے۔ لیکن جو دوست دنیا سے جاتا ہے یا جو عزیز اور پیارا چھوڑ کر چلا جاتا ہے، وہ بے حد دکھ، غم والم اور مایوسی کا سبب بن جاتا ہے۔

ہم جب اپنے ماضی پر نظر ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ کتنے ہی بہت پیارے عزیز نوجوانی یا جوانی ہی میں اپنے ماں باپ اور عزیزوں کو خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔ اس کے بعد بے حد قریبی اور بے تکلف دوستوں میں سے بہت سے ایک ایک کر کے چلے گئے اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

عزیزوں، رشتے داروں اور دوستوں کی جدائی کے یہ داغ ہمیشہ تازہ رہتے ہیں۔ ماں باپ، بہن بھائی اور ان کے بچے سب سے زیادہ پیارے ہوتے ہیں لیکن ایک ایک کر کے اگر وہ آپ کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیں تو جو دل پر گزرتی ہے، اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

جب ہم نوجوان اور جوان تھے تو ہمارے بزرگ بھی صحت مند اور سرگرم عمل تھے۔ اس زمانے میں کسی ایک کی وفات کا غم بھی ذہن پر نقش ہو جاتا تھا اور دل کا زخم کافی عرصے تک رستا رہتا تھا۔ آج سے 30 سال پہلے ایک ہم عمر قریبی دوست کی وفات پر ہم بہت روئے۔ ہمارے عزیز، دوست رشید جاوید نے سمجھایا کہ ''دیکھو، دنیا کا یہی نظام ہے۔ جیسے جیسے انسان کی عمر بڑھتی ہے، اس کے بزرگوں کی اور دوستوں کی تعداد کم ہوتی رہتی ہے۔ ابھی تو یہ آغاز ہے۔ اگر جیتے رہے تو یہ سلسلہ زیادہ تیز ہو جائے گا، پھر کیا کرو گے؟''

یہ نصیحت کرنے والے رشید جاوید بھی اس کے چند سال بعد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ پھر تو جیسے ایک تانتا سا بندھ گیا۔ گزشتہ دو سالوں میں اتنے زیادہ دوست احباب، رشتے دار، شناسا اور مہربانوں نے سفرِ آخرت اختیار کیا ہے کہ بے اختیار وہ شعر یاد آ جاتا ہے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

لیکن انسان پھر انسان ہے۔ جانے والوں کی جدائی کا غم اور ان کی صحبت اور محبت سے محرومی کے صدمے کم ہونے کے بجائے بڑھتے جا رہے ہیں۔ تفصیل کیا گنوائیں۔ فلم کے، صحافت کے، ادب کے اور مختلف شعبوں کے کتنے جیتے جاگتے انسان مٹی کی چادر اوڑھ کر سو گئے۔ ویسے بھی آج کل انسانوں کے مرنے کی خبریں جس کثرت سے روزانہ سننے اور پڑھنے میں آتی ہیں اس کے بعد انسان رفتہ رفتہ ان کا عادی ہو جاتا ہے۔ کسی زمانے میں دو چار انسان حادثے میں مر جائیں یا قتل ہو جائیں تو کافی عرصے تک اس کا تاثر قائم رہتا تھا اور چرچا رہتا تھا۔

1949ء میں پاکستان آنے کے بعد ہم نے پہلی بار سڑک پر ایک حادثے میں ایک شخص کی لاش پڑی ہوئی دیکھی جس کے آس پاس دور دور تک خون بکھرا ہوا تھا۔ ہم ماڈل ٹاؤن جا رہے تھے۔ بس میں سوار تھے۔ بس اچانک رکی اور حادثے میں ایک شخص کے مرنے کی خبر سنی تو سب ہی غمگین ہو گئے۔ ہم نے بھی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور جو منظر دیکھا وہ کئی ہفتے تک ہمیں غمگین کرتا رہا۔ اس روز ہم سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔

اب دنیا میں اور خود پاکستان میں درجنوں انسان ہر روز قتل و اجل بن رہے ہیں۔ کس کس کا ماتم کریں، کس کس کی موت پر آنسو بہائیں؟ دل ایک ایسی فولادی چادر کی طرح ہو گیا ہے جس پر لگنے والی گولی کوئی اثر کیے بغیر زمین پر گر جاتی ہے۔ اس چادر یا زرہ بکتر کے پیچھے والے انسان کو صرف ایک دھچکا سا لگتا ہے اور بس۔ خدایا، انسانی زندگی کتنی ارزاں ہو گئی ہے کہ مکھیوں کی طرح انسان مر رہے ہیں۔ اپنے جانے والے، دوست احباب اور رشتے دار بھی اور وہ سیکڑوں انسان بھی جن سے ذاتی واقفیت نہیں ہے، نہ جان پہچان، نہ کبھی ملاقات مگر پھر بھی دل پر ایک انسان کی موت کا اثر تو ہونا لازمی ہے۔

پچھلے دنوں ہدایت کار محمد جاوید فاضل بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان سے پہلے ٹی وی پروڈیوسر کنور آفتاب، اداکار سید کمال اور سلونی آگے پیچھے دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ یہ سب بہت ہی قریبی تعلقات والے لوگ تھے جن کے ساتھ سالہا سال بلکہ زندگی کا ایک بڑا حصہ گزرا۔ ان کے علاوہ بھی 2010ء میں جانے والے دوستوں اور مہربانوں کی ایک خاصی لمبی فہرست ہے۔

عمر زیادہ ہونے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ آپ چھوٹے چھوٹے بچوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے بڑا ہوتے ہوئے اور پھر صاحب اولاد ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں جو بہت خوشی اور دل لگی کا باعث بنتا ہے۔ مگر جب بہت قریبی عزیزوں اور دوستوں کو، جن میں آپ سے کم عمر بھی شامل ہیں، لحد میں اترتے دیکھتے ہیں تو شدید صدمہ پہنچتا ہے۔

جاوید فاضل کو ہم نے اپنے سامنے فلمی صنعت میں آتے ہوئے، جدوجہد کرتے ہوئے اور پھر ایک ممتاز ہدایت کار بنتے ہوئے دیکھا۔ جاوید کے ذکر کے ساتھ ہی ایک ذہین، بے چین اور تخلیق کے لیے سرگرداں نوجوان کا تصور سامنے آ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ جونیئر اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے، اس وقت ہم نے انہیں اپنا ساتھی اور دوست بنا لیا تھا۔ لوگوں کو حیرت ہوتی تھی کہ ایک مصنف اور فلم ساز کسی معاون

ہدایت کار کو اپنا ہم جلیس بنا لے۔ ہم سے تو کسی نے بات نہیں کی لیکن دوسرے معاون ہدایت کار ایک دوسرے سے اس بارے میں باتیں کرتے رہتے تھے اور جاوید سے جیلس بھی ہو گئے تھے۔

جاوید فاضل کو ہم نے دیکھتے ہی خیال کیا کہ اگر اس نوجوان کو صحیح راہنمائی اور موزوں مواقع مل جائیں تو یہ فلمی صنعت کے لیے ایک اچھا اضافہ ہو گا۔ جاوید نے فلمی زندگی کا آغاز قدیر غوری صاحب کے اسسٹنٹ کی حیثیت سے کیا تھا۔ قدیر غوری ایک تجربہ کار اور ذہین ہدایت کار تھے۔ انہیں موسیقی اور راگ راگنیوں سے بھی واقفیت تھی اسی لیے ان کی فلموں میں موسیقی عموماً اچھی ہوتی تھی۔ اس لیے موسیقار رشید عطرے نے جب اپنی میوزیکل فلم ''موسیقار'' بنائی تو اس کی ہدایت کاری کے لیے قدیر غوری کا انتخاب کیا۔ ''موسیقار'' اپنے زمانے کی ایک یادگار فلم ہے خصوصاً اس کے گانے آج بھی اسی طرح مقبول ہیں۔

قدیر غوری ایک کشادہ دل اور مہربان ہدایت کار تھے۔ بہت کم ہدایت کار ایسے ہوتے ہیں جو اپنے اسسٹنٹ کو اپنا ہنر سکھانے کی کوشش کرتے ہیں ورنہ عام رواج یہی رہا ہے کہ معاون اپنی ذہانت اور مشاہدے سے ہی سیکھ کر ہدایت کار بن جایا کرتے تھے لیکن خوش قسمتی سے جاوید فاضل کو پہلے قدیر غوری اور پھر سید سلیمان جیسے استاد ملے جنہوں نے جاوید کو ہدایت کاری اور منظر نامے کے اصول سکھائے اور انہیں ہر طرح کے مواقع فراہم کیے۔ جن دنوں جاوید فاضل سلیمان کے معاون خصوصی تھے، اس وقت سید نور ان کے جونیئر ترین معاون تھے۔ جب یہ دونوں یکے بعد دیگرے ہدایت کار بن گئے تو نوجوان کے استادوں کو بھی بہت خوشی ہوئی اور انہوں نے ہر طرح ان کی حوصلہ افزائی کی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں اپنی صلاحیت اور ذہانت کی بنا پر ہدایت کار بننے کے مستحق تھے۔ انہوں نے اپنی قابلیت کا مظاہرہ کر کے فلمی صنعت کو حیرت زدہ کر دیا۔ سید نور کو یہ سہولت حاصل تھی کہ وہ مصنف بھی تھے۔ جاوید فاضل مصنف تو نہیں تھے لیکن ان کا مطالعہ اور تجربہ بہت وسیع تھا۔ سلیمان تو ان پر اتنا اعتماد کرتے تھے کہ جب مصنف اسکرپٹ لکھ کر ان کے حوالے کرتے تھے تو وہ جاوید فاضل کو اسکرین پلے اور کہانی کے بارے میں تبادلۂ خیال کرنے کا فرض سونپا کرتے تھے۔

جاوید ایک تعلیم یافتہ، مطالعے کے شوقین اور فلم بینی کے رسیا تھے۔ جب بھارتی فلموں کی پاکستان میں درآمد بند ہو گئی اس کے بعد بھی وہ تازہ ترین بھارتی فلمی جرائد کا مطالعہ کر کے وہاں کے حالات سے باخبر رہتے تھے۔ انہیں بھارتی فلموں کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ وہاں کے ہر فلم ساز، ہدایت کار، مصنف، موسیقار اور گلوکار کے بارے میں ان کے پاس تازہ ترین معلومات ہوتی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ اداکارائیں فلموں کی ہیروئنوں کے خوبصورت ملبوسات اور زیورات کے نمونے بھی فراہم کر دیا کرتے تھے۔ عمر میں اضافے کے بعد وہ سنجیدہ اور کم گو ہو گئے تھے لیکن ابتدا میں وہ خوش مزاج اور حاضر جواب تھے۔ ہم بھی فلموں کی چوائسز کے بارے میں ان سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ شباب کیرانوی، رشید جاوید اور ذاکر حسین کے بعد جاوید ہی تھے جن سے ہم اپنی کہانیوں کے بارے میں رائے اور مشورہ طلب کرتے تھے اور بعض اوقات یہ لوگ بہت اچھے مشورے دیا کرتے تھے۔

جاوید فاضل کی ہم نے حوصلہ افزائی کی تو انہوں نے ہمارے دفتر میں اور اسٹوڈیوز میں باقاعدہ ملاقاتیں شروع کر دیں۔ ہماری اس وقت تک شادی نہیں ہوئی تھی۔ رات بارہ ایک بجے تک ہم ایک نگارخانے سے دوسرے نگارخانے اور ایک فلمی شخصیت سے دوسری فلمی شخصیت کے گھروں پر محفلوں میں شریک رہا کرتے تھے لیکن جب ہم اکیلے ہوتے اور کسی سے ملنے کا پروگرام نہ ہوتا تو جاوید فاضل ہمارے ساتھی ہوتے۔ ہم چینی ریستورانوں میں جا کر نئے نئے کھانوں اور سلاد کے تجربے کیا کرتے۔ اگر ہمارے پاس پیسے کم ہوتے تو ہمارا بہترین ڈنر چکن کارن سوپ، ٹوسٹ مٹھن اور رشین سلاد ہوا کرتا تھا۔ ڈنر کے خاتمے پر گرین ٹی پی جاتی۔ کبھی کبھی آئس کریم بھی کھا لیتے۔

دو افراد کے اس ڈنر پر ان دنوں مشکل سے چھ سات روپے خرچ ہوتے تھے۔ ایک بش کی قیمت سوا روپے سے ڈیڑھ روپے تک اور کچھ عرصے بعد دو روپے ہوئی تھی۔ ویسے یہ رقم بھی اس زمانے میں معقول سمجھی جاتی تھی۔ ڈنر کے بعد ہم سگار یا پائپ سلگا لیتے اور دیر تک فلموں اور کہانیوں کے بارے میں باتیں کرتے رہتے۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا یہاں تک کہ میجر ہمیں آ کر مطلع کرتے تھے کہ جناب، روشنیاں بجھانے کا وقت آ گیا ہے۔

جاوید سے ذرا بے تکلفی ہوئی تو ہم نے کہا کہ بھئی تمہارا تو نام ہی غلط ہے۔

''وہ کیسے؟''

''ایسے کہ جاوید فاضل کا مطلب ہے کہ تمہارے نام میں جاوید فاضل ہے تو پھر تمہارا اپنا نام تو کچھ بھی نہ ہوا۔''

جاوید سے اور زیادہ ملنا ہوا تو انہوں نے اپنے گھرانے

کے بارے میں بتایا۔ دراصل وہ ایک ٹوٹے ہوئے (Broken) گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والدین میں علیحدگی ہوچکی تھی۔ اس قسم کا بچپن گزارنے والوں کے عموماً مزاج میں تلخی اور ترشی پیدا ہوجاتی ہے، وہ بیزار اور ناراض رہتے ہیں۔ اگر بچہ زیادہ حساس ہو تو یہ تلخی اور زیادہ ہوجاتی ہے۔

جاوید فاضل اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے لیکن ماں باپ کی علیحدگی کے بعد وہ والدہ کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ ان کے والد نہایت معقول آدمی تھے۔ جاوید نے ہمیں اپنے والد سے بھی ملوایا تھا جن کی جوتوں کی دکان مال روڈ پر کمرشل بلڈنگ کے پہلے کنارے پر تھی۔ کمرشل بلڈنگ ان دنوں لاہور کا سب سے فیشن ایبل اور مہنگا شاپنگ سینٹر خیال کیا جاتا تھا۔ ان کے والد کی دکان مختصر لیکن ہر قسم کے جوتوں سے آراستہ تھی۔ کبھی کبھی جاوید بھی دکان میں اپنے والد کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے مگر فلموں سے وابستگی کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ جاوید کے والد ہمیں ایک تعلیم یافتہ، خلیق اور شائستہ آدمی محسوس ہوئے تھے۔ جاوید کی والدہ سے ملے تو وہ بھی انتہائی سمجھ دار، شفیق اور بااخلاق خاتون تھیں۔ انہوں نے جاوید کی پرورش بہت اچھی طرح کی تھی۔ ہم نے جاوید سے تو کبھی نہیں پوچھا مگر حیرت ہوتی کہ اس قدر اچھا جوڑا علیحدہ کیوں ہوگیا؟ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ علیحدگی کے بعد جاوید کے والد نے دوسری شادی کی تھی یا نہیں؟ لیکن ان دونوں کی علیحدگی نے اکلوتے بیٹے کو ذہنی اور نفسیاتی طور پر بہت بری طرح متاثر کیا تھا۔ یہ حالات جاننے کے بعد ہم نے جاوید پر زیادہ توجہ دینی شروع کردی اور کوشش کرتے رہے کہ انہیں تنہائی کا احساس نہ ہو۔

اسٹوڈیو میں وہ ہر ایک سے ملتے اور گپ شپ کرتے تھے لیکن غالباً بطور انسان ان کی کسی اور سے اتنی ذہنی اور دلی وابستگی نہ تھی جتنی ہمارے ساتھ تھی۔

تربیتی مرحلہ پورا کرنے کے بعد جاوید فاضل کی بے چین طبیعت نے ہدایت کاری پر اکسایا۔ انہوں نے اپنے استاد سید سلیمان سے باقاعدہ اجازت حاصل کی تھی۔ یہ دور جاوید فاضل کے لیے بے حد کٹھن اور دل شکستگی کا دور تھا۔ انہیں کئی بار ہدایت کاری کا موقع ملا جس کی اطلاع سب سے پہلے وہ ہم ہی کو دیتے تھے لیکن قسمت نے ساتھ نہ دیا۔ ہر فلم یا تو بالکل ابتدائی مرحلے میں یا پھر آگے چل کر اناؤنس کردہ جاتی تھی تو ان پر مایوسی اور ڈپریشن کا دورہ سا پڑ جاتا تھا۔ ہم ان کو تسلی دیتے کہ دیکھو، اللہ نے ہر کام کے لیے وقت مقرر کردیا ہے، جب تمہارا وقت آئے گا تو تم خود بخود ہدایت کار بن جاؤ گے۔ ان کی توجہ بٹانے کے لیے ہم انہیں سنیما لے جاتے، فلم دکھاتے۔ ادھر ادھر گھماتے۔ لوگوں سے ملاتے مگر ہر نا کام کوشش کے بعد وہ مایوس اور دل برداشتہ ہوجاتے تھے۔

اداکارہ دیبا خانم نے اپنی فلم بنانے کا آغاز کیا تو سے اسکرپٹ لکھوایا اور جاوید فاضل کو ہدایت کار مقرر اس فلم کی کاسٹ میں دیبا کے علاوہ وحید مراد، طالش اور منا شوری قابل ذکر تھے۔ یہ بھی ایک ایسے جوڑے کی داستان تھی جن کا گھر ٹوٹتے ٹوٹتے رہ گیا۔ یہ ایک معاشرتی مسئلہ تھا جسے ہلکے پھلکے انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ اس فلم میں ایسے تکنیکی تجربے بھی کیے گئے تھے جو پچیس تیس سال بعد فلموں میں کیے گئے۔ ہم نے ہیروئن کو گلوکارہ ظاہر کیا تھا جس کی آواز سن کر ہیرو اس پر فریفتہ ہوجاتا ہے اور اپنے ایک صحافی دوست (لہری) کو اس سے انٹرویو کرنے کے لیے کہتا ہے۔ اس طرح ہیرو کو اور فلم بینوں کو ہیروئن کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہوجاتی ہیں۔ اس کے بعد جب پاکستان میں ٹی وی کا رواج ہوا تو گلوکارہ ٹی وی پر بھی نغمہ سرا ہونے لگی۔ ٹی وی پر کسی چہرے کو پروگرام میں حصہ لیتے ہوئے دکھانا اس وقت ایک مشکل کام تھا لیکن جاوید فاضل نے یہ مشکل بھی حل کرلی۔ ہمارے خیال میں وحید مراد اور دیبا کی یہ بہترین فلم تھی جس میں وہ حقیقی زندگی کے کردار نظر آتے تھے۔

یہ فلم تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کرتی رہی لیکن بعد میں بوجوہ ایسی اٹکی کہ آج تک مکمل ہوجانے کے باوجود سنیما اسکرین تک نہ پہنچ سکی۔ یہ جاوید کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا۔ ہم نے بہت تسلی دی مگر ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ہدایت کار بننا ان کے مقدر میں نہیں ہے۔ اس سے پہلے احمد رشدی کی ایک فلم بھی ابتدائی دور ہی میں رک چکی تھی۔ تین چار ایسے تجربات کے بعد جاوید بہت بددل اور مایوس ہوچکے تھے۔ انہیں مایوسی کے اس بھنور سے نکالنے کے لیے ہم نے بہت سے جتن کیے۔ اس تمام عرصے میں وہ بدستور سید سلیمان کے معاون خصوصی رہے تھے۔ سلیمان بھی انہیں حوصلہ دلاتے رہتے تھے۔ انہیں اپنے اس ہونہار شاگرد سے بہت توقعات تھیں اور ان کی ہر ناکام کوشش پر انہیں بھی دکھ ہوتا تھا۔

جاوید فاضل کو اول تو فلم بنانے کی دیوانگی تھی دوسرے یہ کہ وہ اپنی پسند کے موضوعات اپنی مرضی کے مطابق پیش کرنے کے خواہش مند تھے لیکن ان کی ہر کوشش ناکام ہوتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان کی بددلی اور مایوسی بجا تھی۔

اس کے بعد ایک نوجوان فلم ساز اسلام الدین نے انہیں ہدایت کاری کی پیشکش کی۔ انہوں نے اسلام سے کہا کہ بھائی میری کوئی فلم ریلیز نہیں ہوتی۔ یہ بات آپ پہلے ہی سوچ لیجئے۔

اسلام نے کہا "اللہ مالک ہے۔ آپ بسم اللہ کریں۔" اور اللہ نے انہیں ہدایت کار بنا دیا۔

ان کی فلم "بلندی" کی کہانی سید نور نے لکھی تھی۔ جاوید نے اس کے منظر نامے پر بہت توجہ دی تھی۔ یہ نو عمر جوڑے کی رومانی کہانی تھی۔ جاوید فاضل نے فلم ساز کو اس بات پر بھی رضامند کرلیا تھا کہ مرکزی کرداروں کے لیے نئے اداکاروں کا انتخاب کیا جائے۔ فلم ساز بھی بہت بڑے دل کا تھا۔ ایک نئے ہدایت کار کے ہوتے ہوئے نئی مرکزی جوڑی کے انتخاب کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے مگر جاوید کی خود اعتمادی کو دیکھتے ہوئے فلم ساز نے بھی اللہ کا نام لے کر رضامندی ظاہر کی۔

جاوید فاضل اور فلم ساز اسلام الدین نے فلم "بلندی" کا افتتاح کانٹی نینٹل ہوٹل میں کیا تھا جو کہ اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ تھا۔ کافی ممتاز فلم ہستیاں اس موقعے پر موجود تھیں۔

جاوید نے اس فلم کے لیے ہیروئن کے طور پر ریما اور ہیرو کی حیثیت سے شان کا انتخاب کیا تھا جو کہ ان کی خود اعتمادی کا ثبوت ہے۔ فلمی صنعت والوں نے پہلی بار اس نئی اور نوخیز فلمی جوڑی کو دیکھا اور پسند کیا۔ ان ہی دنوں جاوید کو کسی بزرگ نے مشورہ دیا کہ تم اپنے نام سے پہلے محمد کا اضافہ کرلو۔ اس طرح جاوید کا نام محمد جاوید فاضل ہوگیا۔ اس نام کی برکت کے آثار بہت جلد ظاہر ہونے لگے جب ان کی فلمیں ہٹ ہونے لگیں۔ بلندی بھی ایک سپر ہٹ فلم تھی جس میں نئے اداکاروں کی اداکاری اور محمد جاوید فاضل کی ہدایت کارانہ ہنرمندی اپنے عروج پر تھی۔ اس فلم نے ریما اور شان کو راتوں رات اسٹار بنا دیا اور کچھ عرصے بعد وہ سپر اسٹارز کی صف میں شامل ہوگئے۔

بلندی کی کامیابی پر جاوید بہت خوش تھے۔

ہم نے کہا "دیکھا، دیر آید درست آید اسی کو کہتے ہیں۔ اللہ نے ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر کردیا ہے جس میں انسان تبدیلی نہیں کرسکتا۔"

اس کے بعد محمد جاوید فاضل کی کامیابیوں کا ایک طویل سفر شروع ہوا۔ جاوید نے جس فلم کی ہدایت کاری کی وہ کامیاب ہوئی یا جاوید کی ہنرمندی کی وجہ سے پسند ضرور کی گئی۔

ہمارے گہرے دوست اور پارٹنر رشید جاوید نے اور ہم نے جب علیحدہ علیحدہ فلمیں بنانے کا فیصلہ کیا تو رشید جاوید نے اپنی فلم "صائمہ" کے لیے محمد جاوید فاضل کو ہدایت کاری کے فرائض سونپے۔ صائمہ کی کہانی سید نور نے لکھی تھی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ جاوید کی 26 فلموں میں سے 20 کے مصنف سید نور ہیں۔

صائمہ مکمل ہوکر ریلیز ہوئی تو سپر ہٹ قرار پائی۔ جاوید کی ابتدائی فلم "گونج" تھی لیکن اس فلم کا کسی نے نوٹس نہیں لیا یہاں تک کہ خود جاوید بھی اس فلم کا تذکرہ نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنی اولین فلم "بلندی" ہی کو کہتے تھے۔ ان کی فلموں میں "آہٹ، دہلیز، لازوال، ہم سے ہے زمانہ، ناراض، اولاد کی قسم، دشمنوں کے دشمن، ضد، حساب، دھنک، آگ ہی آگ، کندن، فیصلہ، بازارِ حسن، الزام، دنیا دس نمبری، استادوں کے استاد، مس فلوپڑہ، زمانہ، آوارگی" شامل ہیں۔ جب فلمی صنعت تعلیم یافتہ اور ہنرمند لوگوں کے لیے تجربہ منعقد ہوئی تو جاوید فاضل نے بھی بڑے اسکرین سے چھوٹے اسکرین کی طرف رخ موڑ لیا۔ کراچی، ٹی وی کا مرکز ہے لہٰذا انہوں نے بھی لاہور میں اپنے گھرانے کو چھوڑ کر کراچی میں بسیرا کرلیا۔ فرصت کے دنوں میں وہ لاہور آتے رہتے تھے۔ ان کی بیگم بھی کراچی جاتی رہتی تھیں لیکن وہ بچوں کی تعلیم و تربیت میں زیادہ مصروف رہیں۔ یہ ان کی بیگم عشرت ہی کا کام ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کو بہت کٹھن حالات میں بھی بہت اچھی تعلیم دلائی جس کے باعث وہ دنیا میں کامیاب زندگی بسر کررہے ہیں۔

جاوید کی شادی اداکارہ شمیم آرا کی بھتیجی عشرت سے ہوئی تھی۔ ان کا خاندان کراچی میں رہتا ہے۔ عشرت بیاہ کر لاہور آگئیں تو کچھ عرصے بعد جاوید کراچی میں جا بسے۔ انہیں فلم کے سوا کسی اور چیز کی فرصت نہیں تھی۔ گھر کی دیکھ بھال، بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی تمام تر ذمے داری عشرت ہی انجام دیا کرتی تھیں۔ جاوید نے ہمیشہ اس بات کا اعتراف کیا۔ وہ اپنی بیگم کی بہت قدر کرتے تھے، خاص طور پر گھر کی تمام ذمے داریاں سنبھالنے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے۔

لاہور میں پہلے ہماری شادی ہوئی پھر جاوید فاضل کی۔ ہماری ملاقات اور دوستی ہر زمانے اور ہر موسم میں اسی طرح بے تکلف اور مخلصانہ رہی۔ گھر میں آنا جانا بھی تھا۔ بچوں سے بھی سب کو دلچسپی تھی۔ وہ لاہور میں فلمیں بناتے رہے۔ ہم نے ان کے لیے صرف ایک کہانی "ناراض" لکھی تھی۔ اس کا آئیڈیا جاوید کا تھا لیکن اسکرین پلے ہم نے لکھا تھا۔ جاوید

کامنی کوشل

نے ہم سے اپنی فلموں کی کہانیاں کیوں نہیں لکھوائیں، اس کا بھی ایک سبب تھا۔ دراصل جاوید کو معلوم تھا کہ ہم ہدایت کار کی کسی غلط بات پر سمجھوتا نہیں کریں گے اور ہم بھی جانتے تھے کہ جاوید جس بات کو صحیح سمجھتے ہیں اس کے لیے سمجھوتا نہیں کرتے۔ انہیں ہمارا احترام بھی تھا اس لیے جانتے تھے کہ بلاوجہ بحث نہیں کرسکیں گے۔ اس لیے ہم نے ان کی فلموں کی کہانیاں نہیں لکھیں، نہ انہوں نے لکھوائیں۔ ایک بار کراچی کے فلم ساز شاہد شفاعت کے لیے ہم دونوں نے ایک کہانی کا آغاز کیا تھا لیکن کہانی مکمل ہونے کے باوجود فلم کا آغاز نہ ہوسکا۔

دوسری فلم ''ناراض'' تھی۔ ناراض آج کل کے نوجوانوں کی کہانی تھی۔ موضوع یہ تھا کہ آج کل کے بچے خصوصاً لڑکے بیزار، مایوس اور ناراض کیوں رہتے ہیں۔ یہ ان کے والدین کے کرتوت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کہانی شروع ہوئی، اسکرین پلے مکمل ہوگیا۔ مصنف اور ہدایت کار دونوں نے اسکرپٹ کو فائنل کردیا۔

جاوید نے مشورہ دیا کہ اسکرپٹ فلم کے ہیرو ندیم اور ہیروئن شبنم کو بھی سنا دیا جائے اور ان کی رائے بھی لے لی جائے۔ ہم اپنی ذاتی فلم کا اسکرپٹ مکمل کرنے کے بعد اس کی ایک ایک کاپی تمام اداکاروں، کیمرامین اور ہدایت کار میں تقسیم کرنے کے عادی نہیں۔ معاون ہدایت کاروں کو بھی اسکرپٹ کی کاپی دے دی جاتی تھی اور ہر ایک سے اس کی رائے اور اعتراض دریافت کیا جاتا تھا۔ اکثر و بیشتر انہیں قائل کرلیا جاتا تھا۔ ان کا معقول اعتراض تسلیم بھی کرلیا جاتا تھا مگر اسکرپٹ کے معاملے میں ہیرو اور ہیروئن سے منظوری لینے کے ہم قائل نہیں رہے اور نہ ہی کسی ہیرو یا ہیروئن کے غیر معقول اعتراض اور مشورے کو تسلیم کیا لیکن جاوید صاحب کا اصرار تھا کہ ان دونوں اداکاروں کو کہانی ضرور سنائی جائے۔ دونوں ہی سے ہماری بے تکلفی تھی اور وہ ہماری عزت بھی کرتے تھے۔ اب ان کی منظوری کا انگوٹھا لگوانے کے لیے ان کے پاس جانا ہمیں پسند نہ آیا لیکن جاوید کی خاطر چلے گئے۔

شبنم کے گھر میں میٹنگ ہوئی۔ سب جانتے تھے کہ ہم کہانی پڑھ کر نہیں سنا سکتے لہٰذا یہ فرض خود جاوید نے ادا کیا۔ ہم نے مکالمے جس انداز میں لکھے تھے، جاوید نے اس طرح نہیں پڑھے۔ ان کی ادائیگی سے ہم مطمئن نہ تھے۔ بہرحال، ایک طویل اسکرپٹ پڑھ کر سنایا گیا تو خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد جاوید نے کہا ''اب آپ لوگ اپنی بیلاگ رائے دیجیے۔''

شبنم اور ندیم دونوں کو ہمارے طریقہ کار اور مزاج کا علم تھا۔ پھر بھی رائے تو دینی ہی تھی۔ رکتے رکتے ان دونوں نے پہلے سین سے تبصرہ شروع کیا اور بے جا فضول سے اعتراض شروع کردیے، جنہیں جاوید صاحب نے کاغذ پر لکھنا شروع کردیا۔

جب تو بت مکالموں اور منظر نامے تک پہنچی تو ہمارے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

ہم نے کہا ''آپ لوگوں کا کام لکھے ہوئے اسکرپٹ کے مطابق کام کرنا اور لکھے ہوئے مکالمے بولنا ہے۔ کہانی اور اسکرین پلے کا آپ دونوں میں سے کسی کو علم نہیں ہے۔''

جاوید نے کہا ''آفاقی صاحب، پھر بھی ان کی رائے.....''

ہمیں غصہ آ گیا۔ ''اگر ان کی رائے اتنی ہی اہم ہے تو ان ہی سے اسکرپٹ لکھوالو۔ آپ لوگوں کو رائٹر کی ضرورت ہی نہیں ہے۔''

ندیم اور شبنم نے پریشانی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

پھر ندیم بولے ''آفاقی صاحب، جاوید صاحب نے مشورہ دینے کو کہا تو ہم نے اپنی رائے دے دی۔''

ندیم کا ایک خوبصورت انداز

ہم نے کہا ''آپ سے رائے دینے کو کہا تھا، کہانی کا پوسٹ مارٹم کرنے کے لیے تو نہیں کہا تھا۔''

جاوید خاموش رہے اور پھر بولے ''آفاقی صاحب، یہ دونوں بہت سینئر آرٹسٹ ہیں، ان کی رائے بھی سنی تو چاہیے اور اس پر غور بھی کرنا چاہیے۔''

ہم نے کہا ''پھر ہمیں اجازت دیجیے، کہانی خود لکھ لیجیے یا ان صاحبوں سے لکھوا لیجیے۔''

یہ کہہ کر ہم اٹھ کر چلے آئے۔ ان تینوں نے روکنے کی بہت کوشش کی مگر ہم نہیں رکے۔

دوسرے دن جاوید ہمارے پاس آئے۔ ''آفاقی، دراصل.....''

ہم نے بات کاٹ دی ''جاوید، ہم نے اس سے زیادہ بے عزتی اور ذلت اس وقت بھی محسوس نہیں کی تھی جب کہانی لکھنے کا آغاز کیا تھا۔ بہرحال، یہ باب اب ختم ہی سمجھ لیجیے۔ کہانی آپ کسی اور سے لکھوائیے۔''

''آپ تو برا مان گئے۔''

ہم نے کہا ''برا تو واقعی مان گئے ہیں مگر اب اس تلخ کہانی کو بھول جاؤ۔ ہمارے تعلقات پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔''

ملاقات ہوئی تو ندیم اور شبنم نے بھی مناسب الفاظ میں معذرت کی مگر ہمارے نزدیک یہ مسئلہ بیٹھ کے لیے ختم ہوگیا تھا۔ جاوید فاضل نے ''ناراض'' کے اسکرین پلے میں کچھ تبدیلیاں بھی کیں مگر کافی حصہ ہمارا ہی لکھا ہوا تھا کیونکہ ہم معاوضہ لے چکے تھے اس لیے یہ ان کا حق تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد جاوید نے کئی بار ہم سے مختلف موضوعات فلمانے کے بارے میں تذکرہ چھیڑا۔ وہ چاہتے تھے کہ ''میرے جیون ساتھی'' کی کہانی کو ضروری تبدیلیوں کے بعد بنانا چاہیے۔ وہ دراصل آج کا موضوع ہے۔

مگر ہم ٹال گئے۔ اس طرح ہم نے نہ تو جاوید کے لیے فلم کی کوئی کہانی لکھی نہ ٹی وی کے لیے ڈرامے۔

جاوید فاضل نے ٹی وی ڈراموں اور سیریلز کی طرف توجہ دی تو اپنی ذہانت، ہنرمندی کے باعث وہاں بھی کامیابیاں حاصل کیں۔ ڈراما ''بنیاد'' میں انہوں نے دینا ملک کو پہلی بار پیش کیا تھا۔ گھر گلیاں، زیور، مہندی، چاندنی راتیں، چار چاند، جیسے جانتے نہیں، دنیاداری، منجدھار کے علاوہ انہوں نے اداکارہ ''میرا'' کے لیے ڈراما سیریل ''اقرا'' بھی بنائی تھی جس کی اب تک نمائش نہیں ہوسکی۔

جاوید فاضل معاشرتی فلمیں بنانے کو ترجیح دیتے تھے۔ انہوں نے بے مقصد اور بے سروپا موضوعات کبھی نہیں بنائے۔

کراچی میں انہوں نے ایک فلم بھی بنائی تھی۔ اس کی تمام شوٹنگ ہندوستان میں ہوئی تھی اور اس میں بھارتی اداکار بھی شامل تھے۔ فلم کا نام تھا ''میں اک دن لوٹ کر آؤں گا''

یہ محمد جاوید فاضل کی آخری فلم ثابت ہوئی۔

جاوید ایک زمانے میں کھانے کے بہت شوقین تھے۔ صرف اچھے کھانے کے نہیں بلکہ زیادہ کھانے کے۔ حیرت ہے کہ اس کے باوجود ان کا وزن کبھی بڑھ نہ سکا تھا۔ ان کی عادات، خوش مزاجی اور مہذبانہ رویے کی وجہ سے انہیں سبھی پسند کرتے تھے۔ وہ حفظِ مراتب کا لحاظ رکھتے تھے اور ہر ایک سے اس کے مرتبے، مزاج اور پسند کے مطابق بات کرتے تھے، اس لیے اداکار اور اداکاراؤں سے لے کر فلم سازوں اور ہدایت کاروں تک ان کی رسائی تھی۔ اس طرح انہیں ایک فائدہ یہ تھا کہ زیادہ کھانے کا موقع ملتا تھا۔ مثال کے طور پر اگر انہوں نے اپنی فلم کے یونٹ کے ساتھ لنچ کھالیا۔ اس کے بعد علی زیب کے دفتر میں پہنچے تو وہاں بھی کھانا کھایا جارہا تھا۔ محمد علی صاحب یا زیبا نے کہا ''جاوید! کھانا کھاؤ گے؟''

جاوید نے شکریہ کہہ کر ایک پلیٹ اٹھائی اور کھانا شروع

کر دیا۔

کسی نے کہا "جاوید، تم تو ابھی کھا کر آئے ہو؟"

"ان کے کھانے کا مزہ ہی اور ہے۔ ان کا باورچی بہت اچھا ہے۔"

زبانے کہا "ہمارا باورچی بدل گیا ہے۔"

"اسی لیے میں حیران ہو رہا تھا۔ یہ تو اس سے بھی زیادہ اچھا باورچی ہے۔"

اس کے بعد وہ کسی اور دفتر میں گئے اور اگر وہاں لنچ جاری ہے تو رسمی طور پر مدعو کرنے پر فوراً پلیٹ اٹھا کر شامل ہو جاتیں گے۔

اگر کسی نے کہہ دیا کہ بھئی تم تو ابھی کھا کر آ رہے ہو تو جاوید کہیں گے "دراصل میں تو اچار چکھ رہا ہوں۔"

"مگر تم تو کھانا کھا رہے ہو؟"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں، اچار ہمیشہ کھانے کے ساتھ کھایا جاتا ہے، خالی اچار کون کھاتا ہے؟"

ایک بار تو انہوں نے فلمی ہپنوٹیشن پیدا کر دی۔

ایک فلم یونٹ آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے مری گیا ہوا تھا۔ سب لوگ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ صبح کا ناشتا ڈائننگ روم میں ہوتا تھا۔ جو تیار ہو کر آ جاتا اس کو ناشتا پیش کر دیا جاتا۔ جاوید صاحب سب سے پہلے اٹھ کر تیار ہو گئے اور ناشتا کر لیا۔ تھوڑی دیر بعد کوٹ بدل کر اور ٹائی لگا کر آ گئے اور ناشتا منگا لیا۔ تیسری بار اوور کوٹ اور ہیٹ پہن کر اور سیاہ چشمہ لگا کر آ گئے اور ناشتا منگا لیا۔ ڈائننگ روم کا ویٹر بے چارہ تو نہ پہچانا مگر ایک ساتھی نے پہچان لیا۔

"جاوید، ابھی کچھ دیر پہلے تو تم ناشتا کر کے گئے ہو؟"

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ کوئی اور ہو گا۔ اس ہوٹل میں بہت سے لوگ ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

کپڑے اور عینک بدل بدل کر ناشتا کرنے کا یہ انوکھا تجربہ تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ بار بار کھانے کے باوجود ان کے وزن میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ لیکن ان کے ہدایت کار بننے کے کچھ عرصے بعد جب ہم امریکا سے واپس آئے تو جاوید بہت کمزور نظر آئے۔

"جاوید، کیا بات ہے، کیا بیمار ہو گئے تھے؟"

"نہیں تو۔"

"پھر اتنے کمزور کیوں نظر آ رہے ہو؟"

"یہ تو میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔"

"ڈاکٹر کو دکھایا؟"

"ضرورت ہی نہیں پڑی، ویسے تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"مگر تمہیں ڈاکٹر کے پاس ضرور جانا چاہیے، اتنا زیادہ وزن کم ہونے کی کچھ تو وجہ ہو گی تم تو بیمار نظر آتے ہو۔"

وہ ڈاکٹر کے پاس گئے ٹیسٹ وغیرہ کے بعد معلوم ہوا کہ شوگر بہت بڑھ گئی ہے۔ ڈاکٹر نے انہیں دوا کے ساتھ کھانے پینے میں سخت پرہیز بتایا مگر وہ پہ دستور بد پرہیزیاں کرتے رہے جس کی وجہ سے وزن اور کم ہو گیا۔ صحت خراب ہوئی تو انہوں نے علاج پر توجہ دی مگر مرض بہت زیادہ بڑھ چکا تھا۔ کھانے پینے میں وہ احتیاط کرتے تھے۔ دوائیں بھی استعمال کرتے تھے لیکن شوگر کا مرض اگر بڑھ جائے تو مشکل ہی سے قابو میں آتا ہے۔

ان ہی دنوں ایک تقریب میں شوکت حسین رضوی اور ان کی بیگم یاسمین سے ملاقات ہوئی، دونوں سے ہمارے بہت پرانے اور گہرے مراسم تھے۔ ایک زمانے میں جب ہم فلم دیکھنے جاتے تھے اگر کسی مزاحیہ سین یا فقرے پر ہنسی آ جائے تو ہمارا یہ غیر ارادی قہقہہ سارے سنیما میں گونج جاتا۔ ایک بار ہم اوڈین سنیما میں فلم دیکھ رہے تھے۔ کسی سین پر بے ساختہ چیخ نما قہقہہ لگایا تو چند منٹ میں سنیما کا ایک گیٹ کیپر آ گیا۔ اس زمانے میں سبھی ہم کو پہچانتے تھے۔ آ کر بولا "آفاقی صاحب، آپ کو شوکت حسین رضوی صاحب یاد کر رہے ہیں۔"

"کہاں؟"

"جی وہ باکس نمبر پانچ میں ہیں۔"

ہم فوراً اٹھ کر گئے۔ باکس کا دروازہ کھولا تو شوکت صاحب نے کہا "آیئے آیئے، آپ کی چیخ سن کر ہم سمجھ گئے تھے کہ آپ بھی فلم دیکھ رہے ہیں۔"

میڈم یاسمین بھی ہنس رہی تھیں، بولیں "آفاقی صاحب، آپ کا قہقہہ بلکہ چیخ تو الگ ہی سے پہچانا جاتا ہے۔"

ہم نے عرض کی "آیندہ خیال رکھیں گے، اب اجازت ہے؟"

شوکت صاحب بولے "ارے میاں کیسی اجازت۔ اتنا بڑا صوفہ خالی پڑا ہے۔ یہیں بیٹھ جاؤ۔"

کچھ عرصے بعد شوکت صاحب تقریب میں ملے تو بولے "ارے میاں، کیا آج کل عشق کر رہے ہو؟"

"جی نہیں۔"

"تو پھر نظر کیوں نہیں آتے؟"

"جی، اب آپ کو شکایت نہ ہو گی۔"

بولے "خیر، تم کل تندوری پراٹھے کھانے کے لیے شام

کو آ جاؤ اور ہاں، اپنی بیگم کے ساتھ آنا۔"

دوسرے دن ہم شام ہی کو پہنچ گئے۔ شوکت صاحب اور میڈم یاسمین سے باتیں شروع ہوئیں تو بات سے بات نکلتی چلی گئی۔ شوکت صاحب پرانے زمانے کے واقعات سناتے رہے اور کلاسیکی شاعروں کا کلام بھی سنایا۔ کچھ دیر بعد دادا کا پوتے سے ملنے آ گئیں۔ امریکا سے آئی ہوئی تھیں، نانی دادی بن گئی تھیں مگر ہم انہیں بے بی ہی کہتے تھے۔ شوکت صاحب بھی انہیں بے بی ہی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ یاد ہے کہ ہنسنا اس وقت بے بی ہی تھیں جب انہوں نے شوکت صاحب کی فلم "جانِ بہار" میں پہلی بار چائلڈ اسٹار کا کردار کیا تھا۔ اس زمانے میں وہ اپنے والدین کے ساتھ شاہ نور اسٹوڈیو ہی میں رہتی تھیں اور سارے دن ہر سیٹ پر اور رش پرنٹ دیکھنے کے لیے موقعے پر موجود رہتی تھیں۔ یہ فلم اتنی دیر میں مکمل ہوئی کہ بے بی نوعمر ہو گئیں مگر مجبوری تھی، ان کا پچھلا کام فلم سے خارج کر کے از سرِ نو فلم بندی نہیں کی جا سکتی تھی چنانچہ اس فلم میں وہ کہیں بچی نظر آتی ہیں اور کبھی نوعمر لڑکی۔ ان کے شامل ہونے کے بعد کچھ اور واقعات شروع ہو گئے یہاں تک کہ ڈنر کا وقت ہو گیا۔ شوکت صاحب کے قدیم ملازم اشرف نے آ کر اطلاع دی کہ کھانا لگ گیا۔ ہم سب کھانے کے کمرے کی طرف چلے گئے۔ وہاں میز کو دیکھا تو ہوش اڑ گئے۔ انواع و اقسام کے کھانے میز پر سجے ہوئے تھے۔ شوکت صاحب کا دسترخوان ہمیشہ بہت وسیع اور کشادہ رہا ہے۔ وہ خود بھی کھانے کے شوقین تھے اور دوسروں کو کھلا کر خوش ہوتے تھے۔

ہم نے کہا "شوکت صاحب! آپ نے تو تندوری پراٹھوں کے لیے کہا تھا؟"

"ارے میاں، وہ بھی آ جائیں گے۔ انہیں تو گرم گرم کھانے کا ہی مزہ ہے۔"

ہم نے میڈم یاسمین سے پوچھا "شوکت صاحب کا پرہیزی کھانا کدھر ہے؟"

وہ مسکرائیں اور میز کی طرف اشارہ کیا جس پر قورمہ، مرغ کا سالن، کوفتے، شامی کباب اور کئی اقسام کے کھانے موجود تھے۔

شوکت صاحب میز کے سربراہ کی جگہ بیٹھ گئے۔ ہمیں علم تھا کہ وہ شوگر کے پرانے مریض ہیں۔ دل کا عارضہ بھی ہے۔ ان دونوں بیماریوں میں پرہیز لازم ہے مگر توبہ کیجیے۔ شوکت صاحب اور پرہیز.....؟

ہم نے خیر خواہی جتانے کے لیے کہا "شوکت صاحب، آپ پرہیز نہیں کرتے؟"

مسکرا کر بولے "ابھی پرہیز بھی آ جائے گا۔"

اسی وقت اشرف ایک انجکشن کی بھری ہوئی سرنج لے کر آیا۔ شوکت صاحب نے اپنے بازو میں خود ہی انجکشن لگایا اور بولے "آپ لوگ شروع کریں۔ میں چند منٹ بعد شریک ہو جاؤں گا۔"

اب جو وہ شریکِ طعام ہوئے تو انہوں نے کوئی ڈش یہاں تک کہ کوئی سوئٹ ڈش بھی نہیں چھوڑی۔ ہم حیران ہو کر دیکھتے رہے۔ وہ کھا گئے، کہنے لگے "ارے میاں، ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

ہم نے کہا "شوکت صاحب، ایسی بدپرہیزی؟"

بولے "ارے تو انسولین کا انجکشن کس لیے لگایا ہے؟"

شوکت صاحب اس وقت بھی عمر کے باوجود سرخ و سفید تھے۔ معلوم ہوا کہ انسولین کا انجکشن لگا کر وہ سب کچھ کھا سکتے ہیں۔

ہم نے جاوید کو بھی یہی مشورہ دیا اور شوکت صاحب کی مثال بھی دی۔ جاوید بولے "مگر انسولین کو ایک بار استعمال کر و تو عمر بھر کے لیے چھٹکارا نہیں ملتا۔"

"بھائی، تمہیں چھٹکارے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر فائدہ ہو، صحت بھی اچھی رہے تو دن میں دو انجکشن لگانے میں کیا حرج ہے۔ اب سب ڈاکٹر یہی مشورہ دیتے ہیں۔ سمجھو کہ یہ بھی کھانے کا ایک لازمی حصہ ہے۔ اس سے نقصان نہیں ہوتا۔" ڈاکٹروں کے مشورے کے بعد جاوید نے انسولین کا استعمال شروع کر دیا تھا جس کی وجہ سے ان کا وزن بھی بڑھ گیا اور صحت بھی ٹھیک ہو گئی اور انہوں نے دن رات کام شروع کر دیا اور آخر دم تک انتھک کام کرتے رہے۔ جس رات ان کا انتقال ہوا اس دن بھی ان کے ڈرامے کی ریکارڈنگ تھی۔ اگر ریکارڈنگ کا ٹیکنٹ ان کو لینے نہ آتا تو دروازہ توڑ کر اندر پہنچ کر وہ جاوید فاضل کی وفات سے باخبر نہ ہوتے۔ ڈاکٹروں کے مطابق کسی وقت انہیں دل کا اتنا شدید دورہ پڑا کہ کافی دیر تک وہ بے ہوش رہے۔ کمرا اندر سے بند تھا اور وہ بالکل اکیلے تھے۔ دروازہ کھولنا تو دور کی بات ہے وہ کسی کو فون تک نہ کر سکے۔ کوئی امداد پہنچنے سے پہلے ہی وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

سچ تو یہ ہے کہ محمد جاوید فاضل کو... پاکستان کی فلمی صنعت میں وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ اس کا ایک بڑا سبب تو یہ تھا کہ جب وہ ہدایت کار کی حیثیت سے فلمی افق پر نمودار ہوئے تو اس وقت بہت بڑے بڑے، نامور اور تجربے کار

ہدایت کار بھی فلمیں بنا رہے تھے۔ ان دیو قامت لوگوں کی موجودگی میں ہدایت کار کی حیثیت سے خود کو ممتاز اور نمایاں کر لینا بجائے خود ایک قابلِ تعریف کارنامہ ہے۔ لیکن جاوید کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ ان میں انکسار، وضع داری اور مروت بہت زیادہ تھی۔ نہ تو وہ اپنے کارناموں کا ڈھنڈورا پیٹتے تھے نہ ہی شہرت حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے، بس خاموشی سے اپنے کام میں لگے رہتے تھے۔ پاکستان کی فلمی صنعت اس وقت پورے عروج پر تھی۔ ہر شعبے میں بہت نمایاں لوگ موجود تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے اپنا مقام بنا لینا اور پھر اپنی حیثیت کو برقرار رکھنا بجائے خود کسی کارنامے سے کم نہیں ہے۔ ان کی آمد کے کچھ عرصے بعد ہی فلمی صنعت کا زوال شروع ہو گیا۔ رفتہ رفتہ پرانے، تجربے کار اور ممتاز ہنر مند ایک ایک کر کے ماحول سے تنگ آ کر رخصت ہو گئے مگر جاوید اپنی جگہ قائم رہے۔ یہاں تک کہ جب فلمی صنعت برائے نام ہی رہ گئی اور جاوید نے ٹی وی ڈراموں کے ذریعے اپنا شوق اور ضروریاتِ زندگی پوری کرنے لگے اس کے بعد بھی موقع ملتے ہی انہوں نے ایک فلم ''میں اک دن لوٹ کر آؤں گا'' بنا ڈالی۔ یہ جاوید فاضل کی وابستگی اور محبت کی مثال ہے۔

فلمی صنعت کے زوال کے زمانے میں بھی وہ اچھی، معیاری فلمیں بناتے رہے۔ جاوید نے کبھی کوئی عامیانہ اور گھٹیا فلم نہیں بنائی، نہ ہی اندرین فلم کا چربہ بنایا حالانکہ خود ان کی بیشتر فلموں کو بالی وڈ والوں نے بڑے شوق سے چوری کیا ہے۔

ہم نے جیسا کہ بتایا ہم جاوید کو کم عمر اور لڑکا ہی سمجھتے تھے لیکن جب ایک دن حساب کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اتنے کم عمر بھی نہ تھے۔ مگر جاوید کی وضع داری دیکھیے کہ انہوں نے ہمیشہ ہمیں ایک سینئر اور بزرگ ہی سمجھا۔

محمد جاوید فاضل 1940ء میں پیدا ہوئے تھے۔ تعلیم لاہور میں حاصل کی اس کے بعد 1960ء میں وہ فلم انڈسٹری میں آئے تو ہدایت کار قدیر غوری کے معاون کے طور پر کام کا آغاز کیا۔ انہوں نے اور بھی چند ہدایت کاروں کے ساتھ کام کیا لیکن زیادہ عرصے وہ ایس سلیمان کے معاون رہے اور اس زمانے میں انہوں نے بہت کچھ سیکھا۔

پاکستان کی سیکڑوں فلمیں اور ہزاروں گانے بالی وڈ نے چوری کیے ہیں جن میں جاوید کی فلم بازارِ حسن، فیصلہ، دلبیر شامل ہیں۔ فیصلہ کو ''پاپ کی دنیا'' کے نام سے اور بازارِ حسن کو ''پتی پتنی اور وہ'' کے نام سے فلمایا گیا۔ دلبیر کی کالی ''اونچے لوگ'' کے نام سے بنائی گئی۔ ان کی کامیڈی فلم ''استادوں کے استاد'' کو ''انداز اپنا اپنا'' کے نام سے بنایا گیا اور یہ وہاں بھی ایک ہٹ فلم ثابت ہوئی۔ ''جان من'' بھی اسی فلم کا چربہ تھی۔ جن سینئر اداکاروں نے ان کے ساتھ کام کیا انہوں نے ان کے بارے میں کہا کہ وہ بہت اچھے ہدایت کار تھے اور دوستانہ انداز میں کام کرتے تھے۔ سینئر اداکاروں کو بھی ہدایت دینے سے نہیں ہچکچاتے تھے کیونکہ انہیں اپنے آپ پر اور اپنے ہنر پر اعتماد تھا۔ وہ اس زمانے میں پہلے ہدایت کار تھے جنہوں نے وحید مراد کو ایک باوقار گیٹ اپ کرنے اور عینک لگانے پر رضامند کر لیا تھا ورنہ جیسا کہ سب جانتے ہیں وحید مراد اپنے چہرے پر مصنوعی سی تبدیلی بھی گوارہ نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ سوائے اپنی والی پنجابی فلم کے وہ کسی فلم میں مونچھیں لگانے پر بھی آمادہ نہ ہوئے تھے مگر جاوید نے اپنے دلائل سے انہیں شیشے میں اتار لیا تھا۔

فلم اسٹار ندیم نے ان کے ساتھ چھ سات فلموں میں کام کیا جن میں صائقہ، آہٹ، لازوال، دلبیر، نظر، فیصلہ، بازارِ حسن، کندن اور بلندی شامل ہیں۔ یہ تمام فلمیں بے حد کامیاب ہوئیں۔ انہوں نے اپنی آخری فلم ''میں ایک دن لوٹ کے آؤں گا'' میں بھی ندیم کو کاسٹ کیا تھا۔ ان دونوں کا ساتھ بہت عرصے تک رہا۔ ندرا اسلام کے علاوہ کسی اور ہدایت کار کی اتنی زیادہ فلموں میں ندیم نے کام نہیں کیا۔ ندیم نے ان کی وفات پر کہا ''جاوید فاضل ایک اچھا ہدایت کار ہی نہیں میرا ایک اچھا دوست تھا، اس کو کام کے سوا کسی اور چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ اپنے کام سے اس قدر عشق کرنے والے لوگ میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔ ان کے ساتھ اتنی فلموں میں کام کرنا میرے لیے ایک فخر کی بات ہے۔''

محمد جاوید فاضل کی فلموں کی عام طور پر موسیقی بہت اچھی ہوتی تھی۔ انہوں نے نثار بزمی، سہیل رعنا، ایم اشرف، روبن گھوش، امجد بوبی جیسے موسیقاروں کے ساتھ کام کیا جس کی وجہ سے ان کی فلموں کی موسیقی بھی فلم کا ایک ضروری حصہ ہوتی تھی۔

انہوں نے جب فلمی صنعت کے ٹھپ ہو جانے کے بعد ٹی وی ڈرامے بنانے تو ٹی وی اداکاروں کو حیران کر دیا کیونکہ بڑے اسکرین سے اس قدر آسانی اور خوبصورتی سے چھوٹے اسکرین پر منتقل ہو جانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں فلم تکنیک، اسکرین پلے اور اداکاروں سے کام لینے کا گر آتا تھا۔

جاوید فاضل کی آخری فلم ''میں ایک دن لوٹ کے آؤں گا'' انڈیا میں فلمائی گئی تھی۔ اس میں ہندوستانی اور

پاکستانی فن کاروں اور ہنر مندوں کا اشتراک تھا۔ گلوکاروں میں آشا بھونسلے اور الکا کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے زیادہ تر فلم بندی حیدر آباد دکن میں کی تھی۔

ان کے ساتھ بہروز سبزواری اور ہمایوں سعید جیسے ٹی وی اداکاروں نے فلم میں کام کیا تھا اور بہت اچھی اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہمایوں سعید نے کہا کہ وہ دن رات کام کرنے کے قائل تھے۔ جب ہم انہیں چھیڑتے کہ جاوید صاحب آپ تو بوڑھے ہو گئے ہیں تو وہ کہتے ''فکر نہ کرو، میں آخر دم تک کام کروں گا اور کام کرتے ہوئے ہی دنیا سے جاؤں گا۔'' اور ایسا ہی ہوا۔ جس رات ان کا انتقال ہوا وہ دن بھر فی وی ڈراما سیریل ''عورت کا گھر کون سا'' کی ریکارڈنگ کرتے رہے تھے اور اگلے دن بھی اس کی ریکارڈنگ تھی۔

جاوید فاضل ایک اچھے ہدایت کار، اچھے انسان اور اچھے دوست تھے۔ وہ دوستی نبھانا جانتے تھے اور اپنے پرانے دنوں کے ساتھیوں اور دوستوں کو انہوں نے کبھی فراموش نہیں کیا۔ جاوید کی دیگر خوبیوں کے علاوہ ہمیں ان کی جو خوبی پسند تھی، وہ ان میں حفظِ مراتب کا احترام تھا۔ ہماری ان سے اس وقت سے رفاقت تھی جب وہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔ مگر ہم انہیں اکثر ساتھ رکھتے تھے۔ ہماری بے تکلفی بھی تھی۔ وہ مذاق بھی کر لیا کرتے تھے مگر شائستگی اور مودبانہ انداز میں۔ انہوں نے ہمیں آفاقی صاحب کے علاوہ کسی اور طرح مخاطب نہیں کیا۔ نہ ہماری موجودگی میں اور نہ غیر موجودگی میں۔ شرافت اور شائستگی انہیں ورثے میں ملی تھیں۔

کئی اور فلمی دوستوں کی طرح جاوید کی شادی کرانے میں بھی ہمارا بڑا دخل تھا۔ ہم نے ان کی والدہ سے اتنے تقاضے کیے اور سمجھایا کہ انہوں نے بالآخر جاوید کو شادی کرنے پر رضامند کر لیا۔ وہ شمیم آرا کے بھی بہت قریب تھے۔ شمیم آرا نے ان کے لیے دلہن تلاش کرنی شروع کر دی اور ان کی شادی اپنی بھتیجی عشرت سے کروا دی۔

جاوید کا اور ہمارا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا۔ اچھے برے ہر حال میں ہماری ملاقاتیں جاری رہیں جب تک کہ وہ کراچی نہیں چلے گئے۔ مگر فون پر بات ہوتی رہتی تھی اور جب لاہور آتے تو ملاقات بھی ضرور کرتے تھے۔ جاوید سے ملنا بہت کم ہو گیا تھا مگر ذہنی اور دلی طور پر ہم ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔

گزشتہ چند سالوں میں جب فلمی صنعت سے ان کے تمام سینئر ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے تو وہ بھی فلمی صنعت کے ''بڑے'' اور سینئر بن گئے۔ کسی نے صحیح لکھا ہے کہ ان کی حیثیت اپنے دور کے ہدایت کاروں میں ایسی ہی تھی جیسے بالشتیوں کے درمیان ایک لمبا تڑنگا انسان۔ اگرچہ وہ بہت کم آمیز اور مصروف انسان تھے مگر اپنے دوستوں اور جاننے والوں کو وہ بہت عزیز تھے۔ انہوں نے تنہائی اور بے بسی کے عالم میں موت کو خوش آمدید کہا۔ اس بات کو سوچ کر دکھ ہوتا ہے کہ اتنے بہت سے دوست، احباب، رشتے دار اور رفیقِ کار ہونے کے باوجود وہ اپنی ذات میں گم ایک اکیلے انسان تھے اور جب دنیا سے گئے تو اکیلے ہی تھے۔

اللہ مغفرت کرے۔

جانے والے تجھے روئے گا زمانہ برسوں

☆☆☆

ساری دنیا ترقی کر رہی ہے۔ ہمارے بعد آزادی حاصل کرنے والی اقوام اس عرصہ میں کہیں سے کہیں پہنچ گئیں۔ ان کی ترقی آگے کی طرف ہے لیکن اگر ترقی معکوس کی مثال دیکھنی ہو تو پاکستان کو دیکھیے۔ کون سا شعبہ ہے جس میں ہم پسماندگی اور پستی کا شکار نہ ہوئے؟

اس وقت ہمارا موضوع فلم ہے۔ جب پاکستان بنا تھا تو یہاں کی فلمی صنعت تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ فلم اسٹوڈیو کھنڈر بن چکے تھے۔ اچھے غیر مسلم ہنر مند ہندوستان چلے گئے تھے۔ مالی حالات بے حد خراب تھے لیکن اس وقت قوم کے ذہن دماغ میں ترقی کرنے اور پاکستان کو دنیا کا عظیم ترین ملک بنانے کا جذبہ اور لگن تھی۔ جیب خالی تھی بے روزگاری عام تھی۔ لاکھوں کروڑوں لٹے ہوئے مہاجرین کی آمد نے سارا نظام درہم برہم کر دیا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ بظاہر کچھ بھی نہ تھا۔ نہ کوئی امید تھی کہ کہیں سے اقتصادی مدد آ جائے گی۔ ہندوستان نے ہمارے حصے کی رقم، اسلحہ اور دوسری اہم اشیا روک لی تھیں۔ قیامِ پاکستان سے قبل جو مسلمان ہدایت کار، اداکار اور عکاس وغیرہ موجود تھے انہیں بھی زیادہ تجربہ نہ تھا۔ وہ اس سے پہلے ہندو ماہرین کے شاگرد بن کر کام کرتے رہے تھے لیکن خود اعتمادی تھی اور اللہ پر بھروسا تھا۔

پاکستان میں فلمی صنعت کا سفر زیرو میٹر سے شروع ہوا تھا۔ نگار خانوں کی مرمت کی گئی۔ بچے کھچے بوسیدہ آلات کو صاف کیا گیا اور قابلِ عمل بنایا گیا۔ اس وقت شوری اسٹوڈیو اور پنچولی اسٹوڈیو کی جلی ہوئی عمارتیں تھیں جہاں ہر چیز اجڑی ہوئی تھی۔ اقبال نے کہا تھا۔

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد

پاکستان بھی ایک ایسی ہی بستی تھی اور یہاں کے فلمی

نگار خانے بھی تعمیر نو کے محتاج تھے۔ شوکت حسین رضوی نے شاہ نور اسٹوڈیوز کو بنایا، سنوارا اور اس کو چند سال کے اندر برصغیر کا ایک بہترین فلم اسٹوڈیو بنادیا۔ مختلف لوگوں نے مختلف اسٹوڈیوز سنبھالے۔ ملکہ پکھراج نے مال روڈ پر ملک اسٹوڈیو کو نئے سرے سے آباد کیا۔ پھر آغا جی اے گل نے ایور نیو اسٹوڈیو اور باری ملک نے باری اسٹوڈیوز کی بنیاد رکھی۔ اس سے پہلے تمام پرانے نگار خانوں کو قابلِ عمل بنالیا گیا تھا۔ اس طرح فلم بنانے کے ساز و سامان کا بندوبست کیا گیا۔ فلموں کی نمائش کے لیے سینما گھر موجود تھے جنہیں فسادات نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا مگر بھارتی فلموں کی درآمد ایک سیلاب کے مانند ہو رہی تھی۔ بڑے بڑے سپر اسٹار اور ہدایت کاروں کی سپر ہٹ فلموں کی پاکستانی سینما گھروں میں نمائش ہو رہی تھی جن پر اس زمانے میں چالیس پچاس لاکھ روپے لاگت آتی تھی مگر پاکستان میں فلم سازوں کے پاس اتنا پیسا نہ تھا۔ ابتدا میں جن لوگوں نے ہمت کی وہ بہ مشکل چالیس ہزار روپے میں فلم مکمل کر لیتے تھے۔ 1957ء میں فلم کی لاگت 70-80 ہزار روپے ہو گئی جبکہ انڈیا میں بڑا اداکار اتنا معاوضہ وصول کرتا تھا۔

بہرحال یہ بہت طویل اور پرانی بات ہے جس کا بارہا تذکرہ ہو چکا ہے اب اس کی تفصیل بیان کرنا ضروری نہیں ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ پاکستان میں کچھ باہمت اور حوصلہ مند لوگوں نے فلم سازی شروع کر دی۔ سہولتوں کی عدم موجودگی اور وسائل کی کمی کے باعث جس قسم کی فلمیں بن سکتی تھیں وہ بنائی گئیں اور فلاپ بھی ہوئیں۔ اعلیٰ معیاری اور بھاری بھرکم بھارتی فلموں کے مقابلے میں ان فلموں کی کیا حیثیت تھی لیکن پھر بھی آہستہ آہستہ فلموں کی رفتار میں اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ سال میں دس بارہ فلمیں بننے لگیں۔ زیادہ تر فلمیں اردو کی ہوتی تھیں۔ پھر کچھ پنجابی فلمیں بھی بننے لگیں۔ فلموں کی تعداد میں اور معیار میں اضافہ ہونے لگا۔ پاکستانی فلموں کا معیار اتنا بہتر ہو گیا کہ بھارتی فلموں کے مقابلے میں پاکستانی فلمیں بھی کامیاب ہونے لگیں۔ انور کمال پاشا مرحوم کی فلموں نے سلور جوبلی منائی تو پاکستانیوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ پاکستانی فلمیں ہندوستانی فلموں کے مقابلے میں پیش کی جاتی تھیں اور کامیابی بھی حاصل کرتی تھیں لیکن سرمایہ کاروں کی کمی تھی۔ سینما گھروں کے مالک اور فلم ڈسٹری بیوٹرز کو پکی پکائی کھانے کی عادت ہو گئی تھی۔ بھارتی فلمیں غیر سرکاری طور پر برائے نام معاوضوں میں حاصل کر لی جاتی تھیں جو لاکھوں کا منافع کما کر دیتی تھیں۔ اس کے برعکس اگر پاکستانی فلم کے حقوق خریدے جائیں تو اس پر کہیں زیادہ لاگت آتی تھی اور یہ بھی یقین نہیں تھا کہ یہ فلم کامیاب بھی ہو گی۔ جبکہ بھارت کی کامیاب ترین فلمیں برائے نام معاوضے پر مل جاتی تھیں۔ پاکستان میں فلمی صنعت کو انڈسٹری کا درجہ حاصل نہیں تھا۔ بینک فلمسازوں کو قرض نہیں دیتے تھے۔ ہندوستانی فلمی صنعت کی طرح یہاں سرمایہ کار بھی نہیں تھے جو مقررہ منافع پر فلم سازوں کو قرضہ دیتے ہیں۔ لے دے کر پاکستان میں فلم ڈسٹری بیوٹرز ہی مختلف علاقوں میں نمائش کے حقوق کے عوض اقساط میں رقم دیا کرتے تھے اور وہ بھی بہت کم۔ اگر فلم کامیاب ہو جاتی تو ڈسٹری بیوٹرز اور سینما کے مالک جعلی رسیدیں بنا کر نقصان ظاہر کر کے منافع خود ہی ہضم کر لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈسٹری بیوٹرز کروڑ پتی ہو گئے تھے اور سینما کے مالک ہر سال شاندار بنگلوں کے علاوہ ایک نیا سینما بھی بنا لیتے تھے۔ جس کی وجہ سے پاکستانی شہروں میں سینما گھروں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوتا رہتا تھا مگر فلم ساز کے حصے میں کچھ نہیں آتا تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنے شوق اور لگن کی وجہ سے فلمیں بناتے رہے یہاں تک کہ آسمگلرز، بدمعاشوں اور جوئے باز اس صنعت میں آ گئے۔ ان کو نفع نقصان کی کوئی پروا نہ تھی اس لیے ڈھیروں روپیہ لٹاتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ اپنے ہی جیسے جاہل اور بدتہذیب لوگوں کو فلمی صنعت میں لائے جس کی وجہ سے تعلیم یافتہ اور باشعور لوگوں کے لیے فلمی صنعت میں کوئی گنجائش نہ رہی۔ وہ اس ماحول میں کام کرنے کے عادی نہ تھے اس لیے ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے اور پھر ان پڑھ اور جاہل فلم سازوں کی بدولت فلمی صنعت کا جو حال ہوا وہ ہم سب کے سامنے ہے۔

اسی دوران میں پاکستانی فلمی صنعت کے لوگوں نے بھارتی فلموں کی درآمد کے خلاف پُرزور احتجاجی مہم چلائی اور ایک طویل جدوجہد کے بعد ایوب خان کے دورِ حکومت میں بھارتی فلموں کی درآمد پر پابندی عائد کر دی گئی۔ ڈسٹری بیوٹرز اور سینما اونرز بہت روئے گائے لیکن پھر مجبور ہو کر بیٹھ رہے۔ اب انہیں کاروبار کے لیے پاکستانی فلموں کی ضرورت پیش آئی تو انہوں نے پاکستانی فلموں میں سرمایہ کاری بھی شروع کر دی۔ بھارتی فلموں کے حامیوں نے فلم اسٹوڈیوز اور فلمیں بنانی شروع کر دیں اور پاکستانی فلمی صنعت دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگی۔ پشتو فلمیں بھی بننی شروع ہو گئیں۔ پاکستان میں بھارت کے معیار کی فلمیں بننی شروع ہو گئیں۔ فلم کے ہر شعبے نے ترقی کی۔ مزید تعلیم یافتہ لوگ فلمی

صنعت سے وابستہ ہو گئے۔ اس طرح بدمعاشوں اور اسمگلروں کے آنے سے پہلے پاکستانی فلمیں دنیا کے ہر ملک میں نمائش کی جانے لگی ہو رہی تھیں۔

گزشتہ چند سالوں میں فلمی صنعت برباد ہو چکی ہے۔ جو لوگ فلمیں بنا رہے ہیں وہ آج بھی جہالت کی پٹی آنکھوں پر باندھے اسی ڈگر پر چل رہے ہیں جس کی وجہ سے فلمی صنعت تباہ ہو کر رہ گئی ہے۔

گزشتہ 2010ء میں پاکستان میں کل بائیس فلمیں ریلیز ہوئیں جن میں سے صرف دو قومی زبان کردہ پوش بنی ہیں۔ پنجابی فلموں کی تعداد نو اور پشتو فلموں کی تعداد گیارہ ہے۔ اس طرح پاکستان میں گزشتہ سال کل 22 فلمیں نمائش کے لیے پیش کی گئیں جن میں کامیاب فلموں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ پاکستان میں کسی زمانے میں ہر سال 125 فلمیں ریلیز ہوتی تھیں جن کے لیے سینما کم پڑتے تھے۔ ڈھائی تین سو فلمیں زیرِ تکمیل رہتی تھیں۔ دنیا کے ہر ملک میں پاکستانی فلم ساز جا کر اعلیٰ معیار کی فلمیں بناتے تھے۔ کہاں وہ دور تھا اور کہاں یہ زمانہ ہے۔ کیسی بلندی، کیسی پستی کا کھلی آنکھوں دیکھنا ہو تو پاکستان کی فلمی صنعت کو دیکھیے۔

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

یہ شعر ہماری اور بھارتی فلمی صنعت پر صادق آتا ہے۔

بھارت کی فلمی صنعت آج دنیا میں سب سے زیادہ فلمیں بناتی ہے، وہاں اردو (جسے وہ ہندی کہتے ہیں) فلموں کے علاوہ علاقائی زبانوں میں بھی بہت اعلیٰ معیاری اور مہنگی فلمیں بنتی ہیں جن کی کل تعداد بالی وڈ میں بننے والی فلموں سے کہیں زیادہ ہے۔ بھارتی فلم سازوں نے اپنی فلموں کو دنیا بھر میں مقبول بنانے کے لیے ایسے مؤثر طریقے اپنائے ہیں کہ بالی وڈ والے بھی دیکھ کر حیران ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ اس وقت بعض بھارتی فن کار دنیا بھر میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔

گزشتہ سال پاکستان میں 33 انتہائی مہنگی اور کامیاب بھارتی فلمیں ریلیز ہوئیں۔ سستی مل جانے کی وجہ سے ہو سکتا ہے بعض فلموں میں منافع بھی حاصل ہوا ہو لیکن زیادہ تر فلمیں ایک ہفتہ بھی نہ چل سکیں۔ یہ بھارتی فلمیں چھوٹے چھوٹے سینماؤں میں ریلیز ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود وہ دن بھی ہاؤس فل نہ ہو سکا البتہ چند فلموں نے بہ مشکل ایک ہفتہ پورا کیا۔ اس طرح سینما گھروں کے مالکوں کا یہ دعویٰ کہ بھارتی فلمیں پاکستان میں "سینما انڈسٹری" کو تحفظ اور فروغ دیں گی درست ثابت نہ ہوا۔ اس سے زیادہ کامیابی تو ہماری فلموں نے حاصل کی ہے۔ اول تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ سینما "انڈسٹری" کیوں کر ہو گئی۔ انڈسٹری وہ ہوتی ہے جو کوئی چیز بنائے مگر سینماؤں میں تو صرف دوسروں کی بنائی ہوئی فلمیں نمائش کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔ اس کو آپ زیادہ سے زیادہ فلموں کا شوروم کہہ سکتے ہیں۔ کاروں کے شوروم کو "کار انڈسٹری" کہنا اگر حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ بہرحال سینما اونرز پھر بھی فائدے میں رہے۔ حکومت نے سینما گھروں کے ٹیکس کم کیے تو مقصد یہ تھا کہ سستی فلمیں دیکھ کر عوام فلم سازوں کو فائدہ پہنچائیں مگر فلم ساز اور عوام تو منہ دیکھتے رہ گئے۔ یہ سب منافع بھی سینما والوں اور فلم تقسیم کاروں کی بندر بانٹ کی نذر ہو گیا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں فلمی صنعت کی بربادی کے ذمے دار کون لوگ ہیں؟

اب آیئے ذرا بالی وڈ یا بھارتی فلمی صنعت کا جائزہ لیتے ہیں۔ سال 2010ء میں دنیا کی اس عظیم ترین خود ساختہ فلمی صنعت نے صرف 121 فلمیں بنائیں اور اتنی ہی فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ان میں بہت اچھی معیاری فلموں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ زیادہ تر بڑے بڑے سپر اسٹارز اور بڑے بجٹ کی فلمیں ناکامی سے دوچار ہوئیں جس کی وجہ سے فلمی صنعت کو بہت گھاٹا برداشت کرنا پڑا۔ بالی وڈ میں فلموں کی لاگت اتنی زیادہ ہو چکی ہے کہ اوسط درجے کا بزنس کرنے والی فلم بھی گھاٹے کا سودا ہوتی ہے تو پھر بالکل فلاپ ہو جانے والی فلموں کے نقصانات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بالی وڈ میں ایک نیا رجحان یہ دیکھنے میں آیا کہ ہر بڑے فلم اسٹار کو فلم پروڈیوسر بننے کا شوق ہو گیا ہے۔ شاہ رخ خان، عامر خان تو پہلے ہی فلم ساز بن چکے تھے لیکن سلمان خان پرانے فلم ساز ہیں۔ انہوں نے بے حد کامیاب اور انتہائی معیاری فلمیں بنائیں۔ شاہ رخ خان کی "مائی نیم از خان" اپنے موضوع، پیشکش اور اداکاری کے اعتبار سے ساری دنیا میں پسند کی گئی اور اس سال آسکر ایوارڈ کے لیے بھی نامزد کی گئی ہے۔ عامر خان نے فلم سازی میں بھی اداکاری کی طرح ایک منفرد مقام پیدا کیا ہے۔ ان کی فلم "تھری ایڈیٹس" بے حد کامیاب فلم ثابت ہوئی مگر اس کے ساتھ ہی یہ ایک بہت اہم موضوعات اور مقاصد کو بھی پیش کرتی ہے۔

ان دونوں "خانوں" کے بعد سلمان خان کے بھائی ارباز خان کی فلم "دبنگ" نے کامیابی اور مقبولیت کا ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیا۔ یہ 2010ء کی سب سے زیادہ کامیاب اور مقبول بھارتی فلم قرار دی گئی ہے۔

ممتاز مفتی کے قلم کا شہکار فلم نیلا پربت

شاہ رخ خان اور عامر خان کے ساتھ سلمان خان کے مقام کو کامیابی سے چیلنج کرنے والا کوئی اداکار ابھی تک سامنے نہیں آیا۔ ان تینوں کی عمریں 40 سے اوپر ہو چکی ہیں مگر ان کی کارکردگی اور مقبولیت میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہے۔ شاہ رخ خان نے بھی بامقصد اور معیاری فلمیں بنائی ہیں مگر عامر خان نے اپنی اداکاری کے ساتھ ساتھ فلم سازی میں بھی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔ تھری ایڈیٹس اور دھوبی گھاٹ جیسی مقصدی اور اعلیٰ معیاری فلمیں بنا کر عامر خان نے اپنے لیے ایک الگ اور بہت بلند مقام حاصل کرلیا ہے۔ اب تک وہ تارے زمین پر، لگان، تھری ایڈیٹس، دھوبی گھاٹ اور منگل پانڈے جیسی فلمیں بنا چکے ہیں۔ ان کی ہر فلم میں کوئی پیغام ضرور ہوتا ہے۔ وہ سال میں صرف ایک فلم میں کام کرتے ہیں اور اپنے نام کی مہر لگا دیتے ہیں۔ شاہ رخ خان اور سلمان خان کا بھی یہی طریقہ ہے۔

2010ء میں بالی وڈ میں ایک اور فلم ''روبوٹ'' نے کامیابیوں کے نئے ریکارڈز قائم کیے۔ یہ ایک تامل فلم کا اردو/ ہندی ری میک ہے جس میں تامل فلموں کے بے تاج بادشاہ رجنی کانت نے اداکاری کا ایک نیا معیار قائم کیا ہے لیکن اس فلم میں انسانوں سے زیادہ اچھی کارکردگی ''روبوٹ'' نے دکھائی ہے۔ فلم کی ہیروئن ایشوریہ رائے اس میں محض آرائش کے طور پر پیش کی گئی ہیں۔

اسی سال امیتابھ بچن، انیل کپور، اجے دیوگن، سیف علی خان نے بھی فلم سازی کی۔ سب سے زیادہ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس سال ڈیڑھ سو کے قریب نئے اداکار، ہدایت کار، موسیقار اور مصنف سامنے آئے جن میں سے اکثر نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ صحافی اور ہدایت کار رضوی نے عامر خان کی فلم ''پیپلی لائیو'' میں کئی نئے چہرے متعارف کرائے۔ یہ فلم موضوع اور پیشکش کے اعتبار سے بھی بہت کامیاب ثابت ہوئی۔ اس فلم کے تمام اداکار نئے تھے۔ ایک ایم اے پاس لڑکی نے پیپلی رہنے والی بچوں کی ماں کا کردار ادا کر کے بڑی بڑی ایکٹرسوں کو شرما دیا۔ فلم ''دبنگ'' میں سلمان خان نے ہیروئن کے طور پر سیاست داں اور اداکارہ شترو گھن سنہا کی بیٹی سناکشی کو اپنے ساتھ ہیروئن متعین کرنے پر راتوں رات سپر ہٹ ہیروئن بنا دیا۔ سلمان خان کے والد (ماضی کے مشہور مصنف) سلیم خان کا یہ کارنامہ بھی تعریف ہے کہ سلمان خان کے ساتھ نئی لڑکیاں متعین ہوتے ہی

ممتاز ایک فنکشن میں

دولت حاصل کرنے کے لیے کام کرتی ہیں اور پیسہ خرچ کرتی ہیں، شادی کا ارادہ نہیں رکھتیں۔

نئے اداکاروں میں پاکستانی گلوکار علی ظفر نے ''تیرے بن لادن'' میں کام کر کے سب کو چونکا دیا۔ اب وہ ایک نئی فلم میں کام کر رہے ہیں۔ ایک اور گلوکار عاطف اسلم بھی اب بالی وڈ کے اداکاروں میں شامل ہو گئے ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ پاکستانی گلوکاروں نے بالی وڈ میں بہت دھومیں مچائیں۔ علی ظفر اور عاطف اسلم کے علاوہ راحت فتح علی خان کے گانوں کو سال کے مقبول ترین نغمے قرار دیا گیا۔ فلم ''دبنگ'' میں۔

تیرے مست مست دو نین

گا کر انہوں نے ایوارڈ بھی حاصل کرلیا۔ بالی وڈ کی فلموں میں پاکستانی گلوکاروں کے ناموں کا ڈنکا بج رہا ہے۔ ان کے دوسرے مقبول ترین گیت یہ ہیں۔

1۔ سجدہ تیرا سجدہ

2۔ دل تو بچہ ہے جی

وہ اس وقت بالی وڈ کے مقبول ترین مرد گلوکار ہیں۔

بالی وڈ کی قابلِ ذکر فلموں میں موضوع اداکاری اور پیشکش کے اعتبار سے فلم ''گزارش'' نے بھی توجہ حاصل کی۔ اگرچہ یہ باکس آفس پر زیادہ کامیاب نہ ہو سکی لیکن ہدایت کار

اپنے دور کی معروف فلم نورا سلام کا پوسٹر

خان کی فلم ''مائی نیم از خان'' عریانی سے محفوظ ہے۔ اس میں گیت بھی بہت کم ہیں لیکن یہ سپر ہٹ فلم ہے۔ عامر خان کی تارے زمین پر میں بھی عام بھارتی فلموں کی طرح عریانی نہیں ہے مگر یہ کامیاب ہے۔ سلمان خان کی فلم ''دبنگ'' ایک نیم عریاں گانے کے سوا عریانی سے عاری ہے لیکن سپر ہٹ فلم ہے۔ ''روبوٹ'' میں بھی عریانی نظر نہیں آئی مگر یہ بے حد کامیاب فلم ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ فلم بین ہیروئنوں کے ننگے جسم نہیں بلکہ اچھی فلموں کو دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ سال گزشتہ فلم ''راج نیتی'' نے بھی بہت کامیابی حاصل کی تھی۔ کترینہ کیف اور رنبیر کپور اس میں مرکزی کردار ہیں۔ اس فلم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ''اندرا گاندھی'' کی زندگی کو سامنے رکھ کر بنائی گئی ہے۔ اس کامیاب فلم میں بھی عریانی نہیں ہے۔ بالی وڈ کی ترقی اور کامیابیوں کا راز یہ بھی ہے کہ اب وہاں ہر شعبے میں صرف تعلیم یافتہ اور مہذب لوگ شامل ہو رہے ہیں جس سے بدولتی سے پاکستان کی فلمی صنعت محروم ہے۔

بالی وڈ کی نیم اسٹار فلموں میں اپنے عریاں جسم دکھانے کا عذر یہ پیش کرتی ہیں کہ ایسا اسکرپٹ کے تقاضوں کے مطابق ضروری تھا۔ ہمارے ملک کی بے باک ہیروئنیں بھی کہتی ہیں کہ وہ بولڈ اور نیم عریاں لباس کہانی اور منظر کی ضرورت کے تحت استعمال کرتی ہیں۔

مگر بھارت کی نئی اداکارہ انوشری دتہ نے اس کے برعکس بیان دیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ نیم عریاں ملبوسات اور ''بولڈ'' مناظر کہانی کی ضرورت کے مطابق نہیں بلکہ فلم بینوں کو خوش کرنے کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب ہدایت کار کہتا ہے کہ ان مناظر میں عریانی اور بے باکی اسکرپٹ کی ضرورت ہے تو وہ جھوٹ بولتا ہے۔

جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ اسکرپٹ کی ضرورت

جیسے نے رتھک روشن اور ایشوریہ رائے سے بہت اچھا کام لیا جس کو بہت سراہا گیا۔

آج کل ہدایت کارہ فرح خان جو اس سے پہلے شاہ رخ خان کے ساتھ ''میں ہوں نا'' اور ''اوم شانتی اوم'' جیسی فلمیں بنا چکی ہیں اس بار شاہ رخ خان کی جگہ انہوں نے سلمان خان اور کترینہ کیف کے ساتھ فلم ''تیس مار خان'' بنائی ہے۔ اس فلم میں بہت دھوم تھی۔ فلم ''دبنگ'' کے عریاں اور ٹرش گانے ''منی بدنام ہوئی ڈارلنگ تیرے لیے'' کی بے پناہ مقبولیت

جاوید فاضل

سے متاثر ہو کر انہوں نے بھی اپنی فلم میں کترینہ کیف کا قحبہ ورگانا ''شیلا کی جوانی'' خاص طور پر شامل کیا جس میں کترینہ کیف نے فحاشی اور عریانی کا بھرپور مظاہرہ کیا اور ایک دو شاٹس میں تو وہ جسم پر برائے نام چادر ڈالے ہی نظر آئیں۔ اس فلم نے پہلے دو ہفتے میں زبردست بزنس کیا مگر بعد میں ٹھپ ہو گئی۔ سنا ہے کہ فرح خان اب دوبارہ شاہ رخ خان کے ساتھ فلم استوار کر رہی ہیں۔

گزشتہ سال بالی وڈ میں گینگ اور نئے ہدایت کاروں اور فن کاروں کی فلم بجٹ والی فلمیں بہت زیادہ پسند کی گئیں۔ اچھے معیار، مضمون اور پیشکش کے اعتبار سے انہیں بہت سراہا گیا اور ان میں سے کوئی ایک بھی گھاٹے میں نہیں گئی جس کی وجہ سے اب بالی وڈ میں یہ رجحان عام ہونے لگا ہے۔ ماضی کے اداکاروں کی اولادیں بھی اب فلموں میں جلوہ گر ہو رہی ہیں جن میں سے بہت کم فن کار کامیاب ہوئے ہیں۔

بالی وڈ کی فلموں میں عریانی اور فحاشی پہلے کیا کم تھی مگر اب یہ رجحان بہت زیادہ بڑھتا جا رہا ہے۔ بالی وڈ کی فلمیں اس معاملے میں ہالی وڈ کی فلموں کو بھی بازی لے جا چکی ہیں اور نیم عریانی اب عریانی کے قریب پہنچ چکی ہے لیکن اس بات پر کوئی توجہ نہیں دے رہا کہ سال کی مقبول ترین فلموں میں عریانی برائے نام بھی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر شاہ رخ

سیدنور ایک کامیاب آدمی

کے مطابق نیم عریاں جسم کا مظاہرہ کریں گی تو انہوں نے جواب دیا کہ بالی وڈ میں گزشتہ چالیس پچاس سال سے یہ رواج جڑ پکڑ چکا ہے اس لیے میں صاف انکار تو نہیں کرسکتی لیکن ایک حد تک ہی نیم عریانی پر رضامند ہوں گی۔ انہوں نے کہا کہ مجھے ابھی فلم انڈسٹری میں آئے ہوئے پانچ سال ہی ہوئے ہیں اور میں کوئی ممتاز مقام حاصل نہ کرسکی جبکہ بڑی بڑی نامور اور کامیاب ہیروئنیں اور سنسر کا ذرہ نہ ہو تو بالکل عریاں جسم کا مظاہرہ کرنے سے بھی نہیں چوکتیں۔ مگر یہ بات کہ سنسر کا کوئی ڈر ہوتا ہے درست نہیں معلوم ہوتی۔ زیادہ تر بھارتی فلمیں فحاشی اور عریانی کے اعتبار سے حد سے گزر چکی ہیں مگر سنسر خاموش ہے۔ وہی فلمیں بالکل اسی طرح پاکستان میں دکھادی جاتی ہیں۔ ہمارے ملک میں تو ''سنسر'' اب صرف ایک پیسا کمانے کا تکمہ بن چکا ہے۔ سنسر والوں کی مٹھی گرم کرکے بالکل عریاں فلمیں بھی دکھائی جاسکتی ہیں، حکومت اور معاشرے نے بھی دم سادھ رکھا ہے لیکن کیا اس عریانی اور بے ہودگی سے فلم سازوں اور فلمی صنعت کو کچھ فائدہ پہنچا ہے؟ اس کا جواب آپ کے سامنے ہے۔ 2010ء میں قومی زبان کی صرف دو، 9 پنجابی اور 11 پشتو فلمیں اپنی داستان خود سنا رہی ہیں۔

☆☆☆

پاکستان کی پرانی یادگار فلموں کی یادیں تازہ کرنے کے سلسلے میں اس بار مشہور مگر متنازع فلم ''نیلا پربت'' کا تذکرہ پیش خدمت ہے۔

''نیلا پربت'' اعلیٰ تعلیم یافتہ، ذہین اور تخلیقی افراد پر مشتمل ٹیم نے بنائی تھی مگر اس کے آغاز سے ہی اس کے بارے میں افواہیں گردش کرنے لگی تھیں کہ یہ ایک ''جنسی بے باک'' فلم ہوگی۔

اب ذرا غور کیجیے کہ اس فلم سے وابستہ کون کون لوگ تھے؟

نیلا پربت کے مصنف اردو کے مشہور و معروف افسانہ نگار ممتاز مفتی تھے۔ ممتاز مفتی کا نام اردو ادب میں ایک معتبر نام ہے لیکن ان کے افسانوں میں جنس پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ یہ قدامت پسند حلقوں میں کبھی پسند نہیں کیا گیا۔ ایک اور مسئلہ تھا کہ ممتاز مفتی اعلیٰ پائے کے ادیب اور افسانہ نگار ہونے کے باوجود فلم اور اسکرپٹ کی تکنیک سے قطعی ناواقف تھے۔

اس فلم کے ہدایت کار احمد بشیر ایک نامور صحافی، ادیب اور دانش ور تھے۔ ان کی صلاحیتوں اور تخلیقی قوت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن وہ بھی فلم کی تکنیک سے قطعی ناواقف تھے۔ ان کے پوٹ میں بھی کوئی ایسا تجربہ کار شخص نہ تھا جو کہ انہیں تکنیکی مشورے دے سکتا لیکن اگر ایسا ہوتا بھی تو احمد بشیر کہاں سننے والے تھے۔ جو لوگ کسی میڈیم کی تکنیک سے ناواقفیت کے باوجود خود کو ماہر تصور کرلیں اور مشورے کے محتاج بھی نہ ہوں، ان سے غلطیاں تو سرزد ہوتی ہی ہیں۔

احمد بشیر کو کافی عرصے سے فلم بنانے کا شوق تھا اور وہ پاکستان میں بنائی جانے والی فلموں کو گھٹیا اور بنانے والوں کو جاہل اور نااہل سمجھتے تھے۔ یہ غلط بھی ان کی ناکامی کا سبب بن گئی۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے خیالات بہت بلند تھے اور وہ ایک قابل انسان تھے۔ انہوں نے اپنے خیالات کے مطابق ایک تجرباتی فلم بنائی تھی جس کے ذریعے وہ پاکستانی فلموں میں نئے رجحانات لانا چاہتے تھے۔

احمد بشیر نے اس فلم کو ہر اعتبار سے ایک کلاسیکی فلم بنانے کی کوشش کی تھی۔ مصنف کے طور پر ممتاز مفتی کا نام ایک سند کی حیثیت رکھتا تھا۔ فلم کی موسیقی معروف کلاسیکی فن کار پیارے رنگ قادر نے بنائی تھی۔ فلم میں جو گانے تھے وہ خالص کلاسیکی رنگ میں بنائے گئے تھے جن کو سمجھنا اور ان سے لطف اندوز ہونا ایک عام فلم بین کے لیے ممکن نہ تھا۔ نغمات نگاروں میں حفیظ جالندھری، انشاء جی، منظور نظر اور پیارے رنگ قادر جیسے بلند قامت شاعروں کے نام شامل تھے۔ نغموں کے بول ملاحظہ کیجیے۔

1۔ کیسے سمجھاؤں پریتم پریت نہ جانے
2۔ ہم سب سے بات کرو جی سانوریا
3۔ اول تو توڑ کے جانے والے دل کی بات بتا جا
4۔ دھیرے دھیرے دیکھ لے، ماہی بڑھتا جائے پیار،

فلم کے گلوکاروں میں روشن آرا بیگم، میڈم نور جہاں،

مقبول اداکارہ شبنم

ثریا، یتیم کے نام شامل تھے لیکن ان نغمات کی طرزوں میں مٹھاس اور عام لوگوں کے لیے سُریلا پن نہ تھا۔

اس فلم کی کہانی بھی ایک اچھوتے موضوع پر تھی جو آج سے تیس چالیس سال پہلے کے پاکستانی فلم بینوں کے لیے ناپسندیدہ تھا۔ مختصر یہ کہ اس فلم میں جان بوجھ کر عام فلم بین کی پسند کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا تھا کیونکہ احمد بشیر کے نزدیک یہ ایک فیشن تھا۔

اب ذرا فلم کا مختصر مرکزی خیال بھی ملاحظہ کیجیے۔

ایک ادھیڑ عمر کا شخص ایک ایسی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوجاتا ہے جو بچپن ہی سے اس کے گھر میں بلکہ اس کے ہاتھوں ہی میں پل کر جوان ہوئی ہے۔ اس لڑکی کو حاصل کرنے کے لیے ادھیڑ عمر عاشق اپنے راستے میں حائل تمام لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔

یہ ایک انوکھا اور پاکستانی فلم بینوں کے لیے متنازع

فلم سات لاکھ کا ایک منظر

خیال تھا۔ خاص طور پر متوسط گھرانوں اور خواتین کے لیے تو یہ ناقابل برداشت تھا۔

اب فلم کی مختصر کہانی ملاحظہ کیجیے۔

ایک پہاڑی علاقے کے جاگیر دار بڑے خان صاحب (آغا طالش) بہت بااثر اور بارعب شخصیت تھے جن کا تمام علاقے پر دبدبہ تھا۔ ان کا بیٹا مختیار (محمد علی) ایک لاابالی اور بے پروا قسم کا نوجوان تھا۔ اسی گھر میں بڑے خان صاحب کے ایک مرحوم دوست کی بیٹی لیلیٰ (حسنہ) بھی رہتی تھی جس کا ہاتھ بچپن ہی میں اس کے باپ نے مرتے وقت بڑے خان صاحب کے ہاتھ میں دے کر وصیت کی تھی کہ وہ اس کی پرورش اور دیکھ بھال کی ذمے داری سنبھالیں گے۔

جب لڑکی جوانی کی عمر میں داخل ہوئی تو اس کو بڑے خان کے بیٹے مختیار سے محبت ہوگئی مگر مختیار اس سے ناواقف تھا۔ وہ اپنی چچازاد بہن راشدہ (کومل) سے محبت کرتا تھا اور دونوں کا زیادہ تر وقت ایک دوسرے کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔

بڑے خان کو خواب میں چلنے کی عادت تھی۔ ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ ایسے لوگ اپنی ناآسودہ خواہشات کی تکمیل کی خواہش میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ بڑے خان جب نیند میں چلتے تھے تو وہ سوتی ہوئی لیلیٰ کے پاس بھی پہنچ جاتے تھے اور جب لیلیٰ ان کی دست درازی کی وجہ سے بیدار ہوتی تھی تو وہ بڑے خان کو جگا کر اور ہوشیار کرکے بتاتی تھی کہ وہ خواب میں چلتے ہوئے کہاں آگئے ہیں۔ خان اس پر حیرت کا اظہار کرکے واپس چلے جاتے تھے مگر ان کی ہوس آمیز نگاہوں سے ان کی خواہشات کا اندازہ ہوتا تھا۔

لیلیٰ نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اس کو ایک ڈراؤنا خواب بہت پریشان کرتا تھا، وہ خواب میں دیکھتی تھی کہ ایک انسانی سائز کا چمگادڑ نمودار ہو کر مقناطیس کی طرح اس کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ وہ گھبرا کر بیدار ہو جاتی تھی لیکن اس خواب کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

کہانی میں ایک اہم موڑ اس وقت آتا ہے جب بڑے خان کے ایک رشتے دار لیلیٰ کے لیے اپنے بیٹے کا رشتہ لینے کے لیے آتے ہیں۔ بڑے خان کسی معقول وجہ کے بغیر یہ رشتہ نامنظور کر دیتے ہیں۔

اسی روز رات کے وقت بڑے خان خواب میں چلتے ہوئے لیلیٰ کے کمرے میں پہنچ کر اس کو اپنی بانہوں میں دبوچ لیتے ہیں اور اس کے ساتھ اپنی والہانہ محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ لیلیٰ حیران اور خوف زدہ ہو جاتی ہے۔ جب بڑے خان اس کی مدافعت کے باوجود زبردستی سے باز نہیں آتے تو لیلیٰ شور مچا دیتی ہے۔ لیلیٰ کی چیخ سن کر گھر کے سب لوگ اس کے کمرے میں پہنچتے ہیں جہاں وہ بڑے خان کو جذبات سے مغلوب ہو کر لیلیٰ کے ساتھ زبردستی اظہارِ عشق کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ بڑے خان کی اس حرکت کو دیکھ کر سب حیران رہ جاتے ہیں۔ بڑے خان اس موقعے پر واشگاف الفاظ میں اعلان کر دیتے ہیں کہ وہ لیلیٰ کو چاہتے ہیں اور اس سے شادی کرنے کے خواہش مند ہیں۔ جب خاندان والے حیرت اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں تو وہ بندوق اٹھا کر سب کو دور رہنے کے لیے کہتے ہیں اور بندوق کے زور پر سب لوگوں کو دھمکا کر لیلیٰ کو اپنے کاندھے پر ڈال کر اپنے وفادار گونگے ملازم کو ساتھ لے کر گھوڑا گاڑی میں اپنی پرانی حویلی کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ اس حویلی کا نام ''نیلا پربت'' ہے اور اسی حوالے سے فلم کا نام نیلا پربت رکھا گیا ہے۔

ان کا بیٹا بختیار (محمد علی) ان کی بھتیجی راشدہ (کوئل) اور لیلیٰ کا بچھڑا ہوا بھائی (کمال ایرانی) وغیرہ بڑے خان کے تعاقب میں ''نیلا پربت'' کی جانب روانہ ہوتے ہیں۔

بڑے خان لیلیٰ کو لے کر پرانی حویلی پہنچتے ہیں تو یہ سب لوگ بھی ان کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ لیلیٰ بہت گھبرائی ہوئی ہے۔ بڑے خان کا بیٹا اپنے باپ کو اس حرکت پر شرمندہ کرتا ہے تو وہ بپھر جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کا بیٹا ان کا رقیب ہے۔ بڑے خان غصے میں آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور بیٹے کو للکارتے ہیں کہ اگر وہ شمشیر زنی کے مقابلے میں اپنے باپ کو شکست دے دے گا تو وہ لیلیٰ کو اس کے حوالے کر دیں گے۔ بیٹا پہلے تو باپ کے خلاف تلوار

اٹھانے سے جھجکتا ہے لیکن بڑے خان کے للکارنے پر رضامند ہو جاتا ہے۔ بڑے خان ایک مانے ہوئے شمشیر زن ہیں۔ مقابلہ ہوتا ہے تو وہ بیٹے کو شکست دے دیتے ہیں اور زخمی ہو جاتا ہے۔ وہ زخمی بیٹے کو اس کی منگیتر کے ساتھ گاڑی میں ڈال کر کہتے ہیں کہ اس کو لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔ میں تمہاری صورت آئندہ یہاں نہ دیکھوں۔

جب بڑے خان کے دو بڑے بیٹے [illegible] ارادے کی راہ میں حائل ہوتے ہیں تو دیوانگی کے عالم میں ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ لیلیٰ بھی ہوا ایک جانب کھڑی ہے اور بے حد خوف زدہ ہے اور بڑے خان کی محبت کے اظہار سے متاثر بھی نظر آتی ہے۔

بڑے خان کے ذہن پر سے جذبات اور غصے کا بخار اترتا ہے تو وہ اپنے طرزِ عمل کے بارے میں سوچ کر بے حد شرمندہ ہوتے ہیں اور اپنی کنپٹی پر پستول رکھ کر خودکشی کر لیتے ہیں۔

لیلیٰ اپنے چاروں طرف بکھری ہوئی لاشوں کو اور پھر بڑے خان کی خون میں نہائی ہوئی لاش کو دیکھتی ہے اور ایک فوری ہذیانی جذبے سے مغلوب ہو کر آگے بڑھتی ہے اور بڑے خان کے خون سے اپنی مانگ بھر لیتی ہے اور پھر خود کو بڑے خان سے منسوب کر کے ان کی خاندانی تلوار سے خودکشی کر لیتی ہے۔ اس طرح ایک انوکھی محبت اختتام کو پہنچتی ہے۔

ممتاز مفتی نفسیاتی اور جنسیاتی افسانے لکھنے کے لیے مشہور تھے۔ اس کہانی میں بھی انہوں نے انسانی جذبات اور خواہشات کو ایک نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ ہر مرد کے اندر ایک شیطانی جذبہ اور درندہ چھپا ہوتا ہے، جو لوگ ان پر قابو پا لیتے ہیں، وہ ان کا اظہار نہیں کرتے لیکن بعض اوقات کچھ لوگ ان لاشعوری جذبات پر قابو پانے میں ناکام ہو جاتے ہیں جس کا انجام نہایت ناخوشگوار ہوتا ہے اور دنیا والوں کے لیے سبق آموز بھی۔ ممتاز مفتی نے ان ہی جذبات کو کرداروں کی صورت میں پیش کیا ہے لیکن اسکرین پلے کی کمزوری مطلوبہ تاثر پیدا نہ کر سکی۔

ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ مصنف اور ہدایت کار دونوں ہی فلمی تکنیک سے ناآشنا تھے اور نہ ہی انہیں کوئی عملی تجربہ تھا۔ انہوں نے اس بارے میں کسی تجربہ کار ہنرمند سے مشورہ لینا بھی ضروری نہ سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ منظر نامے اور ہدایت کاری کی خامیوں نے فلم کو بے جان اور بے تاثر کر دیا۔

نیلا پربت آج سے لگ بھگ چالیس بیالیس سال پہلے بنائی گئی تھی۔ اس زمانے کے اعتبار سے یہ ایک انوکھا موضوع تھا جو فلم بینوں کے لیے پسندیدہ بھی نہ تھا۔ اگر اس نفسیاتی کہانی کو آج ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا جائے تو اس کو پذیرائی مل سکتی ہے۔ اس قسم کے مشکل موضوعات کے لیے ماہر اور ہنرمند اسکرین پلے رائٹر اور انتہائی تجربہ کار ہدایت کار کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کہانی کے لیے جس لوازمات کی ضرورت تھی، وہ پورے نہ ہو سکے حالانکہ یہ ایک جاندار موضوع تھا۔ ہدایت کار، اداکاروں سے اچھا کام بھی نہ لے سکا یہاں تک کہ آغا طالش، محمد علی اور حسنہ جیسے فن کار بھی اپنے کرداروں کے ساتھ انصاف نہ کر سکے۔ جو کمزور اسکرین پلے اور ہدایت کار کی گرفت نہ ہونے کا مظہر ہے۔ فلم کے رنگ ڈھنگ سادہ اور کرداروں کے مطابق ہیں لیکن ہدایت کار اداکاری اور مطلوبہ تاثر پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ''نیلا پربت'' کے موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکا۔

فلم کے گلوکاروں میں ممتاز ترین نام شامل ہیں لیکن بے کیف اور پکے راگوں کی وجہ سے ان میں دلکشی پیدا نہ ہو سکی۔ فلم کا کوئی ایک گانا بھی مقبول نہ ہوا۔ جہاں تک اداکاری کا تعلق ہے اس فلم کا مرکزی کردار آغا طالش ہیں جن کے گرد کہانی گھومتی ہے۔ دراصل یہ ان ہی کی کہانی ہے۔ انہوں نے کردار بہت خوبی سے نبھایا ہے۔ اگرچہ ہدایت کار کی طرف سے کوئی امداد نہ ملی لیکن انہوں نے مختلف مناظر میں موزوں تاثرات کے ذریعے کردار میں جان پیدا کرنے کی کوشش کی ہے..... اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کا انہوں نے پوری طرح اظہار کیا۔ حسنہ کا کردار بھی اچھا ہے اور انہوں نے اس کو نبھانے کی بھی پوری کوشش کی ہے۔ محمد علی کا کردار بہت کم رو، اچ اور بے جان ہے۔ اگر اس کردار پر توجہ دی جاتی تو فلم کے مجموعی تاثر میں بہتری پیدا ہو سکتی تھی۔ کمال ایرانی کا کردار بھی روایتی ہے۔ فلم میں بینا کا ایک رقص بہت اچھا ہے۔ ماسٹر صدیق اور اے حمید نے دھن کی ہدایت کاری بہت اچھی کی ہے لیکن موسیقی کی طرف سے مدد نہ مل سکی لیکن مجموعی طور پر رقص بہتر ہیں۔

یہ فلم 1969ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی لیکن مقبول نہ ہو سکی۔ اس فلم سے متعلق کچھ واقعات قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ احمد بشیر نے اس فلم کے لیے کہیں سے سرمایہ نہیں حاصل کیا تھا۔ اپنی تمام جمع پونجی اور اپنے قریبی رشتے داروں کا سرمایہ اس پر لگا دیا تھا اور ظاہر ہے کہ سب کو نقصان برداشت کرنا پڑا۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں اخبارات میں محمد علی اور حسنہ کے رومانس کا چرچا ہو رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حسنہ کی رشید بھٹی سے شادی کے بعد انہیں محمد علی پر ہمیشہ شک رہا اور انہوں نے ایک بار اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر محمد علی پر ایک ریستوران میں حملہ بھی کر دیا تھا جس کی داستان تفصیل کے ساتھ بیان کی جا چکی ہے حالانکہ اس میں کوئی حقیقت نہیں تھی۔

حسنہ پروفیشنل فلم سازوں کے ساتھ کام کرنے کی عادی تھیں لیکن اس فلم میں انہیں مختلف ماحول ملا۔ حسنہ ویسے بھی من موجی طبیعت کی مالک تھیں اور ان کا موڈ گھڑی گھڑی بدلتا رہتا تھا۔ اس فلم میں انہوں نے جن حالات میں کام کیا وہ انہیں پسند نہ تھا۔ ہدایت کار بھی سے بھی وہ مطمئن نہ تھیں اور سیٹ پر اکتائی اکتائی سی رہتی تھیں۔ ان دنوں فلم کی کراچی کے ایسٹرن اسٹوڈیوز میں شوٹنگ ہو رہی تھی۔ انہوں نے پروڈکشن کنٹرولر کو چائے اور انڈے لانے کو کہا۔ وہ ایک پیالی چائے اور ایک ابلا ہوا انڈا لے کر آ گیا۔ حسنہ کو غصہ آ گیا اور انہوں نے چیخ چیخ کر سارا سیٹ سر پر اٹھا لیا۔ سیٹ پر ہلچل مچ گئی۔ احمد بشیر پریشان ہو کر آئے، پوچھا کہ کیا معاملہ ہے تو حسنہ نے غصے سے کہا ''یہ کیا طریقہ ہے؟ آپ لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہیروئن کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا جاتا ہے؟''

''مگر ہوا کیا؟''

''میں نے چائے اور انڈے مانگے تھے، یہ اٹھا کر فقیروں کی طرح ایک پیالی چائے اور ایک انڈا لے کر آ گیا۔''

احمد بشیر نے کہا ''آپ پریشان نہ ہوں، ابھی سب کچھ آ جاتا ہے۔''

کچھ دیر بعد حسنہ کے سامنے ایک بڑی سے ٹرے لا کر رکھ دی گئی۔ دو پلیٹوں میں دو درجن ابلے ہوئے انڈے اور چائے سے بھری ہوئی چائے دانی رکھی تھی۔ احمد بشیر نے شاید اپنی طرف سے خوش مزاجی اور طنز کیا تھا لیکن حسنہ ایک دم بپھر گئیں۔ ٹرے اٹھا کر پھینکی اور غصے میں چلاتی ہوئی سیٹ سے باہر چلی گئیں۔ ہوٹل پہنچ کر انہوں نے اپنا سامان اٹھایا اور ہوائی جہاز میں بیٹھ کر لاہور آ گئیں۔

احمد بشیر کو معلوم ہوا تو وہ بہت پریشان ہوئے چونکہ فلم کا سیٹ لگا ہوا تھا اور دوسرے تمام آرٹسٹ بھی موجود تھے۔ انہوں نے بار بار حسنہ کو فون کیا مگر انہوں نے ڈیٹ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ میری سخت توہین کی گئی ہے۔ اب میں اس فلم میں کام نہیں کروں گی۔

مجبوراً سیٹ توڑ دیا گیا، شوٹنگ رک گئی۔

تنگ آ کر ایک روز احمد بشیر ہمارے پاس آئے اور

ساری روداد بیان کی۔ انہوں نے کہا کہ چند روز کی شوٹنگ باقی رہ گئی ہے۔ اگر آپ حسنہ کو سمجھائیں تو وہ ضرور مان جائیں گی۔

ہم اسی روز حسنہ کے پاس گئے۔ وہ حسبِ معمول خوش مزاجی سے پیش آئیں۔ ہم نے کہا کہ بھئی احمد بشیر ہمارے دوست ہیں اور بہت اچھے آدمی ہیں۔ تم نے ان کی شوٹنگ کیوں روک دی ہے؟ انہیں پریشان کیوں کر رہی ہو؟

جواب میں انہوں نے اپنی شکایات کا پلندا کھول کر سنا دیا۔

ہم نے کہا "بے بی، ایک پروڈکشن منیجر کی غلطی کی سزا تم فلم ساز اور ہدایت کار کو کیوں دے رہی ہو؟ ان کی شوٹنگ ختم کرا دو پلیز!"

بے بی حسنہ نے ہماری بات مان لی اور شوٹنگ مکمل کرا دی جس کے لیے احمد بشیر نے ہمارا بہت شکریہ ادا کیا۔

لیکن فلم کی ناکامی نے احمد بشیر کے ارمانوں کو راکھ کر دیا۔

☆☆☆

کچھ عرصے قبل اداکار لہری صاحب سے ٹیلی فون پر بات ہوئی۔ زمانہ بھی کتنا مہربان ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ہر روز ان سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔ ہم سب جوان تھے۔ مصروف تھے۔ ان دنوں یہ گمان بھی نہ تھا کہ ایک دن جوانی ساتھ چھوڑ جائے گی اور بے شمار مسائل لے کر آئے گی اور ہم لوگ جو ہر روز ملتے، گپ شپ کرتے اور بے فکری کی زندگی بسر کرتے ہیں، ایسے بچھڑیں گے جیسے سوکھے پتے درخت کی شاخ سے بچھڑ جاتے ہیں اور پھر کوئی نہیں جانتا کہ کون کہاں گیا اور کس کا کیا حشر ہوا۔ انسان کی زندگی بھی ایک بار آور درخت کے مانند ہوتی ہے۔ ہم نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھ بیٹھتے ہیں۔

لہری صاحب سے ملاقات اور باتیں کیے ہوئے عرصہ گزر چکا۔ اول تو جب بھی کراچی گئے، ان کے گھر کا پتا نہ مل سکا۔ یہی معلوم ہوا کہ انہوں نے گھر تبدیل کر لیا ہے۔ کسی نے ان کا فون نمبر بھی فراہم نہیں کیا حالانکہ انہیں مسلسل یاد کرتے رہے۔ کراچی سے ایک صحافی محمود حسن آئے تو انہوں نے لہری صاحب کا فون نمبر دے دیا۔ محمود حسن جہاں گرد ہیں۔ ان کے پیروں میں پہیے لگے ہوئے ہیں اس لیے وہ کسی ایک جگہ نہیں رکتے۔ بھولے بسرے اور بچھڑے ہوئے لوگوں کو آپس میں ملانے کا فرض سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ اللہ انہیں خوش رکھے۔

لہری صاحب کا فون نمبر ملایا تو دوسری طرف سے ایک مضبوط اور صحت مند مردانہ آواز سنائی دی۔ ہم لہری صاحب کی بیماریوں کے بارے میں جو پڑھتے اور سنتے رہے ہیں اس کے پیشِ نظر خیال تھا کہ ان کی آواز کمزور ہو چکی ہوگی۔

"جی، میں لاہور سے بول رہا ہوں، لہری صاحب سے بات کر سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں کر سکتے۔ کوئی پابندی تو نہیں ہے۔ ضرور بات کریں مگر آپ ہیں کون؟"

ہم نے خوش ہو کر کہا "لہری صاحب، میں آغا نی بول رہا ہوں۔"

لہری صاحب ایک لمحے کے لیے چپ ہو گئے۔ شاید اپنے حواس بحال پانے کے لیے پھر بولے "ارے آغا نی صاحب، آپ کہاں گم ہو گئے تھے؟"

ہم نے شرمندگی سے کہا "بس، آپ سے ملاقات اور بات چیت نہ ہو سکی مگر یقین کیجیے ہر وقت یاد آتے ہیں۔"

"بھائی، یہی میرا حال ہے اور پھر یہ تو آج کل میرا فل ٹائم جاب ہے۔"

"کون سا؟"

"لوگوں کو یاد کرنا۔"

لہری صاحب طویل عرصے سے بیمار ہیں، ان پر کیا گزر گئی یہ بھی جانتے ہیں۔ مدت سے صاحبِ فراش ہیں۔ بیماری اور آپریشنز کی تکالیف اپنی جگہ، مالی حالات بھی اچھے نہیں ہیں مگر حیرت اور خوشی ہوئی کہ لہری صاحب نے کسی چیز سے ہار نہیں مانی۔ ان کے جسم میں ایک ٹانگ کم ہو گئی مگر ایک عدد ڈاڑھی کا اضافہ ہو گیا جو بالکل سفید ہو چکی ہے۔ بال بھی سفید برف جیسے ہیں۔ اب ان کا چہرہ نورانی ہو گیا ہے۔

ہم نے کہا "آپ کی تصویریں دیکھی ہیں، چہرہ بہت نورانی ہو گیا ہے۔"

بولے "کیا پہلے شیطانی تھا؟"

یہ ہیں لہری صاحب!

لہری صاحب سے مختصر سی گفتگو ہوئی۔ انہوں نے اللہ سے لو لگا لی ہے۔ نہ کسی چیز کی شکایت نہ شکوہ۔ جو بھی ہے اسی حال میں صابر اور مطمئن ہیں۔ یہ لہری صاحب کا بالکل انوکھا روپ ہے اور ان کی زندگی کا نرالا پہلو۔ ایک ہنسنے ہنسانے والا آدمی اس قدر صابر و شاکر اور سخت تکالیف کے باوجود اس قدر مطمئن بھی ہو سکتا ہے؟ یقین نہیں آتا۔ مگر یہ حقیقت ہے۔ ان کی تصاویر دیکھیے تو ایک انتہائی پُرسکون اور مطمئن انسان کا چہرہ نظر آتا ہے۔ دل پر کیا گزرتی ہے، یہ کوئی نہیں جانتا۔

لہری صاحب نے اپنی فلمی زندگی میں بہت سے یادگار کردار ادا کیے ہیں لیکن وہ آج کل جو کردار ادا کر رہے ہیں وہ غالباً ان کی زندگی کا بہترین اور یادگار کردار ہے۔

لہری صاحب کا تذکرہ شروع ہو تو بے شمار یادیں قطار اندر قطار چلی آتی ہیں۔ ان کے ساتھ لاہور میں ایک طویل وقت گزارا۔ ان کے ساتھ فلموں میں کام کیا۔ ان کے ساتھ ٹریننگ کے سلسلے میں ملک سے باہر بھی گئے۔ یہ وقت اس قدر خوشگوار تھا کہ جی چاہتا ہے کاش وہ پھر واپس لوٹ آئے یا پھر یہ اسی طرح رہتا۔ کبھی نہ بدلتا۔ انسان بھی کیسی کیسی احمقانہ اور ناممکن باتیں سوچتا ہے مگر سوچ اور خیال پر تو کوئی پابندی نہیں ہے۔

لہری صاحب فلمی دنیا میں ایک نیا انداز لے کر آئے تھے۔ جب وہ فلمی دنیا میں آئے تھے اس وقت بھی نذر صاحب، آصف جاہ اور ظریف جیسے مزاحیہ اداکار موجود تھے۔ اس کے بعد تو مزاحیہ اداکاروں کی ایک قطار سی لگ گئی۔ ہر اداکار اپنے انداز میں علیحدہ اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر۔ منور ظریف، منّا، رنگیلا، مظفر زالا، علی اعجاز، آصف جاہ، زلفی اور بھی کئی مزاحیہ اداکاروں نے فلم انڈسٹری کو ہنسانے کا فرض اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ مگر اس کے باوجود لہری صاحب نے اپنی ایک منفرد جگہ بنالی۔

لہری صاحب کی اداکاری کا انداز دوسروں سے مختلف تھا۔ وہ نہ تو جگت بازی کرتے تھے، نہ اوٹ پٹانگ حرکتوں کے ذریعے گرتے پڑتے ہوئے لوگوں کو ہنساتے تھے۔ وہ اسکرپٹ میں لکھے ہوئے مکالمے ادا کرتے تھے۔ کبھی کبھار کوئی فقرہ سوجھ جاتا تو اس کا اضافہ بھی کر دیتے تھے جو اس منظر کا لطف دوبالا کر دیتا تھا مگر اسکرپٹ سے ہٹ کر وہ بہت کم فقرے بولتے تھے۔ مثلاً فضل احمد کریم فضلی کی فلم "انسان بدلتا ہے" میں ایک سین میں نرس ان کے اور ہیرو کے لیے کچھ لے کر آتی ہے۔ جب جانے لگتی ہے تو لہری صاحب نے فقرہ چست کیا "دیکھو، آتی جاتی رہنا۔" اور سنیما ہال میں ایک پُرزور قہقہہ گونج اٹھا۔

لہری بہت سنجیدگی سے مزاحیہ فقرے بولتے تھے اور کیا مجال جو خود ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی نمودار ہو جائے۔

فلم دیور بھابی کے ایک منظر میں وہ ہیروئن کے والد کا کردار ادا کر رہے تھے۔ چھوٹا سا سین تھا مگر لہری صاحب نے اس قدر بے ساختہ انداز میں مکالمے بولے تھے کہ لوگوں کو آج تک یاد ہے۔

ہیروئن کمرے میں داخل ہو کر کہتی ہے "ڈیڈی، میں مری جا رہی ہوں۔"

لہری صاحب سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیتے ہیں اور کہتے ہیں "بھئی، یہ تمہاری مرنے کی عمر تو نہیں ہے۔"

"نہیں ڈیڈی! میں سہیلیوں کے ساتھ کوہ مری جا رہی ہوں۔"

جواب میں لہری صاحب کہتے ہیں "اچھا، کوہ مری ... احتیاط کرنا، وہاں تو سنا ہے پہاڑ ہوتے ہیں۔"

کوہ مری میں انہوں نے کوہ کو اتنا لمبا کر دیا کہ اپنی جگہ وہ خود ایک مزاحیہ فقرہ بن گیا۔

فلم "میرے ہم سفر" کے ایک منظر میں ہیروئن اپنے کھوئے ہوئے والد کو تلاش کرنے کا عزم لے کر یورپ جا رہی ہے۔

"بھئی، یورپ تو بہت بڑا ہے اور سنا ہے وہاں سردی بھی بہت زیادہ پڑتی ہے۔"

"انکل، میں انہیں تلاش کیے بغیر نہیں رہوں گی چاہے اس کے لیے مجھے دنیا کے گوشے گوشے میں جانا پڑے۔"

"بیٹا، شاید تمہیں ابھی تک کسی نے نہیں بتایا کہ دنیا گول ہے، اس کے گوشے اور کونے نہیں ہوتے۔"

لہری صاحب دیکھنے میں ایک کم گو اور کم آمیز شخص نظر آتے ہیں لیکن وہ صرف قریبی، بے تکلف دوستوں کے ساتھ گپ شپ اور ہنسی مذاق کرتے تھے۔

جب "میرے ہم سفر" کا یوٹ شوٹنگ کے لیے یورپ گیا تو لہری صاحب کے ساتھ کافی وقت گزارنے کا موقع ملا۔ اس آؤٹ ڈور شوٹنگ کی کہانی بھی کسی کہانی سے کم نہیں ہے۔

فلم ساز راشد مختار، ہدایت کار پرویز ملک اور عکاس سہیل ہاشمی ایک دوپہر کو اچانک ہمارے گھر تشریف لائے۔ چائے اور بسکٹ کی تواضع کے بعد انہوں نے بتایا کہ وہ ایک بہت ضروری کام سے ہمارے پاس آئے ہیں اور "اقرار" کرائے بغیر نہیں جائیں گے۔

ہم نے کہا "کیا رشتہ لینے آئے ہیں کیونکہ اس قسم کی باتیں عموماً اسی وقت کی جاتی ہیں۔"

"بس یہی سمجھ لیجیے۔"

یہ 1970ء کا ذکر ہے، اس وقت ہماری شادی نہیں ہوئی تھی۔

ہم نے کہا "شکر ہے کہ آپ لوگوں کو بھی ہمارا خیال آیا۔ اب یہ بتائیے کہ لڑکی کون ہے، والدین کون ہیں، کیا کرتے ہیں؟"

راشد صاحب ہنسے اور بولے "بلی کو خواب میں چھیچھڑے نظر آتے ہیں۔ ہم اپنی فلم "میرے ہم سفر" کے سلسلے میں آئے ہیں۔ یہ فلم مسز درانی لکھ رہے تھے مگر بعض وجوہ کی بنا پر انہوں نے عین وقت پر معذرت کرلی۔ اب صورت حال یہ ہے کہ فارن کرنسی کا بندوبست ہو چکا ہے۔ آرٹسٹوں کی ڈیٹس حاصل کرلی ہیں۔ گانے ریکارڈ کرلیے گئے ہیں۔ ہم تینوں یورپ کے مختلف ملکوں میں لوکیشنز دیکھنے کے لیے چار دن بعد روانہ ہو رہے ہیں۔ باقی یونٹ اس وقت روانہ ہوگا جب ہم مطلع کریں گے۔ محمد علی، زیبا اور لہری پہلے ہی یورپ میں موجود ہیں۔ باقی آرٹسٹ بعد میں روانہ ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" ہم نے پوری بات سن کر کہا "اس میں ہماری "ہاں" یا "ناں" کہاں سے آ گئی؟"

"دراصل وہی تو بنیادی ضرورت ہے۔ ہمارے پاس کہانی کا ایک خاکہ تو موجود ہے مگر اسکرپٹ درکار ہے۔"

"اسکرپٹ اس طرح بازار میں ریڈی میڈ تو نہیں ملتا۔ اس کے لیے کافی وقت درکار ہوتا ہے۔"

"وقت تو ہے۔" پرویز صاحب بولے "دیکھیے، میں کہانی کا خاکہ آپ کے پاس چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ آپ اسکرین پلے تیار کریں۔ کل اور پرسوں ہم دونوں اس کے بارے میں تبادلۂ خیال کرلیں گے۔ پھر میں چلا جاؤں گا، آپ اسکرپٹ مکمل کیجیے گا۔"

"مگر آپ کو یہ معلوم نہیں کہ میں "دوستی" کا اسکرپٹ لکھ رہا ہوں۔ ان کا یونٹ بھی بس پندرہ دن میں روانہ ہو رہا ہے۔"

پرویز صاحب نے کہا "آپ مجھ سے ڈسکشن کرلیں۔ پھر دونوں اسکرپٹ مکمل کرلیں۔ جو کام باقی رہ جائے گا وہ ہم یورپ میں کرلیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ یہ دونوں کام مکمل کرسکتے ہیں۔"

"بھئی یہ تو بہت مشکل ہے۔"

اس کے بعد ان تینوں نے ہم سے پہلے تو اپیلیں کیں۔ دوستی کے واسطے دیے۔ پھر دھمکیوں پر اتر آئے۔ ہم نے بہتیرا سمجھایا مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ اپنا پروگرام بتا کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ہم نے خاکے پر نظر ڈالی۔ دلچسپ کہانی تھی اور کافی گنجائش تھی۔ پھر "دوستی" کے فلم ساز اعجاز سے بات کی اور ان لوگوں کو مجبوری بتائی۔

انہوں نے کہا "یار آفاقی، تم فکر کیوں کرتے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم یہ دونوں کام کرسکتے ہو۔ وہاں پہلے ہماری شوٹنگ ہوگی۔ تم اسکرپٹ مکمل کر دینا اور پھر ان کا باقی کام کر دینا۔"

سبحان اللہ، کیا آسان حل تلاش کیا ہے۔

دوسرے دن پرویز ملک صاحب آئے اور اگلے دو دن ہم نے بہت سنجیدگی سے اسکرپٹ کے بارے میں بات چیت کی۔ خیال لیا۔

چوتھے دن تینوں حضرات پھر تشریف لائے۔ پی بسکٹ کھائے اور ہماری پیٹھ ٹھونک کر رخصت ہونے جانے سے پہلے انہوں نے بتایا کہ آپ سے رابطہ کیسے کریں گے۔ باقی یونٹ پی آئی اے سے جا رہا ہے۔ آپ کے اور حضرات کے لیے پان امریکن میں سیٹیں بک کرائی ہیں۔ خیال یہ ہے کہ روم سے شوٹنگ شروع کریں گے۔ بس آپ تیار رہیے، جیسے ہی ہمارا فون آیا، روم روانہ ہو جائیے۔

ایک دن بعد باقی یونٹ بھی بھیج جائے گا اور یہ کہہ کر یہ وہ جا۔

ہم اسکرپٹ بلکہ "اسکرپٹوں" سے سر کھپاتے رہے۔ چند دن کے بعد راشد صاحب کا فون آیا کہ دو دن بعد آپ روم پہنچیے۔ ہم تینوں آپ کا خیر مقدم کرنے کو تیار ملیں گے۔

ہم نے کہا "مگر پاؤنڈز اور ڈالرز ..."

بولے "اس کی آپ فکر نہ کیجیے۔ روم میں پاؤنڈز اور ڈالروں کی بارش ہو جائے گی۔ بس آپ روم پہنچیں۔ اگر کوئی مشکل یا گڑبڑ ہو تو پاکستانی سفارت خانے یا پی آئی اے کے منیجر سے رابطہ کرلیں۔"

دو دن بعد ہم اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ روم روانہ ہوئے مگر وہاں پہنچ تو خیر مقدم کرنے کے لیے کوئی موجود نہ تھا۔ ہم کچھ ڈالرز جوتے میں چھپا کر اور کچھ پاکستانی روپے ساتھ لے گئے تھے جن کو ہم نے روم ائیرپورٹ پر ہی ڈالرز میں منتقل کرالیا۔

سوال تھا کہ اب جائیں گے کہاں؟ بہرحال ایک ٹیکسی والا مل گیا جس کے باپ کا ہوٹل روم ریلوے اسٹیشن کے پاس ہی تھا۔ "سینور، اے ون، ایوری تھنگ اے ون۔"

ہوٹل واقعی ایک پُررونق اور اچھی جگہ تھا۔ ہوٹلوں میں نقد ادائیگی کا اس وقت تک رواج نہ تھا اس لیے ہم تینوں ایک بڑے کمرے میں ٹھہر گئے۔ ناشتا کھانا ہوٹل کے ریستوران سے مل جاتا تھا مگر جیب میں برائے نام ہی رقم تھی۔

اس بھری دنیا میں اس وقت ہم تینوں واقعی بے آسرا تھے۔ پاکستانی سفارت خانے فون کیا تو ایک اطالوی چوکیدار نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بتایا کہ "تو بوڈی ہیئر ویک اینڈ۔" اور فون بند کر دیا۔

پی آئی اے کے منیجر کو فون کیا تو وہ نہ گھر پر تھے، نہ دفتر میں۔ ہم روم میں گھومتے پھرے مگر جان خشک ہو رہی تھی۔

اب صورت حال یہ تھی کہ راشد صاحب اور ہمارے پاکستانی ساتھیوں کو علم نہ تھا کہ ہم کہاں ہیں۔ ہمارے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ ان سے بات کر کے حالات معلوم کرتے۔

فلم ساز، ہدایت کار اور کیمرامین یورپ کے کسی شہر میں تھے۔

محمد علی، زیبا اور لہری صاحب جرمنی یا فرانس میں تھے اور ہم روم میں۔ خالی ہاتھ اور خالی جیب۔ مہاجروں کی طرح پڑے تھے۔

ہمارے ساتھی بے حد پریشان تھے کہ کسی کو ہمارے ہوٹل کا علم ہے نہ ہمارا۔ ہم کیا کریں گے۔ کیا روم کی سڑکوں پر بھیک مانگیں گے۔ جب بھی وہ ناامیدی کا اظہار کرتے ہم انہیں ایک لیرا کی آئس کریم کھلا دیتے اور انہیں وقتی طور پر صبر آ جاتا۔ ہم نے پی آئی اے کے منیجر کو بتا دیا تھا کہ ہمارے ہوٹل کا فون نمبر کیا ہے۔

اس رات ہم لوگ روم کی سیر کر کے اپنے کمرے میں پریشان بیٹھے تھے کہ رات کے بارہ بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری جانب اسسٹنٹ ڈائریکٹر قدیر ملک صاحب تھے۔ وہ بہت جلدی میں تھے اور گھبرائے ہوئے بھی تھے۔

انہوں نے کہا "آفاقی صاحب، میرے پاس وقت ہے نہ ڈالر۔ مختصر یہ ہے کہ اب شوٹنگ کا آغاز پیرس سے ہوگا۔ راشد صاحب وغیرہ پیرس پہنچ چکے ہیں۔ آپ لوگ جتنی جلد ممکن ہو پیرس آ جائیے۔"

ہم نے کہا "ہمارے پاس تو ائیرپورٹ تک جانے کا کرایہ بھی نہیں ہے۔ پیرس کیسے آ جائیں۔ تم لوگوں نے ہمارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ ہم یہاں ایک ہوٹل میں کروی پڑے ہیں جس کا فون نمبر یہ ہے۔"

انہوں نے کہا "میری فلائٹ کا اعلان ہو گیا ہے، میں جا رہا ہوں۔"

"مگر ہمیں اس طرح چھوڑ کر؟"

"میں پی آئی اے کے منیجر کو فی الحال ایک سوڈالر دے کے جا رہا ہوں۔ فلائٹ کے بعد یہ آپ سے رابطہ کرلیں گے۔ اچھا خدا حافظ۔ پیرس میں ملیں گے۔"

وہ فون رکھ کر غائب ہو گئے۔

ہمارے دونوں ساتھی حیرت سے منہ پھاڑے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ انہیں حالات کا کچھ علم نہ تھا۔

"کیا ہوا آفاقی صاحب؟"

"ابھی تک کچھ نہیں ہوا۔ آپ لوگوں کا اللہ پر بھروسا ہے؟"

"جی بالکل ہے۔"

"تو پھر اللہ پر بھروسا کریں اور دعا کریں۔ کوئی سوال نہ پوچھیں۔"

دو ڈھائی بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی تو ہم تینوں یوں چونک پڑے جیسے بم گر گیا ہو۔

فون اٹھایا تو دوسری طرف پی آئی اے کے منیجر تھے۔ بہت شریف آدمی تھے۔ (ان دنوں پی آئی اے کے لوگ شریف آدمی ہی ہوتے تھے)

انہوں نے کہا "آفاقی صاحب، پیرس کی فلائٹ چلی گئی ہے۔ قدیر ملک صاحب آپ کے لیے ایک سو ڈالرز چھوڑ گئے ہیں۔ میں گھر جا رہا ہوں۔"

ہم نے ان کی بات کاٹ دی "بالکل نہیں، آپ گھر نہ جائیں۔"

"تو پھر کہاں جاؤں؟"

"کہیں بھی نہ جائیں، کسی بھی پہلی فلائٹ سے ہم تینوں کو پیرس کی بکنگ دلا دیں ورنہ ہم خودکشی کرلیں گے۔"

"ارے ارے، ایسا نہ کرنا۔" وہ گھبرا گئے "میں ابھی فلائٹ کا پتا کر کے آپ کو فون کرتا ہوں۔"

ہمارے ساتھیوں نے پوچھا "کیا ہوا؟"

"ابھی کچھ نہیں ہوا۔ بس دعا کیے جاؤ، مگر دل ہی دل میں۔"

ایک گھنٹے بعد پی آئی اے منیجر کا فون آیا "دیکھیے، خوش قسمتی سے سوئس ائر کی فلائٹ میں آپ لوگوں کی بکنگ مل گئی ہے۔ فلائٹ کا وقت صبح سات بجے ہے۔"

ہم گھبرا گئے "اتنی جلدی ہم اتنی دور ائیرپورٹ کیسے پہنچیں گے؟ ہمارے پاس تو ٹیکسی کا کرایہ بھی نہیں ہے اور ہوٹل والوں کو بل بھی دینا ہے۔"

وہ اطمینان سے بولے "آپ فوراً سامان پیک کریں۔ ہوٹل کو میں فون کر دوں گا۔ آپ پی آئی اے کے حساب میں بل بنوا کر لے آئیں۔ وہ اجازت دے دیں گے۔ ٹیکسی کو ہم یہاں ائیرپورٹ پر کرایہ دے دیں گے۔"

ہمارے ساتھیوں نے پھر پریشانی سے پوچھا "کیا ہوا؟"

"کچھ نہ کچھ ہو گیا ہے۔ فوراً سامان پیک کرو۔ لباس تبدیل کرلو۔ ہم ابھی ائیرپورٹ جا رہے ہیں، فوراً۔"

ہمارے ساتھی کسی تاخیر کے بغیر فوراً حرکت میں آ گئے۔ ہوٹل کے مالک کو جگا کر ہم نے ہوٹل چھوڑنے کی اطلاع دی۔

وہ بولے "وہات اباؤت بل!" (یعنی بل کا کیا ہوگا؟)

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ ہوٹل کے مالک نے فون اٹھایا اور سننے لگا اور "یس یس، او کے، نو پرابلم" کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ ہمارا بل بنا کر ہمارے حوالے کیا اور بولا "یہ بل کی کاپی ہے، پی آئی اے بل ادا کر دے گی۔"

پھر انہوں نے پوچھا "آپ کو ٹیکسی درکار ہے؟"

ہم نے کہا "بے شک۔ پیدل تو ائرپورٹ نہیں جا سکتے۔ ہمیں فوراً پہنچنا ہے۔"

انہوں نے فوراً دفتر میں سوئے ہوئے ایک نوجوان کو جگایا اور اپنی زبان میں بتایا کہ انہیں فوراً ائرپورٹ لے جاؤ۔

"پانچ ہزار لیرا!" اس نے آنکھیں کھولے بغیر جماہی لے کر کہا۔

ہم نے کہا "ہم ائرپورٹ چل کر دیں گے۔"

اب غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ وہی ٹیکسی ڈرائیور ہے جو ہمیں لے کر آیا تھا۔ ائرپورٹ پر جس ٹریول ایجنٹ والے نے ہمیں ڈرائیور سے ملایا تھا وہ بھی اسی خاندان سے تھا۔

ائرپورٹ پہنچے تو باہر ہی پی آئی اے کے منیجر جعفری صاحب موجود تھے۔ انہوں نے ٹیکسی کا بل ادا کیا، ہم نے ہوٹل کا بل انہیں دیا۔ انہوں نے یہ رقم کاٹ کر باقی ڈالرز ہمیں دے دیے۔

ٹکٹ انہوں نے خود ہی سوئس ائر کے لیے تبدیل کرا دیے تھے۔ جعفری صاحب اس وقت ہمیں فرشتے لگ رہے تھے۔

سوئس ائر کے کاؤنٹر پر ایک نہایت خوبصورت اور ہنس مکھ خاتون تشریف فرما تھیں۔ ہم لوگوں کو دیکھتے ہی وہ سرتاپا مسکراہٹ بن گئیں مگر سامان کا وزن کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ہمیں آٹھ سو ڈالرز مزید ادا کرنے ہوں گے۔ یہ ریکارڈنگ کا بھاری بھرکم سامان تھا جو کراچی سے ہمارے ساتھ آیا تھا اور ادائیگی وہیں کر دی گئی تھی مگر اب ادائیگی کے لیے ہمارے پاس کچھ نہ تھا۔

جعفری صاحب نے کہا "رقم ادا کیے بغیر تو آپ بھی نہیں جا سکتے۔"

ہم نے کہا "یہ سامان آپ نہیں رکھ سکتے؟"

وہ گھبرا گئے "جی نہیں۔ دراصل....."

ہم نے کہا "جعفری صاحب، آپ تو اطالوی زبان جانتے ہیں، اس سنگدل حسینہ کا دل نہیں پگھلا سکتے۔"

"کوشش کرتا ہوں۔" جعفری صاحب خاتون سے باتوں میں مصروف ہو گئے۔ دونوں بار بار اپنے کاندھے اچکا رہے تھے اور ہاتھ ہلا رہے تھے جیسا کہ اٹلی والے کرتے ہیں۔ چند منٹ کے بعد وہ خاتون مسکرائیں اور سامان رکھوا کر ہمیں بورڈنگ کارڈ دے دیا۔ جعفری صاحب نے ان سے ہماری داستانِ غم نمک مرچ لگا کر بیان کی تھی اور بتایا تھا کہ یہ فلم والے لوگ ہیں۔

پیرس کے ائرپورٹ پر راشد صاحب، پرویز ملک اور سہیل ہاشمی موجود تھے۔ ہم کو سخت شکایت اور غصہ تھا مگر مسکراہٹوں اور بغلگیر ہونے کے بعد غائب ہو گیا۔

پیرس میں ہم سب کا قیام نارتھ کے ریلوے اسٹیشن کے سامنے ہوٹل ایمبیسڈر میں تھا۔ یہ بہت بڑا ہوٹل تھا۔ اس کی گیلریاں بھول بھلیاں تھیں جن میں ہم کئی بار راستہ بھولے اور ایک بار اپنا کمرا سمجھ کر ایک خاتون کے کمرے میں داخل ہونے پر پٹنے سے بال بال بچے۔ سارا یونٹ اسی ہوٹل میں مقیم تھا۔ محمد علی، زیبا اور لہری صاحب قریب ہی دوسرے ہوٹل میں مقیم تھے۔ پیرس میں گہرے بادل اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی جو اگلے چند روز بھی جاری رہی۔ اسی عالم میں شوٹنگ کے لیے لوکیشنز تلاش کی گئیں۔

اسی شام لہری صاحب ہمارے ہوٹل میں آئے۔ فیلٹ ہیٹ اور برساتی پہنے ہوئے تھے۔ راشد صاحب نے پوچھا "اچانک کیسے آئے؟"

بولے "میں اپنے گمشدہ رشتے داروں کی تلاش میں آیا ہوں۔"

ہم سے مل کر وہ بہت خوش ہوئے، کہنے لگے "آپ روم میں رہ کر گھبرا رہے تھے۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو اسی شہر میں مہینوں گم رہتا۔"

"مگر کھاتے کہاں سے؟"

"بہت آسان ترکیب ہے۔ جس ہوٹل میں قیام تھا اسی میں نوکری کر لیتے۔ طعام و قیام مفت ہو جاتا بلکہ تنخواہ بھی ملتی۔"

لہری صاحب کے ساتھ ہم محمد علی صاحب کے ہوٹل پہنچے۔ ان سے اور زیبا بیگم سے مل کر ہم نے پوچھا "محمد علی صاحب! لہری صاحب تو آپ کے ساتھ فلم میں کام کر رہے ہیں مگر آپ نے اپنی بیگم کو کیوں زحمت دی ہے۔"

لہری صاحب چپ نہ رہ سکے "فالتو سامان کی طرح۔"

"ٹھیک ہے لہری صاحب، آپ سے تو میں سمجھوں گی۔"

"بھابی، آپ کوئی تکلیف نہ کریں، میں خود سمجھا دوں گا۔"

"اور تم کیا کہہ رہے تھے؟" اب وہ ہم سے مخاطب ہوئیں۔

"ہم تو یہ کہہ رہے تھے کہ محمد علی صاحب اور لہری صاحب تو فلم کے اداکار ہیں مگر آپ کس خوشی میں ساتھ لگی ہوئی ہیں؟"

"میں ان کی بیگم ہوں اور اپنے خرچ پر آئی ہوں۔"

"مگر وہ تو ڈسٹرب ہوں گے نا۔ بھئی آپ ان پر اتنا شک کیوں کرتی ہیں؟"

"شک؟ میں علی پر شک کرتی ہوں؟"

"لوگ تو یہی کہتے ہیں۔"

"کون ہیں وہ لوگ؟ مجھے بتاؤ، میں انہیں....."

لہری صاحب بول پڑے "ارے چھوڑیں بھابی، لوگ تو بکتے رہتے ہیں۔ آپ کیوں اپنی صحت خراب کرتی ہیں۔ چلیے، آپ اپنا میٹھا والا پروگرام شروع کریں۔"

زیبا بیگم ہم سے مخاطب ہوئیں "اب میں تمہیں آم نہیں کھلاؤں گی۔"

"آم یہاں کیسے آ گئے؟"

"پاکستان سے۔"

"مگر کیسے؟"

لہری صاحب نے کہا "ارے بھائی آپ کیوں آم کا مزہ خراب کرتے ہیں، آپ کھانے سے مطلب رکھیے، گٹھلیاں گننے سے پرہیز کیجیے۔"

اس طرح پیرس میں ہمارے کام کا آغاز ہوا۔

لہری صاحب اور یونٹ کے دوسرے ارکان کے ساتھ بہت پُرلطف دن گزر رہے تھے کیونکہ بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ دوسروں کے لیے تو یہ ایک پک نک تھی مگر کام کرنے کے لیے ہمیں اچھا موقع مل گیا۔ جب سارے لوگ ناشتے کے بعد چلے جاتے تو ہم اطمینان سے بیٹھ کر اسکرپٹ پر کام کرتے۔

لہری صاحب، محمد علی اور زیبا کے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے وہ ان دونوں کے ساتھ یورپ کے مختلف ملکوں میں گھومتے پھرتے رہے۔ اس سیر و تفریح کا فلم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ محمد علی صاحب اپنی جیب سے خرچ کر رہے تھے۔ لہری صاحب کو محمد علی ذاتی طور پر بھی بہت پسند کرتے تھے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ لہری صاحب کا انداز بھی ایک ارسٹوکریٹ کا انداز تھا۔ خوش لباس، خوش گفتار اور لباس کے علاوہ رکھ رکھاؤ میں بھی ایک متاثر کرنے والا انداز۔ لہری صاحب کو ہم نے کبھی خراب لباس میں نہیں دیکھا۔ جاڑوں میں بہترین سوٹ، ٹائی، قمیص اور جوتا۔ گرمیوں میں بش شرٹ، پتلون اور اعلیٰ قسم کا جوتا۔ چلنے اور بات کرنے کے انداز میں بھی ایک خاص قسم کا وقار اور رکھ رکھاؤ۔ کسی کامیڈین سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے تو لہری صاحب کو ایک مختلف قسم کا کامیڈین کہا جاتا ہے۔ شخصیت اور لباس کی طرح ان کی کامیڈی میں بھی ایک وقار اور وضع داری تھی۔

پیرس میں ہم لوگ شوٹنگ نہ ہونے کی وجہ سے گھومتے پھرتے تھے۔ پیرس کی ہر قابلِ ذکر جگہ ہم نے دیکھ لی۔ وہاں ریستوران میں یہ دستور ہے کہ جب آپ ریستوران میں جا کر بیٹھیں گے تو ویٹریس ایک خوبصورت ٹوکری میں روٹی اور مکھن کے ساتھ چھری لا کر میز پر رکھ دے گی۔ پیرس کی روایتی روٹی تقریباً دو یا ڈیڑھ انچ موٹی اور ایک فٹ کے قریب لمبی ہوتی ہے۔ ریستوران میں اس کو گنڈیریوں کی طرح ٹکڑے کر کے رکھا جاتا ہے۔ یوں تو یہ سوکھی ہوئی لگتی ہے مگر بے حد لذیذ ہوتی ہے۔ اس پر خالص مکھن کے پیکٹ میں سے مکھن لگا کر کھانے کا ایک علیحدہ ذائقہ ہوتا ہے۔ جب تک کھانا آتا ہم لوگ روٹی کی ٹوکری خالی کر دیتے۔ اس روٹی اور مکھن کی قیمت وصول نہیں کی جاتی شاید اسی لیے یہ زیادہ لذیذ لگتی ہے۔

پہلے دن جب ایک اسمارٹ سی ویٹریس روٹی کی ٹوکری اور مکھن لے کر آئی تو لہری صاحب نے اردو میں پوچھا۔ "مس صاحبہ، ہم نے تو روٹی مکھن کا آرڈر نہیں دیا۔"

وہ حیران ہو کر دیکھنے لگی۔ اس کو انگریزی میں بتایا گیا کہ ہم نے اس کا آرڈر نہیں دیا۔ شکر ہے کہ وہ انگریزی جانتی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کی قیمت وصول نہیں کی جاتی۔ یہ ریستوران کی پیش کش ہے۔ (یہی دستور بعد میں ہم نے ترکی میں بھی دیکھا)

لہری صاحب بولے "اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو ہم کھانے کا آرڈر ہی نہ دیتے۔"

ہم نے کہا "لہری صاحب، یہ کھانے کے ساتھ ہی دی جاتی ہے، آرڈر کے بغیر نہیں ملتی۔"

جتنی دیر میں کھانا آیا ہم لوگوں کا پیٹ تقریباً بھر چکا تھا مگر کھانا تو تھا۔ لہری صاحب کی تجویز تھی کہ آئندہ ایک آدھ سوپ کا آرڈر دے دیا جائے اور روٹی سے پیٹ بھر لیا جائے تو خرچہ کم ہوگا۔ پرائے دیس میں پیسے بچانا ضروری ہے۔"

باہر نکلتے ہوئے ہم سب نے وہ پوری لمبی سی روٹی دیکھی جسے کاٹ کاٹ کر پیش کیا گیا تھا۔ ہم لوگوں نے تو خاص توجہ نہ دی مگر لہری صاحب نے فلم کے ایک منظر میں اس روٹی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ یہ منظر شانزے لیزا کے فٹ پاتھ کے ایک ریستوران میں فلمایا گیا تھا۔ روٹی کو ڈنڈے

کے طور پر استعمال ہوتے دیکھ کر گزرنے والے کھڑے ہو گئے اور بہت لطف اندوز ہوئے۔ خود ریستوران کی ویٹریس کا ہنستے ہنستے برا حال تھا۔

لہری صاحب نے بعد میں مشورہ دیا کہ پیرس کی ٹرکیں کو اپنی طرف مائل کرنے کا یہ بہترین اور انتہائی سستا طریقہ ہے۔

پیرس اور روم کے ٹیکسی ڈرائیور بہت خوش پوش اور با اخلاق ہوتے ہیں لیکن ان دونوں جگہ کے ٹیکسی ڈرائیور بولتے بہت ہیں۔ اللہ کے بندے یہ بھی نہیں سوچتے کہ سننے والے مسافر ان کی زبان سے ناواقف ہیں۔ یوں سمجھیے کہ جب تک ٹیکسی چلتی ہے اس وقت تک ٹیکسی ڈرائیور کی زبان بھی چلتی رہتی ہے۔ کیا مجال جو ایک لمحے کے لیے خاموش ہو جائیں۔ دراصل وہ مسافروں کو اپنے شہر کے ان مختلف حصوں کے بارے میں معلومات فراہم کرتے رہتے ہیں جہاں جہاں سے گزرتے ہیں۔ ان سے لاکھ کہیں کہ بھائی، ہم آپ کی زبان نہیں سمجھتے مگر وہ اللہ کے بندے باز نہیں آتے کیونکہ وہ انگریزی سے نابلد ہوتے ہیں۔

لہری صاحب نے اس کا بہترین علاج تلاش کر لیا۔ ہم لوگ پی گال کی طرف جا رہے تھے کہ ٹیکسی ڈرائیور نے مڑ کر ہم لوگوں کو دیکھا اور فرانسیسی میں کچھ بتایا۔

لہری صاحب نے انگریزی میں کہا ''موسیو، بلاوجہ اپنا وقت اور الفاظ ضائع نہ کریں، ہم آپ کی زبان نہیں سمجھتے۔''

مگر ٹیکسی ڈرائیور کے بیان کی روانی میں کمی نہ آئی۔

اس نے پھر کچھ کہا۔

لہری صاحب اردو میں بولے ''بھائی، ٹھیک کہتے ہو۔ ویسے یہ جگہ ہمیں بھی اچھی نہیں لگی۔''

جواب میں ٹیکسی ڈرائیور نے ایک لمبی تقریر کر دی۔

لہری صاحب نے اردو میں کہا ''یار، تم لوگوں کے پاس تو فالتو وقت بہت ہوتا ہے۔ کوئی اور بات کرنے والا نہیں ملتا تو مسافروں کے کان کھاتے ہو۔''

ٹیکسی والے نے جواب میں اپنی زبان میں کچھ کہا۔

لہری صاحب نے پوچھا ''بھائی میاں، یہ بتاؤ کہ کیا پنجابی سندھی وغیرہ بھی جانتے ہو؟''

ٹیکسی والے کی زبان پھر حرکت میں آ گئی۔

لہری صاحب بولے ''ٹھیک ٹھیک ہے، سمجھ گئے کہ نہیں جانتے، ویسے ہم بھی زیادہ پنجابی نہیں جانتے، بس کام چلا لیتے ہیں۔''

سارے سفر کے دوران میں ٹیکسی ڈرائیور فرانسیسی اور لہری بھائی اردو پنجابی بولتے رہے۔ ٹیکسی سے اتر کر لہری صاحب نے بڑی محبت سے ٹیکسی ڈرائیور سے ہاتھ ملایا۔ خدا حافظ کہا اور بولے ''آپ کے ساتھ گفتگو کر کے بہت خوشی ہوئی اور معلومات بھی حاصل ہوئیں۔ امید ہے پھر ملاقات ہو گی۔''

ٹیکسی ڈرائیور بھی بہت خوش تھا۔ اس نے بھی ہاتھ ملانے کے بعد بہت کچھ کہا۔ ہم سب کو بھی ٹیکسی ڈرائیور سے ہاتھ ملانا پڑا۔

جب وہ رخصت ہو گیا تو لہری صاحب نے کہا ''بہت شریف آدمی ہے۔ اس کی وجہ سے پیرس کے بارے میں کافی دلچسپ معلومات حاصل ہوئیں۔''

اس کے بعد لہری صاحب نے ہر شہر میں یہی دستور رکھا کہ ادھر ٹیکسی ڈرائیور اپنی زبان میں شروع ہوتا ادھر لہری صاحب اردو پنجابی میں گفتگو شروع کر دیتے اور بعد میں کہتے ''کافی معقول شخص ہے۔ اچھی کارآمد گفتگو رہی۔''

لندن میں معاملہ اس کے برعکس تھا۔ انگریز خواہ وہ ٹیکسی ڈرائیور ہی کیوں نہ ہو، بلاوجہ ایک لفظ بھی ضائع نہیں کرتے۔ صرف ضروری بات ہی کرتے ہیں۔

لہری صاحب کو یہ حرکت اچھی نہیں لگی، کہنے لگے ''عجب ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ یہ تو بولتا ہی نہیں۔''

''شکر کرو لہری بھائی، کیونکہ یہ انگریزی بولتا ہے۔ اگر اس کے ساتھ آپ کو بولنا پڑتا تو کئی بار انگریزی میں فیل ہوتے۔''

لہری صاحب سنجیدگی سے بولے ''واقعی، اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔''

باتیں اور باتیں تو بہت ہیں مگر کہاں تک سنائیں۔ بتانا یہ مقصود تھا کہ لہری صاحب کس قدر زندگی سے بھرپور اور دلچسپ انسان تھے اور بیماری نے انہیں کیا بنا دیا ہے؟

کہاں وہ کلین شیو، سوٹ بوٹ میں ملبوس لہری صاحب اور کہاں سفید بالوں اور سفید برف جیسی ڈاڑھی والے لہری صاحب۔ جو کرتہ پاجامہ پہنے بستر پر بیٹھے یا لیٹے رہتے ہیں اور پھر بھی خوش اور مطمئن نظر آتے ہیں۔ ان کی اصل شخصیت اور خوبیوں کا تو اب اندازہ ہوا ہے۔ اچھے وقتوں میں تو سبھی خوش و خرم رہتے ہیں لیکن آزمائش کے وقت انسان کی آزمائش ہوتی ہے۔ لہری صاحب اس میں بھی پورے اترے ہیں۔ انہوں نے فلمی زندگی میں مختلف قسم کے کردار بہت خوبی سے ادا کیے ہیں۔ آج کل وہ اپنی زندگی کا مشکل ترین کردار ادا کر رہے ہیں۔ واقعی وہ ایک عظیم اداکار ہیں۔

جاری ہے

شیرپا

مختار آزاد

جفاکشی میں یکتا، برفیلے پہاڑوں کے بیٹے جنہوں نے ہمالیہ کی چوٹی سر کر کے ایک ریکارڈ قائم کیا۔ ان کی مشکلات بھری زندگی کا ہلکا سا عکس، ایک معلومات بھری روداد۔

اس قوم کا زندگی نامہ جس نے موت کو کھیل سمجھ رکھا ہے

چودھویں کے چاند نے پورے کھمبو کو اپنی دودھیا رنگ کی چادر میں لپیٹا ہوا تھا۔ ہمالیہ کے برفیلے پہاڑوں پر پڑنے والی پورے چاند کی چاندنی نے ماحول کو سحر انگیز بنا دیا تھا۔ میں اپنے خیمے میں لیٹا ہوا تھا اور خیمے کے باہر شیر پا قلیوں کی ٹولی صنوبر کی خشک جھاڑیوں کو آگ لگا کر اس کے گرد بیٹھے کپکپی مار رہے تھے۔ مجھے باتوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ ان باتوں سے ہی یہاں سنگلاخ برفیلے پہاڑوں کی گود میں زندگی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ مجھے ان کا باتیں کرنا اچھا لگ رہا تھا۔ میں نے اپنے خیمے کی زپ کھولی اور سر باہر نکالا تو سرد ہوا کا ایک جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا۔ ان لوگوں کے ہاتھوں میں چائے کے کپ تھے اور آگ کی لپٹیں ان کے چہروں پر آتشی رنگت بکھیر رہی تھیں۔

''ساتھیو..... بہت خوش ہو رہے ہو؟'' میں نے کسی کا نام لیے بغیر انہیں پکارا۔

''ہم تو ہمیشہ ہی خوش رہتے ہیں۔'' ان میں سے ایک نے جواب دیا۔ مجھے یہ جواب اچھا لگا۔

''اب سو بھی جاؤ۔ صبح جلدی سفر شروع کرنا ہے۔'' میں نے مشورہ دیا۔

''آپ سو جائیں۔ ہم صبح آپ کو تیار ملیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ تو پھر میں چلا سونے۔ شب بخیر۔'' یہ کہہ کر میں نے ایک نظر ادھر ادھر دوڑائی۔ ''باپ رے..... بلا کی سردی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے خیمے کی زپ بند کی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد باہر بھی خاموشی طاری ہو گئی۔

ہم اُس وقت ہمالیہ کے دامن میں واقع ایورسٹ بیس کیمپ میں خیمہ زن تھے۔ ہماری یہ مہم ایورسٹ کی چوٹی سر کرنے کے لیے تھی۔ ہم انسانی آبادیوں سے بہت دور فطرت کی آغوش میں تھے۔ چہار سُو خاموشی اور قدرت کے شاہکار یہ پہاڑ اور ویرانے ہی ہم کوہ پیماؤں کے رفیقِ سفر تھے۔

1954ء میں پہلی بار ایورسٹ کی چوٹی سر ہوئی جس کے بعد متعدد کوہ پیما اس پر چڑھ چکے ہیں۔ ایورسٹ کی چوٹی کو سر کرنے کے لیے ہر سال موسمِ بہار میں درجنوں مغربی کوہ پیما نیپال پہنچتے ہیں۔ ان سب کوہ پیماؤں کی منزل کھمبو ہوتی ہے۔ کھمبو کے اسی بیس کیمپ سے تمام کوہ پیماؤں کا آزمائش بھرا سفر شروع ہوتا ہے۔

نیپال کی سرزمین پر ہمالیہ کے دامن میں صدیوں سے آباد یہ شیر پا قبلی ہی جوان کوہ پیماؤں کا سامان اپنی پیٹھ پر لاد کر اُن کے آگے آگے چلتے ہوئے انہیں..... منزل تک پہنچاتے ہیں لیکن ہماری یہ مہم آج تک ایورسٹ کو سر کی جانے والی تمام مہمات سے بالکل منفرد تھی۔ ایورسٹ کی چوٹی سر کرنے کے لیے اس سے قبل ایسی کوئی مہم نہیں کی گئی تھی جیسی کہ اس بار شروع ہوئی تھی۔ اس بار شیر پا قلیوں کی ٹولی ایورسٹ سر کرنے جا رہی تھی اور میں ان کے ساتھ تھا۔ اس مہم کا نام تھا ''شیر پا ایورسٹ مہم 1991ء''

شیر پا لوگوں کے لیے یہ مہم بہت بڑا اعزاز تھی۔ وہ اس بات پر فخر کر رہے تھے کہ پہلی بار وہ کسی دوسرے کے خدمت گار نہیں بلکہ آزاد حیثیت سے اپنے گھر، ہمالیہ کی چھت پر چڑھنے کے لیے جا رہے ہیں۔

''یہ ہماری مہم ہے۔ ہمیں اس بات پر فخر ہے۔ یہ مہم شیر پا کے لیے ہے۔ ہمیں یہ مہم ہمیشہ یاد رہے گی۔'' یہ بات مہم شروع کرتے وقت ٹیم کے رکن سونم دندو شیر پا نے مجھ سے کہی تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی دو بار ایورسٹ کی چوٹی پر چڑھ چکا تھا لیکن قلی کی حیثیت سے مگر اس بار وہ کوہ پیما کی صورت ایورسٹ کی چوٹی کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔

☆☆☆

نیپال بہت قدیم ہندو سلطنت ہے۔ یہاں کی زیادہ تر آبادی ہندوؤں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد بودھ مت کے پیروکار ہیں۔ ان کی آبادی پینتیس ہزار نفوس سے زائد ہے۔ شیر پا بودھ مت کے پیروکار ہیں۔ شیر پا ایورسٹ تک پہنچنے کی کوشش کرنے والے کوہ پیماؤں اور کوہ نوردی کرنے والوں کے لیے بطور قلی اور گائیڈ، خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ اس وجہ سے گزشتہ چند دہایوں کے دوران انہیں بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی ہے لیکن یہ شہرت بہت پرانی نہیں۔

1900ء سے مغربی کوہ پیماؤں نے ایورسٹ سر کرنے کی کوششوں کا آغاز کیا تھا۔ شیر پا قبل وہ پہلے پہل جو جوان کوہ پیماؤں کے ساتھ اس مہم میں شریک ہوئے سے اب تک ایورسٹ کی چوٹی اور شیر پا قلی لازم و ملزوم ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز پر جب ایورسٹ سر کرنے کے جنون مغربی کوہ پیماؤں کے سر پر سوار ہوا تھا' اس وقت شیر پا باقاعدہ ہنر مند کوہ پیما نہیں تھے۔ گو کہ شیر پا ایورسٹ کی وادی کے ہی باسی ہیں لیکن ایورسٹ تک پہنچنے کے لیے انہیں اتنی ہی معلومات حاصل تھیں جتنی کہ کسی پہاڑی گاؤں کے باشندے کو اپنے علاقے کی پہاڑی پگڈنڈیوں کی ہوتی ہے۔ جوں جوں ایورسٹ پر چڑھنے والے خواہشمندوں کی تعداد بڑھتی رہی۔ ان قلیوں کی استعداد اور تجربے میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اب ایک صدی کے بعد ایورسٹ پر چڑھنے کے لیے ان سے بہترین کوہ پیما شاید دنیا بھر میں نہیں ہیں۔ ایورسٹ شیر پا کے مذہبی عقیدے میں شامل ہے۔ وہ ہمالیہ کو عزت بخشتے ہیں۔ وہ اس کی چوٹی کو دیوتا کا درجہ دیتے ہیں۔ شیر پا ایورسٹ کو 'چمالنگ' کہتے ہیں۔ جس کے معنی 'دنیا کی ماں' ہے۔

سلطنت نیپال نے 1949ء میں باضابطہ طور پر اپنی سرحدوں کو غیر ملکیوں کے لیے کھولا۔ انہوں نے ہمالیہ کے سلسلے میں کوہ پیمائی اور کوہ نوردی کے لیے آنے والے غیر ملکیوں کے ذریعے اپنی معیشت کو استحکام دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے بعد ان غیر ملکی کوہ پیماؤں کے لیے سہولتوں کی فراہمی پر توجہ دی گئی۔ ہمالیہ کے مخصوص علاقوں میں جنگلات کو کاٹ کر کیمپ فائر کے لیے مقامات بنائے گئے۔ مقامی ثقافت کو فروغ دینے کے لیے مقامی طور پر تیار کردہ مصنوعات کی خریداری کے لیے سیاحوں کو ترغیب دی گئی ۔ جگہ جگہ ریستوران اور سیاحوں کی دیگر ضروریات پوری کرنے کے لیے تجارتی مراکز قائم کیے گئے۔ فضائی راستوں پر سہولتیں فراہم کرنے کی ہر ممکن کوششیں کی گئیں..... آخر کار، ان کوششوں کے نتیجے میں بہت جلد نیپال میں واقع دنیا کی سب سے بلند ترین چوٹی ایورسٹ کو سر کرنے والے کوہ پیماؤں اور اس چوٹی کو صرف دور سے دیکھ کر خوش ہو جانے والے کوہ نوردوں کی آمد میں تیزی سے اضافہ ہو گیا۔ جوں جوں نیپال میں سیاحوں اور کوہ پیماؤں کی آمد بڑھتی چلی گئی' ان کے لیے

بطور قلی شیر پا بھی اہمیت کرتے چلے گئے۔

اگرچہ شیر پا مادی طور پر آج بہتر زندگی گزر رہے ہیں لیکن 1980ء کی دہائی تک ان کی مالی حالت زیادہ بہتر نہیں تھی۔ البتہ ان کی شہرت بہت زیادہ پھیلتی جا رہی تھی۔ اسی دوران انہیں نیپال میں اپنی نسلی ثقافت اور خدا کا خوف کے احیا کا خیال آیا۔ آہستہ آہستہ شیر پا باشندوں میں یہ سوچ پروان چڑھی کہ انہیں اپنی ثقافت کے فروغ، رسم و رواج کے تحفظ اور لوک زندگی کے بچاؤ کے لیے متحد ہو کر اپنے طور پر کوششیں کرنی چاہئیں۔

80ء کی دہائی میں کھمبو کے رہائشی 32 سالہ لوپ سنگ شیر پا نے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا بیڑا اٹھایا۔ اس نے شیر پا لوگوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے اُن کے اپنے پہاڑی سلسلے ہمالیہ کی چوٹی ایورسٹ پر شیر پا لوگوں کی ایک مہم لے جانے کی منصوبہ سازی کی۔ وہ سمجھتا تھا کہ دنیا کی اس بلند ترین چوٹی پر شیر پا کوہ پیماؤں کی اس مہم کے ذریعے وہ نہ صرف اپنے عظیم ترین پیشرو کو خراجِ تحسین پیش کر سکیں گے بلکہ اس طرح شیر پا لوگوں کو وہ شہرت حاصل ہو گی..جس سے ان کی ثقافت و اقدار کے فروغ اور عالمی سطح پر ان کی پہچان میں مزید اضافہ ممکن ہو سکے گا۔

آنگ نکی شیری پیٹر ایتھنز نے 1990ء میں ایورسٹ کی پہلی کی تھی۔ اُس وقت لوپ سنگ شیر اس کا معاون تھا۔ لوپ سنگ نے پیٹر سے رابطہ کیا اور بتایا کہ وہ شیر پا لوگوں کی مہم لے کر ایورسٹ کی چوٹی سر کرنا چاہتا ہے تاکہ دنیا کے سامنے شیر پا قلیوں کا بطور کوہ پیما رُخ بھی سامنے آجائے۔ پیٹر اس تجویز سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے امریکا میں لوپ سنگ کی مہم کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں مہم کے لیے درکار رقم جمع ہو گئی۔ اس کے بعد مجھے خط لکھ کر بلوایا گیا تاکہ بحیثیت رائٹر میں شیر پا لوگوں کی اس مہم کا حصہ بنوں اور آنکھوں دیکھا حال لکھ کر دنیا کے سامنے بالتصویر پیش کر سکوں۔

میں نے شیر پا کی اس مہم میں، اُن کے ساتھ اور ان کے متوازی دو سفر کیے۔ ایک سفر اس مہم کا تھا۔ دوسرا سفر شیر پا لوگوں کی زندگی، رہن سہن، بود و باش اور رسم و رواج کو جاننے کے لیے تھا۔ مہم میں شامل شیر پا بلندیوں کا سفر طے کر رہے تھے اور میں اُن کے دلوں کی گہرائیوں میں اُتر کر انہیں جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

مارچ 1991ء میں پہلی بار میں شیر پا لوگوں کے خطے

فیض کے ایک خط سے اقتباس

فیض کینیڈا میں تھے۔ وہاں سے انہوں نے اپنے ایک خط میں لکھا۔

''کینیڈا میں ایک ہندوستانی خاتون نے کہا کہ آپ کی اردو بہت مشکل ہے، ہماری ہندی زبان میں بھی لکھیے۔ میں نے کہا، سوچیں گے۔ پھر میں نے پوچھا کہ آپ کیا کرتی ہیں؟ کہنے لگیں ''باتیں کرتی ہوں۔'' یہ بات ہمیں بہت پسند آئی۔ اگلے دن ہم نے اسے یہ گیت لکھا:

چلے لگیں یادوں کی چتائیں
آؤ کوئی گیت سنائیں
اپنے انعامِ حسن کے بدلے
ہم تہی دامنوں سے کیا لینا
آج فرقت زدوں پر لطف کرو
پھر کبھی صبر آزمالینا

میں پہنچا، جس کا نام ہے 'کھمبو'۔ کھٹمنڈو سے کھمبو تک پہنچنے کے لیے سب سے آسان راستہ ہے ہوائی جہاز کا۔ اگر دشوار گزار زمینی راستے سے یہاں پہنچنے کی کوشش کی جائے تو کھٹمنڈو سے کھمبو تک ایک ہفتہ لگ سکتا ہے۔ کھمبو کے لُک لا ہوائی اڈے سے باہر نکلتے ہی میرا استقبال جس چیز نے کیا، وہ ایک دکان کا بورڈ تھا۔

''شیر پا کافی شاپ''

یہ دیکھ کر مجھے تھوڑی سی مایوسی ہوئی۔ تجارتی مقاصد نے ان سادہ لوح پہاڑی باشندوں کو بھی مکمل طور پر اپنی گرفت میں جکڑ لیا تھا۔ ہوائی اڈے سے باہر نکلا تو اشیا بیچنے والوں کی بھرمار تھی۔ بڑی تعداد میں خوانچہ فروش نیپالی طرز کے نقلی زیورات فروخت کر رہے تھے۔ یہ اور بات کہ یہ زیورات بنتے تو کھٹمنڈو میں ہیں لیکن خریدار کو بتایا جاتا ہے کہ تبت

ساختہ ہے۔

ہوائی اڈے کی دیوار کے ساتھ موسم بہار کے اس موسم میں درجنوں شیر پا قلی کام کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس موسم بہار میں ہزاروں کوہ نوردوں اور دو درجن کوہ پیماؤں کی کھمبو آمد متوقع تھی۔ جس کے باعث بے روزگار شیر پا قلیوں کو خاطر خواہ کام ملنے والا تھا۔ اس کام سے عام شیر پا قلیوں کو بھی اتنی آمدنی حاصل ہو جاتی ہے کہ موسم سرما کے سرد ترین مہینے اپنے گھروں کے اندر رہتے ہوئے بے فکری سے گزار سکیں۔

''نمستے سر۔'' ایک شخص میرے نام کا کارڈ بورڈ پکڑ کر ہوائی اڈے کی حدود کے باہر خارجی راستے پر کھڑا ہوا تھا۔ جب میں اس کی طرف بڑھا تو وہ سمجھ گیا۔ اس نے کارڈ بورڈ نیچے زمین پر رکھا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے خوش آمدید کہا۔ یہ تھا شیر پا جنگ بو۔ جو اگلے تین مہینوں تک کے لیے میرا گائیڈ اور مترجم تھا۔ وہ ہوائی اڈے پر مجھے لینے کے لیے آیا تھا۔

جنگ بو نے ایورسٹ تک چڑھائی کے اس طویل سفر کے پیش نظر میرے اور اپنے لیے ایک شیر پا قلی اور دو عدد 'زوپ کیوز' پہلے ہی کرائے پر حاصل کر لیے تھے۔ زوپ کیوز مقامی شیر پا زبان میں یاک کی نمی نسل کو کہتے ہیں۔ جسے پہاڑی علاقوں میں مال برداری اور سواری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایورسٹ تک کے سفر میں ہمیں زوپ کیوز پر اپنا سامان لادنا تھا اور اسی پر سوار ہو کر ایورسٹ کے بیس کیمپ تک بھی پہنچنا تھا۔

کھمبو میں میرا قیام کئی روز کا تھا۔ یہاں مجھے شیر پا لوگوں کی سماجی زندگی، بود و باش اور معاش کا جائزہ لینا تھا۔ کھمبو پہنچنے کے بعد اگلے دو دن میں نے ضروری ساز و سامان کی خریداری کے لیے نمچے کے بازار میں گزارے۔ نمچے کو کھمبو کا غیر اعلانیہ صدر مقام کا درجہ حاصل ہے۔ میں نمچے بازار کے قریب میں ہی واقع لاج میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس لاج سے پورے نمچے کا بہت ہی دلکش طائرانہ منظر دکھائی دیتا تھا۔

ایورسٹ بیس کیمپ یہاں سے ایک ہفتے کی پیدل مسافت پر واقع ہے۔ بیس کیمپ سطح زمین سے 17 ہزار 600 فٹ کی بلندی پر واقع برفیلی چٹانوں اور ہولناک گھاٹیوں کے بیچ واقع ہے۔ یہ ایسی جگہ ہے جسے دیکھ کر کمزور دل لوگوں کا تو کلیجہ ہی منہ کو آ جائے۔ بیس کیمپ پہنچ کر لوپ سنگ نے مجھے شیر پا کوہ پیما ٹیم کے دیگر ارکان سے متعارف کروایا۔

ایورسٹ کو سر کرنے کے لیے جانے والی شیر پا ٹیم بہت دلچسپ اور متنوع پیشہ لوگوں پر مشتمل تھی۔ ٹیم میں شامل 33 سالہ سونم دندو سنگتراش تھا۔ تین زنگ تاشی کی عمر 35 سال تھی اور وہ ایک شادی شدہ بودھ راہب کا بیٹا تھا۔ 33 سالہ این رنزنگ کاشتکاری کرتا تھا۔ نیما تاشی کی عمر بھی 33 سال تھی اور وہ سونم دندو کی طرح دو بار ایورسٹ پر چڑھ چکا تھا۔ انگ سمبو کی عمر 25 سال تھی اور وہ گریجویٹ تھا۔ لکھپا گیالو کی عمر 39 برس تھی اور وہ پیشے سے کسان اور چھ بچوں کا باپ تھا۔ ٹیم میں سب سے زیادہ تجربہ کار اور عمر رسیدہ رکن کیال زن شیر پا تھا۔ اس کی عمر 49 برس تھی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ تیرہ بار ایورسٹ سر کرنے کی مہم میں شامل رہ چکا تھا۔ مغرب کے وہ متعدد مشہور و معروف کوہ پیما جو ایورسٹ سر کر چکے تھے، اس کی ماہرانہ صلاحیتوں کا اعتراف اپنی اپنی کتابوں میں بھی کر چکے ہیں۔

بیس کیمپ سے ہر روز صبح شیر پا کی ایک ٹولی نکلتی تھی۔ وہ دن بھر اگلے پڑاؤ تک کے لیے رسیاں لگاتے اور راستے کا انتخاب کرنے میں گزار دیتے تھے۔ شام کو واپس یہ بیس کیمپ لوٹ آتے۔ کئی روز اسی طرح گزر گئے۔ آخر یکم اپریل کو 'شیر پا مہم' شروع ہوئی۔ اس دن ہم ایورسٹ مہم کے لیے اپنے پہلے پڑاؤ یعنی ایورسٹ بیس کیمپ سے روانہ ہوئے۔ سب کے لیے اگلی منزل دوسرا پڑاؤ تھا۔ جبکہ میں نمچے سے بیس کیمپ تک اور اب یہاں سے اپنے تیسرے پڑاؤ کی طرف جا رہا تھا۔

شیر پا نیپال کے مقامی باشندے نہیں ہیں۔ وہ پہلی پہلی بار ہمالیہ کے اس خطے میں سولہویں صدی میں پہنچے۔ وہ تبت کے انتہائی مشرق میں واقع علاقے 'کھم' سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ تبتی زبان میں 'شیر پا' کے معنی 'مشرق کا باشندہ' ہیں۔ اس لیے وہ آج بھی شیر پا ہی کہلاتے ہیں۔ ہجرت کے بعد یہ لوگ ہمالیہ کے پہاڑی سلسلے سے نکلنے والے دریائے دُدھ کوسی کے کناروں پر آباد ہو گئے۔ یہ علاقہ ہمالیہ کی تنگ گھاٹیوں میں واقع ہے۔

کھم کے پُرخطر علاقے اور سخت تکلیف دہ موسمی حالات میں رہنے کے سبب یہ لوگ انتہائی جفاکش اور سرد ترین موسموں کے مزاج سے آشنا تھے۔ وہ یاک کی پرورش، گلہ بانی اور اس کی تجارت کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ چاول، مکئی اور گندم اُگاتے تھے۔ وہ اپنی پیداوار کو جنوب میں واقع زیریں علاقے سولو میں لے جا کر فروخت کرتے تھے اور وہیں سے اپنے لیے ضروری اسباب زندگی خرید لیا کرتے تھے۔ شروع شروع میں ان کی تجارت 'مال کے بدلے مال' یعنی بارٹر سسٹم کے تحت ہوتی تھی۔ صدیوں تک اپنی زندگی نیپال کی سرزمین پر گزارنے کے باوجود ان کی زبان نیپالی زبان سے نہیں بلکہ تبتی زبان سے مماثلت رکھتی ہے۔ یہی حال ان کے بود و باش اور رسم و رواج کا بھی ہے۔ وہ آج تک نیپال کے رسم و رواج میں ضم نہیں ہو پائے ہیں۔ ان کی زندگی تبت سے دور ہونے کے باوجود تبتی رسم و رواج کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ یہ آزاد منش لوگ ہیں جو اپنی آزاد زندگی پر کسی دوسرے کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتے ہیں، ماسوائے اپنے۔

شیر پا سولہویں صدی عیسوی میں گمنام قبیلے کی حیثیت سے ہجرت کر کے یہاں آئے اور ہمالیہ کے دامن میں آ کر آباد ہو گئے۔ انہوں نے اس پہاڑ کی ہمیشہ تکریم کی ہے۔ جغرافیائی طور پر جس پُرخطر اور مشکل خطے کو شیر پا نے اپنا مسکن بنایا تھا۔ اُس نے ہی انہیں پہاڑوں اور کوہ نوردوں کے درمیان رابطے کا سب سے اہم پل بنا کر عالمی شہرت بخش دی۔

انیسویں صدی کے نصف میں جب ہندوستان انگریزوں کے ماتحت آ گیا تو برطانوی افواج نے مقامی باشندوں کو فوج میں شامل کرنا شروع کر دیا۔ شیر پا لوگوں نے بھی بہتر معاشی حالات کی تلاش میں نیپال کی مشرقی سرحد کے ساتھ واقع دارجلنگ کی طرف ہجرت شروع کر دی۔ دارجلنگ میں برطانوی فوج تعینات تھی جہاں یہ لوگ یہاں اپنے لیے کام کی تلاش میں آئے تھے تاکہ بہ آسانی چار پیسے کما سکیں۔

1920ء کی دہائی میں برطانوی افواج نے ایورسٹ کے راز جاننے کے لیے ایک مہم تشکیل دی۔ اس مہم کے لیے مضبوط جسم، علاقے سے اچھی طرح آگاہ اور سخت ترین موسمی حالات کا مقابلہ کرنے والے شیر پا باشندوں کی خدمات بطور قلی حاصل کی گئیں۔ یہ مہم شیر پا، مغرب اور ایورسٹ کی چوٹی کے مابین رابطے کا آغاز تھا۔ ایورسٹ تک پہنچنے کی یہ وہ پہلی برطانوی یا یورپی ممالک کی کوشش تھی جو نیپال کی سرزمین سے کی جا رہی تھی۔ اس سے قبل بھی برطانیہ نے ایورسٹ تک پہنچنے کی کئی ناکام کوششیں کی تھیں لیکن یہ کوششیں تبت کی سرزمین پر سے کی گئی تھیں۔ جن میں مستقل ناکامی کا منہ دیکھنے کے بعد اب نیپال کی سرزمین کے راستے ایورسٹ تک پہنچنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

ایورسٹ تک پہنچنے کے لیے نیپال سے کی جانے والی یہ پہلی برطانوی کوشش اگرچہ ناکامی سے ہمکنار ہوئی لیکن 1949ء تک کوہ پیماؤں نے متفقہ طور پر یہ بات تسلیم کر لی تھی کہ ایورسٹ تک پہنچنے کے لیے مناسب ترین راستہ نیپال کی سرزمین پر واقع کھمبو سے ہی ہو کر گزرتا ہے۔ کامیابی ملے گی تو کھمبو کے راستے سے ہی۔ اس کے بعد شیر پا، ایورسٹ اور کھمبو..... ایورسٹ سر کرنے کی مہم کا جزو لاینفک بن گئے۔

1952ء تک کوہ پیماؤں کی متعدد کوششوں کے باوجود ایورسٹ کی چوکی ناقابل تسخیر رہی مگر اس کے اگلے برس ایورسٹ تسخیر کر لی گئی۔ 1953ء میں کوہ پیما ایڈمنڈ ہلیری وہ پہلے انسان بن گئے، جن کے قدم 20 ہزار، 28 فٹ بلند دنیا کی اس بلند ترین چوٹی پر پہنچے۔ ان کے ساتھ ساتھ تیزنگ نارگے نامی شخص وہ پہلا شیر پا تھا جس نے ایڈمنڈ ہلیری کے ساتھ اس چوٹی پر قدم رکھے۔ تیزنگ نارگے کھمبو کا رہنے والا تھا۔

تیزنگ نارگے شیر پا کمیونٹی کے لیے قابل فخر شخصیت بن چکا تھا لیکن چند توہم پرست شیر پا اس سے ناراض تھے کہ اس نے مقدس پہاڑ کی چوٹی پر قدم رکھ کر نہ صرف گستاخی کی بلکہ اس سنہری ہنس کو بھی قتل کر دیا جو اس چوٹی پر بسیرا کرتا تھا۔ یہ توہم پرست شیر پا دوسرے لوگوں کو ڈرا رہے تھے کہ اب پہاڑ سے عذاب نازل ہوگا جس کے بعد اس علاقے میں کوہ پیمائی اور کوہ نوردی کی تمام سرگرمیاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہ صرف ختم ہو جائیں گی بلکہ شیر پا باشندوں کا اس سے منسلک روزگار بھی بند ہو جائے گا۔

نارگے کی شخصیت شیر پا لوگوں میں دو رُخ اختیار کر گئی۔ ایک رُخ تھا فاتح ایورسٹ کا جس کی بنا پر دوسرے شیر پا اس پر فخر کر رہے تھے۔ دوسرا رُخ وہ تھا جس کی عکاسی توہم پرست شیر پا اپنی اپنی توجیحات میں پیش کر رہے تھے لیکن نارگے مخالف پروپیگنڈا زیادہ عرصے تک نہیں چل سکا۔ بہت جلد دوسرے شیر پا اور کوہ پیما بھی ایڈمنڈ ہلیری کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایورسٹ پر پہنچنے کی کوششیں کرنے لگے۔ 1976ء تک آٹھ شیر پا ایسے تھے جو کوہ پیماؤں کے ساتھ 25 ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔

ایورسٹ سر کیے جانے کے فوراً بعد نیپال میں سیاحت کی صنعت زور پکڑنے لگی۔ کوہ پیمائی کے شوقین مغربی افراد کی نیپال آمد کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔ سیاحت کی صنعت روز افزوں ترقی کرنے لگی اور..... شیر پا کی زندگی بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تبدیل ہو گئی۔

آج کھمبو کے نصف سے بھی زائد شیر پا کوہ پیمائی کی صنعت سے بلواسطہ یا بلاواسطہ طور پر منسلک ہیں۔ یہ کھمبو اور ایورسٹ بیس کیمپ تک کے درمیان سات دنوں کی پیدل مسافت کی راہ میں بے شمار ریستوران اور رہائشی ہوٹلوں کے مالک ہیں۔ یہی نہیں، کوہ پیماؤں اور کوہ نوردوں کے لیے یہ بطور قلی، باورچی، کیمپ نگراں، گائیڈ سمیت متعدد خدمات

سرانجام دیتے ہیں۔ آج شیر پا نیپال کا وہ نسلی گروہ ہے جو ریاست کے دوسرے باشندوں کی نسبت سب سے زیادہ فی کس شرح کا حامل ہے۔ 1991ء میں شیر پا ٹیم نے جب ایورسٹ مہم شروع کی اس وقت نیپال میں اوسطاً فی کس شرح آمدنی 175 امریکی ڈالر تھی جب کہ ایک شیر پا کی سالانہ فی کس شرح آمدنی 1200 امریکی ڈالر تھی۔

ایک عام شیر پا کم سے کم تین سے پانچ ڈالر روزانہ پر بطور قلی اپنی خدمات پیش کرتا ہے۔ یہ عام سے قلی ہوتے ہیں۔ زیادہ تر ٹریکنگ کے شوقین سیاح ہی ان کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ شیر پا کی دیکھا دیکھی بہت سے دوسرے مقامی نسلی گروہ بھی اس کام میں شامل ہو چکے ہیں۔ ان میں رائے، تمانگ اور چند دوسرے نیپالی نسل کے لوگ شامل ہیں۔ البتہ جان جوکھم کا وہ کام جو شیر پا کا خاصہ ہے، وہ ان لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ ایورسٹ ہی نہیں بلکہ ہمالیہ کی دیگر دشوار گزار اور بلند ترین چڑھائیاں چڑھنے کے لیے غیر ملکی پیشہ ور کوہ پیما اور کوہ نورد صرف شیر پا پر ہی بھروسا کرتے ہیں۔ ان بلندیوں تک چڑھنے کے لیے جو شیر پا حاصل کیے جاتے ہیں۔ ان کا معاوضہ بھی بہت زیادہ ہوتا ہے اور ان کی صلاحیتیں بھی کم نہیں ہوتی ہیں۔ ایسے شیر پا صرف کوہ پیماؤں کے لیے ہی خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ ان کا دوسرے عام شیر پا قلیوں سے کوئی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک کوہ پیمائی کی ٹیم اپنی مہم میں تین ماہ کا عرصہ صرف کرتی ہے۔ اس تین ماہ کے لیے تجربہ کار شیر پا دو سے تین ہزار ڈالر فی کس وصول کرتے ہیں۔

شیر پا کے لیے کوہ پیماؤں کی خدمات سرانجام دینا صرف ایک کام ہے لیکن اس کے باوجود اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ انہیں ہمالیہ کی بلندیاں سر کرنے میں مزہ بھی آتا ہے۔ اب تک 73 شیر پا ایورسٹ کی چوٹی سر کر چکے ہیں۔ انہی میں سے ایک شیر پا انگ ریتا بھی ہے جو سات مرتبہ ایورسٹ کی چوٹی پر چڑھ چکا ہے۔ سر بہ فلک پہاڑوں کی بلندیوں کو تسخیر کرنا شیر پا لوگوں کے لہو میں شامل ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ مغربی کوہ پیماؤں کے مقابلے میں وہ ایورسٹ کی چوٹی تک زیادہ آسانی سے پہنچ سکتے ہیں۔

انگ پربھا شیر پا ہیں اور نیپالی دارالحکومت کھٹمنڈو میں ایک ٹریکنگ کمپنی چلاتے ہیں، وہ کہتے ہیں ''ایورسٹ کی چوٹی سر کرنا تمام مغربی کوہ پیماؤں کا خواب ہے مگر ان سب کے خواب تعبیر نہیں پاتے۔ میرا اندازہ ہے کہ ساٹھ فیصد سے زیادہ کوہ پیما راستے کی تکلیفوں کا سامنا ہی نہیں کر پاتے اور مشن ادھورا چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔ یہ ہم شیر پا ہی ہیں جو بے تھکان چوٹی تک پہنچ جاتے ہیں۔ ہم کبھی بھی بیچ راہ سے واپس نہیں پلٹتے۔ ایک بار شیر پا نے بیس کیمپ سے قدم آگے بڑھا لیے تو وہ اپنی مرضی سے نہیں بلکہ پیچھے ہٹتا ہے تو اس کی مرضی سے، جسے اس کی خدمات کا معاوضہ ادا کرنا ہے۔ شیر پا بہت سخت جان ہیں، بالکل ہمالیہ کی طرح۔''

نوے کی دہائی تک شیر پا کا گزر [illegible] عہد میں زندہ تھا۔ لک لا ہوائی اڈے کے علاوہ صرف [illegible] گاؤں میں بجلی پہنچائی گئی تھی۔ شہر میں ٹیلی فون کا نظام موجود نہیں تھا۔ تار، ٹیلی گراف نام کی کوئی شے نہیں تھی یہاں پر کوئی پختہ سڑک اور گاڑی نہیں تھی۔ حتیٰ کہ آج 2010ء میں بھی کھمبو میں کوئی گاڑی موجود نہیں ہے۔ سارا مال تجارت یاک پر یا پیٹھ پر لاد کر پیدل مسافتیں طے کی جاتی ہیں۔ فضا آلودگی سے اور جسم فالتو چربی سے پاک.....

اس سے پہلے کہ قارئین کے ذہنوں میں سوال اٹھے۔ بتاتا چلوں کہ کھمبو ہمالیہ کی تنگ گھاٹیوں میں آباد ہے یہاں ..... اتنی زمین ہی موجود نہیں ہے کہ جس پر وہ گاڑی چلا سکیں۔ اس لیے توقع ہے کہ یہ سرزمین ہمیشہ رکازی ایندھن کی کثافتوں سے پاک و صاف رہے گی۔

اس کے باوجود کہ کھمبو میں جدید مواصلاتی نظام موجود نہیں، لیکن اس کے باوجود یہاں خبر رسانی کا سلسلہ موجود ہے۔ کھمبو میں 'خبر' برق رفتاری سے سینہ بہ سینہ سفر کرتی ہوئی بہت جلد شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل جاتی ہے۔

کھمبو کے شیر پا خوش گپیوں کے بہت شوقین ہیں۔ راہ چلتے ہوئے ایک دوسرے کو روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

''کہاں سے آ رہے ہو؟''

یہ شیر پا کا پسندیدہ سوال ہے۔ جواب مل گیا تو پھر کہیں گے۔

''ایک ایک کپ چائے ہو جائے۔''

بس پھر کیا۔ قریب میں موجود چائے خانے میں بیٹھ کر ایک، ایک کپ چائے پر دو ڈھائی گھنٹے منٹوں میں گزار دیں گے۔ اس دوران اگلا پچھلا سب احوال ایک دوسرے کے گوش گزار کرتے چلے جائیں گے۔ یوں ہر شیر پا دوسرے علاقے کے ہی نہیں بلکہ ہر گھر کے پورے حالات سے باخبر رہتا ہے۔ شیر پا کو احوال سنانے کا اتنا شوق ہے کہ اگر وہ اپنے گھر سے سفر پر نکلتے ہوئے ٹوتھ برش بھی بھول آیا ہے تو یہ واقعہ بھی راستے میں ملنے جلنے والے ہر شخص کو روک کر سناتا چلا

جائے گا پیشہ ور قصہ گو کی طرح۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوگی۔ ذرا سی دیر میں ہی یہ خبر اس شخص کی بیوی تک بھی پہنچ جائے گی۔ قبل اس کہ وہ گاؤں کی حدود سے باہر نکلے۔ اس سے قبل ہی اس کی بیگم ٹوتھ برش لے کر پہنچ جائے گی۔ یہ حال ہے کھمبو میں سینہ گزٹ کا۔

کھمبو میں میری رہائش 'پیو راما لاج' میں تھی۔ یہ لاج ایک شیر پا فیملی چلاتی ہے جس کے سربراہ لکھپا تھے۔ یہاں قیام کے دوران ان سے میرا تعلق بہت خوشگوار رہا۔ ہر صبح لکھپا سات پیالیوں میں تازہ پانی بھر کر گوتم بودھ کی عبادت کیا کرتا تھا۔ مجھے اس کی عبادت کا انداز بہت دلکش لگتا تھا۔ لاج میں رہائش پذیر مہمانوں کے لیے کھانا اس کی بیوی بناتی تھی۔ ڈائننگ روم میں غیر ملکی مہمانوں کی فرمائش بالعموم فرنچ فرائیز اور پیزا ہوتی تھی۔ لکھپا کی بیوی ڈوما ذائقے دار مغربی کھانا بناتی تھی لیکن یہ لوگ خود ہمیشہ دال بھات پر ہی گزارا کرتے ہیں۔

''یہ ہمارا کھانا ہے۔ ہمیں یہی اچھا لگتا ہے۔'' ایک دن لکھپا کے گھر میں دال بھات کی دعوت اڑاتے ہوئے جب میں نے ان سے پیزا وغیرہ نہ کھانے کی وجہ پوچھی تو ڈوما نے فخر سے سر اٹھا کر جواب دیا۔ لکھپا اور اس کی بیوی کو اپنے شیر پا ہونے پر ناز ہے۔

ڈوما بکرے کا بھنا گوشت بھی بہت اچھا بناتی تھی۔ وہ گوشت بھوننے کے بعد اس پر مقامی طور پر تیار کردہ بیئر کے چھینٹے مارتی۔ یہ بیئر ان کی زبان میں 'چنگ' کہلاتی ہے۔

ڈوما اپنے لاج کے لیے ہفتہ وار خریداری نمچے کے مرکزی اور واحد بازار سے کرتی ہے۔ سنیچر کو یہاں بہت بڑا بازار سجتا ہے۔ جس میں آس پاس کے دیہاتوں کی عورتیں اور مرد سبزیاں اور اناج لے کر آتے ہیں۔ تبتی باشندے زیادہ تر مکئی، چاول اور یاک کے دودھ سے بنا ہوا مکھن لاتے ہیں۔ غرضیکہ، اس ہفتے وار سستے بازار میں بکرے سے لے کر دال تک اور، کپڑے سے لے کر چپل تک، ضروریات زندگی کی ہر چیز کی عارضی دکانیں سجی..... ہوتی ہیں۔ مقامی باشندے زیادہ تر اپنی ضروریات کی اشیا اسی ہفتے وار 'سنیچر بازار' سے خریدتے ہیں۔ یہاں مٹھائیاں بھی بہت فروخت ہوتی ہیں اور اسی تناسب سے کھائی بھی جاتی ہیں۔ شیر پا میٹھا بہت پسند کرتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انسان کو بلندی پر جسم میں گلوکوز کی سطح کو برقرار رکھنے کے لیے میدانی علاقوں کی نسبت، میٹھے کی بہت زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ میٹھا کھانے کی وجہ سے زیادہ تر شیر پا کے دانت خراب رہتے ہیں۔ ان کے ہاں باقاعدگی سے دن میں دو تین بار تو کیا ایک بار بھی دانتوں کی صفائی کے لیے برش کے استعمال کا رجحان نہیں ہے۔

چند سال پہلے کینیڈا سے تعلق رکھنے والی ایک خاتون ڈینٹسٹ کھمبو آئی تھی۔ انہوں نے جب یہاں کے لوگوں میں دانتوں کے امراض کو دیکھا تو ایک شیر پا خاتون کو علاج دندان کی تربیت دی۔ اب یہ شیر پا خاتون اپنا ڈینٹل کلینک چلا رہی ہے۔ ان کی کوششوں سے لوگوں میں دانتوں کی صفائی کے لیے برش اور مسواک کے استعمال کا رجحان بڑھ رہا ہے۔

شیر پا باشندوں میں تمباکو نوشی کا رجحان بہت زیادہ ہے۔ ان کے مرد ایک سے دوسری بیڑی جلاتے ہیں۔ شیر پا صبح بیدار ہونے پر کافی دیر کھانستے اور بلغم تھوکتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ وہی ہے حد سے زیادہ تمباکو نوشی۔ صبح کی اس کھانسی پر قابو پانے کے لیے یہ تبت میں کاشت کی جانے والی پتیوں سے ایک خاص قسم کا قہوہ بنا کر پیتے ہیں۔ یہ ان کے لیے بیڈ ٹی کا درجہ رکھتی ہے۔ لکھپا کے مطابق ''یہ تبتی قہوہ فشار خون کو بھی قابو میں رکھتا ہے۔'' ویسے عام طور پر یہ لوگ برطانیہ اور جنوبی ایشیا کے چند دیگر ممالک کی طرح دودھ ملی چائے پینے کے عادی ہیں۔

☆☆☆

یہ چار اپریل کی بات ہے۔ شیر پا کی کوہ پیما ٹیم دوسرے پڑاؤ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا جب ایک برف کی دیوار اس وقت اچانک ٹوٹ کر گر پڑی جب تین شیر پا ایک تنگ گھاٹی کے اوپر کھڑے ہو کر دو پہاڑوں کے درمیان راستہ بنانے کے لیے ان پر المونیم کی دو سیڑھیوں کو باہم جوڑ کر عارضی پل بنا رہے تھے۔ دیوار ٹوٹی تو کوہ پیما لکھپا گیالو چالیس فٹ نیچے کھائی میں جا گرا۔ گرتے ہوئے اس نے ایک پیڑ کو پکڑ لیا اور اس کے تنے سے چمٹ گیا۔ یوں وہ ہزاروں فٹ گہری برف کی کھائی میں گرنے سے بچ گیا۔ میرے نزدیک یہ ایک بہت بڑا حادثہ تھا۔ اس سے بڑی حیرت کی بات اس کا زندہ بچ جانا تھا۔ میرے لیے لکھپا کی زندگی کا بچ جانا معجزہ تھا۔ ایک بات جو میں نہیں بھلا پایا وہ یہاں کا اطلاعاتی نظام ہے۔ واپسی پر مجھے پتا چلا کہ اس حادثے کی خبر بہت تھوڑے عرصے میں ہی لکھپا کے گھر والوں کو کھمبو میں مل چکی تھی۔ مجھے میرے مترجم نے بتایا کہ جس شیر پا نے حادثے کی یہ اطلاع لکھپا کے باپ کو دی تھی۔ وہ بتا رہا تھا کہ یہ سن کر اس ستر سالہ بوڑھے کی آنکھوں میں

آنسو آ گئے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ کہنے لگا۔

''یہ لوگ میرے دوسرے بیٹے کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گئے تھے؟''

حیرت انگیز..... یہ رونگل صرف بہادر شیر پا کا ہی ہو سکتا ہے۔ اب مجھے شیر پا کی بہادری اور ہمت پر کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔

اس حادثے کے چند گھنٹوں کے بعد لکھپا کو کھائی سے نکال لیا گیا۔ اس حادثے میں اس کے گھٹنے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اس بات کی اطلاع بھی صرف دو روز کے اندر اندر کھمبو میں اس کے باپ تک پہنچ گئی۔

جب میں مہم چھوڑ کر واپس کھمبو لوٹا تو میری پہلی خواہش لکھپا کے باپ سے ملاقات کرنے کی تھی۔ لکھپا کے باپ کا نام منگ ما ہے۔ اس کی زندگی دکھوں اور مصیبتوں کی تصویر ہے۔ زمانے کے سرد و گرم ایام کی آپ بیتی اس کے جھریوں زدہ چہرے پر لکھی ہوئے صاف نظر آتی ہے۔ اس نے اپنی ستر سالہ زندگی میں سے پچپن سال کوہ پیمائی، کوہ نوردی اور مہم جوؤں کا سامان ڈھوتے ہوئے ایورسٹ تک پہنچنے، اُترنے اور پھر چڑھنے میں بسر کیے ہیں۔

برطانوی نوآبادیاتی دور میں منگ ما نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا سب سے بڑا حصہ برطانوی افواج کے ساتھ رہتے ہوئے گزارا۔ منگ ما کی بہادری کے اعتراف میں رائل افواج نے اسے 'ٹائیگر میڈل' سے بھی نوازا تھا۔ اس کے پاس تعریفی اسناد اور خراجِ تحسین کے..... لکھ کر دیے گئے غیر ملکی کوہ پیماؤں اور خود رائل فورس کے اُن افسران کے خطوط کا پلندہ موجود ہے جن کے ساتھ کبھی اس نے کام کیا تھا۔ ان اسناد اور خطوط کے کاغذ بھی اب زرد اور خستہ ہو چکے ہیں مگر یہ زبانِ خستگی سے آج بھی منگ ما کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کی داستان سنا رہے ہیں۔ ایک تعریفی خط میں لکھا ہے:

''ایک سخت جاں اور جفاکش شیر پا وہ ہے جو مشکل سے مشکل ترین کام کو بھی خوش دلی سے قبول کرے اور..... منگ ما ایسا ہی بہادر شیر پا ہے۔''

افسوس کی بات یہ ہے کہ ساری زندگی کوہ پیمائی میں بسر کر دینے والا یہ جفاکش اور بہادر شیر پا زندگی کے آخری ایام میں کسی بھی قسم کی پینشن کا حقدار نہیں ٹھہرا۔ اگر اس کے بیٹے نہ ہوتے تو کل کا یہ جفاکش اور آج کا ناتواں بوڑھا زندگی کی گاڑی کو کیسے دھکیل پاتا؟ یہ سوال پریشان کر گیا۔ مجھے یقین ہے کہ ہر شیر پا شاید منگ ما کی طرح خوش قسمت نہیں ہوتا ہوگا کہ اپنا بڑھاپا بیٹوں کے مضبوط شانوں کے سہارے گزار سکے۔

اس دن جب میں اس سے ملنے کے لیے پہنچا تو وہ اپنے چھوٹے سے مکان میں اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی بیوی توے پر آلو کی ٹکیاں تل رہی تھی۔ باتیں ہوتی رہیں اور دوپہر کا کھانا بنتا رہا۔ باتوں باتوں میں منگ ما نے کہا۔

''یہ کوئی دس سال پہلے کی بات ہے۔'' اس نے بیڑی سلگائی اور ایک گہرا کش لگا کر چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا اور پھر نتھنوں سے دھواں خارج کرتے ہوئے دوبارہ گویا ہوا۔

''میرا چھوٹا بیٹا پاسنگ کیا کو پیما کی ٹیم کے ساتھ ایورسٹ کی طرف گیا۔ کافی بلندی پر تھے وہ لوگ جب اچانک برف کا خوفناک طوفان آ گیا۔ ٹیم اس طوفان میں پھنس گئی۔ اس وقت وہ لوگ کیمپ سے اوپر تین ہزار فٹ کی بلندی پر تھے۔ برف کا یہ طوفان اتنا شدید تھا کہ ٹیم آگے نہ بڑھ سکی اور انہیں واپس پلٹنا پڑا۔ اسی دوران میرا بیٹا طوفان کی زد میں آ کر غائب ہو گیا۔ طوفان تھمنے کے بعد ٹیم والے اسے دو دن تک تلاش کرتے رہے۔ بالآخر برف کے تودے میں دبی اس کی لاش مل گئی۔'' بیٹے کا ذکر کرتے ہوئے اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔

''تو پھر اس کے بعد کیا ہوا؟'' میں نے منگ ما سے پوچھا۔

''مجھے اس حادثے کی اطلاع مل چکی تھی لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ زندہ نہیں مل سکے گا۔'' اس کے لہجے میں بیٹے کی یادیں بھی جھلک رہی تھیں۔ ''پھر یہ ہوا کہ جب اس کی لاش مل گئی تو مجھے شیر پا سردار نے ریڈیو پر اس بات کی اطلاع دی۔ یہ سن کر چند لمحوں کے لیے میرے اوسان جواب دے گئے۔ پھر میں نے خود کو سنبھالا۔'' اس وقت منگ ما کیسے ٹوٹا ہوگا۔ یہ اندازہ میں اس کی بات سن کر سکتا تھا۔

''لاش مل جانے کے بعد شیر پا سردار نے مجھ سے پوچھا کہ میت کا کیا کریں۔ اسے نیچے لائیں یا.....؟'' منگ ما نے مجھے اپنے بیٹے کو پیش آنے والے حادثے اور اس کے نتیجے میں واقع ہو جانے والی اس کی موت کے بارے میں تفصیل سے اپنی داستانِ غم سنائی۔

''سردار کی بات سن کر میں نے کہا۔ نہیں اس کی لاش کو نیچے مت لاؤ۔ اسے وہیں کسی کھائی میں برف تلے دفن کر دو۔''

''ایسا کیوں کیا؟'' یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔

''میرا بیٹا تو چلا گیا مگر میں نہیں چاہتا کہ اس کا مردہ جسم نیچے لاتے ہوئے کوئی اور موت کے منہ میں چلا جائے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے سر گھٹنوں میں دے لیا۔ شاید وہ اپنے آنسوؤں میں مجھے شریک نہیں کرنا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد منگ ما نے سر اوپر اٹھایا۔ ''میں آخری بار

اپنے بیٹے کا چہرہ بھی نہیں دیکھ پایا۔ یہ بات آج بھی مجھے تڑپاتی ہے مگر میں جانتا تھا کہ ایورسٹ کو جانے والے دشوار گزار راستوں پر سے لاش کو واپس نیچے لانا کتنی بڑی مصیبت بن سکتا تھا۔ اس میں کسی کی جان بھی جا سکتی تھی۔ اس کی ماں تو آج تک بیٹے کی موت کا سوگ منا رہی ہے۔ میں بیٹے کا منہ آخری بار نہ دیکھ سکا، یہ افسوس ہے مجھے مگر میں نے اپنے فیصلے سے کئی اور کی زندگی بچائی یہ خوشی بھی ہے مجھے۔'' یہ کہتے ہوئے منگ ما کے لہجے کا وہ اٹل عزم میرے سامنے آیا جو شیر پا کا خاصہ ہے۔

ایورسٹ چوٹی کو سر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے 1990ء تک 115 کوہ پیما جاں لیوا حادثات کا شکار ہوئے اور مارے گئے۔ ان مرنے والوں میں سے 54 شیر پا تھے۔ جن میں سے ایک پاسنگ نیما بھی ہے۔

کھمبو کی سرحد کے اختتام پر گلیشیرز کا طویل سلسلہ واقع ہے۔ جہاں پر بودھ مت کے روایتی انداز میں پتھروں سے تعمیر کیے گئے متعدد معبد قطار کی صورت میں موجود ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے باہر سنگ کتبہ لگا ہوا ہے جس پر ایورسٹ مہم کے دوران مرنے والے شیر پا، مہم کا نام اور سالِ وفات درج ہے۔ یہ ایورسٹ کی راہ میں جان سے گزر جانے والے شیر پا کو یاد رکھنے اور انہیں خراجِ تحسین پیش کرنے کا منفرد طریقہ ہے۔

14 اپریل کو شیر پا ٹیم نے 26 ہزار فٹ کی بلندی پر اپنا دوسرا کیمپ قائم کر لیا۔ یہ بکھیلی چٹانوں اور ویران برف زار کی سرزمین ہے جہاں پر زندگی کے آثار صرف یہ مہم جو تھے یا وہ تند و تیز برفانی ہواؤں کے جھونکے، جن کی آواز دلوں کو دہلا دیتی تھی۔

یہاں سے نیچے نگاہ ڈالی تو بہت دور میدانوں میں وہ علاقہ نظر آ رہا تھا، جہاں میں ہفتوں پہلے گیا تھا۔ اس وقت میرے ساتھ دو نیپالی شیر پا بھی تھے۔

خانقاہ جس پہاڑی پر واقع ہے اس کے قدموں تلے واقع میدان کنیر کے سدا بہار پھول دار جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں اس خانقاہ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس خانقاہ کو تیانگ بوچے کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ خانقاہ شیر پا کے دینی عقائد میں نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ یہ خانقاہ ایک پہاڑی کے کنارے پر بنی ہوئی ہے جو دلکش اور سدا بہار جنگلی پھولوں کے سبب اس ویران برف زار میں نہایت ہی دلکش دکھائی دیتی ہے۔ اس خانقاہ کا نظارہ واقعی دل موہ لینے والا تھا۔

جب میں خانقاہ والی پہاڑی پر پہنچا تو نیچے پہاڑی کے کنارے کنارے وسیع میدان میں گڑے ہوئے بے شمار رنگ برنگ کے خیمے اوپر سے دیکھنے پر بہت ہی خوبصورت نظارہ پیش کر رہے تھے۔ یہ خیمے ان غیر ملکی کوہ نوردوں کے ہیں جو نیپال آتے ہی اس لیے ہیں کہ یہاں پہنچ کر ہمالیہ کی گھاٹیوں، وادیوں اور برفیلے میدانوں میں قدرت کی مصوری کے شہ پاروں کا نظارہ کر سکیں اور فطرت سے ہمکلام ہو سکیں۔

نیچے میدان میں سرخ لباس میں ملبوس درجنوں بودھ مت کے پیروکار گھوم رہے تھے۔ اندازہ کر سکتے ہیں کہ سفید برف زار میں رنگ برنگ کے خیمے اور سرخ لباس میں ملبوس وہاں گھومتے پھرتے ان بودھ راہبوں کو دور سے دیکھنے پر، نیچے میدان کا منظر کتنا دلکش دکھائی دیتا ہوگا۔

ہمالیہ کے برف زار میں واقع نخلستان میں نیچے جلنے والے چولہوں سے اٹھنے والا دھواں اور قریب میں پائن کے تازہ کٹے ہوئے درختوں سے آنے والی مہک نے ماحول میں عجیب سے خوشبو پھیلا دی تھی۔ پائن کے یہ درخت کسی نئی خانقاہ کی تعمیر یا پرانی خانقاہ کی مرمت کے لیے کاٹے گئے تھے۔ کیا شان ہے خدا کی۔ ہمالیہ کے اس سب سے بلند علاقے میں، جہاں برف اور گلیشیرز کے سوا کچھ نہیں، وہاں ہرا بھرا نخلستان موجود ہے۔

یہاں ایک مکان میں مقامی لاما کی رہائش ہے۔ میں نے ان کے گھر میں جا کر ان سے ملاقات کی۔ ملاقات کے وقت میں نے دوپٹے کی طرز کے ایک سوتی مفلر اور تین سو روپے بطور عطیہ برائے خانقاہ انہیں پیش کیے۔ انہوں نے پیسے تو الگ پھینک دیے اور وہ دوپٹہ میرے گلے میں مفلر کی طرح لپیٹ کر دعا دی۔ یہ بودھ مت کے پیشواؤں کا دعائیں دینے کا ہزاروں سال پرانا طریقہ ہے۔ ایک دلچسپ بات بتاتا چلوں کہ مغرب سے آنے والے تیز رفتار دنیا کے تھکے ذہنوں کے باسی کوہ نورد جب یہاں فطرت کی آغوش میں پہنچتے ہیں تو وہ ان تارک الدنیا راہبوں سے دعائیں لینے کے لیے ان کے پاس ضرور پہنچتے ہیں اور یہ راہب بھی خوشی خوشی انہیں گلے لگا کر خشوع و خضوع کے ساتھ انہیں من کی شانتی مل جانے کی دعا دیتے ہیں۔

خانقاہ کے عقب میں پتھروں کو اوپر تلے جوڑ کر ایک ثقافتی مرکز بنایا گیا ہے۔ یہ شیر پا کی تاریخ کو دیکھنے کے لیے بہت عمدہ جگہ ہے۔ یہاں قدیم انداز میں تحریر کردہ شیر پا کی تاریخ موجود ہے۔ ان کے قدیم روایتی ملبوسات، عورتوں کے زیورات، اور دوسرے فنون پر مشتمل فن پارے موجود ہیں۔ جنہیں دیکھ کر شیر پا کی تاریخ پڑھے بغیر ہی سمجھ میں آنے

لگتی ہے۔

''جب سے یہاں کوہ پیماؤں اور کوہ نوردوں نے آنا شروع کیا ہے۔ تب سے بہت کچھ ضائع ہو چکا ہے۔'' ہیلڈا نامیرے ساتھ ہی اس پہاڑی ثقافتی مرکز میں موجود تھے۔ انہوں نے نوادرات میں میری دلچسپی کو دیکھ کر بتانا شروع کیا۔ ''پھر بھی یہاں اتنا کچھ موجود ہے۔ جس کے ذریعے ہم اپنی نئی نسل کو بتا سکتے ہیں کہ صدیوں پہلے ان کے اجداد کی ثقافت، ہنرمندی اور رسم و روایات کیسی شاندار تھی۔ یہ مرکز، ہماری نئی نسل اور باہر کی دنیا والوں کے لیے شیر پا کے اجداد اور ان کی تاریخ و ثقافت کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔'' اپنی بات ختم کر کے انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

''بالکل بجا ارشاد فرمایا آپ نے۔'' میں نے بھی تو سمجھی نگاہوں سے ان کی بات کی تصدیق کی۔ ''موت ایک انسان کا وجود معدوم کرتی ہے اور ثقافت کی موت پورے کے پورے نسلی گروہ کو مٹا ڈالتی ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔''

شیر پا لوگوں کا عقیدہ ہے کہ زندگی کے بعد موت اور، موت کے بعد پھر زندگی ہے۔ آواگون کا یہ عقیدہ ہندومت میں بھی موجود ہے جس کے تحت زندگی اور موت کی یہ آنکھ مچولی نہ ختم ہونے والا ایک سلسلہ ہے۔ یہ اُس وقت تک باقی رہے گا جب تک دنیا کا وجود باقی ہے۔

''ہم لوگ ہمیشہ سے بودھ مت کے پیروکار رہے ہیں۔'' خانقاہ سے باہر نکلنے پر میرے ساتھ یہاں تک آنے والے شیر پا رم پوچے نے کہا۔ وہ میرے کے ساتھ بطور قلی کام کر رہا تھا۔ ''ہمارے ہاں پہلے یہ رواج تھا کہ خوشحال والدین اپنے دوسرے بیٹے کو بودھ خانقاہ کو دے دیا کرتے تھے لیکن اب یہ رواج بہت کمزور پڑ گیا ہے۔ اب اکثر والدین اپنی اولاد کو خانقاہ کو دینے سے کترانے لگے ہیں۔''

''تو کیا شیر پا کا عقیدہ کمزور پڑ رہا ہے؟'' میں نے رم پوچے سے پوچھا۔

''نہیں..... غربت اور اولاد سے محبت بڑھ گئی ہے۔'' کہتے ہیں کہ کان اِدھر سے پکڑو یا اُدھر سے۔ بات ایک ہی ہے۔ رم پوچے بھی یہی کہہ رہا تھا۔

تیانگ بوچے کی اس خانقاہ میں صرف دو درجن بودھ بھکشو تھے۔ ان ہی میں سے ایک بائیس سالہ نوجوان نوان تین زنگ ہے۔ یہ شیر پا مہم جو ٹیم کے سب سے عمر رسیدہ رکن گیال زن شیر پا کا بیٹا ہے۔

''یہاں بہت کم نئے بھکشو آتے ہیں۔'' میرے ساتھی شیر پا نے بتایا۔ ''اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر تو لڑکیوں کی محبت میں مبتلا ہو کر دنیاوی زندگی کو ترجیح دینے لگے۔ جب کہ بہت سارے ایسے ہیں جو بطور بھکشو اپنے کاندھوں پر عائد ذمے داریوں کو نبھانے سے کترانے لگے ہیں۔''

''خانقاہوں میں آنے والے نئے بودھ بھکشو کی دو تہائی تعداد تعلیم مکمل ہونے سے پہلے ہی بھاگ جاتی ہے۔'' رم پوچے کا بھائی پاسنگ تھنہ دکھی نہیں موجود تھا۔ مجھے بتانے لگا۔

''یہاں سے بھاگنے والے زیادہ تر بھکشو مالی آسائش کے چکر میں نکلتے ہیں۔ جب مالی حالات اچھے ہوں تو خوبصورت لڑکی بھی مل ہی جاتی ہے آسانی سے۔'' پاسنگ نے مسکرا کر کہا۔

''دو جوان بھکشوؤں میں یہ رجحان کب سے دیکھنے میں آ رہا ہے؟'' میں نے پاسنگ سے سوال کیا۔

''جب سے آسودہ حال مغربی سیاحوں کی بہت بڑی تعداد یہاں آنے لگی ہے۔'' اس نے ایک لمحہ دیر کیے بنا جواب دیا۔ پاسنگ جو کہہ رہا تھا وہ ٹھیک ہی ہوگا۔ یہ خود بھی سولہ برس تک بھکشو کی زندگی گزارتا رہا اور ایک دن سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نیچے وادی میں اُتر گیا۔

''میں اپنی پسند کی عورت سے شادی اور کاروبار کر کے آسودہ زندگی بسر کرنے کے لیے خانقاہ چھوڑ گیا تھا۔'' پاسنگ نے اعتراف کیا۔

آج پاسنگ نیچے وادی میں ایک لاج کا مالک ہے۔ ایک خوبصورت عورت اس کی بیوی اور دو بچے ہیں۔ ''خوشحال زندگی ہی بسر کر رہا ہوگا ورنہ دوبارہ بھکشو نہ بن جاتا۔'' میں یہ سوچ کر دل ہی دل میں مسکرا دیا۔

اپریل کی بیس تاریخ کو شیر پا کی ٹیم نے پہلی مرتبہ ایورسٹ کی جنوبی سمت سے اس پر چڑھنے کی کوشش کی۔ یہ 26 ہزار 300 فٹ کی بلندی تھی۔ سب سے پہلے لوپ سنگ یہاں تک پہنچا۔ اس کے پیچھے پیچھے سونم، ناشی اور تیمبا بھی برفانی ہوا کا سینہ چیرتے ہوئے بادلوں کی اوٹ سے نکل کر یہاں تک پہنچ گئے تھے۔ امریکی طرز کے اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے سبب انگ تیمبا کا چیزوں کو دیکھنے اور اپنی رائے قائم کرنے کا نظریہ بدل چکا تھا۔ اُس وقت جب ہم ایورسٹ کی چوٹی کے بہت ہی قریب تھے، اس نے مجھ سے کہا ''شیر پا کا عقیدہ ہے کہ چانگ (ایورسٹ) کی چوٹی پر دیوتا رہتا ہے اور چوٹی سے ذرا نیچے برفانی انسان ہیں۔ میں اُن سے ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ جب تک اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں۔ تب تک یہ بات نہیں مان سکتا۔ میں اب چوٹی سے کچھ ہی دور ہوں۔ وہ تو بعد میں پتا چل ہی جائے گا کہ ہمارا دیوتا

وہاں ہے یا نہیں مگر مجھے تو اس جگہ کوئی برفانی انسان نظر نہیں آیا۔ یہاں تو چھوڑو۔ نیچے بھی کہیں نہیں دکھائی دیا۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش ہوا۔ اپنی سانس درست کی۔ آکسیجن ماسک کو ٹھیک کیا اور کہنے لگا ''چھوڑو یار..... وہ سب کہتے ہیں۔''

ایورسٹ کی اس بلندی سے بہت نیچے شیر پا کی بستیوں میں ہر سال موسم بہار کے آغاز پر روایتی دعائیہ میلہ منایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ میلہ بودھ مت کے ماننے والے ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ ہوا، تب سے مناتے چلے آ رہے ہیں۔ اس رسم کا آغاز تبت سے ہوا تھا، جسے شیر پا نے نیپال میں بھی زندہ رکھا ہوا ہے۔ اس میلے میں وہ اُن نادیدہ شیطانوں کے شر سے بچنے کی دعا کرتے ہیں جو انہیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ان لوگوں کا ماننا ہے اس دعا کے باعث ان کا پورا سال خیر و برکت سے گزرتا ہے۔

جب میں نیچے پہنچا تھا تو وہ موسم بہار کا آغاز تھا۔ اُن دنوں میں اور میرا مترجم نیچے سے پچیس کلومیٹر دور سولو قمبے پہنچے تھے جہاں اس دن یہ میلہ سجنے والا تھا۔ میں اس ثقافتی تقریب کو دیکھنے کا شدت سے خواہشمند تھا اور میری یہ خواہش جلد پوری ہونے والی تھی۔

سولو سے مزید ایک دن کی پیدل مسافت پر وہ خانقاہ واقع تھی جہاں یہ رنگا رنگ میلہ سجنے والا تھا۔ پانچ روز تک جاری رہنے والے اس تہوار کو شیر پا کی زبان میں 'دوچی' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

اس تہوار کی پہلی رات سب سے پہلے نانک رچایا گیا۔ اس نانک میں ایک شخص شرابی کا بہروپ دھار کر ایک طوائف کے پاس پہنچتا ہے۔ اس نانک کا مقصد دنیاوی برائیوں کو پیش کرنا ہے۔

نانک کے اس منظر کے بعد ایک بھکشو دیوتا کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ اس کے گلے میں زرد اور سرخ پھولوں کی مالا ڈلی ہوئی تھی۔ وہ یاک پر سوار تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں یاک کے مکھن سے جلنے والا چراغ اور دوسرے میں یاک کے سینگ سے بنا ہوا سنکھ تھا۔ یہ بھکشو دیوتا تماش بینوں کے سامنے پہنچ کر کہتا ہے!

''اچھائی دنیا کی تاریکی کو اس طرح دور کر دیتی ہے جیسے اس چراغ کی روشنی، اور برائی دنیا کی روشنی کو تاریکی میں اس طرح بدل ڈالتی ہے جیسے یہ شرابی مرد اور گناہگار عورت۔'' یہ درس دینے کے بعد 'دیوتا' نے سنکھ اٹھایا اور منہ سے لگا کر پھیپھڑوں کی پوری قوت سے پھونک ماری۔ اس کے بعد کافی دیر تک پہاڑوں سے اس کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔ آدھی رات تک اسی طرح کے ناٹک رچے جاتے رہے۔ عورتیں گیت گاتی رہیں، نوجوان ناچتے رہے اور سیکڑوں برس پرانی اس خانقاہ کے باہر خوانچہ فروش کم عمر دکاندار اس مذہبی رسومات میں استعمال ہونے والی اشیا لالٹینوں کی روشنی میں بیچتے رہے۔

نصف شب کے وقت لوگ واپس چلے گئے۔ جو نہیں جاسکتے تھے، انہیں وہیں زائرین کے لیے بنے کمروں میں سونے کی جگہ مل گئی۔

اگلی صبح میں اٹھا۔ ناشتے سے فراغت کے بعد میں سامنے والی پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ میں پہاڑی کی دوسری طرف بنی ایک اور قدیم خانقاہ میں رہنے والے مقامی لاما انگ دورجی سے ملنے کے لیے جا رہا تھا۔ انگ دورجی ایک کاشتکار اور سابق سپاہ سالار ہیں۔ اس برس یہاں دوچی تہوار پر اٹھنے والے سارے مصارف انہوں نے ادا کیے ہیں۔

''میری خواہش ہے کہ میرے مرنے کے بعد میرا بیٹا اس تہوار کے اخراجات برداشت کرے۔ اگر، بالفرض محال وہ جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتا ہے تو پھر میں سمجھوں گا کہ اس نے اپنا مذہبی عقیدہ فروخت کر دیا ہے۔'' لاما نے بات چیت کے دوران دوچی تہوار منانے کے حوالے سے ایک سوال کا نہایت جذباتی انداز میں جواب دیا۔

لاما کے بیٹے جے پی لاما کی عمر سینتیس برس ہے اور وہ کھٹمنڈو میں ایک ٹریکنگ کمپنی چلاتا ہے۔ شاذ و نادر ہی وہ اپنے اس آبائی گاؤں کا رُخ کرتا ہے۔ لاما سے ملاقات کے بہت دنوں بعد میری جے پی لاما سے ملاقات ہوگئی۔ جب میں نے اُس کے باپ کی بات کو دہرایا تو وہ کہنے لگا۔

''بالکل..... میں دوچی کے انعقاد کے لیے پیسا دوں گا۔ میں اپنے باپ کی بات سے کبھی بھی روگردانی نہیں کر سکتا۔''

یہ کہہ کر وہ خاموش رہا اور کچھ دیر تک چھت کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ پھر اٹکتے ہوئے گویا ہوا۔ ''ویسے اس تہوار کو منانے کا حقیقی مطلب کیا ہے؟ یہ بات مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکی لیکن باپ کا حکم ہے۔ ہماری روایت ہے۔ اس لیے دوچی کو منانے کے لیے پیسا تو مجھے دینا ہی پڑے گا۔''

جے پی لاما تنہا نہیں۔ اس کی طرح کے سیکڑوں، ہزاروں بودھ نوجوان ایسے ہیں جو اپنی تہذیبی روایات اور رسم و رواج کو بالکل نئے انداز سے دیکھنے لگے ہیں۔ اس میں سب سے بڑا دخل تعلیم کا ہے جس نے چیزوں کو پرکھنے، سمجھنے

اور برتنے کا قرینہ بدل دیا ہے۔

لاما لانگ دورجی کے چار بیٹے ہیں۔ ان میں سے صرف ایک بینا گاؤں میں اپنے والد کے ساتھ رہتا ہے اور انہی کی طرح زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ بی جے لاما کھٹمنڈو میں کاروبار چلا رہا ہے اور دو بیٹے کیلیفورنیا کے ایک کالج میں پڑھتے ہیں۔ ایسے میں یہاں صدیوں قدیم عقائد اور رسم و رواج میں تبدیلی کی شرح کیا ہے؟ اس کا جواب دورجی کے چار بیٹوں کے تناسب سے لگائیں۔ جواب مل جائے گا۔

بودھ باشندے نیپال کی کل آبادی کا صرف دس فیصد ہیں۔ انہیں اپنے رسم و رواج کے تحفظ کے لیے جہاں اندرونی مزاحمت کا سامنا ہے، وہیں بیرونی خطرات بھی ہیں۔ شیرپا کی تہذیب و ثقافت کو درپیش خطرات مغرب کی دولت اور وہاں کے آسودہ حال سیاحوں سے بھی زیادہ، نیپال کی ہندو اکثریت کی طرف سے لاحق ہیں۔

''ہمیں ڈر ہے کہ کہیں ہماری آنے والی نسلیں ہندومت کی ثقافتی رنگینی میں نہ کھو جائیں۔'' دورجی جب مجھ سے یہ بات کہہ رہے تھے تو ان کا لہجہ گلی میں کھڑے، سہمے ہوئے اس بچے جیسا تھا جس کے ہاتھ میں کھلونا ہو اور وہ ڈر رہا ہو کہیں کوئی دوسرا بچہ اس کے ہاتھوں سے اُسے جھپٹ نہ لے۔

یہ بات تو ہوئی دورجی کی جنہیں اپنی تہذیب سے خطرہ ہے لیکن نیپالی ہندو، جن کی اکثریت سرکاری مشینری پر حاوی اور پالیسی سازی و فیصلہ سازی کے زمرے میں آتی ہے، وہ کیا کہتے ہیں؟ یہ جاننے کے لیے رام بجے پال سے میں نے ملاقات کی جو صحافی ہیں۔

''شیرپا کی زندگی دقیانوسی خطوط پر استوار ہے۔ آج کی زندگی تیز رفتار ہے۔ اس کے اپنے تقاضے ہیں جو ان تقاضوں کو سمجھتے ہوئے وقت کا ساتھ دیتے ہوئے خود کو بدل ڈالے گا، وہی ترقی کرے گا۔ ورنہ یہ دقیانوسی لوگ..... مجھے تو خطرہ ہے کہ ان کے فرسودہ عقائد اور توہمات بھری زندگی ہی انہیں لے ڈوبے گی۔''

کھمبو میں صرف تین ہزار شیرپا رہتے ہیں۔ کوہ پیمائی کرنے والے شیرپا زیادہ تر کھمبو خطے کے مضافات سے تعلق رکھتے ہیں۔ شیرپا کی کوہ پیمائی ٹیم کے ارکان میں سے صرف دو ارکان ایسے تھے جن کا تعلق کھمبو کے علاقے سولو سے تھا۔ ان میں سے ایک انگ رن زنگ ہے۔ یہ عام طور پر سال کا نصف حصہ اپنے گاؤں تاپ تینگ سے دور پہاڑوں پر گزارتا ہے۔

''میری کوہ پیمائی سولو علاقے کے باشندوں کے لیے قابلِ فخر ہے۔ ان کے لیے یہ اعزاز کی بات ہے کہ ان کے علاقے میں وہ کوہ پیما رہتا ہے جو ایورسٹ پر چڑھ چکا ہے۔'' انگ رن زنگ نے فخر سے کہا۔ میں اس شیرپا کے ساتھ اس کے گھر جا رہا تھا۔

ہم جب اس کے گھر پہنچے تو اس کی بائیس سالہ بیوی انگ چوپکا نے خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا۔ اس نے آتشدان کے سامنے ہمارے لیے کرسی لگائی۔ کہتے ہیں کہ شیرپا لوگوں میں مہمان کو کرسی پر آتشدان کے سامنے بٹھانا اس کی انتہائی عزت افزائی کے مترادف ہے۔ کچھ ہی دیر میں وہ ہمارے لیے تھرمس چائے بنا لائی۔ یہ چائے کی پتی، نمک اور یاک کے مکھن کا ملغوبہ ہوتی ہے۔ گاڑھی نمکین اور گرم۔ اس نے اپنی روایت کے مطابق تین بار ہمارے خالی کپ بھرے اور ہر بار یہی کہتی رہی 'شے شے'۔ شیرپا کی زبان میں اس کا مطلب وہی ہے جو اگر بڑی زبان کے لفظ 'پلیز پلیز' کا ہے۔

میری آمد کا سن کر تھوڑی دیر میں ہی گاؤں کی دو اور عورتیں بھی یہاں پہنچ گئیں۔ ان میں سے ایک پچی تھیں۔ یہ کوہ پیما شیرپا نینا گیال زن کی ماں ہیں۔ یہ اس وقت شیرپا کی ایورسٹ مہم میں بطور مددگار شریک تھا۔

''جب گھر کے مرد پہاڑوں پر کوہ پیمائی کے لیے چلے جاتے ہیں تو پھر پیچھے رہ جانے والی یہ عورتیں مسائل کا سامنا کیسے کرتی ہیں؟'' میں نے ایک کھلا سوال کیا۔

''اُس وقت کسی گھر میں میت ہو جائے تو کوئی لاش اٹھانے والا بھی نہیں ہوتا۔'' پچی نے کھٹ سے جواب دے دیا۔

''تو پھر کیا کرتی ہیں آپ عورتیں ایسے حالات میں؟''

''کیا کر سکتے ہیں بھیا..... بیٹھ جاتے ہیں گھر کے سامنے لاش رکھ کر دھوپ تاپنے کے لیے۔'' پچی نے عجیب سے لہجے میں جواب دیا۔

تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر اچانک انہوں نے ہمیں ایک مشروب پلانے کی پیشکش کر دی۔ میں نے فوراً یہ پیشکش قبول بھی کر لی۔ یہ مشروب چاول سے کشید کردہ شراب ہے، جسے شیرپا عورتیں تیار کرتی ہیں۔ اسے مقامی زبان میں 'راکشی' کہتے ہیں۔

''بہت عمدہ ہے۔'' میں نے راکشی سے بھرا ہوا بڑا سا گلاس اپنے حلق میں اُنڈیل کر کہا۔ ''شکریہ..... راکشی پلانے کا۔''

''جب ہمارے مرد پہاڑوں سے اُتر کر گھروں کو لوٹ آتے ہیں۔ تو سارا دن گھر پر پڑے پڑے یہی پیتے رہتے ہیں۔'' پچی نے میرے تشکر کے جواب میں راکشی کے مزید

استعمال سے آگاہ کیا۔

''اور وہ بیچارے کریں بھی تو کیا۔ گرمیوں کے بعد کام تو ہوتا نہیں ہے۔ اس اکیلے پن میں انہیں راکشی کا ہی سہارا مل جاتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے دو گلاس اور کمرے کے چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''بھئی لوگ تو ٹھیک ٹھاک ہیں۔ کیوں نا ڈانس کر لیں؟''

خاصی رنگینی تھی بڑی بی کے مزاج میں۔

''کوہ نوردی اور کوہ پیمائی کے لیے ہر سال بڑی تعداد میں مغربی عورتیں بھی یہاں آتی ہیں اور ہمارے مردان کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ ایسے میں بعض ان کے درمیان جسمانی تعلقات قائم ہو جاتے ہوں گے لیکن شیرپا مردوں کی طرح ہم شیرپا عورتیں اس طرح کے تعلقات قائم کرنے میں آزاد نہیں۔ وہ تو مرد ہیں یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔'' پچی کی بہو پریم کلی نے میرے ایک سوال کے جواب میں کہنا شروع کیا۔

''شوہر کی مہینوں دوری کی وجہ سے اتفاقاً اگر ایک شادی شدہ شیرپا عورت کسی پرائے مرد سے جسمانی تعلقات قائم کر بیٹھے اور یہ بات شوہر کے علم میں آ جائے تو وہ اسے گھر سے نکال دیتا ہے۔ ایسی عورت کو تو آس پڑوس والے بھی طوائف کہہ کر پکارنے لگتے ہیں۔'' پریم کلی نے تفصیل سے شیرپا عورت کو درپیش صورتِ حال بتائی۔

پریم کلی ناخواندہ ہے لیکن اس کی بیٹی پڑھ رہی ہے 'ایڈمنڈ ہلیری ٹرسٹ' کے قائم کردہ اسکول میں۔

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں جب ایڈمنڈ ہلیری اور تن زنگ نارگے نے انسانی تاریخ میں پہلی بار ایورسٹ کی چوٹی پر قدم رکھا تھا۔ اس وقت تک یہاں شیرپا بچوں کے لیے کوئی اسکول موجود نہیں تھا۔ 1961ء میں ایڈمنڈ ہلیری نے شیرپا بچوں کی تعلیم کے لیے نچے کے شمال میں واقع گاؤں خم جنگ میں پہلا اسکول قائم کیا۔ اس اسکول میں داخل ہونے والے پہلے دس بچوں نے غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ بعد میں کوئی اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت گیا تو کسی نے کاروبار شروع کر دیا اور کوئی طالب علم مقامی سیاست میں حصہ لیتے ہوئے علاقے کی ترقی کے لیے سرگرم ہو گیا۔

اس پہلے اسکول کے قیام کے بعد شیرپا بچوں کے لیے مزید اسکول کھولے گئے۔ بعد کے برسوں میں ایڈمنڈ ہلیری نے کھمبو کے مختلف علاقوں میں 25 اسکول کھولے۔ جنہیں چلانے کے لیے غیر منافع بخش ادارہ 'ہلیری ہمالین ٹرسٹ' کے نام سے قائم کیا گیا۔ اس ٹرسٹ کے تحت لائق شیرپا بچوں کو نہ صرف وظائف دیے جاتے ہیں بلکہ انہیں کھٹمنڈو جا کر کالج میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے مالی امداد بھی دی جاتی ہے۔

آج ایڈمنڈ ہلیری کے قائم کردہ اسکول اور ٹرسٹ کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے والے چار شیرپا طالب علم نیپال کی قومی ائیر لائنز میں پائلٹ ہیں اور تین ڈاکٹر ہیں۔

ایڈمنڈ ہلیری کے قائم کردہ ٹرسٹ نے صرف تعلیم کے فروغ میں ہی نمایاں کردار ادا نہیں کیا بلکہ علاقے کے قدرتی ماحول کے تحفظ کی کوششوں میں شامل رہے۔ 1976ء میں شیرپا کی وادی کھمبو کے انتہائی سرے پر 'ساگر متھا نیشنل پارک' قائم کیا گیا۔ جس کے قیام میں ہمالین ٹرسٹ سب سے زیادہ سرگرم رہا۔

تعلیم نے شیرپا باشندوں کی زندگی یکسر تبدیل کر دی ہے۔ تجارت، سیاست، ملازمت..... تعلیم کی بدولت ترقی کے لیے ہر شعبے کے دروازے ان پر کھل چکے ہیں۔ ایڈمنڈ ہلیری کے اسکولز نے شیرپا کی ایک پوری نسل کو تبدیل کر دیا ہے۔ اُس وقت کھٹمنڈو میں ایک سو ٹریکنگ کمپنیاں کام کر رہی ہیں۔ جن میں سے 21 کے مالک وہ شیرپا ہیں جو ایڈمنڈ کے قائم کردہ اسکولوں سے تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔

''تعلیم کے فروغ نے شیرپا کی زندگی پر کیا اثر ڈالا ہے؟'' میں نے یہ سوال شیرپا کوہ پیما ٹیم میں شامل سب سے عمر رسیدہ رکن گیال زن سے کیا۔

'میری زندگی پر اس بات کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ وہ اس لیے کہ میں تعلیم یافتہ نہیں ہوں۔ تعلیم ہی زندگی میں تبدیلی لاتی ہے جو بدقسمتی سے میرے پاس نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں تعلیم سے محروم رہنے کا افسوس صاف دیکھا جا سکتا تھا۔

☆☆☆

میں کوہ پیما نہیں ہوں۔ اس لیے بہت زیادہ بلندی پر نہیں جا سکتا تھا۔ جب مجھے محسوس ہوا کہ آگے کا سفر میرے بس کی بات نہیں تو مجھے واپس بھیج دیا گیا۔ اب میرا وقت زیادہ تر کوہ نوردی کرتے اور شیرپا لوگوں سے ملتے جلتے میں گزرتا تھا۔

گو کہ دنیا کے کئی ملکوں میں یہ موسمِ گرما کے عروج کے دن تھے لیکن کھمبو کے سرد ترین خطے میں موسمِ گرما ختم ہونے والا تھا۔ کوہ پیماؤں کی زیادہ تر ٹیمیں پہاڑوں سے لوٹ آئی تھیں۔ ان کے ساتھ گئے ہوئے شیرپا واپس آ کر اپنے گھروں میں لیٹ کر سارا دن راکشی پینے میں بتانے لگے تھے۔ کھمبو اور سولو کے شیرپا کو اُن دنوں بس ایک انتظار تھا اور

وہ بھی شدت کا کہ کب اُن کے مہم جو شیر پا ایک بار پھر ایورسٹ کی قدم بوسی کر کے واپس پلٹتے ہیں۔

موسم کے جس حصے کی بات ہے، اسے شیر پا بُرا موسم کہتے ہیں۔ شیر پا لوگوں کا کہنا ہے کہ اس موسم میں ایورسٹ پر چڑھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے سب لوگ فکر مند تھے کہ ان کے مہم جو ابھی تک کیوں نہیں لوٹے؟

نمچے کی رونقیں بھی اُداس دنوں اور سنسان شاموں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ لاجز، گیسٹ ہاؤس اور ہوٹلوں کے زیادہ تر غیر ملکی مہمان واپس جا چکے تھے۔ ان دنوں سولو اور کھمبو کے دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی شیر پا مہم جوؤں کے کامیاب لوٹ آنے کے انتظار میں دن گزار رہا تھا۔

دن کو میں اپنے مترجم اور گائیڈ کو ساتھ لے کر شیر پا لوگوں سے ملنے کے لیے نکل جاتا تھا۔ اُس دن میں سطحِ زمین سے اٹھارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک پہاڑی پر کھڑا ہوا تھا۔ اس جگہ کا نام 'گوکیو' ہے۔ یہ علاقہ نیپال اور تبت کے درمیان سرحدی علاقہ ہے۔ نظروں کے سامنے دور پار جو سرزمین تھی وہ دیو مالائی سرزمینِ تبت تھی جس پر ایستادہ سفید پوش پہاڑ نہایت ہی سحر انگیز لگ رہے تھے۔ وہ سارا دن انہی پہاڑوں کے سحر میں کھویا رہا۔

سہ پہر ڈھلے جب میں نمچے واپس پہنچا تو راہ میں ہی اطلاع مل گئی کہ شیر پا کوہ پیما آج دن کے دو بج کر تیس منٹ پر چوٹی کے انتہائی نزدیک ترین پہنچ چکے ہیں۔ بس اب ایک آخری کوشش ہوگی اور مشن مکمل..... یہ اطلاع ریڈیو کے ذریعے بیس کیمپ اور پھر وہاں سے پیغام رساں کے ذریعے برق رفتاری سے سفر کرتی ہوئی نمچے تک پہنچی تھی۔

دوسرے دن صبح کے نو بج رہے تھے جب بیس کیمپ کو ریڈیو پیغام ملا۔

''ہم چوٹی پر پہنچ گئے۔''

یہ اطلاع جیسے جیسے سولو اور کھمبو میں پھیلتی گئی۔ شیر پا لوگوں کے چہرے خوشی سے تمتماتے چلے گئے۔

ایورسٹ کی چوٹی پر سب سے پہلے سونم دندو نے قدم رکھا۔ اس کے بعد انگ تمبا پہنچا۔ جس کے بعد ان کا معاون اپا شیر پا پہنچ گیا۔ آخر میں شیر پا مہم کے لیے چندہ جمع کرنے والے امریکی کوہ پیما پیٹر ایتھنز نے ایورسٹ پر قدم رکھا۔

ویسے تو کئی بار شیر پا کے قدم اس چوٹی پر پڑے لیکن شیر پا کی تاریخ کا یہ پہلا موقع تھا کہ مکمل طور پر شیر پا باشندوں پر مشتمل ٹیم کے کوہ پیماؤں نے ایورسٹ پر شیر پا کا روایتی سرخ پرچم لہرایا تھا۔ شیر پا اپنے مقدس ترین پہاڑ پر اپنا اعزاز کندہ کر چکے تھے۔

مشن کی تکمیل کے بعد مہم جوؤں نے واپسی کا سفر شروع کیا اور نو دن کے بعد وہ نیچے پہنچ گئے۔ وہ دن کھمبو کے شیر پاؤں کے لیے بہت ہی پُر مسرت دن تھا۔ شیر پا ایورسٹ مہم کی کامیابی اور فاتح ایورسٹ مہم جوؤں کے استقبال کے لیے لوگوں کا جمِ غفیر موجود تھا۔

کئی ہفتوں کے بعد ایک دوسرے سے ہم سب نے کھم جنگ میں..... عین ایورسٹ کی ڈھلوانوں تلے واقع گاؤں میں۔

اس رات کھم جنگ میں میلے کا سماں تھا۔ ہم سب نے خوشی سے لبریز جذبات کے ساتھ چاندنی رات میں فتح کا جشن منایا۔ رقص کیا گیا، شیر پا کے لوک گیت گائے گئے۔ خوب ہلا گلا رہا نصف شب تک..... گاؤں کا ہر باشندہ شیر پا کی اس فتح کے جشن میں دل کی گہرائیوں کے ساتھ شریک تھا۔

اگلی صبح ناشتے وغیرہ سے فراغت کے بعد سارے شیر پا لاج کے باہر میدان میں جمع ہوئے۔ ہماری نگاہوں کے عین سامنے بادلوں میں لپٹی ہوئی ہمالیہ کی دُلہن..... ایورسٹ کی چوٹی..... موجود تھی۔

اس وقت ہم سب جذباتی ہو رہے تھے۔ یہ وداعی کا وقت تھا۔ اب سب کو ایک دوسرے کو خدا حافظ کہتے ہوئے، اپنے اپنے راستوں پر ہو لینا تھا۔ سب کی منزل اپنا گاؤں اور اپنا گھر تھا۔ شیر پا کا بھی اور ہمارا بھی۔

آخر مہم میں شریک سارے شیر پا ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے اپنی اپنی راہ پر لوٹ گئے۔ میں وہیں کھڑا رہا ایورسٹ کی چوٹی تلے ہمالیہ کی ترائی میں واقع اس گھاٹی کی سرزمین پر۔

جدائی کے اُس لمحے میں، میں سوچ رہا تھا کہ جو لوگ اپنی ثقافت اور رسم و رواج کے تحفظ کے لیے دنیا کی سب سے بلند اور دشوار گزار چوٹی پر پہنچ کر اپنا جھنڈا گاڑ سکتے ہیں۔ ایسے باہمت، پُرعزم اور جفاکش لوگوں کی تہذیب و ثقافت کو زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کیسے شکست دے سکتے ہیں۔

''کیا سوچ رہے ہو۔ بس اب چلو۔'' اچانک کسی نے میرا شانہ پکڑ کر ہلایا۔ یہ پیٹر ایتھنز تھا۔ کھم جنگ کی گھاٹی میں ہم دونوں تنہا رہ گئے تھے۔ اب ہمیں بھی ہزاروں میل دور اپنے اپنے گھروں کو لوٹ کر جانا تھا۔

''چلو۔'' میں نے آخری نظر ایورسٹ پر ڈالی اور واپس جانے والے راستے پر چل دیا۔

مسجد وزیر خان

زلفی شاہ

یہ مسجد صرف عبادت گاہ ہی نہیں، تاریخی ورثے کا درجہ رکھتی ہے۔ اس نے کتنے ہی عروج و زوال دیکھے ہیں۔ خود میں تاریخ کدہ بھی ہے جس کے ہر گوشے پر حوادثِ زمانہ کی مہر ثبت ہے۔

شہر لاہور کی اس مسجد کا تذکرہ جو شہر کی پہچان بن گئی ہے

مغل فرماں روا ہندوستان کے باسی یا باشندے نہیں تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے اس سرزمین سے محبت و چاہت کی ایسی داستانیں رقم کیں جو تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ رخشندہ و تابندہ رہیں گی۔ یہ داستانیں پشاور سے بنگال اور دہلی سے راس کماری تک پھیلی ہوئی ہیں۔ مغل فرماں رواؤں کی ہندوستان سے محبت کہیں باغات کی صورت نظر آتی ہے تو کہیں وسیع و عریض قلعوں کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ کہیں مساجد ہیں تو کہیں مقابر ہیں جبکہ کہیں محلات ہیں تو کہیں پورے کے پورے شہر مغلوں کی ہندوستان سے دلچسپی اور محبت کے افسانے سناتے نظر آتے ہیں۔

یوں تو مغل سلسلے کے تمام بادشاہوں نے ہندوستان کے سینے کو اپنے اپنے ذوق کے مطابق سجایا لیکن پہلے چھ مغل فرماں رواؤں شہنشاہ ظہیر الدین محمد بابر، شہنشاہ نصیر الدین

محمد ہمایوں، شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر، شہنشاہ نورالدین محمد جہانگیر، شہنشاہ ابومظفر شہاب الدین محمد شاہجہاں اور شہنشاہ ابوظفر اورنگ زیب عالمگیر نے ایسی تعمیرات کرائیں جو آج بھی ہندوستان کا تاج کہلاتی ہیں۔ شاہ جہاں نے تو ''تاج محل'' کی صورت ایک ایسی یادگار چھوڑی جو اس وقت دنیا کے عجائبات میں شامل ہے۔

مغل شہنشاہوں کی ایک خاص بات یہ تھی کہ انہوں نے کسی علاقے یا خطے کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کیا۔ ہاں وہ شہر ان کی توجہ کا زیادہ مرکز رہے جہاں ان کی آمد و رفت یا رہائش تواتر کے ساتھ رہی۔ لاہور کا شمار بھی ان خوش قسمت شہروں میں ہوتا ہے جو ہر مغل بادشاہ کی نظرِ التفات کا مرکز رہا۔ یہاں درجنوں عمارتیں ایسی ہیں جو آج بھی اپنے معماروں کی صناعی اور محنت شاقہ کا واضح ثبوت ہیں۔

لاہور میں ایک عمارت ایسی ہے جسے مورخین ''لاہور کے حسین رخسار کا تل'' قرار دیتے ہیں۔ یہ مسجد وزیر خان ہے جو اپنے تعمیراتی حسن، بیرونی و اندرونی تزئین و آرائش اور رنگوں کے خوبصورت استعمال کی وجہ سے عالمی شہرت کی حامل ہے۔

مسجد وزیر خان ویسے تو لاہور کے پرانے شہر یعنی ''اندرونِ شہر'' میں دہلی دروازے کے قریب واقع ہے لیکن یہ قدیم لاہور کے کم و بیش ہر حصے سے دکھائی دیتی ہے۔ پرانا لاہور میں بارونق اور کھچا کھچ بھرے رنگ محل بازار میں ذرا سا آگے بڑھیں تو بازار کا ختم ہوتے ہی آپ کو ایک مسجد کے مینار نظر آنا شروع ہو جائیں گے۔ یہی مسجد وزیر خان ہے۔ ان میناروں کا کمال یہ ہے کہ انہیں دیکھتے ہی آپ اردگرد کے ماحول سے بے خبر اور لاتعلق ہو کر ان کی خوب صورتی اور بناوٹ میں کھو جائیں گے۔

جیسے جیسے آپ آگے بڑھیں گے ان میناروں کی خوبصورتی زیادہ واضح ہوتی جائے گی۔ ان پر ایسے رنگ استعمال کیے گئے ہیں کہ لاہور کی گرد آلود فضا میں بھی علیحدہ دکھائی دیتے ہیں۔ میناروں کے علاوہ مسجد کی دیواروں، صحن اور مرکزی ہال میں اتنے رنگ بکھرے ہوئے ہیں کہ ان کا شمار شاید ممکن نہ ہو لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ مسجد کے باہر تجاوزات اور بے ہنگم دکانوں نے اس کے بیرونی منظر کو دھندلا دیا ہے۔

یہ معاملہ صرف مسجد وزیر خان کے ساتھ ہی نہیں بلکہ پاکستان میں موجود تمام تاریخی ورثے کے ساتھ ہے۔ جانے یہ ہماری سرشت کا حصہ ہے یا عادت کہ ہم اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتے جب تک کسی حسن کو گرہن زدہ نہیں کر لیتے۔ اس کی ایک مثال لاہور کا تاریخی شالامار باغ بھی ہے جس کے گرد بڑھتے ہوئے تجاوزات اور ناجائز تعمیرات نے اس کے حسن اور خوبصورتی کو داغ دار کر رکھا ہے۔ متعلقہ ادارے اور خود حکومت پاکستان و پنجاب بارہا ان کی نشاندہی کر چکی ہے اور ہٹانے کی سفارش بھی کر چکی ہے لیکن ان آبادیوں کے نام پر بیٹھے ہوئے لوگ کسی صورت یہاں سے ہٹنے کو تیار نہیں۔

یہ بے حس رویے دیکھ کر کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ ہم اپنی تاریخ اور ورثے کو اپنے ہاتھوں تباہ و برباد کر رہے ہیں اور ہمیں اس کی کوئی پروا بھی نہیں۔

مسجد وزیر خان کا شمار دورِ مغلیہ کی خوبصورت ترین تعمیرات میں ہوتا ہے جبکہ اسے تاج محل، جامع مسجد دہلی اور قلعہ آگرہ کے خالق شہنشاہ ابومظفر شہاب الدین محمد شاہجہاں کے عہد میں مکمل کیا گیا۔

شہنشاہ شاہجہاں کے خصوصی درباری طبیب کا نام شیخ علم الدین انصاری تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شیخ علم الدین اپنے علم اور دانش و آگہی کی وجہ سے شہنشاہ کے بے حد قریب تھے۔ شیخ صاحب نے بادشاہ کے لیے بعض ایسی خدمات انجام دیں کہ بادشاہ نے انہیں لاہور کی گورنری سونپ دی۔

شہنشاہ شہاب الدین شاہجہاں خود تو 1628ء سے 1658ء تک برسرِ اقتدار رہا لیکن شیخ علم الدین انصاری کا گورنر لاہور کی حیثیت سے تقرر 1634ء میں عمل آیا اور آپ 1639ء تک اس مرتبے پر فائز رہے۔ شیخ علم الدین انصاری کا تعلق چنیوٹ سے تھا اس لیے لاہور اور پنجاب سے آپ کا تعلق نہایت فطری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شیخ علم الدین نے منصب سنبھالتے ہی لاہور کی ترقی، بہتری اور خوبصورتی پر توجہ دینا شروع کی۔

یہ وہ دور تھا جب مغلوں کا تعمیراتی ذوق و شوق اپنے عروج پر تھا۔ شیخ علم الدین انصاری نے اپنے بادشاہ کی تقلید میں ایک مسجد کی تعمیر کا منصوبہ بنایا اور شہنشاہ سے اجازت چاہی۔ اذن ملتے ہی 1634ء (اور بعض مورخین کے مطابق 1635ء) میں مسجد کی تعمیر کا آغاز کر دیا گیا۔

شیخ علم الدین انصاری خود بہت باذوق شخصیت کے حامل تھے اس لیے ان کے ذہن میں ایک ایسی مسجد کا خاکہ تھا جو ہر لحاظ سے منفرد اور یکتا ہو۔ شیخ علم الدین انصاری کو عام طور پر وزیر خان کے نام سے پکارا جاتا تھا چنانچہ انہوں نے

مسجد میں کوئی ایک رنگ استعمال کرنے کے بجائے کئی رنگ استعمال کرنے کا حکم دیا۔ یہی وجہ ہے کہ مسجد وزیر خان میں جتنے رنگ استعمال کیے گئے ہیں اتنے شاید دنیا کی کسی اور مسجد کی تعمیر میں نہیں ہوئے۔

یہ ناقابلِ روزگار مسجد سات سال کے عرصے میں 1641ء یا 1642ء میں مکمل ہوئی۔ شیخ علم الدین انصاری اس کی تکمیل سے دو سال پہلے ہی گورنر لاہور کا منصب چھوڑ چکے تھے لیکن چونکہ مسجد کی تعمیر کا بنیادی خیال اور محنت انہی کی تھی اس لیے اسے ''مسجد وزیر خان'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔

مسجد بہت زیادہ بڑی نہیں لیکن اسے ہر ممکن طریقے سے خوبصورت اور منفرد بنانا مقصود تھا اس لیے اس کی تعمیر پر زیادہ عرصہ صرف ہوا۔

میو اسکول آف آرٹس کے سابق پرنسپل ایف ایچ اینڈریوز، مسجد وزیر خان کی تعمیر کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ ''مسجد کی تعمیر کے لیے سلوں سے مشابہ چھوٹی پختہ اینٹیں استعمال کی گئیں۔ یہ مغلیہ طرزِ تعمیر سے ذرا ہٹ کر تھیں کیونکہ مغل عام طور پر اپنی تعمیرات کے لیے پختہ چھوٹی اینٹیں استعمال کرتے تھے لیکن ان کی عدم دستیابی یا مہنگی ہونے کی صورت میں ان سلوں کو کام میں لایا جاتا تھا۔

مسجد وزیر خان کی تعمیر کے لیے ظاہر ہے وسائل کی کوئی کمی تو نہیں رہی ہوگی اس لیے اغلب خیال ہے کہ سلوں کا استعمال اینٹوں کی عدم دستیابی کی وجہ سے کیا گیا ہوگا۔

پوری مسجد میں صرف دو مقامات پر پتھر استعمال ہوا۔ یہ دو مقامات محرابیں اور مسجد کا پنجرہ ہیں۔ انہیں پتھر سے تعمیر کیا گیا۔ مسجد کی تمام دیواروں پر پلاستر (چونہ) کیا گیا جبکہ بیرونی سمت نہایت ہی نفیس قسم کے مرکب کی تہ چڑھائی گئی جس کی سطح تو سنگ مرمر کی طرح چکنی ہے لیکن اس میں مختلف رنگوں کی آمیزش کی گئی۔

بیرونی سمت کیا جانے والا پلاستر کا تمام کام شوخ سرخ رنگ سے کیا گیا جو ہندوستان اور اس کے باسیوں کا پسندیدہ رنگ ہے۔ بعد میں سفید رنگ سے اینٹوں کی بناوٹ، موٹائی اور چوڑائی کو اجاگر کرنے کے لیے حاشیہ کاری کی گئی۔ دیواروں پر کندہ کاری اور کاشی کاری کا بے شمار کام کیا گیا تاکہ مسجد کے جمالیاتی حسن میں کسی قسم کی کوئی کسر باقی نہ رہ جائے۔

مسجد کے سامنے والے حصے پر خصوصی توجہ دی گئی اور اس پر مختلف رنگین پتھر چسپاں کیے گئے۔ اسے کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا اور ہر حصے کو مختلف رنگ دیا گیا لیکن رنگوں کا یہ امتزاج

ایک بار لندن میں رضا کاظم کے فلیٹ پر فیض صاحب ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہیں رضا کاظم ان کی بیگم نسیم اور ان کے بچے بھی ایک کمرے میں مقیم تھے لیکن فیض صاحب کے بیڈ روم میں ہر وقت لوگوں کا مجمع لگا رہتا تھا۔ بر منگھم میں بدر اور ان کی بیگم بھی آ کر مقیم ہو گئی تھیں۔ ملاقاتیوں میں ہر طرح کے لوگ آتے تھے۔ جن کی فیض صاحب ہر طرح کی ناپسندیدہ باتیں بھی برداشت کرتے رہتے۔ پھر رات گئے تک تنہائی اور یکسوئی میسر نہ آتی لیکن کیا مجال کہ کبھی چہرے پر بددلی کے آثار پیدا ہوئے ہوں۔ کبھی کبھی تو اپنے مخالف کو ایسا مختصر جملہ اتنے دھیمے لہجے سے کہہ دیتے کہ مخاطب گھائل ہو جاتا۔

اقتباس: ستارۂ وفا از سحاب قزلباش

ایسا ہے کہ دل اسے منتخب کرنے والے کو داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

مرکزی دروازہ محرابی شکل کا ہے لیکن اس کے گرد مستطیل شکل کا دیدہ زیب حاشیہ لگایا گیا۔ اس حاشیے میں دروازے کی اوپری اور دونوں عمودی سمتوں میں فارسی رسم الخط میں آیاتِ ربانی کندہ کی گئیں جس سے اس دروازے کی شان دوبالا ہو گئی۔

میناروں کے علاوہ مسجد کی بیرونی اور اندرونی سمت پہلے پلاستر کیا گیا جس کے بعد اس پر رنگ آمیزی کی گئی۔ ان رنگوں کو مختلف علامتیں دی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر نیلا رنگ پنجاب اور پنجابی ثقافت کی نمائندگی کرتا ہے۔ سورج کی روشنی کی عکاسی سنہرے رنگ سے کی گئی جبکہ قیمتی پتھروں کے حوالے سے ارغوانی رنگ استعمال کیا گیا۔

مسجد کا مرکزی ہال پانچ حصوں پر مشتمل ہے اور ان میں سے ہر حصے پر علیحدہ گنبد بنایا گیا ہے۔ ان گنبدوں کے اندرونی جانب بھی رنگ ہی رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ چھت کو قیمتی اور عام پتھروں کے علاوہ رنگین شیشوں سے سجایا گیا۔ ان گنبدوں کے نیچے کھڑے ہو کر آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ قوسِ قزح کے بیچوں بیچ آ گئے ہوں۔

مسجد کی دلکشی میں اضافے کے لیے ہال کی اندرونی

دیواریں اور فرش زرد رنگ کی چکنی سلوں سے تعمیر کیا گیا جبکہ ان پر طرح طرح کے بیل بوٹے بنائے گئے۔ صحن مصلّے کے انداز میں بچھایا گیا اور دور سے دیکھنے پر یوں لگتا ہے کہ اسے سنگِ مرمر سے بنایا گیا ہے۔ یہاں بھی رنگوں کا بے تحاشا لیکن سلیقے سے استعمال کیا گیا ہے۔

دیکھنے والے کو حیرت ہوتی ہے کہ مسجد وزیر خان رنگوں کا مجموعہ ہے لیکن قابلِ ستائش بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی رنگ آنکھوں کو چبھتا ہے نہ برا لگتا ہے۔ اس میں گہرے اور ہلکے رنگ دونوں شامل ہیں لیکن انہیں کچھ اس انداز میں ترتیب دیا گیا ہے کہ ہر رنگ پہلے والے سے زیادہ بھلا محسوس ہوتا ہے۔

مسجد کے دائیں اور بائیں جانب دو مینار ہیں جن میں سے ہر ایک کی بلندی ایک سو فٹ ہے۔ ان میناروں کو ہشت پہلو (آٹھ کونوں والے) انداز میں تعمیر کیا گیا ہے جبکہ ان میں جانے کے لیے سیڑھیاں بھی موجود ہیں۔ ایک مینار میں ساٹھ قدچوں (سیڑھیوں) کی بلندی پر "ایوانِ موذن" ہے جہاں سے دن میں پانچ بار "اللہ اکبر" کی صدائیں فضا میں گونجتی ہیں جبکہ یہاں سے لاہور کے پرانے شہر کا خوبصورت نظارہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

مسجد کا صحن مربع شکل میں ہے جس کے عین وسط میں فوارہ نصب ہے۔ یہ فوارہ نمازیوں کے وضو کے لیے بنائے جانے والے مربع تالاب کو پانی فراہم کرتا ہے۔ اس تالاب پر بیک وقت ایک سو سے زائد نمازی وضو کر سکتے ہیں۔

مربع صحن کے ساتھ چھوٹے حجرے بنائے گئے ہیں جو صحن کی دونوں جانب واقع ہیں۔ ہر طرف تیرہ تیرہ حجرے ہیں جنہیں تلاوتِ قرآن پاک، مطالعے اور استغراق وغیرہ کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ ان حجروں میں دو پلڑے والے روایتی دروازے لگائے گئے ہیں۔

ان حجروں کے ساتھ ہی ڈیوڑھی واقع ہے جس پر باقاعدہ چھت ڈالی گئی ہے۔ ڈیوڑھی سے دو طرفہ زینوں کے ذریعے مسجد کی چھت تک رسائی ممکن ہے۔ اس طرح کی چھوٹی ڈیوڑھیاں فرش کے نچلے حصے میں بھی شمالی اور جنوبی اطراف میں بنائی گئی ہیں۔ خیال ہے کہ انہیں تعمیراتی تناسب برقرار رکھنے کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔

مسجد کو تعمیر ہوئے چونکہ چار سو سال کا عرصہ بیت چکا ہے اس لیے اس میں ٹوٹ پھوٹ فطری عمل تھا چنانچہ 1977ء میں محکمۂ اوقاف حکومتِ پنجاب کی زیرِ نگرانی مسجد کی مرمت اور تزئینِ نو کا کام مکمل کیا گیا جس سے مسجد کی آب و تاب اور شان و شوکت پھر سے بحال ہو گئی۔

پرانا لاہور کے گرد آلود ماحول نے گو مسجد کے شوخ رنگوں کو کسی حد تک دھندلا دیا ہے لیکن اس کے باوجود مسجد وزیر خان کا شمار اب بھی پاکستان کی خوبصورت ترین مساجد میں سے ایک ہے۔

مسجد کے اندرونی صحن میں ایک تہ خانے میں ایک بزرگ کا مزار بھی ہے۔ ان کا اصل نام تو سید محمد اسحاق تھا لیکن انہیں میراں شاہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کا تعلق ایران سے تھا اور وہ تغلق شاہی دور (1321ء سے 1398ء) میں ہجرت کر کے لاہور میں آباد ہو گئے تھے۔

محمد دین قادری نے اپنی تصنیف مدینۃ الاولیا میں سید محمد اسحاق کا نام حضرت سید اسحاق گازرونی سہروردی لکھا ہے۔ آپ حسنی سید تھے اور چند واسطوں سے آپ کا سلسلۂ نسب تیسرے امام حضرت امام حسین علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔ آپ ایران کے علاقے کازرون میں رہائش پذیر تھے۔ بے شمار اولیائے کبار سے فیوض و برکات حاصل کیے اور جب علوم ظاہری و باطنی میں تکمیل ہو گئی تو دنیا کی سیر و سیاحت کے لیے چل پڑے۔

آپ نے شیخ اوحد الدین اصفہانی کے دستِ حق پر بیعت کی اور خرقۂ خلافت پایا۔ شیخ مذکور کا سلسلۂ طریقت اس طرح ہے۔ شیخ رکن الدین مرید تھے شیخ قطب الدین سہروردی کے، وہ شیخ ضیاء الدین ابوالنجیب سہروردی کے۔ مولوی نور احمد چشتی لکھتے ہیں کہ آپ عبدالغنیث کازرونی سے بیعت تھے اور انہی کے حکم سے لاہور تشریف لائے۔

خزینۃ الاصفیا کے مولف مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں کہ "اول در شہر گاہ کازرونی اقامت داشت بعد ازاں باشارت غیبی در شہر آمدند۔"

آپ طویل مدت تک اس شہر میں رشد و ہدایت میں مشغول رہے اور اس شہر میں آپ کو اس قدر مقبولیت ہوئی کہ جلیل القدر اور مشرب عالم آپ کی خدمتِ اقدس میں حاضری دینے کو فخر خیال کرتے تھے۔ جب لاہور تشریف لائے تو لاہور کے محلہ رزہ میں مقیم ہوئے۔

نہایت عظیم المرتبت بزرگ تھے۔ آپ کے مریدوں کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ سید اسحاق علم و حیا کے مالک تھے۔ تحمل اور بردباری میں باکمال تھے۔ جو شخص بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہدایت سے سرفراز ہوتا۔ آپ اپنے زمانے کے قطب الاقطاب اور شیخ الشیوخ تسلیم کیے جاتے تھے۔

آپ کا انتقال 1284ء (اور بعض روایات میں

1384ء) بہ مطابق 786 ہجری میں بہ عہد فیروز شاہ تغلق لاہور میں ہوا۔ تاریخ وفات "بسم اللہ الرحمن الرحیم" ہے۔ (کیونکہ بسم اللہ کے اعداد بھی 786 ہیں) اور اندرونِ دہلی دروازہ دفن ہوئے۔

آپ کا مزار مسجد وزیر خان کے صحن میں نیچے ایک تہ خانے میں واقع ہے۔ نواب وزیر خان (شیخ علم الدین انصاری) گورنر لاہور نے جب مسجد وزیر خان بنوائی تو اس قدیم مزار کو قائم رکھا۔ سکھوں کے عہد میں ہر جمعرات کو یہاں میلا لگتا تھا۔

مرزا لعل بیگ مصنف ثمرات القدس نے لکھا ہے کہ جب پہلے پہل آپ کی وفات کے بعد قبر خام (کچی قبر) بنی تو ایک نہایت سرسبز و شاداب بیل اس پر اگ آئی جس نے پوری قبر کو ڈھانپ لیا۔ اس پر لوگ اس مزار کو پیر سبز کا مزار کہنے لگے۔

کہتے ہیں کہ دو سو سال تک یہ بیل سرسبز رہی اور بیمار لوگ یہاں آ کر اس کے پتے لے جاتے اور ان کو کھا کر صحت یاب ہوتے۔ مسجد کی تعمیر کے موقع پر یہ بیل کاٹ دی گئی۔

تحقیقاتِ چشتی میں لکھا ہے کہ شروع میں امیر الامراء نادر خان نے اپنی حویلی مزار کے قریب بنالی اور یہ مزار حویلی کے اندر آ گیا مگر اس کے گرد ایک خشتی (اینٹوں کا) حجرہ بنوا دیا۔ بعد ازاں عہدِ شاہ جہاں میں نواب وزیر خان نے یہ حویلی خرید کر مسجد وزیر خان میں شامل کر دی۔

مسجد وزیر خان کے پہلو میں ایک اور جلیل القدر بزرگ کا مزار اقدس بھی واقع ہے۔ یہ حضرت سید صوف سہروردی ہیں اور ان کا مقبرہ مسجد وزیر خان کے عین سامنے چوک میں ہے۔

رسالہ تحفۃ الواصلین میں لکھا ہے کہ آپ مسجد وزیر خان کے صحن میں مدفون سید اسحاق گازرونی کے ہم عہد و ہم مجلس تھے۔ کئی لوگ آپ کو حضرت گازرونی کا بھائی بتاتے ہیں مگر اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔

آپ ایک نہایت خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں ہی لاہور تشریف لائے اور اسی بادشاہ کے عہد میں یہیں وفات پائی۔ ہوا اس طرح کہ سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں جب دشمن نے لاہور پر حملہ کیا تو آپ بھی مردانہ وار دشمن کے مقابلے پر ڈٹ گئے اور جامِ شہادت نوش فرمایا۔

یہ واقعہ 1284ء بہ مطابق 786 ہجری میں پیش آیا۔ اس زمانے میں اس علاقے کو رزہ (پنجابی زبان میں میدان کو کہتے ہیں) کہا جاتا تھا اور یہاں امیر الامراء نادر خان کی حویلی تھی جو مغل بادشاہ شہنشاہ شہاب الدین محمد شاہ جہاں کے عہد تک اس کے وارثین کے پاس رہی۔ اس کے بعد گورنر لاہور نواب وزیر خان نے مسجد وزیر خان تعمیر کرنے کی غرض سے اس حویلی کو مسجد میں شامل کر لیا۔

حضرت سید صوف سہروردی کا مقبرہ چونکہ چوک میں واقع تھا اس لیے انگریزوں کے عہد حکومت یعنی 1850ء میں جب چوک کے اندرونی مکانات گرائے گئے اور چوک بنایا گیا تو اس خالی مزار پر میاں محمد سلطان ٹھیکے دار نے مقبرہ بنوا دیا۔ مسجد وزیر خان کی تعمیر سے پہلے ہی یہ مزار اس جگہ موجود تھا جبکہ سکھوں کے عہد میں بھی اس مزار پر بڑی رونق رہتی تھی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ لاہور کا انگریز ڈپٹی کمشنر میجر میکر یگر اس مزار کو منہدم کرانا چاہتا تھا لیکن انتہائی کوششوں کے باوجود وہ کامیاب نہ ہو سکا چنانچہ جب روضہ بنایا گیا تو اس کی شمالی دیوار پر سنگِ مرمر کی تختی پر یہ عبارت لکھوائی گئی۔

"بہ صوابدید صاحب عالی مناقب میجر جارج میک ریگر صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر ضلع لاہور، مقبرہ متبرکہ حضرت سید صوف رحمۃ اللہ علیہ قدس سرہ، تعمیر کردہ شیخ سلطان ٹھیکے دار سرکار فیض آثار کمپنی انگریز بہادر دام اقبالہ، 1852ء 1908 بکرمی 1268 ہجری بہ اتمام رسید۔"

ان دنوں یہ مقبرہ ہشت پہلو تھا۔ موجودہ صورت میں آپ کے مزار پر سنگِ مرمر کی جو تختی لگی ہے اس پر تحریر ہے "شیخ المشائخ حضرت پیر کبیر سید صوف فیض بخش رحمۃ اللہ علیہ الحسنی سہروردی، سنِ وصال 786 ہجری۔"

قبر کا تعویذ نہایت خوبصورت اور فنِ تعمیر کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ مزار اقدس پر یہ عبارت بھی تحریر ہے۔

"روضۂ اقدس، سلطان العارفین، زبدۃ الکاملین، مظہرِ بارگاہِ ایزد سید حضرت سید صوف فیض بخش عظیم انوار اللہ مرقدہ در عہد بادشاہ ابو المظفر فیروز شاہ تغلق۔"

اس کے علاوہ بعض دیگر اشعار بھی تحریر کیے گئے ہیں۔

بہت سے لوگ مسجد وزیر خان میں دہرے ثواب کی نیت سے آتے ہیں کیونکہ ایک جانب تو وہ بارگاہِ ایزدی میں سجدہ ریز ہو کر اپنے فرائض کی بجا آوری کرتے ہیں تو دوسری جانب میراں بادشاہ اور سید صوف کے حضور حاضری دے کر روحانی فیوض و برکات حاصل کرتے ہیں کیونکہ دونوں صاحبانِ مزار کا فیض چھ صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی جاری و ساری ہے۔

سورج کا دیس

تحریر: الطاف شیخ
ترجمہ: ابہیم جمالی

تیسرا حصہ

سرگزشت کا خاصہ ہے کہ ایسے سفرنامے دیے جائیں جو اپنی مثال آپ ہوں۔ اگر یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ سفرنامہ نگاری میں ایک نئے عہد کا اضافہ کیا گیا اور ان خرافات کو یکسر نظرانداز کیا گیا کہ سیاح کو بطور چاکلیٹی ہیرو بنادیا جائے۔ ہر شہر میں وہ محبت کی ایک داستان چھوڑ آئے۔ ان کی جگہ تاریخ و جغرافیہ اور دیگر معلومات پر زور دیا گیا اور اس قسم کے سفرناموں کو قارئین نے بھی بہت پسند کیا۔ زیرنظر سفرنامہ بھی اسی طرح نامکمل ہے کہ آپ کو مسحور کرلے جنہوں نے اس ملک کو سرسری نظروں سے دیکھا ہے انہیں تو پسند آئے گا ہی' جنہوں نے وہاں تک کا سفر نہیں کیا ہے وہ ان سے بھی زیادہ محظوظ ہوں گے۔ قارئین خود کو سفرنامہ نگار کے ساتھ محو سفر محسوس کریں گے۔

آپ کے ذوق مطالعہ کی خاطر ایک دلچسپ سفر کہانی' واقعات کی زبانی

جاپان ایک سنگلاخ ملک ہے۔ یہاں آبادی کے لحاظ سے زراعت نہیں ہوتی۔ عوام کی رہائش کے لیے بھی وافر زمین دستیاب نہیں، اس لیے جاپان کے لوگ صدیوں سے سمندری خوراک پر گزارہ کرتے آئے ہیں۔ جاپان کے باسی سمندر میں پائی جانے والی ہر قسم کی مچھلی، جھینگے، کیکڑے حتیٰ کہ وہیل اور شارک جیسی بڑی مچھلیوں کو بھی کھا جاتے ہیں۔ سمندری گھاس تک ان کے شکم میں پہنچ جاتی ہے۔

سمندر میں پفر (Puffer) نامی ایک انتہائی زہریلی مچھلی ہوتی ہے۔ اس سے بڑے بڑے سمندری جانور بھی کتراتے ہیں لیکن جاپانی اسے بھی نہیں چھوڑتے، بڑے شوق سے کھاتے ہیں بلکہ اسے کھانا اسٹیٹس سمبل کا درجہ رکھتا ہے۔ گویا زہریلی اور انتہائی درجے کی خطرناک مچھلی کھانا بہادری اور مردانگی کی علامت ہے۔

میں نے جاپان میں مقیم اپنے ایک ہم وطن سے کہا۔ ''عجیب بات ہے کہ جاپانی ڈھیروں رقم خرچ کرکے موت سے کھیلتے ہیں اور اسے بہادری کا نام دیتے ہیں۔''

''یہ ایسا ہی ہے۔'' انہوں نے جواب دیا ''جیسے ہمارے ہاں بڑی مونچھوں والے کو بارعب اور دبدبے کا حامل فرض کرلیا جاتا ہے۔''

بہرحال جاپانیوں کی دو باتیں میری سمجھ میں نہیں آسکیں، ایک یہ کہ پبلک باتھ میں فیملی کے ہمراہ حتیٰ کہ پڑوسیوں کے ساتھ بے لباس ہوکر غسل کرنا جبکہ جاپانی عورتیں بنیادی طور پر شرمیلی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ پفر جیسی مچھلی کھانا بڑی شان اور برکت کی بات بھی جاتی ہے۔ پفر مچھلی کو جاپانی زبان میں فوگو کہا جاتا ہے۔

جاپانی ہوٹلوں میں برگر اور سینڈوچ ایک سو بیس (تقریباً پچیس روپے) میں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر عام مچھلی، بیف اور چکن وغیرہ زیادہ سے زیادہ دو ہزار ین میں کھایا جاسکتا ہے۔ وہیں پر مذکورہ زہریلی مچھلی ''فوگو'' بھی پیش کی جاتی ہے۔ یہ خطرناک ڈش کرنے والے بہادر شوقین بطور بل پچیس ہزار ین یعنی تقریباً بارہ ہزار روپے بخوشی ادا کرتے ہیں۔

یہ مچھلی اس قدر زہریلی ہوتی ہے کہ اس کی تیاری اور صفائی میں باورچی سے معمولی سی بھی غفلت سرزد ہوجائے تو اسے کھانے والا فوراً ہلاک ہوجاتا ہے۔ صفائی کے دوران غلطی سے مچھلی کے زہریلے حصوں سے گوشت چھو بھی جائے تو یہ ڈنر کرنے والے کی جان لینے کے لیے کافی ہے۔ گاہک گویا بڑی رقم ادا کرکے اپنی زندگی ہوٹل کے شیف کے حوالے کردیتا ہے۔ باورچی کی ذرا سی سستی اور معمولی سی غلطی ہوٹل

میں آنے والے مہمان کی جان لے سکتی ہے۔ یہ بات دیگر ہے کہ اس مچھلی کو صاف کرنے، چھیلنے اور تیار کرنے والے باورچی تجربے کار اور ماہر ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود انسان سے دانستہ یا بے خیالی میں غلطی ہوسکتی ہے۔ اس مچھلی کو تیار کرنے والے باورچیوں کو لائسنس حاصل کرنے کے لیے کئی کورس کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے بعد کئی برس تک قابل باورچی کی نگرانی میں کام دیکھنا اور سیکھنا پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ ''بااختیار'' باورچی بننے کے لیے کئی مشکل تحریری اور عملی امتحانات سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تعلیم پائلٹ اور ڈاکٹر بننے کے امتحان سے بھی زیادہ محنت طلب اور مشکل ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کئی معزز مہمان، باورچیوں کے ہاتھوں موت کا شکار ہوجاتے ہیں۔ حالیہ اعداد و شمار کے مطابق جاپان کے مختلف ہوٹلوں میں پفر (فوگو) مچھلی کھانے سے سالانہ ستر سے سو افراد کی اموات ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے یہ عام اور غریب لوگ نہیں ہوتے۔ ایک وقت کے کھانے کے پندرہ ہزار روپے ادا کرنے والے امیر لوگ ہی ہوسکتے ہیں۔

مجھے یاد ہے۔ 1975ء میں یہاں کا ایک مشہور اداکار متسو گورو ایسی ہی موت کا شکار ہوا تھا۔ وہ جاپان کے روایتی اسٹیج ڈراموں ''کابوکی'' کا بہترین اور ہردلعزیز اداکار تھا۔ اسے حکومت کی طرف سے ''جاپان کے قومی خزانے کا تاحیات ہیرو'' کا خطاب ملا ہوا تھا۔ وہ کیوٹو کے ایک ایسے اعلیٰ قسم کے ریسٹورنٹ میں پفر مچھلی کھا کر ہلاک ہوا جہاں انتہائی قابل اور نامور باورچی کام کرتے تھے۔ باورچی اپنی قابلیت، کوشش اور محنت کے باوجود مچھلی کے جسم میں سے مکمل طور پر زہریلے اجزا الگ کرنے میں ناکام رہے تھے۔ متسو گورو جیسے اداکار کو اس مچھلی کی قیمت ادا کرنے کے لیے رقم کے ساتھ اپنی جان بھی دینی پڑی تھی۔

ایک ہوٹل کے مالک نے بتایا کہ اس مچھلی کے زہر کا شکار ہونے والا عجیب بے چارگی کی موت مرتا ہے۔ کس قدر بے بسی کی بات ہے کہ مرنے والے کا دماغ آخری سانس تک بیدار رہتا ہے لیکن وہ بولنے سے معذور ہوتا ہے۔ وہ ہر بات اور منظر کو واضح طور پر دیکھ اور سمجھ رہا ہوتا ہے لیکن زبان سمیت اس کا پورا وجود حرکت سے قاصر ہوتا ہے۔ پھر جلد ہی وہ سانس لینے سے عاجز آجاتا ہے۔

اوائل دنوں میں جب میں نے اس مچھلی اور اس کی ہلاکت خیزی کے بارے میں سنا تو ایک دن یوکوہاما کے ایک ڈاکٹر سے دریافت کیا ''اس مچھلی کا زہر کس حد تک خطرناک ہے؟''

"میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں؟" وہ بولا اور چند لمحے سوچنے کے بعد بولا "آپ سائنائیڈ کے بارے میں جانتے ہیں؟"

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "سائنائیڈ سوئی کی نوک پر لگا ہو اور وہ کسی کو چبھو دی جائے تو وہ فوراً موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔ جنگ کے دوران میں اس کیمیکل کی گولیاں جاسوس سپاہیوں کو دی جاتی ہیں تاکہ اگر وہ دشمن کے ملک میں گرفتار ہو جائیں تو ذہنی اور جسمانی تشدد کے عذاب سے بچنے کے لیے وہ گولی کھا کر فوراً خود کو موت کے حوالے کر دیں۔

"فوگو مچھلی کا زہر سائنائیڈ سے 1200 گنا زیادہ خطرناک ہے۔" ڈاکٹر نے بتایا۔

ہمارے ہاں عاشق اپنی محبوبہ کے التفات سے مایوس ہو کر اسے خودکشی کرنے کی دھمکی دیتا ہے یا اپنی سچی محبت کے اظہار کے لیے "جو آنسو نہیں پیتے، وہ تیرے ہاتھوں زہر پی گئے" کہہ کر محبوبہ کے ہاتھ سے زہر کا پیالہ خوشی خوشی پی لیتا ہے۔

اسی طرح جاپانی عاشق، عشق میں نامراد ہوتا ہے تو اسے فوگو مچھلی یاد آتی ہے۔ جاپان کے ایک مشہور شاعر یوسانو نے اپنی محبوبہ کی بے وفائی اور وعدہ خلافی سے عاجز آ کر آج سے تقریباً ڈھائی سو برس قبل کہا تھا۔

"وہ آج رات بھی نہ آئی تو
میں اس کا خیال اپنے ذہن سے نکال دوں گا
میں فوگو مچھلی کھالوں گا۔"

میرے خیال کے مطابق شاعر اپنی محبوبہ سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ اس کی بے وفائی کے سبب اس کا خیال اپنے ذہن سے نکالنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ یعنی عقل اسے یہ "محفوظ" راہ سجھاتی ہے لیکن اس کے دل میں موجود محبت کا جذبہ محض اس فیصلے سے مائد نہیں پڑتا۔ اسے موت ہی اس راہ سے ہٹا سکتی تھی۔ وہ اس سلسلے میں یقینی موت چاہتا تھا اور اس کام کے لیے اس نے فوگو مچھلی کا انتخاب کیا جسے کھانے کے بعد زندہ رہنا ناممکن تھا!

جاپانی اس مچھلی کی تعریف کرتے ہیں اور ہم غیر جاپانیوں میں سے جس نے فوگو مچھلی کھائی ہے، وہ بتاتے ہیں کہ اس کا گوشت عام مچھلی کے بجائے مرغی کے گوشت جیسا ہے اور کھانے کے بعد وجود میں ایک فرحت انگیز حرارت کا احساس ہوتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پفر (فوگو) مچھلی کا سوادِ مرغی جیسا ہو یا تیتر بٹیر جیسا... کیا یہ ایسی بات ہے کہ اس کے لیے اتنا بڑا خطرہ مول لیا جائے؟ اس مچھلی کے کچھ حصے یعنی پتہ، آنتیں، گردے وغیرہ انتہائی زہریلے ہوتے ہیں۔ صفائی کے دوران یہ چیزیں باقی گوشت سے محض چھو بھی جائیں تو اسے کھانے والا منٹوں میں راہی ملکِ عدم ہو جائے گا۔ اس زہر کا شکار ہونے والے کے ہاتھ لرزنے لگتے ہیں۔ ہاتھوں میں تھامی چاپ اسٹکس پلیٹ پر بجنے لگتی ہیں اور پھر فوراً اس کے ہاتھوں سے چاپ اسٹکس یا چھری کانٹا چھوٹ جاتا ہے۔ جسم کی حرکت بند اور دیکھتے ہی دیکھتے سانس اکھڑنے لگتی ہے۔

سانپ اور مگرمچھوں کا کوئی نہ کوئی علاج موجود ہے لیکن پفر مچھلی کے زہر کا علاج ہنوز دریافت نہیں ہو سکا۔

یہاں کے ٹی وی پر ایک نیوز رپورٹر بتا رہے تھے۔

"ایک طاقت ور اور صحت مند نوجوان کی موت کے لیے اس زہر کا ایک ملی گرام کافی ہے۔ یہ زہر کی اتنی قلیل مقدار ہے جو سوئی کی نوک پر آ سکتی ہے۔"

ڈاکٹر ہم غیر جاپانیوں کی معلومات اور ہمیں خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے بتا رہے تھے تاکہ ہم محتاط رہیں۔ کس قدر بدقسمتی کی بات ہے کہ کچھ دوست مل کر ہوٹل میں کھانا کھانے جائیں اور واپسی پر کسی ایک کی لاش ساتھ لائیں۔

ایسے ہی ایک منظر پر جاپان کے ایک گیت کا شعر ہے۔

"رات کو وہ اور میں فوگو کھانے گئے۔
آج اس کی لاش کو کندھا دے رہا ہوں۔"

اس قدر خطرے کے باوجود پفر (فوگو) مچھلی کی فروخت میں نہ صرف روز بروز اضافہ ہو رہا ہے بلکہ اس کی قیمت بھی بڑھ رہی ہے۔ سمندر سے حاصل ہونے والی مچھلی عوام کی طلب پوری نہیں کر پاتی۔ اس لیے کئی مقامات پر پفر مچھلی کے فارم قائم کیے گئے ہیں۔

جاپان کے ہر شہر کے کسی نہ کسی ہوٹل میں فوگو مچھلی سرو کی جاتی ہے۔ سب سے زیادہ شمونوسیکی شہر کے ہوٹلوں میں فروخت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے شمونوسیکی کو "فوگو گوٹی" بھی کہا جاتا ہے۔

مختلف ممالک میں مقیم جاپانی بھی اس مچھلی سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن بعض ملکوں میں پفر (فوگو) مچھلی کی فروخت اور اسے تیار کرنے پر پابندی عائد ہے۔ امریکا بھی ان ملکوں میں شامل ہے۔ اب جا کر کچھ عرصہ پیشتر

شمونوسیکی کی ایک فوڈ کمپنی کو امریکا میں فوگو مچھلی ایکسپورٹ کرنے کی اجازت ملی ہے۔ امریکا کے "فوڈ اینڈ ڈرگ ایڈمنسٹریٹر" نے اس شرط پر یہ اجازت دی ہے کہ فوگو مچھلی جاپان ہی سے صاف ہو کر امریکا پہنچے گی۔ یعنی اس کے زہریلے حصے الگ کر کے امریکا بھیجی جائے گی اور ہر سرتبہ شمونوسیکی کا میئر اس بات کی تصدیق کرے گا۔

امریکا کے جن ہوٹلوں میں پفر مچھلی پیش کی جاتی ہے، ان میں سے ایک نیویارک کا "نپان ریسٹورنٹ" ہے جہاں فوگو (پفر) مچھلی کے ڈنر کی قیمت 160 ڈالرز مقرر ہے۔ اگر گاہک کی قسمت اچھی ہے تو وہ 160 ڈالرز کے عوض اپنا شوق پورا کر سکتا ہے۔ دوسری صورت میں اسے 160 ڈالرز کے ساتھ جان بھی دے کر اپنے اس منفرد اور خطرناک شوق کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔

فوگو مچھلی کو کچا بھی کھایا جاتا ہے۔ ماہر باورچی اس کے انتہائی باریک قتلے بنا کر پلیٹ پر پھولوں اور پرندوں کی شکل میں سجا کر پیش کرتا ہے۔ ماضی قریب میں اس مچھلی کے کھانے سے جس شخص کی موت واقع ہوئی ہے، اس کے سامنے مچھلی کے باریک قتلے کنج کی شکل میں سجا کر پیش کیے گئے تھے۔ اسے انتہا درجے کی بدقسمتی کہا جا سکتا ہے کہ جاپانی عقیدے کے مطابق اس پرندے "کونج" کو لمبی عمر کی علامت تسلیم کیا جاتا ہے لیکن اس بے چارے کی عمر طویل ہونے کے بجائے وہیں مختصر ہو گئی تھی۔

ہمیں معلوم ہے کہ یہ مچھلی انتہائی خطرناک ہے لیکن پھر کے باورچی اکثر اس مچھلی کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ جاپان کی مشہور شاعرہ ہاشیوتو کی ہائیکو ہے۔

"فوگو مچھلی کے زہریلے حصے
کتے نے کھائے
اسے سمندر ہی دیکھنا پڑا۔"

آئن فلیمنگ کے مشہور ناول From Russia with Love میں جیمس بانڈ کو جس زہر سے ہلاک کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس کے بارے میں ناول "ڈاکٹر نو" اور فلم میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ کسی سانپ کا نہیں بلکہ فوگو (پفر) مچھلی کا زہر تھا۔

اس زہریلی مچھلی کو جاپانی فوگو کہتے ہیں۔ انگریزی میں پفر کے علاوہ دیگر ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ مثلاً بلوفش، گولڈ فش اور SwellFish وغیرہ۔ اس کے یہ نام اس کے پھول کر فربہ ہونے کی وجہ سے پڑے ہیں۔ اس مچھلی کے پیٹ میں ایک قسم کی تھیلی ہوتی ہے۔ وہ خوف کی حالت میں اس تھیلی کو پانی یا ہوا سے بھر کر خود کو گنے سائز کا بنا لیتی ہے۔ دشمن سے بچنے، حملہ آور کو خوف زدہ کرنے اور اس سے محفوظ رہنے کے لیے قدرت نے اسے یہ طریقہ عطا کیا ہے۔ پھول جانے کے بعد اس کا جسم اس قدر ٹھوس اور سخت ہو جاتا ہے کہ اس پر انسان اپنے پورے وزن کے ساتھ کھڑا ہو جائے تب بھی وہ پچکتی یا دبتی نہیں ہے۔

پفر مچھلی کا سائنسی نام "Tetrodontiformes" ہے۔

☆☆☆

جاپان کے کئی بڑے شہروں میں ہندوستانی ہوٹل ہیں۔ کہیں کہیں پاکستانی ہوٹل بھی ہیں لیکن وہ بھی ہندوستانی کہلاتے ہیں۔ ان میں دیسی کھانے تیار کیے جاتے ہیں۔ یہاں برصغیر کے لوگوں کے علاوہ کبھی کبھار مقامی لوگ بھی آتے ہیں اور سالن روٹی کھا کر اس کی تعریف کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ اپنی کمپنی کے جہاز کی تفصیلی مرمت کے لیے اسے یوکوہاما کی متسوبشی شپ یارڈ میں لے جا کر کھڑا کیا۔ پہلے ہی دن وہاں کے جاپانی انچارج نے بتایا کہ اسے ہمارے ملک کے کھانے پسند ہیں اور وہ اکثر انڈین ہوٹلوں میں جاتا رہتا ہے۔

میں نے اسے اپنے ساتھ جہاز پر لنچ کی دعوت دی لیکن اس نے بتایا کہ وہ یہاں کھانے کے بجائے کھانا اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ شاید وہ بیوی بچوں کے ساتھ کھانا چاہتا تھا۔

لنچ کے بعد میں سوچتا رہا کہ اسے کسی برتن میں سالن دیا جائے تاکہ گاڑی کے جھٹکوں میں چھلکنے نہ پائے۔ اس دوران میں وہ خود بھی ملک کا خالی ڈبا لے آیا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی ٹفن یا پلاسٹک کی تھیلی میں کھانا لے جائے۔ لیکن وہ نہ مانا اور ڈبے میں شوربا اور بوٹیاں ڈال کر ڈھکن کو ٹیپ سے مضبوطی کے ساتھ بند کر کے روانہ ہو گیا۔ وہ اگلے دن خالی ڈبے اور تعریفوں کے ساتھ ملا۔ اس کے بعد یہ معمول بن گیا کہ وہ روزانہ گھر جاتے ہوئے جہاز سے کھانا لے جاتا۔ میں نے اس سلسلے میں باورچی کو ہدایت کر دی تھی۔ وہ ڈبے میں کھانا پیک کر کے انچارج کو پہنچا دیتا تھا۔

ایک دن جہاز پر سری پائے تیار کیے گئے۔ باورچی نے فون کر کے مجھ سے پوچھا کہ آج بھی انچارج صاحب کے لیے کھانا پیک کرنا ہے یا نہیں۔ میں نے اثبات میں جواب دیا اور روزمرہ کی طرح اس دن بھی جاپانی انچارج کھانا لے

کر روانہ ہوا۔ اگلے دن میں انجن روم میں چند لوگوں کے ساتھ موجود تھا اور جہاز کی مرمت کے سلسلے میں تبادلۂ خیال ہو رہا تھا۔ جاپانی انچارج وہاں آ گیا اور میرے قریب آ کر سرگوشی میں بولا۔

''چیف صاحب! کل آپ کے باورچی نے میرے ساتھ مذاق کیا ہے۔''

''مذاق.....!'' میں نے حیرت سے پوچھا ''کیسا مذاق؟''

''اس نے ڈبے میں سالن کے بجائے ہڈیاں اور بکریوں کے ڈرٹی کھُر ڈال دیے تھے۔''

اس کی بات سن کر مجھے بہت ہنسی آئی۔ میری اس ''حرکت'' کا بھی اس نے سخت برا منایا۔ پھر میں نے سنجیدگی سے اسے یہ بتا کر قائل کیا کہ یہ ہمارے ہاں کی فیورٹ ڈش ہے جسے وہ ہڈیاں اور کھُر قرار دے رہا ہے۔

☆☆☆

ہیروشیما اور ناگاساکی پر امریکا کی جانب سے گرائے گئے ایٹم بم سے جو تباہی ہوئی، حدت اور نیوکلیئر لہروں سے جو گھر، دکان، اسکول اور اسپتال تباہ ہوئے تھے وہ دوبارہ تعمیر کیے جا چکے ہیں۔ جب ستر کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں، میں پہلی مرتبہ جاپان کے شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی گیا تھا تو سوائے ''پیس پارک'' جیسے مقامات کے دیگر تمام عمارات دوبارہ تعمیر ہو چکی تھیں۔ پیس پارک کو یادگار کے طور پر جوں کا توں چھوڑ دیا گیا تھا۔ کہیں کہیں تعمیرِ نو کا کام جاری تھا لیکن بم کے جسمانی متاثرین اور نفسیاتی طور پر بیمار اور ابنارمل قسم کے لوگ ہر جگہ نظر آتے تھے۔ ظاہر ہے بم گرنے کے وقت یعنی 1945ء میں جو لوگ تیس برس کے تھے، وہ 1975ء میں ساٹھ، ستر برس کے ہو چکے تھے۔

نیوکلیئر Radiation کے شکار ہونے والے لولے لنگڑے، معذور اور جھلسے ہوئے جسم کے جاپانی مرد اور عورتیں نہ فقط ناگاساکی اور ہیروشیما میں نظر آئے بلکہ ایسے لوگ ٹوکیو اور یوکوہاما میں بھی موجود تھے۔ ہم ان ایام میں یعنی ستر کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں پچیس، چھبیس برس کے جوان تھے اور ہمارے ہم عمر جاپانی جوانوں اور عمر رسیدہ افراد کے دلوں میں امریکا اور امریکا کی تمام چیزوں سے شدید نفرت پائی جاتی تھی۔ پھر اس کے بعد وقت گزرنے کے ساتھ ہماری آمد و رفت جاپان میں جاری رہی لیکن ایک حیرت انگیز بات میرے مشاہدے میں آئی کہ جاپانیوں کی امریکا کے خلاف نفرت میں رفتہ رفتہ کمی آنے لگی تھی اور وہ امریکی پراڈکٹ کو قبول کرنے لگے۔ نہ صرف قبول کرنے لگے بلکہ پسند بھی کرنے لگے تھے۔

امریکن میوزک، امریکی ساکر (فٹ بال)، امریکی یونیورسٹیاں، امریکن موٹیلز اور رومانٹک ناولز..... اور امریکن بھی انہیں اچھے لگنے لگے تھے۔ امریکن، جاپان میں آتے تو ہر ہوٹل، مسافر خانے اور ہر دکان کا مالک انہیں خوش دلی سے خوش آمدید کہتا تھا۔ رفتہ رفتہ ان کا اسٹائل اور دولت جاپانیوں کو بھلی لگنے لگی۔ ویسے بھی کہا جاتا ہے کہ وقت بہت بڑا مرہم ہے جو پرانے زخم مندمل کر دیتا ہے۔ بوڑھے لوگ اس دنیا سے رخصت ہوتے گئے، ہمارے ہم عمر، عمر رسیدہ ہو کر گھر بار اور ذرائع معاش کے مسائل میں مشغول ہو گئے اور نوجوان نسل، جو ایٹم بم کی تباہ کاریوں کے متاثرین کی چیخ و پکار سننے کے بجائے امریکن میوزک سننا پسند کرنے لگی تو ظاہر ہے ''پرانی'' باتیں ان کے لیے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں تھیں۔

1981ء کی ابتدا میں، جب میرا جہاز آخری مرتبہ خلیج ٹوکیو سے نکل رہا تھا (وہ میرا جاپان کا آخری سفر تھا) تو جہاز پر موجود ہمارے مقامی آفس کے ایک کلرک کے ساتھ گفتگو کے دوران میں ایٹم بم کا ذکر نکل آیا۔ میرے ایک سوال کے جواب میں گویا اس نے اس موضوع سے جان چھڑانے کے لیے ایک ہی جملے میں بات ختم کر دی۔

''اس میں ہم جاپانیوں کا بھی قصور تھا کیونکہ جنگ ہم ہی نے شروع کی تھی۔'' پھر وہ موضوع بدلنے کی غرض سے فوراً بولا ''میں اس جہاز راں کمپنی میں اس لیے ملازمت کر رہا ہوں تاکہ میں کچھ رقم حاصل کر سکوں۔ آیندہ سال میرا امریکا جا کر تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ ہے۔ امریکا کی تعلیم بہت اچھی ہے اور وہاں کا لائف اسٹائل بھی۔''

اور اب اس بات کو بھی 25 برس کا عرصہ بیت چکا ہے۔ میرا ایک مرتبہ پھر جاپان جانا ہوا تھا۔ وہ بچے جو 1980ء، 81ء میں پیدا ہوئے تھے، وہ بھی 25 برس کے جوان ہو چکے تھے۔ اب جاپان بہت بدلا بدلا سا لگتا ہے۔ آج کا جاپان کئی ملکوں سے زیادہ ''امریکن ازم'' کے سحر میں گرفتار ہے۔ جگہ جگہ میکڈونلڈ، کے ایف سی اور لوئیرا جیسے امریکن چین ریسٹورنٹس اور سپر مارکیٹس نظر آتی ہیں۔ زیادہ تر جاپانیوں کے لیے جنگ کے بعد والا دور عرصہ قبل ختم ہو چکا ہے۔ کم از کم ہم یہی سوچتے ہیں..... لیکن سمیکو اور کوبایاشی جیسی بوڑھیوں اور بوڑھوں کے لیے ہرگز نہیں۔ ایٹم بم کے ایسے Survival اب بھی زندہ ہیں۔

جاپان کے جس شہر کوکورا میں میری رہائش تھی، اس کے ایک طرف ناگاساکی اور دوسری سمت ہیروشیما ہے۔ جہاں اب بھی اس واقعے کے متاثرین اور ذہنی مریض موجود ہیں۔ سمیکو اور کوبایاشی سے تو کوکورا ہی میں ملاقات ہوئی تھی۔ کیونکہ ان کی رہائش بھی وہیں تھی۔ 1980ء کے دنوں میں میری ان سے پہلی ملاقات شمونوسیکی میں ہوئی تھی۔ وہ شہر کوکورا سے اتنے فاصلے پر ہے جیسے دادو سے سیہون یا ہالہ سے حیدرآباد!

وہ اب بھی اس حادثے کا ذکر بڑی اذیت سے کرتے ہیں۔ ان کی عمریں نوے سال سے زیادہ ہو چکی ہیں۔ ان لوگوں کی یہ تکلیف کب ختم ہوگی؟ کیا اس وقت، جب یہ زندگی سے ناتا توڑ لیں گے..... یا اس وقت، جب یہ خطرناک نیوکلیئر بیلنس سیٹ ہوگا؟ نہیں..... شاید تب بھی نہیں! ان کی ذہنی اذیت اس وقت ختم ہوگی جب ان کا خواب، ایٹمی ہتھیاروں سے پاک اور پُرسکون دنیا، شرمندۂ تعبیر ہوگا۔ تاکہ آیندہ کوئی اس اذیت سے نہ گزرے۔

''ایسا کیوں ہے کہ دنیا کی فوجی قوتیں آج بھی انتہائی خطرناک..... ایٹمی ہتھیاروں کو حاصل کرنے کی دوڑ میں شریک ہیں؟''

اس سوال کے جواب میں ایک جاپانی دانشور نے جو بات کہی تھی، وہ سب کے دل کی آواز ہے۔

''ہر قوم کا نصب العین عوام کی خوشحالی اور سکون ہونا چاہیے اور سائنسی ایجادات کو انسانی فلاح و بہبود کے لیے استعمال میں لانا چاہیے نہ کہ تباہی اور بربادی کے لیے.....''

کہتے ہیں کہ ایٹم بم کا فارمولا ایجاد کرنے والے سائنس داں البرٹ آئن اسٹائن نے کہا تھا۔

''اگر مجھے دوبارہ زندگی ملی تو میں سائنس دان ہونے کے بجائے پلمبر ہونا پسند کروں گا۔''

''میری بیٹی کو مجھ سے بچھڑے آج ساٹھ برس ہو چکے ہیں۔ وہ 9 اگست 1945ء کو ایٹم بم کا شکار ہوئی تھی۔'' نوے برس کی ضعیف خاتون یائیکو نے آنسو بہاتے ہوئے بتایا ''وہ اگر کسی بیماری کا شکار ہو کر یا کسی حادثے میں مر جاتی تو شاید اس کی جدائی کا غم مجھے اس طرح شکستہ نہ کرتا لیکن ایٹم بم کے دھماکے اور ایٹمی لہروں کی حدت کے سبب اس کی بے دردی کی موت کا غم میں پوری زندگی فراموش نہیں کر سکی اور میری آیندہ زندگی میں بھی یہ دکھ مجھے کچوکے لگاتا رہے گا۔ لوگ کہتے ہیں کہ وقت کا مرہم بڑے سے بڑے زخم کو بھی مندمل کر دیتا ہے ممکن ہے وہ ٹھیک ہی کہتے ہوں لیکن میرا دل اس کی نفی کرتا ہے۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی میرا دل زخموں سے چور چور ہے۔ جوں جوں میں بوڑھی ہوتی جا رہی ہوں، میری پیاری بیٹی کی جدائی کا غم میرے دل کو اپنی گرفت میں لیتا جا رہا ہے، میرے دکھ میں شدت آتی جا رہی ہے۔''

یائیکو کا مکان ہیروشیما میں بم گرنے والے مقام سے تقریباً تین میل مشرق میں Mukainda کے علاقے میں ہے۔ وہ سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے انتہائی دکھی لہجے میں بتانے لگی۔

''میری بیٹی ان ایام میں ہائی اسکول کے دوسرے سال میں تھی اور وہ اپنی کلاس فیلوز کے ساتھ مل کر شہری کاموں میں ملٹری والوں کی مدد کرتی تھی۔ اس کی دو سہیلیاں تھیں جو ہمارے ... ہی محلے میں رہتی تھیں۔ وہ روزانہ صبح ساڑھے چھ بجے ان کے ساتھ کام کے لیے روانہ ہوتی تھی لیکن اس دن، جس دن ہیروشیما پر بم گرا معلوم نہیں کیوں میری بیٹی اپنی سہیلیوں کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ جب وہ میری بیٹی کو لینے کے لیے ہمارے گھر آئی تھیں تو اس نے کہا تھا۔ ''تم لوگ جاؤ، میں آدھے گھنٹے کے بعد آؤں گی۔''

''وہ چند لمحے تک اپنی ایک تصویر کو دیکھتی رہی جس میں وہ اپنے باپ کے ساتھ کھڑی تھی۔ میں نے اس کی بڑبڑاہٹ سنی تھی۔ وہ تصویر کو دیکھتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں بول رہی تھی ''میں کتنی خوبصورت لگ رہی ہوں؟''

''پھر وہ تصویر کو میز پر چھوڑ کر ڈیوٹی پر روانہ ہو گئی۔ اس کے پیروں میں جاپانی سینڈل ''زوری'' (Zori) تھے اور اس نے نصف بازوؤں والا بلاؤز پہنا ہوا تھا۔ جبکہ وہ عام طور پر ایسا لباس نہیں پہنتی تھی..... اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں اپنی بیٹی کو آخری مرتبہ دیکھ رہی ہوں اور پھر جب ہیروشیما پر بم گرا تو گویا پوری دنیا ہی بدل گئی۔ کیا سے کیا ہو گیا۔ ایٹمی تابکاری نے قیامت برپا کر دی تھی۔ جگہ جگہ لاشوں کے ڈھیر تھے اور جھلسے ہوئے لوتھڑوں کی صورت میں زندہ لاشیں زندگی کے لیے تڑپ رہی تھیں۔ انسانی جسموں کے بریدہ اعضا درختوں کی شاخوں اور بجلی کے تاروں پر جھول رہے تھے۔ میں دیوانوں کی طرح شہر کی گلیوں میں اپنی بیٹی کو تلاش کرتی رہی۔

''ہیروشیما کھنڈر ہو چکا تھا۔ ایک ہنستا بستا آباد شہر لمحوں میں قبرستان بن گیا تھا اور قبرستان بھی ایسا جس نے لاشیں باہر اگل دی ہوں۔ لاشوں سے اٹھنے والا تعفن ناقابلِ برداشت تھا۔ جہاں سے بھی میرا گزر ہوتا لاشوں کے درمیان جھلسے ہوئے اور زخمی انسانوں کی چیخیں، آہیں اور کراہیں سنائی دیتی تھیں۔ اس دن گویا ہر انسان بے بس تھا۔ کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ زخمی لوگ بھی موت سے

ہمکنار ہوتے چلے گئے۔ کثیر تعداد میں لاشیں کوئلہ کی صورت اختیار کر چکی تھیں۔ زندہ لوگ پانی کے لیے تڑپ رہے تھے۔ میں ان کے درمیان ڈگمگاتے قدموں سے گرتے پڑتے اپنی بیٹی کو تلاش کرتی رہی۔ میں چیخ چیخ کر اس کا نام پکارتی تھی، اس امید پر کہ شاید وہ زخمی حالت میں کہیں پڑی ہو اور میری پکار کا جواب دے..... آخرکار میں مایوس ہو کر گھر واپس آ گئی۔ دل میں ایک مبہم سی امید مجھے سہارا دیے ہوئے تھی کہ شاید وہ گھر پہنچ گئی ہو..... لیکن وہاں پہنچ کر مجھے پتا چلا میرا گھر بھی کھنڈر ہو چکا تھا اور میری بیٹی کہیں نہیں تھی۔ میں وہاں سے بیٹی اور پاگلوں کی طرح دوڑتے ہوئے اسے آوازیں دیتی گلی گلی میں بھٹکتی رہی۔"

یانگیوا اپنے شہر ہیروشیما پر ایٹم بم گرنے کی روداد سنا رہی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں جاپان کے کئی شہروں پر متحدہ قوتوں کی جانب سے چھوٹے بڑے بم گرائے جا رہے تھے لیکن ہیروشیما پر کبھی اس سے قبل بم نہیں گرایا گیا تھا۔ تین دن قبل، یعنی چھ اگست 1945ء کی صبح سوا آٹھ بجے ناگاساکی پر بم گرایا گیا تھا جس کے نتیجے میں تقریباً ایک لاکھ افراد آناً فاناً لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ اس کے بعد چند ہی دنوں میں ایٹمی تابکاری اور حدت کے باعث مزید تقریباً ایک لاکھ افراد تڑپ تڑپ کر مر گئے تھے۔ جو افراد زندہ بچ گئے تھے، ان پر Radiation کا اس قدر اثر ہوا کہ وہاں کے لوگ آج تک کینسر کی ایک ایسی قسم کا شکار ہوتے ہیں کہ اس قسم کا کینسر دنیا کے کسی دوسرے ملک میں نہیں ہے۔

ہیروشیما پر جو بم گرایا گیا تھا اس میں یورینیم شامل تھا۔ جبکہ ناگاساکی پر گرائے گئے بم میں پلوٹونیم شامل تھا۔ چھ اگست کے دن ناگاساکی پر بم گرایا گیا تھا اور اس کے تین دن بعد ہیروشیما کو نشانہ بنایا گیا۔ 2 ستمبر کو جاپانیوں نے سرینڈر کیا۔ آج تک یہ بات زیرِ بحث رہتی ہے کہ کیا ایٹم بم گرایا جانا ضروری تھا؟ بم گرنے کے بعد جاپانیوں نے جنگ بند کر دی۔ کیا بم گرانے کے بجائے وارننگ دینا مناسب نہ تھا؟ اگر جاپان کے پاس بھی ایٹم بم موجود ہوتا تو کیا جواباً وہ اسے استعمال کر کے بہت بڑی تباہی نہ مچاتا، وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال ہیروشیما اور ناگاساکی پر جو دو ایٹم بم گرائے گئے تھے، وہ ٹوٹل 83 کلو TNT کے حامل تھے۔ جنہوں نے جاپان جیسی طاقت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا اور آج ایٹمی ہتھیاروں کی قوت 50 میگاٹن کے برابر ہے۔ یعنی ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے گئے بموں سے ایک ہزار گنا زائد تباہ کن!

اس قسم کے تباہ کن ہتھیار اس دھرتی پر موجود ہیں!

"دن گزرتے رہے۔ میری حالت پاگلوں جیسی ہوتی گئی۔ کاش کوئی میری بیٹی سے مجھے ملا دے.....! وہ نہ جانے کہاں ہو گی؟ کس حال میں ہو گی؟ کوئی مجھے اس کے بارے میں بتائے۔" یانگیوا کہتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو دینے لگی۔

"ہیروشیما کے درمیان سے گزرنے والی ندی کے کنارے پر جس وقت میں اپنی بیٹی کو تلاش کر رہی تھی، وہاں مجھے کچھ سپاہی نظر آئے تھے۔ وہ ایک بانس پر بندھے ہوئے ہک کے ذریعے دریا میں بہتی ہوئی لاشوں کو کھینچ کر باہر نکال رہے تھے۔ وہاں سیکڑوں کی تعداد میں لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ میں ان سپاہیوں کے قریب کھڑی ہو گئی اور ہر لاش کو غور سے دیکھنے لگی، اس خیال سے کہ ان نکالی جانے والی لاشوں میں شاید میری بیٹی کی بھی لاش ہو۔ زیادہ تعداد ایسی لاشوں کی تھی جو شناخت کے قابل نہیں تھیں۔ بہرحال ان میں میری بیٹی کی لاش نہیں تھی۔"

"انہی دنوں ایک کالج کا اسٹوڈنٹ میرے پاس آیا۔ اس نے بتایا کہ فلاں پہاڑ پر واقع ایک مندر میں ایک بوڑھا بدھ بھکشو رہتا ہے۔ ممکن ہے وہ میری "گمشدہ" بیٹی کے بارے میں کچھ بتا سکے۔ یہ سن کر میں اسی وقت پہاڑ کی طرف چل دی تھی۔ میرا جسم کانپ رہا تھا۔ بھوک پیاس سے میری بری حالت تھی لیکن میں اپنی بیٹی سے ملنے کی خاطر سب کچھ فراموش کیے ہوئے تھی۔ آخرکار دور ہی سے پہاڑ پر روشن چراغ کی روشنی نظر آ گئی۔ میں اس طرف چلتی رہی۔ مجھے ایک مندر دکھائی دیا۔ میں جیسے ہی مندر میں داخل ہوئی، ایک نیم برہنہ بھکشو نے چیخ کر کہا۔

"تم اپنی بیٹی کی تلاش میں نکلی ہو میں سچ کہہ رہا ہوں نا؟ وہ تو اسی دن "آؤکی باشی" میں مر گئی تھی۔ البتہ تمہارا شوہر ابھی تک زندہ ہے۔ ممکن ہے، مرنے سے بچ جائے۔"

"اس کی زبانی "آؤکی باشی" کا نام سن کر میں اسی وقت اس طرف روانہ ہو گئی۔ وہاں بھی ہر طرف سوختہ لاشوں کے ڈھیر تھے۔ ہر چیز کوئلہ بنی نظر آ رہی تھی۔ گھر، دکانیں، درخت، انسان یعنی ہر چیز جل کر بھسم ہو گئی تھی۔ وہاں چلنا بھی بہت کٹھن تھا لیکن میں ہمت کر کے آگے بڑھتی رہی۔ میں تلاشی نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھتی جا رہی تھی لیکن مجھے ایسی کوئی لاش نہیں ملی جس پر مجھے اپنی بیٹی کا شبہ ہوتا۔

"اسی تلاش میں کئی دن گزر گئے تھے لیکن مجھے کہیں سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ زندہ ہے یا مر چکی ہے اور اگر وہ مر چکی ہے تو میں اس کی لاش کو کہاں تلاش کر سکتی تھی۔ ایک پڑوسی کے گھر میں مجھے شہنشاہ جاپان کے براڈکاسٹ کیے ہوئے

اعلان کے بارے میں معلوم ہوا۔ میں دربدر بھٹکنے کے بعد ستانے کے لیے وہاں پہنچی تھی۔ اعلان میں بتایا گیا تھا۔

"اب جنگ ختم ہو چکی ہے۔"

گویا انسانیت کے خاتمے کے بعد یہ "خوش خبری" سنائی جا رہی تھی۔

بہرحال میں ایک بار پھر نکل کھڑی ہوئی۔ ریڈ کراس اسپتال کے مین گیٹ کے باہر سوختہ لاشوں کے ڈھیر میں سے ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی "اوہاسان، اوہاسان۔" (میڈم، میڈم)

"وہ ایک لڑکی تھی جو مجھے پکار رہی تھی۔ میں اس کے قریب گئی اور اس کے گلے میں پڑی ہوئی نام کی تختی (Name Tag) پر "سونی" نام پڑھ کر حیران رہ گئی۔ وہ میری بیٹی کی دوسہیلیوں میں سے ایک تھی جو اسے روزانہ صبح کے وقت ڈیوٹی پر جانے کے لیے لینے آتی تھیں۔ وہ بے چاری اس قدر جھلس چکی تھی کہ اس کی پسلیوں کی ہڈیاں دکھائی دے رہی تھیں جن سے وہ نام کی تختی چپٹی ہوئی تھی۔

"اوہاسان! میزو کدا سائی۔" (میڈم! مجھے پانی پلائیے) اس نے کمزوری آواز میں مجھ سے کہا۔ میں اس دوران میں لپک کر اسے اپنے بازوؤں میں لے چکی تھی۔ میرے پاس پانی کی بوتل تھی اور میں اس سے پانی نکال کر اسے پلانے ہی لگی تھی کہ اسپتال سے نکلنے والی نرس نے چیختے ہوئے کہا۔

"میڈم! اسے پانی مت پلائیے..... پانی پینے سے اس کی موت جلد واقع ہو جائے گی۔ آپ اتنی مہربانی کیجیے کہ اگر اس کے والدین میں سے کوئی زندہ ہے تو اسے بلوا لیجیے۔"

"میری بیٹی کی تلاش میں میرے پڑوسی بھی میرے ساتھ آئے تھے۔ ان میں سے ایک خاتون اس لڑکی کے ماں باپ کو بلانے کے لیے دوڑ گئی۔ ایک اس کے پاس رک گئی اور میں اپنی گمشدہ بیٹی کی تلاش میں آگے بڑھ گئی۔

"میں "موتو یاسو" ندی کے کنارے کنارے چلتی رہی اور دوبارہ "آؤکی باشی" آ گئی۔ جہاں مرنے والوں کی لاشوں کو خود آگ کے حوالے کیا جا رہا تھا۔ ان لاشوں کی گردن میں ہار کی طرح لٹکنے والی لوہے کی پلیٹیں ایک جانب ڈھیر کی صورت میں رکھی ہوئی تھیں جن پر ان کے نام لکھے ہوئے تھے۔ میں نے ان میں سے سیکڑوں نام پڑھ لیے لیکن افسوس کہ میری بیٹی کا وہاں نام و نشان تک نہیں تھا البتہ نام پڑھ کر مجھے یہ معلوم ضرور ہو گیا کہ ان لاشوں میں میری بیٹی کے ٹیچرز، کلاس میٹ اور دوسرے اہم لوگ شامل تھے جن میں سے بعض کو میں جانتی تھی۔

"میں نے کئی دن تک اپنی بیٹی کی تلاش جاری رکھی لیکن وہ نہ مل سکی اور نہ ہی اس کے بارے میں کوئی خبر ملی۔ ایک دن میری بیٹی کی ایک کلاس فیلو لاشوں اور کھنڈروں میں اپنے کسی عزیز کو تلاش کرتی نظر آئی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں "ہیروکو" کی ماں ہوں۔ یہ سنتے ہی وہ روتے ہوئے بولی۔ "آپ کس کو ڈھونڈ رہی ہیں..... ہیروکو کی تو پہلے ہی دن بم کے دھماکے میں مر گئی تھی۔"

یہ کہہ کر وہ یکا یک خاموش ہو گئی اور پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ شاید وہ لرزہ خیز نظارہ اس کے تصور میں ابھر آیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ لہرا کر گرنے لگی۔ میں نے زمین پر گرنے سے پہلے ہی اسے اپنے بازوؤں میں سنبھال لیا تھا۔ پھر میں اسے بے ہوشی کی حالت میں اپنے کندھے پر اٹھا کر قریبی ایسوسی ایشن کے آفس لے گئی تھی۔

اپنی بیٹی کی لاش نہ ملنے پر میں دوسروں کی نذرِ آتش کی گئی لاشوں کی راکھ اٹھا کر گھر لے آئی اور ایک پیالے میں رکھ لی۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ گھر کا ایک پیارا اور عزیز ترین فرد لاپتا ہو جائے اور پیالے میں مرنے والوں کی راکھ کا ذرہ بھی نہ ہو!

اس دوران میں ایک طرف تو کھانے کو کچھ دستیاب نہیں تھا اور دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ میرا گھر ٹوٹ پھوٹ گیا تھا اور رہنے کے قابل نہیں رہا تھا اور اپنی پیاری بیٹی کی جدائی نے میرے دل میں ایک عجیب قسم کا خوف پیدا کر دیا تھا۔ میری نیند اڑ گئی تھی لیکن طویل وقفے کے بعد اونگھ بھی آ جاتی تو خواب میں خوفناک مناظر دیکھ کر چیخ کر اٹھ بیٹھتی تھی۔ آخرکار کئی دنوں کی بے چینی کے بعد میں اکیونی شہر، اپنے بھائی کے گھر چلی گئی جو ہیوگو پریفیکچر میں ہے۔

"میں وہاں تھوڑا ہی عرصہ رہی تھی۔ کوئی ملازمت نہ ملنے کے سبب میں وہاں سے اوبی شہر چلی آئی جو ہونشو جزیرے کے انتہائی مغربی حصے میں واقع ہے۔ مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ میرا شوہر زندہ ہے لیکن میں اس کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی تھی، پھر بھی مجبور تھی۔

"مجھے گزر بسر کے لیے بہت جدوجہد کرنی پڑی۔ میں لوگوں کے کپڑے سی کر اور کچھ چیزیں بلیک مارکیٹ میں فروخت کر کے کچھ رقم حاصل کر لیتی تھی۔ اس دوران میں ایٹمی تابکاری کے سبب میرے جسم میں پیدا ہونے والی بیماریوں کی علامات ظاہر ہونے لگیں۔ میری ہر وقت نکسیر بہتی رہتی تھی اور جسم سے خون کا جریان بھی جاری ہو گیا۔ وہ نرس جو مجھے انجکشن لگاتی تھی؟ اس نے مجھے زچگی کے مرحلے تک

پہنچنے سے منع کیا تھا لیکن دو سال کے بعد میں امید سے ہوگئی۔ پھر میں دوبارہ اپنے بھائی کے گھر اکیونبی میں جا کر رہنے لگی۔ وہیں میں نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔

''میری گرتی ہوئی صحت سنبھلنے کے بجائے دن بہ دن مزید خراب ہوتی چلی گئی۔ تب میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے کسی بڑے شہر میں جا کر رہنا چاہیے۔ وہاں مجھے کم از کم طبی سہولیات تو بہ آسانی دستیاب ہوسکتی تھیں۔ اس خیال کے تحت میں نے اپنے بیٹے کو بھائی کے گھر پر چھوڑا اور خود ''ٹشی نومیا'' شہر آ گئی۔ وہ 1957ء کا زمانہ تھا۔ ٹشی نومیا میں میری چار خالائیں رہتی تھیں اور اس شہر میں خاصی تعداد میں اسپتال قائم تھے جہاں میں کام کرسکتی تھی۔

''دو برس کے بعد میں نے اپنے بیٹے کو بھی وہیں بلوالیا اور اس سرکاری رہائش گاہ میں رہنے لگی جو ان بچوں کے لیے تھا جن کے باپ نہیں تھے۔ میں نے اپنے نکمے شوہر کو طلاق دے دی تھی۔ وہ کوئی کام نہیں کرتا تھا اور مجھے کما کر اسے کھلانا پڑتا تھا۔

وہ انتہائی مشکل زندگی تھی جو میں گزار رہی تھی۔ ایک طرف اپنے بچے کی فکر تھی تو دوسری جانب اپنے علاج معالجے کا انتظام بھی کرنا پڑتا تھا۔ میں یہاں کا روایتی لباس کیمونوسی کرا اپنے اخراجات پورے کرتی تھی۔ اس کے علاوہ دوسرے کام بھی کرتی تھی۔ میں ہفتے میں ایک مرتبہ اسپتال کے کپڑے دھونے جاتی کیونکہ اسپتال میں کام کرنے سے یہ تسلی ضرور ہوتی تھی کہ اگر کام کے دوران میں بے ہوش ہوگئی تو میرا ضرور خیال رکھا جائے گا۔

''آج میں وہ دن یاد کرتی ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان ایام میں، میں دواؤں کے سہارے زندہ تھی۔ روزانہ مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا پڑتا تھا۔ میرے کئی آپریشن ہوچکے تھے۔ کان، ناک، آنکھوں اور پیٹ کے آپریشن ہوتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھے مسلسل دو مہینے اسپتال میں رہنا پڑا تھا۔

''اب میری ساعت تقریباً جواب دے چکی ہے اور میں بینائی سے تو محروم ہو ہی چکی ہوں، رقیق چیزوں کے علاوہ کچھ نہیں کھا سکتی۔ بہرحال اس کے باوجود میں خوش ہوں۔ میں اپنے بیٹے کی فیملی کے ساتھ رہتی ہوں۔ اب میرا بیٹا اکیاون برس کا ہوچکا ہے۔ میرے چار پوتے اور پوتیاں ہیں۔ میں پانچ، چھ مرتبہ ہیروشیما جا چکی ہوں۔ واپسی پر ہر مرتبہ میرا دل غم سے بوجھل ہوتا ہے۔ مجھے ہر وقت اپنی پیاری بیٹی کی یاد ستاتی ہے..... آج بھی میرے دل میں یہ امید سر اٹھانے لگتی ہے کہ شاید اچانک کہیں سے میری بچی آ جائے اور اپنی پیاری اور سُریلی آواز میں مجھے ''ماں'' کہہ کر پکارے۔'' کبھی کبھی یہ خیال مجھے دیوانہ سا بنا دیتا ہے۔'' یہ کہہ کر ضعیف خاتون بالکل خاموش ہوگئی۔

یہاں نقاش کاظمی کا قطعہ تحریر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہوں۔ قطعے کا عنوان ہے ''نئے دھماکے''

ہیروشیما کی خاک اور راکھ کو دیکھ
آدمیت کی بھی شکست ہے یہ
ایشیا کے نئے دھماکے سن
ناگاساکی کی بازگشت ہے یہ

☆☆☆

میں دوپہر کے وقت گھر پہنچا تو بیگم نے بتایا کہ میری غیر موجودگی میں ''ہوسٹ مدر'' نعومی کا فون آیا تھا۔

''کل اس کے بیٹے کے اسکول میں کوئی فنکشن ہے۔ اس نے ہم سب کے لیے کہا ہے کہ ضرور چلیں۔ وہ انتظار کرے گی لیکن میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ مریم سمیت ہم سب بڑی ہیں۔'' میری بیوی مستوراں نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

میں نے فرحت محسوس کرتے ہوئے سکون کا سانس لیا۔

''یہ تم نے بہت اچھا کیا، خواہ مخواہ اسکول جا کر پورا دن ضائع ہوگا۔ یقیناً نعومی کے بیٹے یوجی کا گریجویشن ڈے ہوگا یا والدین کا دن ہوگا۔''

''وہ فنکشن کے بارے میں بتا تو رہی تھی لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ مجھے اس کی انگریزی سمجھ میں آتی ہے نہ جاپانی۔ بہرحال اتنا سمجھ میں ضرور آیا کہ وہ کم سے کم آپ کے آنے پر اصرار کررہی تھی۔ بار بار ایک جملہ دہرا رہی تھی ''میں انتظار کروں گی، الطاف کو ضرور آنا چاہیے۔''

''اوہ.....!'' میں نے گہرا سانس لے کر کہا ''یوجی کا اسکول بہت دور ہے۔ جب ہم نعومی کے گھر سے چلے تھے تو اس نے بتایا تھا کہ اس کے بیٹے کا اسکول ''توباتا'' شہر سے بھی خاصے فاصلے پر شاید ''یاماتا'' میں ہے..... بس، مجھ سے یہ غلطی ہوگئی تھی کہ میں نے اس کے بیٹے کی انگریزی کی تعریف کردی تھی اور کہا تھا کہ اس کا اسکول بھی یقیناً بہت اچھا ہوگا جہاں ایسی اچھی انگریزی پڑھائی جاتی ہے۔''

''پھر آپ کو ضرور جانا چاہیے۔ آپ جاپانیوں کی عادات سے واقف ہیں۔ اس نے اسی دن پروگرام بنایا ہوگا۔ ممکن ہے کوئی ایسا فنکشن ہو جس کے ٹکٹ یا دعوت نامے خریدنے کے لیے اس نے رقم خرچ کی ہو۔''

مستوراں نے مجھے یہاں کے مکمل حالات سے آگاہ کیا اور میں اگلے دن نعومی کے بیٹے یوجی کے اسکول جانے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ کرنے لگا۔

رات کو نعومی کا دوبارہ فون آیا ''میں آپ کو لینے کے لیے صبح آٹھ بجے آؤں گی کیونکہ نو بجے تک ہمیں اسکول پہنچنا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں آپ کو تیار ملوں گا۔'' میں نے کہا اور دل ہی دل میں سوچا کہ آدھی مشکل آسان ہوگئی۔ یعنی یہاں سے کوکورا ریلوے اسٹیشن جانے اور ٹکٹ خرید کر اسکول تک جانے کے بجائے وہ مجھے اپنی کار میں لے جارہی تھی۔

ٹھیک آٹھ بجے نعومی ہمارے ہاں پہنچی۔ وہ اپنے گھر میں کاشت کی ہوئی سبزیوں میں سے دو ٹوکری اور دو عدد گاجریں تحفتاً ہمارے لیے لائی تھی۔ جب سبزیاں سستی ہوتی ہیں تو تین ٹوکری، تین گاجریں یا تین ٹماٹر کم سے کم سو ئین کے ہوتے ہیں۔ مہنگائی کی صورت میں دو ٹوکری کی قیمت سو ئین (پچاس روپے) ہوتی ہے۔ ہم نے پُرجوش انداز میں اس کا تحفہ قبول کیا ''بائے دو موا ری گا تو گذائی ماس'' (یہ لانے کے لیے آپ کا شکریہ)

حالانکہ ابتدائی دنوں میں جاپانی عورتوں کا ایک یا دو ٹماٹر یا ہری مرچ ہمیں پیش کرنا خاصا مضحکہ خیز لگتا تھا اور ہمیں حیرت ہوتی تھی۔ جاپان میں سبزیوں، پھلوں اور اناج کی قلت ہے بلکہ وہاں ان چیزوں کا کال ہی سمجھیے۔ اب جا کر ہوائی جہاز اور سمندری سروس میں تیزی آنے کے باعث اور جاپان کے مالی طور پر خوشحال ہونے کے سبب یہ چیزیں دوسرے ملکوں سے منگوائی جاتی ہیں۔ اس سے پہلے صدیوں تک جاپان میں ابلے ہوئے چاول بھی بڑی عیاشی سمجھی جاتی تھی۔ ان دنوں میں جاپانی کسی دوسری چیز کے بارے میں سوچتے ہی نہیں تھے۔ محض سادہ قسم کے کھچڑی بھر چاول کی دستیابی ان کے لیے بڑی بات تھی۔ یہاں کا لٹریچر اس بات کا گواہ ہے۔ جاپان کی لوک کہانیوں سے رومانوی افسانوں تک میں اس بات کا ذکر موجود ہے۔

بہرحال نعومی نے جلدی جلدی کافی پی اور ہم روانہ ہونے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کے بیٹے کا اسکول یاماتا شہر میں تھا، جہاں پہنچنے کے لیے اس نے ''ارابن ہائی وے'' کے راستے 500 ئین کے ٹکٹ کی بچت کی اور جلدی پہنچنے کے لیے تقریباً دو ہزار ئین کا فالتو پیٹرول خرچ کرنا قبول کیا تھا۔ وہ عام راستوں سے، قصبوں اور بستیوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے یاماتا کی طرف بڑھنے لگی۔ گویا وہ مجھے مختلف علاقوں کی سیر کراتے ہوئے اسکول کی جانب لے جارہی تھی۔ میں نے دل میں سوچا کہ اچھا ہی ہوا جو میں اس کے ساتھ چل دیا تھا۔ پھر اسکول پہنچ کر مزید اچھا ہوا کہ اگر میں آج یہاں نہ آتا تو نہ صرف میں بلکہ شاید میرا ملک بھی تنقید کا نشانہ بنتا۔

اسکول میں کوئی اہم دن نہیں منایا جارہا تھا بلکہ سادگی کا پیکر مادام نعومی نے اسکول والوں پر میری معرفت اپنی دھاک بٹھانے کے لیے، ان سے کہا تھا کہ ایک پاکستانی مصنف یہاں آیا ہوا ہے جس کی پچاس ساٹھ کتابیں چھپ چکی ہیں اور وہ ایجوکیشنل فیلڈ سے متعلق رکھتا ہے۔ اسے یہ اسکول دیکھنے کا بڑا اشتیاق ہے۔

اسکول کا پرنسپل ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ ہم جیسے ہی اسکول کے داخلی دروازے پر پہنچے، اسکول کا وائس پرنسپل مسٹر ماساؤ اپنے فزکس کے پروفیسر اور سیکریٹری کے ساتھ ہمارا استقبال کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ یہاں تک میرا یہی خیال تھا کہ شاید تمام مہمانوں کو اسی طرح ریسیو کیا جارہا ہے۔ لیکن جب ہم اسکول کے دروازے سے گزر کر اندر داخل ہوئے تو سامنے والے ہال کے شیشے کے دروازے پر مجھے تقریباً تین فٹ کا پاکستانی جھنڈا بنا ہوا نظر آیا۔ اس جھنڈے کے اوپر اور دائیں بائیں کی دیواروں پر Welcome to our School لکھا تھا۔ اس کے اردگرد کوئی دوسرا جھنڈا نہیں تھا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ یہاں کوئی فنکشن وغیرہ نہیں ہے بلکہ خاص طور پر مجھے بلوایا گیا ہے۔

اندر آفس میں دوسرے لوگوں سے ملنے کے بعد مجھے گیسٹ روم میں بٹھایا گیا۔ جہاں چائے اور بسکٹوں کا دور چلا اور مسٹر ماساؤ مجھے اپنے اسکول کے بارے میں بتاتا رہا اور مجھ سے میرے بارے میں اور میرے ملک کے بارے میں بھی عمومی سوالات کرتا رہا۔

گفتگو کے دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ مادام نعومی نے پہلے ہی میرا تعارف ان سے کرا دیا تھا، بلکہ ''ٹھیک ٹھاک'' قسم کا تعارف کرایا تھا۔ میں ان کی زبانی اپنے بارے میں بڑی بڑی باتیں سن کر اپنے آپ کو اجنبی سا محسوس کرنے لگا۔ مادام نعومی کے پاس جاپان کے متعلق لکھی ہوئی میری دو کتابیں ''جاپان رس'' اور ''جاپان جن کے مَن میں'' موجود تھیں۔ اس نے ان میں سے ایک کتاب اسکول والوں کو تحفتاً دی تھی۔

چائے پینے کے بعد مجھے اسکول دیکھنے کی دعوت دی گئی۔ وہ مجھے جس کلاس میں بھی لے گئے وہاں کے بلیک بورڈ

فزکس اور کیمسٹری کے اسکیچز اور Equations سے بھرے ہوئے تھے۔ تین کلاسوں میں انگریزی پڑھائی جارہی تھی۔ وہاں بھی پورا بورڈ، گرامر، نگیٹو اور پازیٹو جملوں یا دوسری چیزوں سے پُر تھے۔ بعد میں میری سمجھ میں آیا کہ کلاس کے ہر ٹیچر کو خبردار کیا گیا تھا کہ ایک بیرون ملک کا مصنف اور انجینئر اسکول میں آرہا ہے جس کا تعلق ٹیچنگ سے ہے لہٰذا ہر ایک بہتر شو پیش کرنے کے لیے بہترین کارکردگی کا اظہار کررہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا کہ یہ اچھا ہی ہوا کہ آج میں یہاں چلا آیا..... یہ سوانگ صرف اور صرف میرے لیے سجایا گیا ہے!

ہر کلاس میں مجھے ٹیچر اور کلاس کے بچوں کے ساتھ انگریزی میں بات کرنے کا کہا گیا۔ جاپان میں جاپانیوں کو ان ہی کے بارے میں بتانے کے لیے میرے پاس ڈھیروں مواد تھا۔ میں انہیں اپنے جاپان آنے کے آغاز کی باتیں سنانے لگا۔ یہ ان دنوں کی باتیں تھیں کہ اسکول میں بیٹھے ہوئے طلبا وطالبات تو کیا انہیں پڑھانے والی کئی استانیاں بھی پیدا نہیں ہوئی تھیں کیونکہ ان میں سے کوئی بھی 25 یا 30 برس سے زیادہ عمر کی نظر نہیں آرہی تھی۔ ہر کلاس میں جاپان کے متعلق میرے تیس برس قبل یعنی 1973ء کے زمانے کے تجربات اور مشاہدات بڑے غور اور دلچسپی سے سنے گئے۔

کہیں میں قریبی بندرگاہوں تو باتا، موجی اور شمونوسیکی کی باتیں بتانے لگتا اور کہیں دور دراز کے شہروں مثلاً کوبے، اوساکا، نگویا، ٹوکیو، یوکوہاما، ہاچی نومی، ساسیبو وغیرہ کے قصے سنانے لگتا۔ نتسومی بہت خوش ہورہی تھی کہ اس کی عزت رہ گئی اور وہ اس خوشی کے موقعے پر جاپانی میں شکریہ ادا کرنے کے بجائے بار بار انگریزی میں ''شینک یو، شینک یو'' (تھینک یو تھینک یو) کہتی رہی۔

ایک کلاس میں اس کا بیٹا بھی تھا جس کے ساتھ بیٹھ کر فوٹو بنائے گئے۔ آٹھ دس کلاسز دیکھنے کے بعد ہم اسکول کی لائبریری اور لیبارٹری میں آگئے۔ میں وقفے وقفے سے اسکول والوں کی تعریف بھی کرتا رہا کہ نتسومی کا بیٹا اس اسکول میں پڑھنے کی وجہ سے اچھی انگریزی بول سکتا ہے..... اور اسی بات نے مجھے متاثر کیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ میرے دل میں اس اسکول کو دیکھنے کا اشتیاق ہوا، وغیرہ وغیرہ۔

اس موقعے پر مادام نتسومی کی ''شینک یو، شینک یو'' کی تسبیح میں مزید تیزی آجاتی تھی۔

جاپان جیسے ملک میں جہاں قصبوں اور گاؤں کے سرکاری پرائمری اسکول بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ وہاں [illegible] جیسے بڑے شہر میں اسکولوں کا معیار کیا کم ہوگا؟ مادام نتسومی [illegible] بیٹا وہاں کے کسی بھی اسکول میں تعلیم حاصل کرسکتا [illegible] کوکورا شہر کے شمال میں ریلوے اسٹیشن کے قریب [illegible] اور نتسومی قدرے مضافات میں، شمالی علاقے میں [illegible] یوں سمجھیے کہ وہ نارتھ ناظم آباد میں اور ہم صدر یا [illegible] تھے۔ نتسومی کے بیٹے کی تعلیم کے لیے کوکورا شہر [illegible] اور پرائیویٹ اسکول موجود تھے لیکن وہ روزانہ اپنے [illegible] کوکورا سے تقریباً پچاس میل دور یاہاتا کے اس [illegible] بھیجتی تھی۔ اس اسکول کا نام ''کیشو انٹرنیشنل یونیورسٹی [illegible] اسکول'' تھا۔ یہ خوبصورت درختوں اور چھوٹوں سے [illegible] ہوئی پہاڑی کی بلندی پر لاہور کے ''ایچی سن'' قسم کے اسکول کی طرح ایک پرائیویٹ اور ''کلاس'' قسم کا اسکول ہے جہاں کے اخراجات نواب، رئیس اور جاگیردار یا راجا، مہاراجا قسم کے لوگ ہی برداشت کرسکتے ہیں میرا مطلب تقسیم سے قبل کے ایچی سن اسکولز سے ہے۔ جن میں صرف انگریزوں اور راجاؤں کے ہی بچے پڑھ سکتے تھے۔

بہرحال نتسومی کے پاس بھی پیسا بہت ہے اور بیٹا بھی اکلوتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس اسکول میں پڑھنے سے اس کا بیٹا انگریزی کے ساتھ ساتھ اچھی جاپانی بھی سیکھ جائے گا۔ اس کی طرح ''شینک یو'' کہنے کے بجائے درست تلفظ کے ساتھ ''تھینک یو'' کہہ سکے گا۔ اس اسکول کی بین الاقوامی اہمیت سے وہ بخوبی واقف تھی۔ اسے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ آج کے دور میں انگریزی سے واقفیت ضروری ہے۔ اسی لیے تو وہ خود بھی اس عمر میں انگریزی سیکھنے کے لیے ہر وقت ایک بھاری الیکٹرونک ڈکشنری اپنے پرس میں لیے پھرتی تھی۔ وہ ہم جیسے لوگوں سے زبردستی انگریزی بولنے کی کوشش کرتی، خواہ بعد میں ہم اس کی انگریزی پر ہنستے رہیں، اس بات کی اسے بالکل پروا نہیں تھی۔

واپسی پر لنچ کا وقت ہوگیا۔ مجھے اس ہال میں لایا گیا جہاں تقریباً ایک ہزار طلبا وطالبات کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ مختلف کلاسز کے طلبا ٹولیوں کی صورت میں اور کچھ تنہا وہاں آتے رہے۔ وہاں سیلف سروس تھی۔ اس لیے کاؤنٹر پر پیسے دے کر مطلوبہ کھانے کی چیزیں لی جاسکتی تھیں جس میں زیادہ تر سینڈوچ تھے۔ کچھ اسٹوڈنٹ چاروں طرف رکھی ہوئی وینڈنگ مشینوں سے اپنی پسند کی چیزیں اور ڈرنک نکال کر میز پر بیٹھ رہے تھے۔

میں نے دیکھا کہ معمولی سینڈوچ اور کولڈ ڈرنک وغیرہ کا

بل کسی بھی صورت میں ایک ہزار ین (پانچ سو روپے) سے کم نہیں تھا۔ ڈائننگ ہال میں داخل ہونے والے ہر بچے کے ہاتھ میں ایک ہزار ین کا نوٹ نظر آرہا تھا۔ میرے لیے اور میرے ساتھ احسن اور ایمان کے لیے مادام نتسومی ڈھونڈ کر چند چیزیں لے آئی جنہیں ہم کھا سکتے تھے۔ نتسومی کو معلوم تھا کہ مسلمان کون کون سی چیزوں سے احتراز کرتے ہیں۔ اس لیے وہ ڈبل روٹی کے دو سلائس لے آئی تھی جن کے بارے میں اسے یقین تھا کہ ''ٹھیک'' ہیں۔ یہاں کئی قسم کے کیک، بسکٹ اور ڈبل روٹیوں میں جو مکس آئل استعمال کیا جاتا ہے اس میں خنزیر کی چربی کی آمیزش ہوسکتی ہے جبکہ کھانے کی کئی چیزوں میں پورک لازمی شامل ہوتا ہے۔

وائس پرنسپل نے اس کا سبب جاننا چاہا تو مادام نتسومی نے نہایت بہتر انداز میں اسے بتایا کہ ان کے لیے مذہب کی جانب سے کچھ چیزیں ممنوع ہیں۔ مثلاً شراب اور کچھ دیگر چیزیں۔

واپسی پر تیز بارش شروع ہوگئی۔ اس قدر کہ سامنے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ کچھ دیر تک ہم گاڑی میں ہی بیٹھے رہے تاکہ بارش میں کچھ کمی آئے اور راستہ دکھائی دینے لگے تو سفر شروع کیا جائے۔

نتسومی نے پوچھا ''مسٹر الطاف! آپ کو اسکول کیسا لگا؟''

میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ''مادام! اتنے اخراجات میں، پاکستان جیسے ملک میں دس طالب علم میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کرسکتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ رہائش اور کھانے پینے کا خرچہ بھی پورا ہوسکتا ہے۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کا بیٹا انگریزی میں بھی قابل اور ماہر ہوجائے تو آپ اس پر جتنی رقم یہاں خرچ کررہی ہیں اس کے نصف میں آپ اسے تعلیم حاصل کرنے کے لیے آسٹریلیا یا نیوزی لینڈ بھیج سکتی ہیں۔''

''میں اس بات سے ڈرتی ہوں کہ معلوم نہیں وہاں کا ماحول کیسا ہو۔ میرا بیٹا کم عمری میں ہی غلط راہوں پر نہ نکل پڑے۔ اس لیے میں اسے امریکا یا انگلینڈ بھیجتے ہوئے بھی گھبراتی ہوں۔'' نتسومی نے کہا اور پھر یہ بھی بتایا کہ اس کا بیٹا اسکول کی جانب سے ایک ایک ہفتہ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی سیر کرآیا ہے۔

''ویسے تو میرا واسطہ بھی گزشتہ بیس برسوں سے درس وتدریس سے رہا ہے۔ میں نہ صرف جاپان کے اسکولوں اور تعلیمی نظام سے واقف ہوں بلکہ یورپ کے اچھے اور برے تعلیمی اداروں سے بھی آگاہ ہوں۔ دراصل اس اسکول کا صرف ظاہر دیدہ زیب ہے۔'' میں نے نتسومی کو آگاہ کیا۔

''ہاں، مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''صرف پیسا، پیسا..... ہر بات کے لیے پیسا مانگتے ہیں۔ میں اپنے اکلوتے بیٹے کو رف اور مف دیکھنا چاہتی ہوں لیکن یہاں نزاکتیں ہی نزاکتیں ہیں..... میری دلی خواہش ہے کہ یہ کہیں باہر جاکر تعلیم حاصل کرے۔''

''آپ کا خیال بالکل مناسب ہے۔'' میں نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''پھر، میں اسے کہاں بھیجوں؟''

''میرا مشورہ ہے کہ اس کے لیے سنگاپور بہتر رہے گا۔ یہ ملک یورپ اور امریکا سے بھی کئی باتوں میں بہتر ہے۔ تعلیمی نظام میں بھی اور امن وامان، صحت کے حوالے سے بھی۔ ویسے ملائیشیا بھی ایک ایسا ہی ملک ہے جسے Prefer کیا جاسکتا ہے۔ لیکن آپ جاپانیوں کے لیے سنگاپور ہی بہتر ہے' جہاں آپ کا بیٹا آپشنل سبجیکٹ میں چینی زبان لے سکتا ہے جو آپ کے لیے آسان ہے۔ چینی اور جاپانی ''کانجی'' (رسم الخط) یکساں ہے اور خرچ آسٹریلیا سے بھی کم آئے گا۔''

''وہ رواں سال اس اسکول میں مکمل کرلے، پھر میں آپ سے رابطہ کروں گی۔ پھر ہم دونوں چل کر اسے سنگاپور چھوڑ آئیں گے۔'' اس نے کہا اور میں نے اثبات میں گردن ہلادی۔

بارش کی موٹی موٹی بوندیں بدستور برس رہی تھیں لیکن اب اس کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ اب نہ صرف راستہ صاف نظر آرہا تھا بلکہ پہاڑ سے نیچے دیکھنے پر سمندر کی لہروں پر ہچکولے کھاتے ہوئے جہاز بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ہم پہاڑی کے پیچدار راستے پر سفر کرتے ہوئے نیچے آئے اور سڑک پر پہنچ کر اپنے شہر کوکورا کی جانب چل دیے۔ راستے میں پیش آنے والا ایک واقعہ اب بھی ذہن میں تازہ ہے..... بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اسکول کی اس روداد کو تحریر کرنے کا مقصد ہی یہی تھا۔ اگر میں اس مختصر سے واقعے کا مشاہدہ نہ کرتا تو شاید یہ مضمون تحریر کرنا ضروری نہ سمجھتا اور اسکول جانے کا قصہ دوسری کئی باتوں کی طرح فراموش ہوچکا ہوتا۔

اسکول کی چند کلاسز کی لنچ ٹائم میں چھٹی ہوچکی تھی۔ عام طور پر یہاں جاپان میں اسکول صبح آٹھ بجے سے شام پانچ بجے تک کھلے رہتے ہیں لیکن بعض دنوں میں چند کلاسز کی ایک یا دو گھنٹے قبل بھی چھٹی ہوجاتی ہے۔ اگر میوزک کی کلاس ہو یا پیراکی اور فٹ بال کھیلنے کا پیریڈ ہو تو ایک دو گھنٹے کی تاخیر بھی ہوجاتی ہے۔ ہم کھانا کھا کر نکلے تو بارش شروع ہوگئی تھی۔ اس دن بارش کی پیش گوئی بھی نشر نہیں کی گئی تھی۔ یہی سبب تھا کہ

ہم بھی اپنے ساتھ چھتریاں نہیں لائے تھے۔ اسکول والوں نے پیش کش کی تھی کہ وہ ہمیں اسکول کے کار پورچ سے مہمانوں کی کار پارکنگ تک اپنی گاڑی میں لے جا کر پہنچا دیتے ہیں لیکن نتسوی نے کہا کہ ہم کار تک دوڑ کر پہنچیں گے لہٰذا آپ لوگ زحمت نہ کریں۔

سب سے پہلے اس نے دوڑ لگائی اور جا کر اپنی کار کے دروازے کھولے۔ اس کے بعد ہم دوڑ کر کار میں جا بیٹھے۔ جب بارش کی رفتار کچھ دھیمی ہوئی تو راستے میں کئی بچوں اور بچیوں کی ٹولیاں پیدل جاتی نظر آئیں، جن کے گھر غالباً پہاڑ کے اردگرد کہیں قریب ہی تھے۔ کچھ چھتریاں لیے ہوئے تھے اور کچھ بغیر چھتریوں کے بارش میں بھیگتے چلے جا رہے تھے۔ ظاہر ہے بارش کی پیش گوئی نہ ہونے کے سبب وہ چھتریاں اپنے ساتھ نہیں لائے تھے۔ بہرحال وہ اپنے دوستوں کی چھتریوں کی آڑ میں چھپے ہوئے خود کو بھیگنے سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ہم تھوڑا آگے بڑھے تو ہم نے دیکھا چار لڑکیاں، جن کی عمریں چودہ پندرہ سال کے لگ بھگ ہوں گی، سڑک کے کنارے کنارے چلی جا رہی تھیں۔ ان میں سے دو کے پاس چھتریاں تھیں اور انہوں نے تیسری لڑکی کو اپنے درمیان میں لے لیا تھا۔ بے چاری چوتھی لڑکی جو قد میں ان تینوں سے قدرے چھوٹی تھی، وہ ان سے چار پانچ قدموں کے فاصلے پر سرد ہوا میں کپکپاتے اور بارش میں بھیگتے چلی جا رہی تھی۔ شاید آگے جانے والی تین لڑکیاں اس کی دوست نہیں تھیں۔ بہرحال ان کی بھی اپنی مجبوری تھی کہ دو چھتریوں کے نیچے تین افراد ہی آ سکتے تھے۔ اگر وہ چاہتیں تو ایک چھتری کے نیچے دو دو ہو کر بھی چل سکتی تھیں۔ اس طرح چاروں کا کسی حد تک بارش سے بچاؤ ہو سکتا تھا۔ کم سے کم وہ تنہا بچی سرد ہوا اور پانی سے بچ جاتی۔ جبکہ ہم نے کار کا ہیٹر آن کر رکھا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسکول سے نکلنے کے بعد ہی بارش نے انہیں آ لیا تھا اور ان کے لیے واپس لوٹنا بھی مشکل تھا۔

وہ گاڑی نتسوی کی تھی۔ وہ لڑکی، جس کے سر سے پیروں تک پانی ٹپک رہا تھا، نتسوی اسے اپنی کار میں بٹھا کر اس کی سیٹوں کو گیلا کرنا پسند کرے گی یا نہیں، میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

راستہ تنگ اور بل کھاتا ہوا تھا۔ ہم ان لڑکیوں کے پیچھے ہلکی رفتار سے اس انتظار میں چل رہے تھے کہ آگے چل کر کہیں سڑک کشادہ ہو تو گاڑی کی رفتار بڑھائی جائے۔ پھر جوں ہی سڑک پر کچھ گنجائش پیدا ہوئی، جہاں پر پیدل چلنے والوں اور گاڑیوں کو آسانی سے کراس کیا جا سکتا تھا، اچانک ہمارے پیچھے آنے والی ایک ٹیکسی نے ہمیں اوور ٹیک کیا اور اس لڑکی کے قریب سے گزر کر ایک دم رک گئی۔ ڈرائیور نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر اشارے کے ساتھ چیخ کر لڑکی کو رکنے کے لیے کہا۔

کیا مقصد ہو سکتا ہے ٹیکسی والے کا؟ یہ وہی بوڑھا ٹیکسی والا تھا جو اسکول کے پاس پسنجر کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ہمیں بھی اپنی خدمات پیش کی تھیں لیکن ہم نے اسے بتایا تھا کہ ہمارے پاس اپنی گاڑی ہے لہٰذا وہ کسی اور مسافر کا انتظار کرے۔ شاید اسے کوئی پسنجر نہیں ملا تھا اور خالی واپس جا رہا تھا۔ اب راستے میں بارش میں بھیگتی لڑکی کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر شاید کرایہ کمانے کے لیے اسے زبردستی ٹیکسی میں بٹھا رہا ہے۔ کیا واقعی یہی بات تھی؟

وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر تیزی سے باہر آیا۔ لڑکی سہمی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گھبراہٹ اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھی۔ میں سمجھا کہ ڈرائیور اس لیے ٹیکسی سے باہر آیا ہے کہ وہ پچھلا دروازہ کھول کر شاید لڑکی کو زبردستی ٹیکسی میں بٹھانا چاہتا ہے لیکن وہ پچھلا دروازہ کھولنے کے بجائے ٹیکسی کے عقب میں آ کر ڈکی کھولنے لگا۔ بارش میں وہ خود بھی بھیگ رہا تھا۔ وہ جتنی عجلت کا مظاہرہ کر رہا تھا، اسے ڈکی کھولنے میں اتنی ہی تاخیر ہو رہی تھی۔ مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ اس وقت نتسوی کیا سوچ رہی تھی لیکن میں عجیب تجسس میں مبتلا ہو گیا تھا کہ آخر یہ بوڑھا ٹیکسی ڈرائیور ایسی بارش میں ڈکی میں سے کیا نکالنا چاہتا ہے؟

آخر کار اس نے ٹیکسی کی ڈکی کھول لی اور اندر سے ایک چھتری نکال کر اسے کھول کر لڑکی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ چھتری بوڑھے نے یقیناً اپنے لیے ڈکی میں رکھی ہوگی۔ بہرحال لڑکی نے پرس کھول کر غالباً چھتری کے عوض رقم دینے کی کوشش کی لیکن ٹیکسی ڈرائیور نے قدرے جھک کر اسے رقم دینے سے منع کر دیا۔ لڑکی نے بھی جواباً سر کو خم دے کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد ڈرائیور پلٹ کر معذرت خواہانہ انداز میں ہمارے سامنے جھکا، کیونکہ اس نے تنگ سڑک کو بلاک کر کے ہمیں انتظار کرایا تھا۔

جب تک ڈرائیور ڈکی بند کر کے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا، تب تک میں لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور چہرے پر خوشی کے رنگ دیکھتا رہا۔ اس نے وہاں سے روانہ ہونے سے قبل اپنے سر کو زور سے دائیں بائیں جھٹکا اور بالوں سے پانی جھاڑ کر پہلے سے تیز قدموں سے چلنے لگی۔ مجھے آج بھی اس بات کا افسوس ہے کہ ہم اتنی دیر سے اس لڑکی کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے لیکن ہم اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکے تھے، وہ بڑی بے چارگی کے ساتھ پہاڑی کے ساتھ ساتھ کپکپاتی چلی جا رہی تھی۔ قریب میں کوئی ایسی آڑ بھی میسر نہیں تھی جس کے نیچے رک کر وہ بارش کے تھمنے کا انتظار کرتی۔

مجھے آج بھی اس لڑکی کا خوشی سے مہکتا ہوا چہرہ نہیں بھولتا جب اسے چھتری ملی تھی اور اس نے بالوں کو جھٹک کر چلنا شروع کیا تھا۔ مجھے وہ نیک پیر مرد بھی نہیں بھولتا جو تھوڑی دیر قبل کچھ کمانے کی امید پر پسنجر کا منتظر تھا۔ آخر کار وہ مایوس ہو کر پیٹرول جلاتا ہوا خالی ٹیکسی لیے نیچے شہر کی طرف جا رہا تھا۔ بہرحال وہ دل والا بزرگ تھا۔ اس نے اپنی 500 ین (ڈھائی سو روپے) کی چھتری ایک راہ چلتی انجان لڑکی کو دے دی تھی، بغیر کسی ظاہری فائدے کے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ نیک کام کر کے، ایک مجبور لڑکی کو مصیبت سے بچا کر اسے بہت سکون محسوس ہوا ہوگا۔

کاش، یہ کام اس سے پہلے ہم کر گزرتے!

☆☆☆

نئی نئی خبریں اور مزے دار باتیں حاصل کرنے اور سفرنامہ لکھنے کے لیے احسن اور ایمان کا اسکول بھی دلچسپ جگہ ہے۔ صبح کے وقت ہر بچے کی ماں عجلت میں ہوتی ہے اور اپنے بچے کو دور ہی سے چھوڑ کر چلی جاتی ہے لیکن چھٹی کے وقت اپنے بچوں کو لینے کے لیے وقت سے پہلے ہی پہنچ جاتی ہے تاکہ بچے کو کلاس روم سے نکال کر گھر پہنچنے کے لیے انتظار نہ کرنا پڑے۔ پھر جب تک چھٹی نہ ہو، بچوں کی مائیں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر دنیا جہاں کی باتیں کرتی ہیں۔ سنی سنائی چی جھوٹی یا اخبارات میں پڑھی ہوئی خبروں پر تبادلۂ خیال کرتی ہیں۔

جاپان میں تمام بچوں کو ایک ہی وقت میں چھٹی نہیں ملتی البتہ اسکول شروع ہونے کا وقت ایک ہے یعنی صبح آٹھ بجے۔ کسی کلاس کی چھٹی پانچ بجے ہو جاتی ہے اور کسی کی چار اور تین بجے بھی۔ بعض کلاسز کی چھٹی چھ بجے بھی ہوتی ہے۔ اگر کسی کے دو بچے ہیں تو وہ ماں اپنے دوسرے بچے کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہے۔ احسن اور ایمان بھی مختلف کلاسز میں پڑھتے ہیں یعنی فور اور تھری میں۔ کبھی کبھی مجھے بھی گھنٹا یا ڈیڑھ گھنٹا مزید بیٹھنا پڑتا ہے۔ ایمان کی چار بجے چھٹی ہو جاتی ہے۔ پھر احسن کی فٹ بال سیکھنے کی کلاس ختم ہو، ہمیں اس کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

ابتدائی دنوں میں، میں چپ چاپ اکیلا بیٹھا رہتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ وہ مائیں مجھ سے بات چیت کرنے لگیں جن کے بچے احسن اور ایمان کے اچھے فرینڈ تھے۔ احسن اور ایمان کی طرح اس کے کلاس میٹ بھی مجھے ''اوجیسان'' یعنی ''نانا'' کہہ کر پکارنے لگے اور اس کے بعد ان کی دیکھا دیکھی ان کی مائیں بھی مجھے ''نانا'' کہنے لگیں۔ ان میں سے ایک جنوبی کوریا اور ایک فلپائن کی خاتون ہیں۔ ان کے شوہر یہاں ملازمت کرتے ہیں اور ایک میکسیکن اور ایک تائیوان کی عورت بھی ہے جن کے شوہر جاپانی ہیں۔ وہ انگریزی میں گفتگو کرتی ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ جاپانی مائیں ایسی بھی ہیں جو اپنی انگریزی درست کرنے کے لیے میرے ساتھ زبردستی غلط سلط انگریزی بولنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان کے ذریعے یہاں کی خبریں حاصل ہونے کی وجہ سے وہ میرے لیے دلچسپ عورتیں ہیں اور میں ان کے لیے دلچسپی کا باعث اس لیے ہوں کہ میں اس سرزمین پر اس وقت دس برس رہ چکا تھا جب وہ محض دو یا تین برس کی تھیں اور ان میں سے کچھ اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔

ظاہر ہے جو عورتیں 35 برس کی ہیں، وہ 1973ء میں جب میں پہلی بار جاپان آیا تھا، اس وقت تین چار برس کی بچیاں ہی ہوں گی۔ وہ ان ایام کے اور آج کے اس شہر ''کوکورا'' اس کے علاوہ قریبی شہروں، موجی، فکوؤکا، شمونوسیکی میں نظر آنے والی خاص تبدیلیوں کے بارے میں پوچھتی ہیں۔ وہ میری سندھی اور اردو کی کتابیں دیکھ کر خوشی اور حیرت کا اظہار کرتی ہیں۔ خاص طور پر جنوبی کوریا کے شہر ''پوسان'' سے تعلق رکھنے والی ماں بڑی دلچسپی سے میری باتیں سنتی ہے۔ جس کے شہر پوسان اور قریبی بندرگاہ شمونوسیکی کے درمیان ہمیں ہر بار کئی کئی مرتبہ جہاز کو لے جانا پڑتا تھا۔ اس کی سہیلی مریم، یعنی احسن اور ایمان کی والدہ کا بچپن میرے ساتھ جہاز پر یا ان شہروں میں گزرا تھا۔

وہ مجھ سے جہازی سفر اور یہاں کے سمندری طوفانوں کے بارے میں پوچھتی ہیں۔ یہاں کے مقامی لوگوں اور کلچر کے متعلق جاننے کی مشتاق ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی میں ان کے اپنے ادیبوں، تاکاگی، یاکومو، نتسوی سوسیکی، اکوتا گاوا اور کاوابا تا کے اقتباسات اور اشی کاوا، ماتسوباشو، اس ساہ اور موراکامی جیسے معروف شاعروں کے اشعار اور ہائیکو سناتا ہوں تو انہیں بہت تعجب ہوتا ہے۔

''احسن اور ایمان اسکول کی جانب سے ملنے والا کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ اپنے ساتھ گھر سے کھانا کیوں لاتے ہیں؟ اسلام کیا ہے؟ اسلام کن چیزوں سے منع کرتا ہے؟ ان

کے پاس اسی قسم کے بے شمار سوالات ہوتے ہیں جن کے جوابات دینے کے لیے میں بھی ہر وقت تیار رہتا ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی باتیں، غم و خوشی کی کہانیاں، اپنے اپنے خوف اور امیدوں کے راز، عقائد، وساوس اور سوچوں کے متعلق نت نئے پہلو معلوم کر کے مجھے بھی حیرت ہوتی ہے۔ ان میں کئی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو کتابوں میں بھی نہیں مل سکتیں اور اخبارات میں شائع نہیں ہوتیں۔ وہ اکثر میری خبروں کی مختصر رہتی ہیں اور میں ان کی باتیں سنتے کا۔

کبھی کبھی میں دو تین دن نہیں جا سکتا تو وہاں موجود بچوں کی ماؤں میں سے اکثر مجھ سے پوچھتی ہیں "او جیسان، آپ کہاں چلے گئے تھے؟"

"اوسا کا گیا تھا۔" میں انہیں جواب دیتا یا کوبے، کیوٹو جانے کا بتاتا تھا۔ پھر میں انہیں بتاتا کہ اب یہ شہر مجھے کیسے لگتے ہیں۔

کبھی کبھی وہ مجھ سے پاکستان کے متعلق پوچھتیں اور کبھی ملائیشیا کے بارے میں۔ انہیں سب سے زیادہ یہ فکر دامن گیر ہوتی ہے کہ کسی طرح ان کے بچے انگریزی سیکھ جائیں۔ ایک ٹیچر کی حیثیت سے انگریزی بولنے والے ملکوں میں رہنے کے سبب، وہ اکثر مجھ سے اپنے بچوں کے مستقبل اور ان کی تعلیم کے بارے میں دریافت کرتی ہیں۔ اکثر ان کا سوال یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے کہاں بھیجیں؟ ان کے جواب میں، میں خواہ کتنے ہی دلائل پیش کروں کہ سنگاپور، نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا جیسے ملک تعلیم کے لحاظ سے بہتر ہیں لیکن دوستو! جاپانی لوگوں کے دماغ میں صرف ایک ہی "ملک" سمایا ہوا ہے، یو ایس اے!

انہیں بنیادی طور پر اپنا ملک پسند ہے۔ یہ اپنے وطن سے محبت کرتے ہیں لیکن جاپانی نوجوانوں، خاص طور پر عورتوں کی شدید خواہش ہے کہ امریکا میں جا کر رہا جائے۔ "وہاں کا لائف اسٹائل اچھا ہے۔ یعنی عورتوں کو زیادہ آزادی میسر ہے اور معاشرے پر عورتوں کی اجارہ داری قائم ہے۔"

یہاں جاپان میں جاپانی عورتیں دن بھر محنت و مشقت کرتی ہیں اور اس کے باوجود شوہروں کے رحم و کرم پر ہوتی ہیں۔ کئی خواتین تو شوہروں کا جسمانی تشدد بھی برداشت کرتی ہیں۔ بعض عورتوں کی زبانی سن کر یہ احساس ہوتا ہے کہ انہیں یہی گھڑیاں آرام کی میسر آتی ہیں جو وہ اسکول آ کر بچوں کی چھٹی کے انتظار میں گزارتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا سارا وقت گھر میں کام کرتے ہوئے گزرتا ہے۔ کام کاج میں مدد کے لیے کسی ملازم یا ملازمہ کے رکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس مہنگے ملک میں کوئی ایسی عیاشی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ نہ ہی مرد حضرات یہ چاہتے ہیں کہ ان کی بیویاں سکون کی سانس لیں۔ جاپانی عورت جس کنفیوشن میں رہتی ہے وہ اس دنیا واقف ہے۔

☆☆☆

بحری جہاز کے مختلف سفروں کے دوران ایک مرتبہ کراچی سے سامان بھر کر کولمبو اور سنگاپور سے ہوتے ہوئے جاپان پہنچے۔ وہاں کی مختلف بندرگاہوں پر سامان اتار کر ہم خالی جہاز کو "ساسیبو" لے آئے۔ ساسیبو بندرگاہ ہمارے اس شہر کو کورا اور ناگاساکی کے درمیان میں ہے۔ ویسے تو جاپان کی کئی بندرگاہوں پر جہازوں کی مرمت رہتی کہ پورے سال جہاز تک تیار ہوتے ہیں۔ اس سے قبل میں مختلف جہازوں کی مرمت اوساکا، یوکوہاما اور کوبے میں بھی کرا چکا تھا لیکن اس مرتبہ اپنے کراچی ہیڈ آفس کی ہدایت کے مطابق مرمت اور ڈرائی ڈوکنگ کے لیے جہاز کو ساسیبو لانا پڑا تھا۔ ضرور وہاں کی شپ یارڈ میں بھیڑ نہیں ہوگی اور انہوں نے کم سے کم عرصے میں مرمت کی پیش کش کی ہوگی، دوسرا سبب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ساسیبو شمالی کوریا کے بالکل قریب ہے اور جہاز کی مرمت کے بعد ہمیں کوریا سے سامان اٹھا کر واپس ہوم پورٹ یعنی کراچی لوٹنا تھا۔

بہر حال جہاز کے لیے کارگو حاصل کرنا، اسے جہاز پر لوڈ کرنا اور اس کے بعد منزل پر اصل مالکوں کے حوالے کرنا، جہاز کی ریپئرنگ کے لیے کسی بندرگاہ اور شپ یارڈ کا انتخاب کرنا اور مرمت کا حساب ادا کرنا یہ تمام کام کراچی کے ہیڈ آفس میں بیٹھے ہوئے عملے کا ہے۔ ہمارا کام محض اتنا ہوتا ہے کہ جہاز کو ایک بندرگاہ سے دوسری بندرگاہ تک لے جانا اور دوسرا یہ کہ جہاز کی مرمت وغیرہ پر نظر رکھی جائے۔ دوسری صورت میں جہاز کو چلانا ہمارے لیے مصیبت بن جائے گا۔

جہاز کی مرمت سے نہ صرف جہاز کے چیف انجینئر کا مطمئن ہونا ضروری ہے بلکہ جس کمپنی کے پاس جہاز انشورڈ ہے، اس کمپنی کے سرویئر کا اطمینان بھی ضروری ہے کیونکہ اس کے بعد اگر کوئی حادثہ پیش آ جائے تو تمام اخراجات اس انشورنس کمپنی کو ادا کرنا پڑتے ہیں۔

ہمارا جہاز ایک برٹش کمپنی سے انشورڈ تھا اور ساسیبو کا وہ شپ یارڈ اس قدر طویل اور مصروف تھا کہ وہاں انشورنس کمپنی کے کئی جہاز آتے رہتے تھے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر کمپنی نے اپنا ایک انگریز سرویئر مستقل طور پر وہاں تعینات کر دیا تھا تاکہ اسے بار بار انگلینڈ سے نہ بلوایا جا سکے۔

اس سرویئر کی رہائش بھی ساسیبو شہر میں تھی۔ اسی کے محلے میں میری رہائش کا بھی انتظام کر دیا گیا تھا تاکہ مہینا بھر جہاز کی مرمت کے دوران شپ یارڈ کے شور شرابے سے دور رہ کر کم سے کم رات کو سکون کی نیند سو سکوں۔ انگریز سرویئر فیملی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کا ایک بیٹا تھا جس کی عمر تقریباً آٹھ برس تھی۔ ان ایام میں اس نے اپنے بیٹے کو قریب واقع ایک جاپانی اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ چند دنوں کے بعد میں نے انگریز سرویئر سے پوچھا "آپ کا بیٹا کیسا ہے اور یہاں کا اسکول اسے کیسا لگتا ہے؟"

"وہ ٹھیک ہے اور وہ یہاں کے اسکول میں ایڈجسٹ ہو گیا ہے لیکن یہاں کے رواج کے مطابق "Soji" یعنی صفائی کرنی ہوتی ہے۔ بچیں اور دیواریں جھاڑنے کے لیے ہر بچے کے پاس اپنا کپڑا ہوتا ہے جسے جاپانی زوکن (Zokin) کہتے ہیں۔ صفائی کرنے کے یہ کپڑے کلاس روم کی عقبی دیوار پر لگے ہینگر پر لٹکے ہوتے ہیں۔ جہاں سے ہر بچہ چھٹی ہونے کے وقت اپنا اپنا "زوکن" اٹھا کر کلاس روم کی صفائی کرتا ہے۔ اس کے بعد فرش پر جھاڑو لگائی جاتی ہے اور آخر میں پانی کی بالٹی اٹھا کر فرش پر پوچا لگاتے ہیں۔ اس کام میں بمشکل دس منٹ صرف ہوتے ہیں لیکن یہ صفائی کا کام کسی خاکروب یا جھاڑو پوچا کرنے والی ماسی ٹائپ ملازمہ کے بجائے اسکول کے بچوں کو کرنا پڑتا ہے۔

یہ 1975ء کی بات ہے۔ آج تیس، اکتیس برس کے بعد جبکہ ہم جیسے ملکوں میں بھی ویکیوم کلینر جیسی صفائی کرنے والی چیزیں عام ہو چکی ہیں لیکن جاپان میں آج بھی اسکولوں کی صفائی اسکول میں پڑھنے والے بچے ہی کرتے ہیں۔ جھاڑو پوچے کے بعد فرش پر جھاڑو لگا ہوا اور گیلے کپڑے سے فرش کو رگڑ کر چمکانا طلبا کا کام ہے۔

نرم کے اختتام یا دو تین ہفتے کی چھٹی شروع ہونے سے قبل ہی صفائی بڑے پیمانے پر کی جاتی ہے۔ جسے "O, soji" کہا جاتا ہے یعنی "خاص صفائی"۔ یہ صفائی دس منٹ کے بجائے تین چار گھنٹے تک جاری رہتی ہے جس میں دیواریں، دروازے، کھڑکیاں اور شیشے وغیرہ یعنی ہر چیز کی خوب صفائی کی جاتی ہے۔ جاپانی اسکولوں میں پڑھنے والے غیر ملکی بچے اس صفائی سے کتراتے ہیں لیکن جاپانی بچے اور ان کے والدین اسے عبادت کا درجہ دیتے ہیں اور اس عمل کو تعلیم ہی کا حصہ سمجھتے ہیں۔ جاپانیوں کے بقول ان کے بچے بچپن ہی سے صفائی کے ہنر اور عظمت سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔

جاپانی مردوں یعنی لڑکوں کو زیادہ تر وہ صفائی آخری مرتبہ اسکول ہی میں کرنی پڑتی ہے۔ گھر میں ان کی مائیں یہ ذمے داری انجام دیتی ہیں اور شادی کے بعد ان کی بیویاں یہ کام سنبھال لیتی ہیں۔ یعنی اسکول چھوڑنے کے بعد مردوں کو عمر بھر کے لیے صفائی کرنے سے نجات مل جاتی ہے لیکن لڑکیوں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان کے لیے اسکول کے دنوں کی صفائی گویا کتاب کا پیش لفظ ہے، اس تمام زندگی کا جو اسے گھر کو صاف ستھرا رکھتے ہوئے گزارنی ہے۔

جاپانی مرد خواہ کتنا ہی امیر کیوں نہ ہو، وہ دیگر لایعنی اور فضول مدوں میں لاکھوں ین خرچ کر دے گا لیکن اپنی بیوی کو آرام پہنچانے کے لیے صفائی ستھرائی کرنے والی ملازمہ ہرگز نہیں رکھے گا۔ بلکہ حقیقت تو یہ بھی ہے کہ جاپان میں ملازم یا ملازمہ رکھنے کی اجازت ہی نہیں ہے۔ ہمارے ایک دوست ڈاکٹر عبدالرزاق میمن ہیں جو ہمارے ہی شہر سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے مکمل تعلیم جاپان ہی میں پائی ہے اور شادی بھی ایک جاپانی لڑکی سے کی ہے۔ وہ اکثر کہتے ہیں۔

"اس سلسلے میں خواتین کی اکثریت شکایت کرتی رہتی ہے لیکن اسمبلیوں میں تو اکثریت مردوں کی ہے۔ وہ ایسے قوانین کیوں پاس کریں گے جن سے ان کی بیویوں کو کچھ "ریلیف" ملے۔"

ہمیں حلال گوشت فروخت کرنے والے ٹوکیو کے ایک "لاہوری" نے بھی یہی بات کہی تھی۔ اس کی بیگم بھی جاپانی ہے۔ "جاپانی بیویاں پورے مہینوں سے بھی ہوں گی تب بھی صفائی ستھرائی اور گھر کے کام کاج میں جتی رہیں گی۔ مستقل کام بلکہ مشقت سے ان بے چاریوں کی شکلیں ہی بدل جاتی ہیں لیکن جاپانی مرد اس کی بالکل پروا نہیں کرتے۔ سرکاری یا آفیشل عوتوں میں جاپانی اپنی بیویوں کو ساتھ نہیں لے جاتے کیونکہ انہیں "دھبسی" ہوئی بیویاں دکھاتے ہوئے دوستوں کے سامنے شرمندگی ہوتی ہے۔ زیادہ تر تنہا آتے ہیں یا کسی کم عمر گرل فرینڈ کو ساتھ لے آئیں گے۔ مختلف جہازوں کے ذریعے تقریباً دس برس تک میری جاپان میں آمد و رفت رہی ہے۔ اس دوران میں ہمارے اور ہم سے تعلق رکھنے والے دفاتر کے لوگوں کے لیے جہاز پر یا مقامی ہوٹلوں میں کئی مرتبہ دعوتوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مجھے بالکل یاد نہیں آ رہا کہ کوئی جاپانی افسر یا بزنس مین اپنی بیوی کے ساتھ دعوت میں شریک ہوا ہو۔ ابتدائی برسوں میں ہم اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے حیرت کا اظہار کرتے تھے لیکن بعد میں ہم بھی اس "معاملے" کو سمجھ گئے۔ کوئی بھی جاپانی مہمان کسی عورت کے ساتھ دعوت میں شریک ہوتا تو ہم اسے اس کی بیوی نہیں سمجھتے

تھے۔ ہمیں یقین ہوتا تھا کہ وہ ضرور اپنی سیکریٹری یا گرل فرینڈ کو ساتھ لایا ہوگا۔ اس کی بیوی تو گھر میں بچوں کی میاں اور اس کے موزے، جرابیں دھو رہی ہوگی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جب یہ خود دعوت کرتے ہیں تو اس وقت بھی اپنی گھر والیوں کو بلوانے کے بجائے اجرت پر ''باہر والیوں'' کی خدمات حاصل کرتے ہیں تاکہ وہ میزبان کی حیثیت سے آنے والے مہمانوں کو ریسیو کریں اور ان کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کریں۔

جاپان کے شہر کیوٹو کے گھروں کے لیے کہا جاتا ہے کہ پورے جاپان میں ایسے صاف ستھرے کہیں نہ ہوں گے۔ اس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ کیوٹو میں، وہاں کے رواج کے مطابق ہر لڑکی کو یہ سبق دیا جاتا ہے کہ عورت کی شادی گھر سے ہوتی ہے نہ کہ شوہر سے۔ کیوٹو میں یہ کہاوت مشہور ہے۔ "Lye wa onna no takara" یعنی گھر عورت کا خزانہ ہے۔ اس کہاوت کے حق میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ مرد سب ایک جیسے ہوتے ہیں اور آپ کو مایوس بھی کر سکتے ہیں لیکن گھر کبھی آپ کو دھوکا نہیں دے گا۔ معلوم نہیں مرد کے ہاتھوں پٹنے کے خوف سے یا اپنے شوق کے سبب جاپانی عورت کو گھر کی صفائی کا جنون ہے۔ فرش اور دیواریں کس طرح صاف کی جائیں، نل اور چولھے، کموڈ اور بیسن کس طرح چمکائے جائیں؟ اس موضوع پر جاپان میں جس قدر کتابیں نظر آتی ہیں، دوسرے ملک میں نہیں ملیں گی۔ اخبارات میں اکثر اس قسم کے اشتہارات شائع ہوتے ہیں جن میں جاپانی عورتوں کو گھر کی صفائی کے سلسلے میں کسی مشہور عورت کا لیکچر سننے کی دعوت دی جاتی ہے۔ اس لیکچر میں اکثر یہ بتایا جاتا ہے کہ گھر کی چیزوں کو کسی کیمیکل سے صاف کرنے کے بجائے خالص روئی سے صاف کیا جائے۔ دھلے ہوئے کپڑوں کو کسی کونے میں ڈھیر کرنے کے بجائے انہیں خشک کر کے تھیلوں میں رکھا جائے۔ گھر کی صفائی مکمل کرنے کے بعد گلی کا کچھ حصہ بھی صاف کرنا چاہیے، وغیرہ وغیرہ۔ خاص طور پر ہر لیکچر میں یہ جملہ ضرور دہرایا جاتا ہے۔ ''جو عورت صفائی کے معاملے میں سست ہے، اسے جاپانی کہلانے کا کوئی حق نہیں ہے۔''

ایک جاپانی خاتون نے صفائی کے حق میں بولتے ہوئے کہا ''صفائی عورت کی روح کو قوت عطا کرتی ہے۔ وہ جس قدر زیادہ صفائی کرے گی، اتنا ہی جنت کے قریب ہوتی جائے گی۔''

بقول ظفر شیخ ''جاپانی مرد بھی بڑے کائیاں ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو انہوں نے عورت کو مرد سے کمتر ثابت کرنے کے لیے ایسی کہاوتیں اور ضرب المثل گھڑ کر مشہور کر دی ہیں، جن سے عورتوں کو ہر وقت یہ احساس رہتا ہے کہ ''سیانوں'' نے انہیں کم عقل اور بے وقوف قرار دیا ہے۔ مثلاً ''عورت فساد کی جڑ ہے۔ عورت ناپاک ہوتی ہے۔ اس قدر کہ صدیوں سے انہیں مندروں، گرم پانی کے چشموں حتیٰ کہ فیوجی جیسے پہاڑوں کے قریب بھی نہیں آنے دیا جاتا۔ دوسری طرف عورت سے محنت اور مشقت کرانے کے لیے اسے فرمانبردار اور خدمت گار بنانے کے لیے عجیب قسم کے اقوال گھڑ لیے ہیں کہ وہ جس قدر زیادہ صفائی کرے گی، اتنا ہی جنت کے قریب ہوتی جائے گی۔ یعنی جنت کے اندر داخل نہیں ہوگی بلکہ صرف اس کے قریب پہنچے گی۔ گویا جنت کے اندر خود مرد کسی محنت کے بغیر پہنچے ہوئے ہوں گے۔''

یہ حقیقت ہے کہ جاپانی عورت انتہائی خدمت گزار، محنتی اور سادہ ہے، اسے محنت اور مشقت کے کاموں سے روکا بھی جائے تو وہ اس کے باوجود ان سے چمٹی رہے گی۔ خواہ اس کا شوہر سست، کاہل، اور بیکار ہو یا وہ کسی اور عورت سے عشق کرتا ہو، اس کے باوجود یہ اپنے شوہر پر فدا ہوگی۔ گویا ایک روبوٹ کی طرح اس کے دماغ میں صفائی، محنت اور خدمت Programmed ہے۔

ہمارے ایک جہازی ہم وطن نے جاپانی لڑکی سے شادی کی تھی۔ اس بات کو بیس برس گزر گئے ہیں۔ کبھی وہ کراچی میں رہتے ہیں اور کبھی اپنے گاؤں (پنجاب) میں ہوتے ہیں جہاں ہمارے دوست کی آبائی زمینیں اور باغات ہیں۔ میں حال ہی میں اسلام آباد جاتے ہوئے اپنے اس دوست سے ملنے اس کے گاؤں گیا تھا، وہاں میں نے دیکھا کہ ملازم اور ملازماؤں کے ہوتے ہوئے بھی اس کی بیگم صفائی ستھرائی میں مصروف رہتی تھی۔ وہ منظر دیکھ کر میں بے اختیار ہنس دیا تھا۔ مجھے اپنی ہنسی کا سبب بھی بتانا پڑا تھا کہ گھر کی صفائی ستھرائی کے معاملے میں جاپانی عورت کا جواب نہیں۔ یورپین کہتے ہیں کہ جس گھر کی چمنیاں بھی چمک رہی ہوں تو یقیناً اس گھر میں جاپانی عورت ہوگی۔

اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا ''مسٹر الطاف! گھر کا کام مزدوری نہیں ہوتی جس کے عوض تنخواہ لی جائے۔ یہ تو ایک راہ ہے جو انسان کو اندرونی نور اور سکون کی جانب لے جاتی ہے۔''

لیجئے جناب! اب اس بات کا کیا جواب دیا جائے؟

جاری ہے

شیرنیوں کا قاتل

شمیم حیدر

ہر شیر کی خاصیت ہے کہ وہ شیرنی کی خاطر اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیتا ہے مگر وہ شیر کچھ ایسی طبیعت کا تھا کہ شیرنی کو دیکھتے ہی بھڑک اٹھتا اور اسے چیر پھاڑ کر رکھ دیتا۔

ایک عجیب خصلت شیر کے شکار کی داستان

جتنے مہم جو ڈچ مینز کو میں جانتا ہوں یا سننے میں آیا ہے یا کتابوں میں ان کے قصے پڑھے ہیں وہ اتفاقاً ایک ٹانگ سے لنگڑے نظر آئے۔ شاید آپ نے ڈرائنگز یا بڑی بڑی پینٹنگز میں بھی دیکھا ہوگا۔ خوفناک تلوار مار کا مونچھیں، لمبی الجھی ہوئی ڈاڑھیاں، ایک آنکھ پر کالی پٹی، ایک ٹانگ لکڑی کی، یہی شکل بحری قزاقوں کے سردار کی ہوتی تھی بلکہ میں نے ایک لنگڑے ڈچ ہی کے متعلق ایک اخبار میں پڑھا تھا کہ اس کی اڑتالیس بیویاں تھیں جو سب کی سب جوان تھیں جبکہ شوہر کی عمر ان سے زیادہ تھی۔ ہالینڈ کی حکومت نے اسے نوٹس دیا تھا کہ یا تو اپنی سینتالیس بیویوں کو آزاد کر دے یا ہالینڈ چھوڑ کر چلا جائے۔ بیویوں کو تو اس نے آزاد نہیں کیا البتہ ہالینڈ چھوڑ کر کینیڈا جا بسا، وہاں اس نے مزید شادیاں کیں۔ اس کی اولاد کی تعداد تین سو سے زیادہ تھی۔ لیکن جس ڈچ مین کے متعلق بتانے جا رہا ہوں اور جس کا گہرا تعلق اس کہانی سے ہے وہ بھی ایک ٹانگ سے محروم تھا۔ نہ وہ بحری قزاقوں کا سردار تھا، نہ اس کی اڑتالیس بیویاں تھیں، نہ اس کے بچوں کی تعداد سیکڑوں میں تھی بلکہ وہ ایک معزز آدمی تھا، وہ سیلون میں چائے کے باغات کا مالک تھا اور میرے گہرے دوستوں میں سے تھا۔ ہمارا مشترکہ شوق شیر کا شکار تھا۔ وہ ہر سال سیلون سے جنوبی ہندوستان کچھ دنوں کے لیے اپنے اس شوق کی تکمیل کے لیے آتا تھا۔ کیپٹن جان کولاس نے نیلگری پہاڑ کے دامن میں سطح سمندر سے تین سو فٹ بلند مہاوان ہالا گاؤں سے دو میل دور اپنے قیام کے لیے موٹے بانسوں اور چٹائیوں سے ایک بہت شاندار محل نما گھر بنایا ہوا تھا جس کا نام اس نے جنگلی محل رکھ دیا تھا۔ وہاں تمام آسائشیں میسر تھیں۔ قیام و طعام کے اسباب کے علاوہ شکاریات کا تمام سامان، سفر کے لیے گھوڑے، گارے کے لیے جانور، مچان باندھنے کا جملہ سامان، مختلف قسم کی سیڑھیاں، نوکر چاکر، قدموں کے نشانات اٹھانے والے کھوجی۔ الغرض ہر سہولت وہاں موجود تھی۔ اس کے علاوہ کیپٹن کا حلقہ احباب بھی وسیع تھا۔ بیرونِ ممالک سے آئے ہوئے مہمانوں کو بھی وہ اسی محل نما جھونپڑی میں ٹھہراتا تھا۔ ان میں کچھ تو شکاری ہوتے تھے اور کچھ ایسے مہمان جو شہروں کے ہنگامی شب و روز سے اکتائے ہوئے گوشۂ عافیت کے متلاشی ہوتے تھے۔ یہاں آ کر ان کی دنیا

ہی بدل جاتی تھی۔ چاروں طرف پھیلا ہوا ہرا بھرا جنگل، جنگلی پھولوں کی مہکتی خوشبو، جنگلی جانوروں کے نظارے، بڑے بڑے ہرے بھرے درخت، رنگ برنگ کے چہچہاتے پرندے، شیر کی دہاڑیں، سانبھر اور چیتلوں کی خطرے سے آگاہ کرتی آوازیں، ہاتھیوں کی چنگھاڑیں۔ مغربی ملکوں سے آئے ہوئے مہمان اپنے کمروں کی کھڑکیوں میں کھڑے ہو کر اندھیرے میں نظریں گاڑے ان آوازوں کے بانیوں کو دیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ پھر انہیں ایک اور نظارہ مسحور کر دیتا تھا، وہ تھا ہزاروں جگنوؤں کی اندھیرے میں چمک دمک۔ جنگلی محل کے ساتھ ایک خوبصورت باغیچہ بھی بنا ہوا تھا جس میں جنگلی پھولوں کے خوبصورت پودے لگے تھے۔ جنگلی محل کے ورانڈے میں بچھی کرسیوں پر چاندنی رات میں کبھی کبھی دریا پر جانے والے ہاتھیوں کے کالے سائے بھی نظر آتے تھے۔ کیپٹن نے یہ علاقہ بڑی دانش مندی سے اپنے ہیڈ کوارٹر کے لیے منتخب کیا تھا۔ یہ جنگلی نباتات سے مالا مال ہونے کے علاوہ جنوبی ہندوستان کی ایک بہترین شکارگاہ تھی۔ شیر، چیتے، جنگلی بھینسا، چیتل، سانبھر، جنگلی بھیڑوں کے علاوہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر پہاڑی بکروں کا شکار شکاریوں کی صلاحیتوں کے لیے ایک آزمائش ہوتا تھا۔ مہاوان ہالا گاؤں کے مشرق میں سیو گور دریا بہتا تھا اور میلوں تک جنگل ہی جنگل تھا جس کا سلسلہ ضلع کمبایز تک وسیع تھا جس میں قابلِ شکار جانوروں کی بہتات تھی۔

کیپٹن جان کولاس کی آمد کے ساتھ ہی اس کے یورپ سے آئے ہوئے مہمان جن میں شکاری، فوٹو گرافر سب ہی ہوتے تھے، یہیں ٹھہرتے تھے۔ یہ قصہ کیپٹن جان کولاس کا ہے۔ اس کی مہم جوئی کی داستان جو آپ کو سنانے والا ہوں وہ ایک ایسے شیر کے متعلق ہے جو شیرنیوں کے قاتل کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے کیپٹن کی پوری توجہ اپنی جانب مبذول کرالی تھی۔ کیپٹن ایسے ہی پُراسرار کرداروں کی تلاش میں رہتا تھا۔ وہ ایک ٹانگ سے معذور تھا مگر اس کی مصروفیات میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ اپنی معذوری کے باوجود جنگل کے راستوں پر بڑے آرام سے ڈرائیو کر لیتا تھا۔ جہاں کار نہیں جا سکتی تھی، وہاں گھوڑے پر سوار ہو کر جاتا تھا۔ وہ اپنی مہم جو طبیعت سے مجبور ہو کر اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر کبھی ایک رات کے لیے اور کبھی کئی دن کے لیے غائب ہو جاتا تھا۔ وہ کہاں جاتا تھا، یہ پتا نہیں چلتا تھا۔ البتہ گھوڑے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کہیں دور سے آیا ہے۔ اکلوتی ٹانگ سے وہ گھڑسواری بھی کرتا اور مچان پر بھی بہ آسانی چڑھ جاتا۔

مچان جو درختوں پر بنتا ہے، اس پر پہنچنے کے لیے ہم مختلف سیڑھیاں استعمال کرتے ہیں۔ بعض درخت ایسے ہوتے ہیں جن پر شاخوں کی مدد سے چڑھا جا سکتا ہے۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو سیدھے تنے والے ہوتے ہیں وہاں سیڑھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہت زیادہ موٹے تنے والے درختوں کے لیے بھی سیڑھی چاہیے لیکن بعض ناگزیر حالات میں بانسوں کے جھنڈ پر مچان بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے جسے ہم سب سے بدترین قسم کے مچان میں شمار کرتے ہیں کیونکہ بانسوں والے جنگل ہاتھیوں کی مرغوب جگہ ہوتی ہے۔ خیر، میں آپ کو مچان کی سیڑھیوں اور کیپٹن کے متعلق بتا رہا تھا۔ مچان پر پہنچنے کے لیے ایک تو وہ سیڑھی ہوتی ہے جو دو موٹے موٹے رسوں کے درمیان نو انچ لمبے لکڑی کے ڈنڈے باندھ کر بنائی جاتی ہے اور ایک قسم کی سیڑھی وہ ہوتی ہے جس میں دو مضبوط بانسوں کے درمیان ڈیڑھ فٹ کے ڈنڈے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لگا دیے جاتے ہیں۔ یا ان کی جگہ مضبوط رسی سے ڈنڈوں کا کام لے لیا جاتا ہے۔ کیپٹن جان کولاس اپنی ٹانگ کی معذوری کی وجہ سے مچان پر چڑھنے کے لیے اسی قسم کی سیڑھی استعمال کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی ہمت کو داد دینی پڑتی تھی کہ وہ ساری رات مچان پر ایسے بیٹھتا تھا جیسے وہ بھی مچان کا ایک حصہ ہو۔ صبح ہونے پر وہ مچان سے اتر کر آدھا میل چل کر اپنی کار تک پہنچتا تھا۔ وہاں سے وہ جنگلی محل پہنچ جاتا تھا۔ وہ سیلون سے ہی سارے دوستوں کو خط لکھ کر اپنی آمد سے مطلع کر دیتا تھا۔ ہم مقررہ تاریخ پر جنگلی محل پہنچ جاتے تھے۔ اس نے مجھے بتایا کہ سیلون کے جنگل بہت خوبصورت ہیں مگر ایک چیز کی کمی ہے کہ وہاں شیر نہیں ہوتے۔ کیپٹن ہر سال ایک دو مہینے کے لیے جنگلی محل شیر کے شکار کے لیے آتا تھا۔ اس دفعہ لوگوں نے بتایا کہ مہاوان ہالا کے علاقے میں ایک ایسا شیر آ گیا ہے جو شیرنیوں کا دشمن ہے۔ وہ چن چن کر شیرنیوں کو شکار کر کے کھا رہا ہے۔ اس کا اصل مسکن تو مودم ملائی کی وائلڈ لائف سنچری تھی جو دریائے میسور کا احاطہ کرتی تھی۔ وہاں سے وہ چلتا ہوا فارسٹ کی چھوٹی چوکی تپیا کدو، مشرقی سمت ہونڈی ڈیم کے علاقے اور مہاوان ہالا سے ہو کر ٹیلگری کے سلسلۂ کوہ کے دامن میں بنے آنائی کوٹی کے فارسٹ بنگلے تک پہنچتا تھا۔ یہاں وہ دس دن قیام کر کے پھر ان ہی علاقوں سے گزرتا ہوا واپس مودم ملائی وائلڈ لائف سنچری میں واپس آ جاتا تھا۔

کیپٹن نے شیر کی بیٹ کی تفصیلات بڑی محنت اور انتھک جدوجہد کے بعد ایک نقشے پر جمع کی تھیں۔ اس نے باقاعدگی

سے ہر اتوار کو مانس گودی قصبے میں ہفتہ واری بازار جو ہر اتوار کو لگتا تھا وہاں دور پرے کے گاؤں سے خریداری کے لیے آئے ہوئے مختلف قبیلوں کے دیہاتیوں، چرواہوں اور عورتوں سے پوچھ گچھ کر کے شیر کی نقل و حمل کو نقشے پر نشان زد کر لیتا تھا حتیٰ کہ یہ تک معلوم کر لیا تھا کہ کن تاریخوں میں شیر کون سے علاقوں میں ہوگا۔

شیر اپنی شکم پری کرنے کے لیے ایک وسیع علاقہ جو تقریباً پچیس تیس مربع میل پر مشتمل ہوتا ہے، مقرر کر لیتا ہے جسے شکاری زبان میں شیر کی بیٹ کہا جاتا ہے کیونکہ اگر وہ ایک ہی جگہ ٹھہر جائے تو قابلِ شکار جانوروں کی قلت ہو جائے گی۔ تقریباً ہر شیر اس اصول پر عمل کرتا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے چل کر ہر دو تین میل کے بعد ایک دو روز قیام کرتا ہوا مقررہ بیٹ کے آخری سرے پر پہنچتا ہے اور پھر اسی طرح عمل کرتا ہوا واپس اپنی جگہ آ جاتا ہے۔ اس کو اپنی بیٹ کے چپے چپے سے واقفیت ہوتی ہے۔ اس کو اس کا بھی علم ہوتا ہے کہ بیٹ کے فلاں مقام پر جنگلی جانوروں کی کمی کی وجہ سے پالتو مویشیوں پر گزارہ کرنا ہوگا۔ اس کی اس صحرانوردی کا عرصہ تین ماہ ہوتا ہے۔ اپنی مقرر کردہ بیٹ میں وہ کسی دوسرے شیر کی مداخلت برداشت نہیں کرتا۔ اگر غلطی سے کوئی دوسرا شیر آ جائے تو خونخوار لڑائی ناگزیر ہوتی ہے۔ وہ اپنی بیٹ کی حدود درختوں کے تنے کو ناخنوں سے چھیل کر یا جہاں درخت نہ ہوں وہاں جھاڑیوں پر پیشاب کا اسپرے کر کے مقرر کر لیتا ہے اور وقتاً فوقتاً اس کا اعادہ کرتا رہتا ہے تاکہ مداخلت کنندہ ان علامات کو دیکھ کر باز رہے۔

کیپٹن اپنی مہم جوئی اور انوکھی چیزوں کی متلاشی طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس شیر کو شکار کرنے کے لیے بے چین تھا۔ بہت سے لوگوں نے کیپٹن کو بتایا کہ یہ عجیب اور انوکھا شیر ہے۔ یہ نوجوان شیرنیوں کا دشمن ہے اور ان کو ہلاک کر کے کھا جاتا ہے۔ وہیں اتوار بازار میں اتفاقاً کارمبا قبیلے کے میاں بیوی نے جو جنگل میں کوئلہ بنا کر فروخت کرتے تھے، آنکھوں دیکھا واقعہ اس شیر کے متعلق سنایا۔ انہوں نے بتایا کہ ہماری جھونپڑی جنگل میں میسور اسٹیٹ کی باؤنڈری سے تین میل اندر ہے۔ ایک رات ہمیں دو شیروں کے لڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔ دو گھنٹے تک لڑائی جاری رہی۔ اگلی صبح اٹھ کر جائے واردات پر پہنچے تو جھونپڑی سے ایک فرلانگ دور ایک شیرنی کی ادھ کھائی لاش ملی۔ لاش کے آس پاس ایک بڑے شیر کے پیروں کے نشانات واضح تھے۔ ایرلاز اور کسواس قبیلے کے دور دراز سے آئے لوگوں نے بھی ایسے قصے سنائے۔ آنائی کوٹی کے فارسٹ بنگلے کے چوکیدار

کیا آپ
لبوب مُقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟
کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مُقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مُقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مُقوّی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک
المسلم دارلحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

نے کیپٹن کو بتایا کہ ایک شام میں فارسٹ بنگلے کے نزدیک دریا پر پانی بھرنے گیا تو ایک شیرنی جو دریا پر پانی پینے میں مشغول تھی، کو دیکھ کر میں ٹھٹک گیا اور فوراً قریبی درخت پر چڑھ گیا۔ میں ابھی درخت پر چڑھا ہی تھا کہ شیرنی کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ بھی شاید مجھے دیکھ چکی تھی۔ وہ بھی میری طرف آنے لگی۔ میں نے سوچا کہ اب میرا آخری وقت آگیا ہے۔ میں نے اللہ کو یاد کرنا شروع کر دیا۔ شیرنی میرے درخت کے نیچے آکر کھڑی ہو گئی۔ وہ بار بار غصے سے دھاڑ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید اس کا بچہ میرے قریب ہے۔ اس لیے وہ اتنا غصہ کر رہی ہے۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لکڑی کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اگر وہ مجھ پر حملہ کرتی تو میں اس لکڑی سے اس کا مقابلہ کرتا۔ میں نے اللہ سے دعا کی کہ وہ مجھے اس مصیبت سے نجات دلا دے۔ شیرنی کافی دیر تک درخت کے نیچے کھڑی رہی۔ پھر وہ واپس چلی گئی۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ پھر میں درخت سے نیچے اترا اور گھر کی طرف چل پڑا۔ میں نے سوچا کہ شیرنی کہیں آس پاس ہی ہوگی۔ اس لیے میں نے اپنا راستہ بدل لیا۔ میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ اس راستے پر میں نے شیرنی کے پنجوں کے نشانات دیکھے۔ میں نے سوچا کہ شیرنی میرے پیچھے آرہی ہے۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ میں بھاگنے لگا۔ میں نے سوچا کہ اگر شیرنی نے مجھے دیکھ لیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔ میں بھاگتا رہا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو شیرنی میرے پیچھے آرہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب میرا آخری وقت آگیا ہے۔ میں نے اللہ کو یاد کرنا شروع کر دیا۔ شیرنی میرے قریب آگئی۔ وہ میرے اوپر حملہ کرنے ہی والی تھی کہ اچانک وہ رک گئی۔ وہ میرے اوپر حملہ نہیں کر رہی تھی۔ وہ کسی اور چیز کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید اس کا بچہ کہیں آس پاس ہے

کتے کو۔ کبھی ہاتھی کو دیکھ رہا تھا۔ شیر بہت بھوکا تھا۔ وہ کتے کو ہلاک کر کے اپنا پیٹ بھرنا چاہتا تھا مگر ہاتھی درمیان میں حائل تھا۔ شیر اپنے جسم اور جبڑے کو زمین سے لگا کر اپنی خوفناک دہاڑوں سے ہاتھی کو خوفزدہ کرنے لگا۔ ہاتھی آہستہ آہستہ کھسک کر گھاس کے قطعے کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا اور جوابی چنگھاڑوں سے شیر کی دہاڑوں کا جواب دینے لگا۔

ان کی چنگھاڑوں اور دہاڑوں سے بچان کانپ رہا تھا، میرے کانوں کے پردے جھنجھنا رہے تھے۔ میں نے کئی دفعہ سوچا کہ ان دونوں کو ہی ختم کردوں مگر اپنے ارادے سے اس لیے باز رہا کہ جنگل میں درندوں کی لڑائی کا منظر شاذونادر دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہاں لڑائی کے ڈرامے کا اسٹیج بالکل تیار تھا، بس کسی ایک فریق کی طرف سے پہل کا انتظار تھا مگر کوئی بھی میدان چھوڑنے پر تیار نہ تھا کہ شیر نے پہل کردی۔ اس نے ایک غراہٹ کے ساتھ ہاتھی پر حملے کا آغاز کردیا۔ وہ اس کے سر پر چھلانگ لگا کر پہنچنا چاہتا تھا۔ ہاتھی نے ایک عجیب حرکت کی، وہ اپنی دونوں اگلی ٹانگیں اٹھا کر کھڑا ہوگیا جیسے سرکس کا ہاتھی کرتب دکھاتا ہے۔ وہ اپنی سونڈ سے چھلانگ لگاتے شیر کو پکڑ کر ٹانگوں سے کچلنا چاہتا تھا۔ مگر شیر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک طرف ہٹ گیا۔ پھر اس نے پلٹ کر اپنے نوکیلے ناخنوں سے ہاتھی کی سونڈ نوچنے کی کوشش کی مگر ہاتھی نے فوراً اپنی سونڈ کو مزید اٹھالیا۔ شیر کا وار خالی گیا۔ جواباً ہاتھی نے شیر کو اپنے واحد دانت سے مارنے کی کوشش کی مگر شیر نے پھر جھکائی دی اور اچھل کر ہاتھی کی پیشانی پر چھلانگ لگادی۔ اس نے وہاں اپنے پنجے گاڑ کر ہاتھی کی سونڈ اور آنکھوں کو ادھیڑنے کی کوشش کی۔ ہاتھی نے اس حملے کو ناکام بنانے کے لیے ایک عجیب حرکت کی، وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنے سر کو زمین پر ٹکا کر پورا زور دینے لگا۔ شیر اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کی جدوجہد میں نوچنا کھسوٹنا بھی بھول گیا اور نیچے سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ بڑی مشکل سے پچھلے دھڑ کو نکال پایا تھا کہ ہاتھی نے اس پر اپنا داہنا پیر رکھ دیا۔ شیر کی گردن ڈھیلی پڑگئی تھی۔ ہاتھی نے شیر کے جسم کے اگلے حصے کو بھی اپنے بائیں پیر کے نیچے دبالیا، اس طرح شیر کا سر ایک پیر کے نیچے اور پچھلا حصہ دوسرے پیر کے نیچے دبا ہوا تھا۔ شیر بالکل بے بس پڑا تھا۔ دہاڑوں کی جگہ اس کے منہ سے گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں۔

ہاتھی نے اپنی زخمی سونڈ کو شیر کے درمیانی جسم کے نیچے داخل کر کے ایک طاقت ور جھٹکے سے اوپر کھینچا۔ شیر کا جسم تین ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا۔ پھر اس نے دونوں پیروں میں دبے شیر کے جسم کے حصوں کو کچل کچل کر مٹی کا ڈھیر بنادیا۔ حالانکہ ہاتھی کے زخمی سر اور گردن سے کافی مقدار میں خون بہہ رہا تھا، اس کا غیظ وغضب عروج پر تھا۔ وہ اپنے اگلوتے دانت کو گوشت کے ڈھیر میں گھونپ گھونپ کر اپنے انتقامی جذبے کی تسکین کررہا تھا۔

اس کام سے فارغ ہوکر اس نے کتے کی طرف دیکھا اور ایک چنگھاڑ ماری۔ اس چنگھاڑ میں فتح مندی اور نخوت جذبہ تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کتے کو ہلاک کرے میں نے رائفل پر لگی ٹارچ کو جلا کر اس کے سر کے اوپر ایک ہوائی فائر کیا۔ یہی میری غلطی تھی۔ اگر میں ٹارچ جلائے بغیر فائر کردیتا تو ممکن تھا کہ فائر کے دھماکے سے وہ وہاں سے بھاگ جاتا مگر اس کے برعکس وہ سیدھا میرے بچان کی طرف آیا اور بانس کو اکھاڑنے لگا۔ حسن اتفاق سے پہلا بانس جو اس نے اکھاڑا، وہ بچان والا نہیں تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ ایک ایک کر کے تمام بانسوں کو اکھاڑے گا اور بچان کو گرادے گا۔ میرے لیے اس کو ہلاک کرنے کے علاوہ اب کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا مگر آخری کوشش کے طور پر میں نے ٹارچ کو بجھا کر دو فائر لگاتار اس کا سر بچا کر ہوا میں کیے۔ وہ مڑا اور جنگل میں دوڑتا چلا گیا۔ جھاڑیوں کو پھلانگتا، چھوٹے درختوں کو گراتا وہ اپنے جنون میں بھاگا جارہا تھا۔ پھر خاموشی طاری ہوگئی۔

اس حیرت انگیز ڈرامے سے میرے خون کی گردش جو تیز ہوگئی تھی اور ایک ہیجان پیدا ہوگیا تھا، اب وہ آہستہ آہستہ معمول کی طرف لوٹ رہا تھا۔ بس مجھے افسوس تھا کہ میرے پاس کیمرا ہوتا تو یہ ایک نادر جنگلی ڈراما مکس بند ہوجاتا۔ مجھے ایک ماہ کے بعد شدید پچھتاوا ہوا کہ کاش میں اس ہاتھی کو اسی رات ہلاک کردیتا تو میرا قریبی دوست ہنڈرسن شاید بچ جاتا کیونکہ ایک ماہ کے بعد اسی ہاتھی نے ہنڈرسن اور اس کے کئی قلیوں کو اس کی کافی اسٹیٹ میں ہلاک کردیا تھا۔ اس کے بعد فاریسٹ ڈپارٹمنٹ نے اسے باقاعدہ قرار دے کر ہلاک کرنے کی عام اجازت دے دی تھی۔ بعد میں کسی شکاری نے اسے ہلاک کردیا تھا۔

عام طور پر شیر اتنے بے وقوف نہیں ہوتے جیسے یہ شیر تھا، جس نے بغیر سوچے سمجھے ہاتھی سے ٹکر لے لی تھی۔ شیر اپنے سے بڑی جسامت والے جانور پر اول تو حملہ کرنے سے بچتے ہیں اور ناگزیر صورت میں بڑی ٹیکنیک سے کام لیتے ہیں۔ عام طور پر اگر وہ کسی جنگلی بھینسے کو شکار کرنے کی ٹھان لیتے ہیں تو سب سے پہلے اس کی پچھلی ٹانگ توڑ کر گرا کر ہلاک کرتے ہیں۔ آپ کو ایک اور دلچسپ قصہ سناتا ہوں، جس سے آپ

کو شیر کی سمجھ بوجھ کا اندازہ ہوجائے گا۔ یہ واقعہ بھی اسی زمانے کا ہے جب میں شیرنیوں کے قاتل شیر کے لیے گائے باندھ کر مچانوں پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرتا تھا۔ مجھے میرے کھوجیوں نے بتایا تھا کہ مغربی پہاڑیوں کے درمیان وادی میں وسیع گھاس کا ایک قطعہ ہے جہاں صبح شام جنگلی بھینسے، چیتل اور سانبھر گھاس چرنے آتے ہیں اور سب مل جل کر چرتے ہیں۔ میرے دل میں فوٹو گرافی کا شوق چرایا۔ میں نے ایک ایسی چٹان پر جو وادی کی طرف نکلی ہوئی تھی اور اس گھاس کے میدان کا منظر صاف نظر آتا تھا، چھپ کر بیٹھنے کے لیے جھاڑیوں کا ایک مورچہ بنالیا اور لنچ سے فارغ ہوکر اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر میں وہاں پہنچ گیا۔ میں نے ساتھ آئے نوکر کو گھوڑا واپس لے جانے کے ساتھ یہ ہدایت کردی کہ وہ ساڑھے پانچ بجے مجھے واپس لے جانے کے لیے دوبارہ گھوڑا لے کر آجائے۔ مجھے بیٹھے ہوئے ابھی ایک ہی گھنٹا گزرا تھا کہ ایک جیم تیم بھینسا جنگل سے نکل کر گھاس کے میدان میں آگیا۔ اس کا فاصلہ مجھ سے سو ڈیڑھ سو گز رہا ہوگا۔ میں اس کی فوٹو گرافی کے لیے اپنا کیمرا تیار کررہی رہا تھا کہ دوسرے کنارے پر اگی ہوئی جھاڑیوں میں ایک خفیف سی حرکت محسوس ہوئی۔ غور سے دیکھنے پر شیر کی جھلک نظر آئی۔ شیر جھاڑیوں میں چھپا ہوا بھینسے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ بھینسا شیر کی موجودگی سے لاعلم تھا کیونکہ شیر ہوا کے مخالف تھا اس لیے اس کی بو بھینسے تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ وہ بے فکر ہوکر سر جھکا کر گھاس کھانے میں مشغول تھا۔ مجھے یقین تھا کہ شیر اتنے بڑے بھینسے پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ میں کسی ایمرجنسی سے نمٹنے کے لیے اپنے ساتھ رائفل بھی لایا تھا۔ میرے دل میں آیا کہ یہ بہترین موقع ہے اور شیر بھی بڑا ہے، بڑی اچھی ٹرافی بنے گی، شیر کو ماردوں لیکن پتا نہیں کیوں مجھے شیر کی پُراسرار حرکت سے اندازہ ہورہا تھا کہ کوئی ڈراما چلے ہونے والا ہے۔ میں اس خواہش کو دبا کر کیمرے سے منظر کشی کرنے میں مشغول ہوگیا۔ پھر شیر نے ایک عجیب حرکت کی۔ وہ جھاڑی سے نکل کر ایک بڑے درخت کے نیچے کھڑا ہوگیا۔ چرتے ہوئے بھینسے کی آنکھ کے گوشے نے یہ حرکت دیکھ لی۔ وہ جلدی سے گھوم کر اپنا رخ شیر کی طرف کر کے کھڑا ہوگیا۔ اس نے سینگ نما آواز میں تیز سانس لی لیکن شیر اپنی جگہ کھڑا رہا۔ صرف اس کی دم حرکت کررہی تھی۔ بھینسے کے نتھنوں سے نکلنے والی پھنکاروں میں تیزی آگئی اور وہ اگلے داہنے پیر کو زمین پر پٹخ کر کھُر سے مٹی اڑانے لگا۔ اس سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ وہ شیر پر حملہ کرنے جارہا ہے۔ اگلے لمحے وہ سر جھکا کر اپنے نوکیلے سینگوں کو آگے کر کے تیزی سے دوڑتا ہوا شیر کے نزدیک پہنچا۔ عین موقعے پر شیر جھکائی دے کر ایک طرف ہٹ گیا اور بھینسا اپنے زور میں عین شیر کے پیچھے درخت کے تنے سے جا ٹکرایا۔ ایک لمحے کے لیے بھینسا چکرا کر رہ گیا۔ اس نے گھوم کر اپنے دشمن کو دیکھا تو شیر چھلانگیں مارتا ہوا ایک دوسرے بڑے درخت کے نیچے جا کھڑا ہوا اور اچانک بھینسے کی طرف کرلیا پھر اس کی دم حرکت کرنے لگی۔ اللہ جانے شیر کی دم کی حرکت بھینسے کو اشتعال دلانے کے لیے تھی یا حملے کی دعوت دینے کے لیے تھی۔ بھینسا پھر اپنے نتھنوں سے پھنکاریں مارتا ہوا سر جھکا کر حملہ کرنے کے لیے دوڑ پڑا۔ دوسری دفعہ پھر شیر نے عین موقعے پر وہی حرکت کی، وہ خود کو ایک طرف ہٹ گیا اور بھینسا اپنے زور میں دوسری مرتبہ پھر درخت کے تنے سے جا ٹکرایا۔ بھینسا اس قدر احمق تھا کہ بری طرح شیر کے ہاتھوں بے وقوف بن رہا تھا۔ اس لڑائی کے انجام کے لیے میرے اندر ایک ہیجان برپا تھا کہ دیکھیں، کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ ساتھ ساتھ میرا کیمرا اس لڑائی کی ایک ایک تفصیل کی منظر کشی کررہا تھا۔ آخر میں چوتھی مرتبہ درختوں کے تنوں سے ٹکرانے کے بعد اس کی حالت خراب ہوچکی تھی۔ اس کی پیشانی اور منہ خون سے تربتر ہوگئے تھے۔ وہ تھک کر چور ہوگیا تھا اور گہرے سانس لے رہا تھا۔ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ شیر نے اس کی پیٹھ پر جمپ لگا کر اس کی گردن کو اپنے پنجوں اور دانتوں میں دبا کر توڑ دیا۔ بھینسا ایک دھماکے کے ساتھ زمین پر ڈھیر ہوگیا، ساتھ ہی شیر بھی پیٹھ سے اتر آیا اور اطمینان سے اس کی گردن دبوچ لی۔ اب میری برداشت سے باہر ہوگیا تھا، میں نے ..... کیمرے کو ایک طرف رکھا اور رائفل اٹھا کر شیر کا نشانہ لے کر اسے ہلاک کردیا، ساتھ ساتھ دوسری گولی سے تڑپتے بھینسے کو اذیت سے آزاد کردیا۔ جب میرا نوکر گھوڑا لے کر مجھے لے جانے کے لیے آیا تو شیر اور بھینسے کی لاش دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مجھے شدت کے ساتھ انتظار تھا کہ شیرنیوں کا قاتل شیر میرے باندھے ہوئے گاروں میں سے کسی جانور کو ہلاک کرے مگر انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی گئیں۔ حالانکہ میرے حساب سے اسے ان دنوں بھوکا ہونا چاہیے تھا مگر وہ نہیں آیا اور نہ کسی علاقے سے اس کی موجودگی کی اطلاع ملی۔ اس کے بعد سے وہ نظر سے غائب ہوگیا۔ لوگوں کی متفقہ رائے تھی کہ جو شیر میں نے بھینسے کے ساتھ ہلاک کیا تھا، وہی شیرنیوں کا قاتل تھا۔

جنگل کلب

سید احتشام

کمپیوٹر پروگرامز میں تہلکہ مچادینے والی اس بھارتی حسینہ کے چاہنے والے بہت تھے مگر وہ صرف دوستی کی قائل تھی۔ دوستوں کو گھربلاتی، ذہنی تفریح کا سامان کرتی، جنگل میں شکار کے لیے بھی جاتی جہاں تشنگانِ عشق لب تشنہ جمع ہوتے۔ اس روز بھی اسیرانِ زلفِ گرہ گیر اس کے جنگل کلب میں جمع تھے کہ ان میں سے ایک ناپدیدہ قاتل کا شکار بن گیا۔ قاتل نے بڑی چالاکی سے قتل کیا تھا مگر قانون کے ہاتھ اس کی گردن تک پہنچ ہی گئے مگر کیسے؟

سراغ رسانی کی ایک دلچسپ داستان

بنگلور شہر سے باہر، منگور جانے والے راستے پر جنگل سے ملحق ''ہیگڑے ولا'' کسی راج محل جیسی شان وشوکت کا حامل تھا۔ یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیا مہنگائی کے اس دور میں بھی کوئی شخص ایسا وسیع وعریض اور شاندار محل تعمیر کرا سکتا ہے۔ تیا ہیگڑے کے والد روی کانت ہیگڑے کے پاس کتنی دولت، زمین جائداد ہوگی، اس کا اندازہ انکم ٹیکس کے افسر بھی نہیں لگا سکتے اور نہ ہی کبھی اندازہ لگانے کی گستاخی کر سکتے ہیں۔ جس کے پاس دولت ہوتی ہے، طاقت بھی اسی کے پاس ہوتی ہے۔ روی کانت ہیگڑے کے لیے چار پانچ کروڑ کی رقم کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ اسی روی کانت ہیگڑے کی اکلوتی اولاد تھی تیا۔ وہ جتنی حسین تھی، اتنی ہی خوش اخلاق اور ملنسار بھی تھی۔ اتنے بڑے باپ کی بیٹی ہونے کے باوجود اس میں ذرا سا بھی گھمنڈ نہیں تھا۔

بنگلور شہر میں روی کانت ہیگڑے کی ایک عالی شان کوٹھی تھی۔ اس کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں اس وقت ڈی ایس پی ہری ہرن بیٹھے سگار کے کش لیتے ہوئے، تیا ہیگڑے سے قتل کی ایک واردات کے سلسلے میں پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ ان دنوں روی کانت ہیگڑے بھارت میں نہیں تھے۔ ان کا صندل کی لکڑی کا کاروبار تھا اور وہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں نیویارک گئے ہوئے تھے۔ تیا ہیگڑے کا اپنے باپ کے کاروبار سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ تیا کی تعلیم امریکا میں ہوئی تھی۔ اس نے ہارورڈ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور واپس وطن آ کر وہ ایک سوفٹ ویئر پروگرام سے وابستہ ہوگئی تھی جہاں کام کرتے ہوئے اس نے کمپیوٹر کا ایک ایسا انوکھا اینٹی وائرس ایجاد کیا تھا جو کمپیوٹر کے ہر وائرس کا جانی دشمن تھا۔ یہ پروگرام نئے نئے اور زبردست وائرس کو بھی کمپیوٹر کے کسی پروگرام کے قریب پھٹکنے نہیں دیتا تھا۔ اس کے اس پروگرام کی دھوم مچ گئی تھی۔

تیا نے بنگلور ہی میں اپنا ہیڈ آفس قائم کیا تھا۔ ویسے بھی بنگلور بھارت کا الیکٹرونک سٹی کہلاتا ہے۔ اسی شہر میں رہتے ہوئے وہ اپنی پروڈکٹ کو لانچ کرنا چاہتی تھی۔ تیا اس کے علاوہ بھی کئی پروگرام پر کام کر رہی تھی اس کے لیے وہ دن رات محنت کر رہی تھی۔ پہلے پروگرام کی کامیابی نے اسے حوصلہ بھی دیا تھا اور مالی فائدہ بھی پہنچایا تھا۔ اس کے پاس دیسے بھی دولت کی کوئی کمی نہیں تھی اس لیے وہ اتنی مصروفیت سے بھی وقت نکال کر اپنے دوستوں کو پارٹیاں دیتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی لانگ ڈرائیو پر بھی نکل جاتی تھی۔ ویسے بھی جنگل سفاری اس کا خاص شوق تھا۔ یوں تو جنگلی جانوروں کے شکار پر پابندی ہے لیکن اگر جنگل میں کوئی جانور نظر آ جائے تو شکاریوں کے ہاتھ میں کھجلی ہونے لگتی ہے۔ تیا اور اس کے دوستوں کا بھی یہی حال تھا۔ کبھی جنگلی بطخوں اور کبھی کسی اور جانور کے شکار کا پروگرام بنا کر اسے اپنے یار دوستوں کو تفریح کا سامان فراہم کرنا پڑتا تھا۔ اس نے منگلور کی سمت، گیرا کے گھنے جنگل میں اپنا ایک کلب ہاؤس بنا رکھا تھا۔ علاقے کی مناسبت سے یہ کلب ہمیشہ بادلوں اور دھند میں ملفوف رہتا تھا۔ سیمیں کے پہاڑ سے غروب آفتاب کا نہایت دلکش اور دلفریب نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ اس نظارے سے لطف اندوز ہونے کے لیے دور دور سے لوگ آتے تھے۔

اسی مقام پر چار دن پہلے تیا چار دوستوں کے ساتھ اپنی تھکان اتارنے کے ارادے سے جنگل سفاری کے لیے آئی تھی اور دوستوں کے ساتھ کلب ہاؤس میں ٹھہری تھی۔ اس کے یہ چاروں دوست اس کے ہم عمر تھے، نوجوان تھے۔ اس کلب ہاؤس کی رکھوالی کے لیے ایک شخص ستیہ نارائن اپنی بیوی گائتری کے ساتھ گیٹ کے پاس بنے کوارٹر میں رہتا تھا۔ آزاد خیال تیا ہیگڑے کو لڑکیوں سے دوستی بالکل پسند نہیں تھی، اس لیے اس کے سارے ہی دوست مرد تھے۔ اس کے ساتھ آنے والے دوستوں میں سے ایک کا نام اوتھیلو تھا۔ اس کا باپ شیکسپیئر کا زبردست مداح تھا اسی وجہ سے اس نے اپنے

بیٹے کا نام اوتھیلو رکھا تھا۔ ادھر لوگ کہنے لگے تھے کہ تیا، اوتھیلو کو اپنا جیون ساتھی بنائے گی لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے اپنا جیون ساتھی بناتی، پولیس اسے رام کمار کے قتل کے الزام میں پکڑ کر لے گئی تھی۔

☆☆☆

رام کمار ورما بھی تیا کے چاہنے والوں میں سے ایک تھا۔ اکثر جن چار دوستوں کے ساتھ تیا شکار کھیلنے آتی تھی، وہ چاروں ہی تیا سے شادی کے خواہش مند تھے۔ یہاں پر بات پیار کی کم، دولت کی زیادہ تھی کیونکہ اس کے ان چاروں دوستوں کو معلوم تھا کہ تیا جسے بھی اپنا جیون ساتھی بنائے گی، وہ شادی کے بعد دنیا کے گنے چنے امیروں میں سے ایک ہوگا۔ پری جمال اور خوش اندام بیوی کے ساتھ ساتھ بے حساب دولت بھی اسے ملے گی۔ اسی خواہش نے جرم کو دعوت دے دی تھی۔

رام کمار کا قتل جنگل ہی میں ہوا تھا۔ اس وقت اوتھیلو چندن لیک کے شمال مشرقی سمت میں تھا۔ اس سے بیس گز کے فاصلے پر رام کمار تھا۔ رام کمار کے داہنی طرف بیچ کی جگہ تیا کے لیے خالی تھی لیکن تیا ان کے ساتھ نہیں آئی تھی اور کلب ہاؤس میں رک گئی تھی کیونکہ اس کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی۔ اس نے اپنے دوستوں کو جنگل روانہ کر دیا تھا اور ان سے کہا تھا کہ وہ تھوڑی دیر میں آئے گی۔ اس خالی جگہ سے بیس گز کے فاصلے پر موہن چندارکی بیٹھا تھا۔ اس سے بھی بیس گز کی دوری پر، چندن لیک کے جنوب مشرقی کنارے پر بیریشور جھک بیٹھا تھا۔ اسی طرح چندن لیک کے مشرقی کنارے پر چاروں دوست بیس پچیس گز کی دوری پر شکار کے لیے گھات لگائے مسلح بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں رام کمار اور موہن کے بیچ پچاس گز کا فاصلہ تھا۔ یہاں کی گھاس لگ بھگ بارہ فٹ اونچی تھی۔ جنگلی جانور اسی گھاس میں سے ہوتے ہوئے، چندن جھیل پر پانی پینے آتے تھے۔ کبھی کبھار کوئی بڑا جانور ادھر آ جاتا تو وہ ان شکاریوں کے چنگل سے بہ مشکل ہی بچتا تھا کیونکہ یہاں کوئی محکمہ جنگلات کا آفیسر نہیں تھا مگر پورا علاقہ یعنی جنگل اور پہاڑ سب کچھ روی کانت ہیگڑے کی نجی ملکیت تھی۔

تیا کے بدن میں درد تھا، اس لیے وہ اس شام اپنے دوستوں کے ہمراہ شکار پر نہیں جا سکی تھی حالانکہ اس نے کلب ہاؤس میں ہی فائرنگ کی آواز سنی تھی۔ اس سے اسے لگا تھا کہ آج شاید اچھے شکار مل رہے ہیں۔ وہ لوگ ہمیشہ شام سات بجے کے قریب کلب ہاؤس لوٹ آتے تھے۔ اس دن بھی ساڑھے سات بجے اوتھیلو، بیریشور اور موہن چندارکی لوٹ آئے تھے لیکن رام کمار نہیں لوٹا تھا۔ لڑکیوں کا دل کسی انہونی کو بہت جلد بھانپ لیتا ہے، اس لیے رام کمار کے ساتھ نہ آنے پر تیا کا دل بھی کسی انجانے خوف سے دھڑکنے لگا تھا۔

رام کمار کے کلب نہ لوٹنے پر موہن، بیریشور اور اوتھیلو بھی حیران اور متفکر تھے۔ لوٹنے وقت ان لوگوں نے سوچا تھا کہ تیا سے تنہائی میں ملنے کے خیال سے شاید وہ شکار کیے ہوئے پرندوں کو لے کر پہلے ہی چلا گیا۔ ان لوگوں نے چھ بجے کے آس پاس رام کمار کی بندوق کی آواز سنی تھی۔ اوتھیلو، رام کمار کے بائیں طرف بیٹھا تھا اور اپنی جگہ سے ہی اس نے دیکھا تھا کہ گھاس کے اوپر اڑتے پرندے یکے بعد دیگرے گر رہے تھے۔ اس نے دو فائر کیے تھے۔ اس کے بعد رام کمار نے کوئی فائر نہیں کیا تھا۔ پھر اس کے سر کے اوپر سے جنگلی بطخوں کے جھنڈ بے روک ٹوک اڑتے رہے تھے۔ تب اوتھیلو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب رام کمار فائر کیوں نہیں کر رہا ہے اور اسے یہ خیال گزرا تھا کہ شاید تیا سے تنہائی میں ملاقات کرنے کے ارادے سے وہ اپنے شکار کیے ہوئے پرندوں کو لے کر چلا گیا ہے۔

☆☆☆

جنگل خطرناک تھا اس لیے رات ہونے سے پہلے رام کمار کا پتا لگانا ضروری تھا۔ برآمدے میں تیا فکر اور تشویش سے بھویں سکیڑے کھڑی تھی۔ اس کے پاس ستیہ نارائن بھی کھڑا تھا۔ وہ اس کلب کا نگراں تھا۔ وہ ایک سابق فوجی تھا۔ رام کمار کو تلاش کرنے کی بات آئی تو ستیہ نارائن سب سے آگے اپنی بندوق اور ٹارچ لے کر نکل گیا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے باقی لوگ بھی روانہ ہوگئے تھے۔ ستیہ نارائن نے بھی سب سے پہلے رام کمار کو دیکھا تھا۔ وہ سیدھے رام کمار کی لاش کے پاس اس طرح جا کر کھڑا ہوگیا تھا جیسے اسے پہلے ہی سے پتا تھا کہ رام کمار وہیں مرا پڑا ہے۔ بارہ نٹ اونچی گھاس کے جنگل میں تھوڑی خالی جگہ تھی، وہیں رام کمار اوندھے منہ گرا ہوا تھا۔ کسی نے اسے گولی مار کر ہلاک کردیا تھا۔ گولی پیچھے سے ماری گئی تھی جو سینے کو پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔

ستیہ نارائن لاش اپنے کندھے پر رکھ کر کلب ہاؤس تک لے آیا تھا۔ اس کے بعد تھانہ گیرا کو واردات کی اطلاع دی گئی تو پولیس آ گئی۔ پولیس نے لاش کا معائنہ کیا۔ اس کی پیٹھ پر جس گولی کا سوراخ تھا، اس سے بڑے جانوروں کا شکار کیا جاتا تھا۔ ہیریشور اور موہن کے پاس وہ گولیاں تھیں جن سے پرندوں کا شکار کیا جاتا تھا۔ صرف اوتھیلو کے پاس وہ گولیاں تھیں جو بڑے جانوروں کے شکار میں استعمال ہوتی تھیں۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ اوتھیلو ہی قاتل تھا۔ یہ اس بات کا پہلا ثبوت تھا۔ دوسرا ثبوت تھا اس کے پیروں کے نشان۔

ستیہ نارائن نے پہلے ہی سے سب کی جگہ مقرر کر رکھی تھی۔ اس لیے چاروں سمت اپنی اپنی بندوق اٹھائے چندن لیک کے مشرقی کنارے پر اپنی اپنی جگہ چلے گئے تھے۔ لیک کے کنارے کیچڑ پر پاؤں کے جانے کے بعد دں کے نشان تھے لیکن لوٹتے وقت صرف دو افراد کے پیروں کے نشان پائے گئے تھے۔ اوتھیلو کے پیروں کے نشان جھیل کے مشرقی کنارے سے سیدھے شمال مشرقی سمت میں اس کی جگہ تک گئے تھے۔ وہاں سے شمالی کنارے تک اکیلے اس کے لوٹنے کے پیروں کے نشان ملے تھے۔ یہ نشان آنے اور جانے دونوں کے تھے۔ پیروں کے یہ نشان یہ ثابت کر رہے تھے کہ اوتھیلو نے جا کر رام کمار کو پیچھے سے گولی ماری تھی اور پھر اپنی جگہ لوٹ آیا تھا۔

تیسرا ثبوت ہیریشور اور موہن سے ملا تھا۔ شکار پر جاتے وقت رام کمار اور اوتھیلو آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ یہ جھگڑا تیا کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ ان سے کچھ دوری پر ان کے پیچھے چلنے والے موہن اور ہیریشور نے ان کی دو چار باتیں سن لی تھیں۔ رام کمار، اوتھیلو کی کھنچائی کرتے ہوئے کہہ رہا تھا ''کیوں بے، پیسے کے لالچ میں تیا سے شادی کرنا چاہتا ہے؟''

اوتھیلو، رام کمار کی اس بات پر غصے سے آگ بگولا ہوگیا تھا۔ شکار کی جگہ پہنچنے تک دونوں میں تو تو میں میں ہوتی رہی تھی۔

''اسی کے بعد رام کمار کی زندگی کا چراغ گل ہوگیا تھا؟'' ڈی ایس پی ہری ہرن نے اپنے ہونٹوں سے سگار ہٹا کر پوچھا تھا ''تیا جی! آپ کو کیا لگتا ہے، کیا اوتھیلو نے ہی رام کمار کا قتل کیا ہے؟''

''نہیں۔'' تیا نے نفی میں سر ہلایا ''مجھے تو اس بات پر بالکل یقین نہیں ہوتا۔ آپ بھی اسے دیکھیے ہی سمجھ جائیں گے کہ کسی بھی شخص کا قتل کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔''

''کیا ملزم کو یہاں لایا گیا ہے؟''

''آپ کے آنے کی خبر سن کر میں نے اسے لے کر آنے کے لیے اپنے آدمی بھیج دیے ہیں۔''

''سب تک آ جائیں گے وہ لوگ؟''

''بس آتے ہی ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے، ذرا ایک گلاس پانی منگوائیے۔'' ڈی ایس پی نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''گائتری!'' تیا نے اونچی آواز میں پکارا۔

کمرے میں ایک جوان عورت داخل ہوئی۔ ساڑی پہننے کے ڈھنگ سے ہی لگتا تھا کہ وہ میسور کی رہنے والی تھی۔ بے حد گوری لیکن چہرے پر روکھا پن صاف جھلک رہا تھا۔ اس کے ہونٹ سوجے ہوئے تھے، جسے اس نے آنچل سے ڈھانپ رکھا تھا۔ تیا نے کنڑ زبان میں کچھ کہا اور وہ چلی گئی۔

ڈی ایس پی ہری ہرن نے پوچھا ''اس کے ہونٹوں کو کیا ہوا ہے؟''

''مچھر کے بل گرگئی تھی، دانت ٹوٹ گئے ہیں۔'' تیا نے جواب دیا۔

''یہاں رہتی ہے؟''

''نہیں، کلب ہاؤس رہتی ہے۔ ستیہ نارائن کی بیوی ہے۔ ایک لڑکا تھا، جو آوارہ ہوگیا تھا۔ کچھ ہی دنوں پہلے اس کی موت واقع ہوگئی۔ میاں بیوی کلب ہاؤس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ آپ آ رہے تھے، اس لیے میں نے آج ہی دونوں کو یہاں بلا لیا ہے۔''

☆☆☆

گائتری کو دیکھتے ہی ہری ہرن کی چھٹی حس بیدار ہوگئی

تھی۔ چالیس سال کے آس پاس ہونے کے باوجود اس نے اپنی جوانی سنبھال کر رکھی تھی۔ ہری ہرن نے غور کیا تھا کہ گائتری کی آنکھوں میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ اس کی چتون میں کچھ ایسا تھا کہ اسے دیکھ کر کسی بھی مرد کا دل ڈول سکتا تھا۔

''تیا جی، میں ذرا گائتری سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' ڈی ایس پی ہری ہرن نے کہا۔

تیا تھوڑی حیران تو ہوئی لیکن اس نے فوراً ڈی ایس پی کے کہنے کے مطابق انتظام کردیا۔ گائتری کے سامنے آتے ہی ڈی ایس پی ہری ہرن نے پوچھا ''رام کمار سے تمہاری کتنی جان پہچان تھی؟''

''بہت۔'' گائتری نے جواب دیا۔

ڈی ایس پی صاحب کو لگا کہ یہ کہتے ہوئے گائتری کے ہونٹوں پر ایک دبی دبی سی مسکان ابھر آئی تھی لیکن ہونٹ سوجے ہوئے ہونے کی وجہ سے ظاہر نہیں ہو سکی تھی۔

''تم کتنی بار اس سے ملی ہو؟''

''ہیگڑے ولا میں ہوتی تھی تو صبح شام ملاقات ہوتی تھی کیونکہ یہاں تو دونوں ہی وقت ان کا آنا جانا تھا لیکن جب کلب میں ہوتی تھی تو شکار پر جانے پر ہی ہوتی تھی۔''

''کبھی اکیلے میں بھی میل ملاقات ہوئی تھی تم دونوں کی؟''

''مطلب؟''

''جو بوجھا جائے، اس کا سیدھا سیدھا جواب دو۔''

''ہوئی تھی۔''

''تمہارے ساتھ اس کا سلوک کیسا تھا؟''

''ان کا کردار ٹھیک نہیں تھا۔''

''کیوں؟ کیا کیا تھا اس نے تمہارے ساتھ؟''

''مجھ سے ہم بستری کرنا چاہتا تھا۔''

''تم راضی تھیں؟''

''پیسے کی خاطر بہت کچھ کرنا پڑتا ہے صاحب! لیکن اس کے ساتھ قتل کا کیا سمبندھ ہے؟''

اسی وقت کمرے میں تین نوجوان داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے دو افراد اور بھی تھے۔ تینوں نوجوان اونچے قد کاٹھ کے تھے۔ ان کے چہرے کے رنگ روپ بھی ایک جیسے تھے۔ بس، ایک نوجوان کی ڈاڑھی تھی جو اسے دوسرے نوجوانوں سے الگ پہچان عطا کر رہی تھی۔ شاید وہی اوتھیلو تھا۔ غصیلا چہرہ، اس وقت بھی اس کی آنکھوں سے غصہ جھلک رہا تھا۔

تیا نے اس نوجوان کی طرف دیکھ کر کہا ''اوتھیلو، تم یہاں میرے پاس بیٹھو۔ تم بے گناہ ہو، یہ ثابت کرنے کے لیے ڈی ایس پی ہری ہرن صاحب یہاں آئے ہیں۔ ان کے بائیں طرف سب انسپکٹر مریگا ناگ راجن ہیں اور دائیں طرف کیپل ادھیر ہیں۔ اور ان کو تو تم پہچانتے ہی ہو، روہت کانجی لال۔ اس بار شکار کی مہم پر مضمون لکھنے آئے تھے، لیکن.....!''

ان تینوں کے ساتھ آئے ہوئے دونوں افراد اوتھیلو کے پیچھے کھڑے تھے۔ ایک تو تھانہ گیرا کا انچارج ونکٹ چنائے تھا جو اوتھیلو کو اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ دوسرا آدمی ایسا تھا جیسے کسی نے کالا پتھر تراش کر اس میں جان ڈال دی ہو۔ اس کی سرخ آنکھوں سے سختی جھلک رہی تھی۔ تیا نے اس کا تعارف کرایا ''ستیہ نارائن، سابق فوجی۔ فی الحال ہمارے کلب ہاؤس کا کیئر ٹیکر ہے۔''

اس دوران گائتری کافی رکھ گئی تھی۔ ڈی ایس پی ہری ہرن کافی پیتے ہوئے، اوتھیلو اور اس پولیس آفیسر سے بھی بات کرتے رہے پھر کافی ختم کر کے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا۔ ''چلیے، پہلے ہم کلب ہاؤس چل کر پیروں کے وہ نشان دیکھ لیتے ہیں جس کی بنیاد پر آپ سب اوتھیلو کو قاتل مان رہے ہیں۔ ستیہ نارائن جی، آپ بھی چلیے۔ آپ ہی کو وہ نشان ہمیں دکھانے ہیں۔''

☆☆☆

گاڑی سے وہاں تک پہنچنے میں لوگ بھک تین گھنٹے لگے تھے۔ تھانہ انچارج چنائے نے پہلے ہی سے سارا انتظام کر رکھا تھا تاکہ دن کے اجالے میں ہی ساری چھان بین ہو جائے۔ چندن لیک واقعی بڑی خوبصورت اور دلفریب جگہ تھی۔ چاروں طرف پہاڑی کی چوٹیاں، اونچے اونچے پیڑ، کہر اور بادلوں سے گھری چندن جھیل جیسے فریم میں منڈھی ہوئی تصویر لگ رہی تھی۔ کلب ہاؤس سے جھیل نظر نہیں آتی تھی۔ یہ بالکل پُرسکون اور سنسان جگہ تھی۔

وہ لوگ گاڑیاں کلب ہاؤس کے سامنے پارک کر کے پیڑوں کے درمیان پگڈنڈی سے ہوتے ہوئے، چندن جھیل کے کنارے پہنچے۔ جھیل بہت بڑی تھی۔ ایک کنارے سے دوسرا کنارا نظر نہیں آتا تھا۔ جھیل کے اوپر پرندے اڑ رہے تھے اور پانی میں جنگلی بطخیں تیر رہی تھیں۔ جھیل کے کنارے، جہاں وہ لوگ کھڑے تھے ایک ناؤ بندھی ہوئی تھی جس کے پتوار سمیٹ کر ناؤ میں رکھ دیے گئے تھے۔

پیروں کے نشان دیکھتے ہوئے سب لوگ آگے بڑھے۔ شمال مشرقی کنارے پر پہنچ کر پیروں کی چار جوڑی کے نشان کی جگہ اب تین جوڑی کے نشان ہی رہ گئے تھے۔ ہیریشور اپنی جگہ پر رک گیا تھا، اس کے بعد تھوڑا آگے جانے

پر دو جوڑی نشان رہ گئے تھے۔ موہن بھی اپنی جگہ پر آ گیا تھا۔ پھر آگے چل کر رام کمار رک گیا تھا۔ اس کے آگے پیروں کی ایک ہی جوڑی کے نشان تھے۔ خاص پیچ لگے ہوئے شکاری جوتے اوتھیلو کے تھے۔ جوتے کے نچلے حصے کے بڑے بڑے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔

''چاروں یہاں آ کر اپنے اپنے جوتے بدل لیتے تھے۔'' ستیہ نارائن نے کہا'' کلب ہاؤس میں سارا سامان رکھا رہتا تھا۔ جوتے، بندوق، گولیاں، سب کچھ.....!''

سب لوگ قدرت کے حسین نظاروں میں کھو سے گئے تھے۔ تھانہ مگیرا کے انچارج وینکٹ چنائے اور ڈی ایس پی ہری ہرن جھک کر جوتوں کے ان نشانوں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ پھر سیدھے کھڑے ہو گئے تھے اور بھویں سکیڑ کر خوبصورت جھیل کی طرف دیکھنے لگے۔ دھند ابھی تک چھٹی نہیں تھی۔ ڈی ایس پی ہری ہرن نے چنائے کو پاس بلا کر کہا'' جوتوں کے ان نشانات کے فوٹو اپ لیجئے۔''

''یس سر!''

''اوتھیلو کے جوتوں کے نشانوں کی تین قطاریں نظر آ رہی ہیں۔ یہ تینوں ایک ہی پرنٹ میں آنی چاہئیں۔ اس بات کا دھیان رکھیے گا۔''

''او کے، سر!''

پرندوں کی چہچہاہٹ کے بیچ پولیس کے کیمرے کی کلک کلک کی آواز بھی کو واضح طور پر سنائی دینے لگی تھی۔

''ستیہ نارائن!'' ڈی ایس پی ہری ہرن نے آواز دی۔

''جی سر!'' پل بھر میں وہ سیاہ فام پتلا جسم تن کر کھڑا ہو گیا۔ فوج کی بات ہی الگ ہے۔ ڈی ایس پی صاحب نے سوچا۔

پھر انہوں نے ستیہ نارائن پر نظریں گاڑ کر پوچھا'' اوتھیلو نے رام کمار کو پیچھے سے گولی ماری تھی؟''

''یس، سر!'' ستیہ نارائن نے جواب دیا۔

''آپ فوٹو کھینچ چکے ہیں تو مہربانی کر کے یہاں آیئے۔'' ڈی ایس پی صاحب نے تھانہ انچارج وینکٹ کو اپنے پاس بلایا۔

''یس سر، ابھی آیا۔''

ڈی ایس پی صاحب، ستیہ نارائن اور تھانے دار وینکٹ کو لے کر آگے بڑھے۔ ستیہ نارائن آگے بڑھتے ہوئے کیچڑ پر بنے بوٹوں کے نشان دیکھ رہا تھا۔ اس اونچی اونچی گھاس کے اندر جا کر پولیس آفیسرز نے دیکھا کہ نرم مٹی میں ایک جگہ گولائی میں دبی ہوئی تھی۔ ستیہ نارائن نے کہا۔

''رام کمار جی یہاں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر شکار پر نشانہ لے رہے تھے۔''

وہاں کھڑے ہونے پر گھنی گھاس کے بیچ سے جھیل کا پانی نظر تو آ رہا تھا لیکن صاف نہیں۔ ڈی ایس پی صاحب جھیل کے کنارے آ گئے۔ انسپکٹر وینکٹ ان کے ساتھ ہی تھے۔ انہوں نے پھر سے الگ الگ زاویے سے ان بوٹوں کے نشانوں کی تصویریں اتاریں جو اوتھیلو کے بتائے جا رہے تھے۔ سامنے پیڑ کی ایک موٹی سی شاخ کیچڑ میں دھنسی ہوئی تھی۔ اس کا دوسرا حصہ پانی میں تھا۔ اس شاخ کو پکڑ کر توازن برقرار رکھے ہوئے ڈی ایس پی صاحب آگے بڑھے۔ دوسری طرف پہنچ کر وہ سیدھے کھڑے ہو گئے۔ پھر گھاس کے جنگل کی طرف جھک کر کچھ دیکھنے لگے۔ اچانک ان کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ وہ اپنا پیٹ زور سے دبائے، لڑکھڑاتے ہوئے کنارے پر آ کر مخاطب ہوئے'' مجھے فوراً ٹائلٹ جانا ہے۔''

ستیہ نارائن نے کہا'' چلیے۔''

''کلب ہاؤس کا ٹوائلٹ کدھر ہے، تم یہ بتا دو۔ باقی تم انسپکٹر صاحب کی مدد کرو۔ جہاں جہاں اوتھیلو کے بوٹ کے نشان ہیں، انہیں دکھاؤ۔ مجھے اس کے جوتوں کے سارے نشانوں کی تصویریں چاہئیں۔'' پھر وہ انسپکٹر وینکٹ سے مخاطب ہوئے'' تصویریں ذرا ٹھیک سے کھینچئے گا۔''

''وہی طرف صاحب!'' ستیہ نارائن نے کہا۔

ڈی ایس پی صاحب، سب انسپکٹر مریگا کو آواز دے کر کلب ہاؤس کی طرف بھاگے۔ سب انسپکٹر مریگا بھی ان کے پیچھے کلب ہاؤس پہنچی۔ اس نے اندر جا کر دیکھا تو ڈی ایس پی صاحب کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔ کلب ہاؤس کے پھاٹک کے سامنے ہی ان کی گاڑی تھی۔ مریگا نے باہر آ کر دیکھا تو ڈی ایس پی صاحب اپنی گاڑی میں بیٹھے نظر آئے۔ انہوں نے اس سے دبی آواز میں کہا۔

''مریگا! میں نے سنا ہے کہ تم سیٹی بجا کر گانا بہت اچھا گا لیتی ہو؟''

''ایسی صورتِ حال میں اچانک ایسا سوال سر!'' مریگا بھونچکی رہ گئی۔

''تم ڈرائیور کو لے کر ناؤکی سیر کے بہانے جھیل کے کنارے جاؤ۔'' ڈی ایس پی صاحب نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا'' پھر ناؤ پر سوار ہو کر اسی کنارے چکر کاٹتی رہو۔ اگر ستیہ نارائن اس طرف آنے لگے تو تم زور سے سیٹی بجا کر گانا گانے لگنا۔ سیٹی اتنی زور سے بجانا کہ میں سن سکوں۔''

''یس سر!'' مریگا نے کہا اور ڈرائیور کے ساتھ فوراً

جھیل کے کنارے پہنچ گئی۔''

پھر جیسا ڈی ایس پی صاحب نے کہا تھا، اس نے ویسا ہی کیا۔ ستیہ نارائن جب تیزی سے کلب ہاؤس کی طرف بھاگنے لگا تو وہ زور سے سیٹی بجا کر ایک فلم کا گانا گانے لگی۔ سیٹی کی آواز سن کر ستیہ نارائن ایک بار رکا لیکن پھر اور تیزی سے کلب ہاؤس کی طرف گھنے پیڑوں کے بیچ گم ہو گیا۔

کچھ دیر کے بعد کلب ہاؤس کی طرف سے بندوق کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ سب لوگ اس طرف بھاگے۔ سب سے آگے انسپکٹر وینکٹ تھا۔ اس کے پیچھے باقی لوگ کافی پیچھے رہ گئے تھے۔ پھاٹک کے اندر بائیں طرف کیئر ٹیکر ستیہ نارائن کا کمرا تھا۔ ڈی ایس پی ہری ہرن صاحب ستیہ نارائن کے کمرے کے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے یونیفارم کی حالت ایسی تھی جیسے ابھی ابھی ان کی کسی سے دھینگا مشتی ہوئی ہو۔ سب لوگ انہیں سوالیہ نظروں سے تکنے لگے۔ انہوں نے ستیہ نارائن کے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''رام کمار کا قاتل اس کمرے میں ہی ہے ہوش پڑا ہے۔ میں نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے ہیں۔ اسے بے ہوش نہ کرتا تو اس کی گولی کا نشانہ بن کر رام کمار کے پاس پہنچ چکا ہوتا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ میرا بھرپور مکا اس کی ہنسلی کی ہڈی پر پڑا جس سے اس کی ہنسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اب اسے کچھ دن اسپتال میں رکھنا پڑے گا۔''

کسی کو بھی اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ لوگ حیران اور ششدر کھڑے تھے۔ پھر مریگا نے ہکلاتے ہوئے مہر خاموشی توڑی۔

''جج..... جی، بھی تو اوتھیلو پر شک کر رہے تھے۔ ایسے میں آپ کو ستیہ نارائن پر کیسے شک ہو گیا؟''

''اوتھیلو کے جوتے کے نشان کو دیکھ کر۔''

''کیا تھا ان جوتوں کے نشانوں میں؟''

''بہت معمولی سا فرق تھا۔ بوٹ بہت پرانا تھا۔ جب اوتھیلو جنگل میں تھے، اس وقت ان کے جسم کا وزن ہر نشان پر برابر پڑا تھا۔ جن جوتوں کے نشان دیکھ کر آپ لوگوں کو شک ہوا تھا اور آپ لوگوں نے جسے دوسرا ثبوت مان لیا تھا کہ اوتھیلو نے اپنی جگہ سے آ کر رام کمار کو پیچھے سے گولی ماری تھی اور اپنی جگہ لوٹ گیا تھا۔''

''جی، یہ شک نہیں بلکہ جوتوں کے دو طرفہ نشان اس بات کا ثبوت ہیں۔'' مریگا نے بحث کی۔

''نہیں، جوتوں کے وہ نشان بالکل اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ اوتھیلو ہی قاتل ہے۔ میں نے انسپکٹر چنائے سے جو تصویریں کھنچوائی ہیں، انہیں ذرا غور سے دیکھیے۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ اس کے بوٹ کے نشان سے ہر جگہ ایک جیسے گڑھے نہیں بنے ہیں۔ وہ گڑھے کہیں زیادہ گہرے ہیں تو کہیں کم گہرے ہیں۔ اوتھیلو چلتے چلتے کبھی ہلکا تو کبھی بھاری تو ہو نہیں سکتا تھا۔''

اوتھیلو، خاموشی سے ڈی ایس پی صاحب کی باتیں سن رہا تھا۔ سب انسپکٹر مریگا نے اگلا سوال کیا'' تو کیا وہ نشان نقلی ہیں؟''

''جی، بالکل۔'' ڈی ایس پی صاحب نے جواب دیا۔ ''ہاتھوں سے کسی نے کیچڑ پر وہ نقلی نشان بنائے تھے۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے، سر! پھر تو اس گیلی مٹی پر اس شخص کے بھی پیروں کے نشان ہونے چاہیے تھے، اس شخص نے اگر کر تو وہ نشان بنائے نہیں ہوں گے۔''

''اڑ کر نہیں بنائے تھے بلکہ کشتی پر سوار ہو کر بنائے تھے۔ کشتی پر سوار ہو کر، جھک کر ہاتھوں سے گیلی مٹی پر نشان بناتا ہوا، آگے بڑھتا چلا گیا تھا۔''

''کیا گولی بھی اس نے ناؤ سے ہی چلائی تھی؟ گولی پیچھے لگی تھی، جبکہ ناؤ تو سامنے تھی۔ یہ کیسی بات ہوئی، سر!'' مریگا نے جاننا چاہا۔

''اس کا جواب میں بعد میں دوں گا۔'' ڈی ایس پی صاحب مسکرا کر بولے'' ٹوائلٹ جانے کے بہانے یہاں آ کر میں نے ستیہ نارائن کے کمرے کی تلاشی لی تھی۔ اس تلاشی میں مجھے چار چیزیں ملیں۔ وہ بندوق جس سے رام کمار کا قتل کیا گیا۔ بڑے جانوروں کا شکار کرنے کی گولیاں بھی ملیں، جبکہ اوتھیلو نے اپنے بیان میں بتایا تھا کہ وہ شکار پر جاتے وقت بڑے جانوروں کا شکار کرنے والی چار گولیاں لے کر گیا تھا۔ پولیس نے چاروں گولیاں اس سے برآمد کر لی تھیں۔ پوچھ گچھ کے دوران ستیہ نارائن نے بھی یہ بات بتائی تھی کہ شکار پر جاتے وقت اس نے اوتھیلو کو بڑے جانوروں کا شکار کرنے والی چار اور چھوٹے شکار کے لیے دس گولیاں دی تھیں۔ اسی بات نے ستیہ نارائن کو مشکوک بنا دیا تھا۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کافی دنوں سے تیاری کر رہا تھا۔'' مریگا نے حیرانی سے کہا'' تیسری اور چوتھی چیزیں کیا تھیں، سر!''

''یہ رہی۔'' ڈی ایس پی صاحب نے اپنی شرٹ کی جیب سے سونے کا ایک ہار نکال کر سب کے سامنے لہرایا۔ پھر انہوں نے اس میں لگے لاکٹ کو پلٹ کر کہا'' اس ہار کو غور سے دیکھیے۔ اس لاکٹ کے پیچھے کنڑ زبان میں لکھا ہے۔

"رام کمار کو سوامی آتما آنند کی طرف سے بڑے خلوص سے نذرانہ" اب اس سے آپ لوگ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ یہ ہار رام کمار کا ہے۔"

"سوامی آتما آنند!" مریگا نے حیرانی سے کہا "ویویک آنند مشن کے مہاراج!"

"پہچانتی ہو انہیں؟"

"جی نہیں، نام سنا ہے۔"

"مشن کا ٹیلی فون نمبر تو آپ کے پاس ہوگا ہی، ذرا نمبر ملاؤ۔"

مریگا نے اپنے موبائل میں محفوظ نمبروں میں سے مشن کا نمبر نکال کر ملا دیا۔ دوسری طرف سے "ہیلو" کی آواز آئی تو ڈی ایس پی صاحب نے پوچھا "سوامی آتما آنند!"

"جی، بول رہا ہوں۔ آپ.....؟"

"منگلور کا ڈی ایس پی ہری ہرن!"

"کہیے ڈی ایس پی صاحب....."

"آپ کسی رام کمار ورما کو جانتے ہیں؟"

"جی، کیوں.....؟"

"ان کا قتل ہو گیا ہے۔"

"اوہ کس نے قتل کیا؟"

"اس کا پتا لگانے کے لیے میں نے آپ کو فون کیا ہے۔ کیا آپ نے کبھی اسے سونے کا ہار تحفتاً دیا تھا؟"

"ہاں، لیکن وہ تو کئی سال پہلے ڈکیتی میں چلا گیا تھا۔ دراصل چندن کی لکڑیوں کے چوروں نے رام کمار کے یہاں ڈکیتی ڈالی تھی۔ اسی ڈکیتی میں ڈکیت اس کی وہ سونے کی مالا بھی لے گئے تھے۔ رام کمار نے گولی چلا کر ایک ڈکیت کو گھائل بھی کیا تھا لیکن یہ تو پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ اب وہ مالا آپ کو کہاں مل گئی؟"

تمیا نے دانت پیستے ہوئے کہا "چار سال پہلے ستیہ نارائن کو کلب ہاؤس کے کیئر ٹیکر کی نوکری پتا جی نے دی تھی کیونکہ وہ سابق فوجی تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اس سے پہلے چندن کی لکڑیوں کا چور تھا اور اب تو اس نے قتل جیسا بھیانک جرم بھی کر دیا ہے۔"

"اب آگے کی جانکاری گائتری سے ملے گی۔ اس لیے گائتری کو ستیہ نارائن کے پکڑے جانے کی خبر ملے اور وہ بھاگ نکلے، اس سے پہلے ہمیں ہیگڑے ولا پہنچ جانا چاہیے۔" ڈی ایس پی صاحب نے اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "وینکٹ جی، یہاں دو پولیس اہلکاروں کو روک دیجئے۔ بے ہوش پڑے ستیہ نارائن کو گاڑی میں ڈال لیجئے اور شہر میں اس کے علاج کا بندوبست کرائیے۔"

☆☆☆

لگ بھگ تین گھنٹے کے بعد سب لوگ ہیگڑے ولا کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ ڈی ایس پی صاحب کے سامنے گائتری کھڑی تھی۔ اسے ابھی تک پتا نہیں تھا کہ ستیہ نارائن قتل کے جرم میں پکڑا جا چکا ہے۔ ڈی ایس پی صاحب نے گائتری سے پوچھا "تم لوگوں نے رام کمار کا قتل کیوں کیا تھا؟"

گائتری خاموش رہی۔ اس کا جسم ہولے ہولے کانپنے لگا تھا۔

"اس طرح خاموش رہنے سے کام نہیں چلے گا۔" ڈی ایس پی ہری ہرن نے گرج کر کہا "رام کمار کے قتل کے جرم میں تمہارا شوہر ستیہ نارائن گرفتار ہو چکا ہے۔ اب تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ تم سچائی بتا دو۔"

"اس نے میرے بیٹے کا قتل کیا تھا۔" گائتری نے جواب دیا۔

"تمہارے بیٹے نے رام کمار کے گھر پر ڈاکا ڈالا تھا۔ وہ اس کے سونے کا ہار لے کر بھاگ رہا تھا۔ رام کمار نے برآمدے سے اسے گولی ماری تھی۔ تمہارا بیٹا ڈاکو تھا ناں؟" ڈی ایس پی صاحب نے کہا اور پھر وہ ہار نکال کر اس کے سامنے لہرایا۔

گائتری کھڑی نہ رہ سکی اور سر تھام کر وہیں پڑی ایک کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے نظریں اٹھا کر ڈی ایس پی صاحب کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور پھر اس نے جو کچھ بتایا، وہ کچھ یوں تھا کہ شکاری پارٹی کے نکلنے کے بعد دونوں میاں بیوی کشتی لے کر نکلے تھے۔ اس وقت تمیا بستر پر پڑی تھی، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور یہ رام کمار کو ٹھکانے لگانے کا بہترین موقع تھا جس کے وہ ایک عرصے سے متلاشی تھے۔ جھیل میں ناؤ ایک دم کنارے کر کے ستیہ نارائن ہاتھوں سے جوتے کے نشان بناتا گیا تھا۔ دراصل وہ نشان جوتے کے نہیں بلکہ پکائی ہوئی مٹی پر اوتھیلو کے جوتے کے پرنٹ تھے جو اس کے کمرے سے برآمد ہوئے تھے۔ یہی چوتھی چیز تھی۔ نشان بنانے کے بعد ستیہ نارائن سوکھے پیڑ کے تنے پر جا بیٹھا تھا اور وہیں سے اس نے رام کمار کا نشانہ لے کر گولی چلا دی تھی اور پھر جتنی خاموشی سے گئے تھے، اتنی ہی خاموشی سے وہ کلب ہاؤس لوٹ آئے تھے۔

گائتری کو اسی وقت گرفتار کر لیا گیا۔ بعد میں ستیہ نارائن نے بھی اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔

دانا بینا

شکیل ادریس

ہوائیں تہ کمند کب آتی ہیں اور کب نگاہوں پہ اختیار رہتا ہے۔ ذرا سی پلک جھپکی اور حالات کچھ سے کچھ ہو گئے۔ اس پائلٹ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا مگر معجزہ سا ہوا اور وہ سب موت کی دہلیز سے پلٹ آئے۔

ماضی قریب کے ایک دلچسپ حادثے کا ذکر

جب کیپٹن عبدالرزاق کو کنٹرول ٹاور سے یہ ہدایت ملی کہ وہ ائرپورٹ کے قریب پہنچنے والا ہے، لہٰذا اسے اپنی بلندی کم کر لینا چاہیے۔ اس کا مسافر طیارہ اس وقت بیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہا تھا۔ اس نے طیارے کی بلندی کو ہدایت کے مطابق اتارنا شروع کر دیا۔ اس کا طیارہ اس وقت وسطی جاوا (انڈونیشیا) کی فضاؤں میں پرواز کر رہا تھا اور وہ مکمل طور پر پُرسکون تھا، اس لیے کہ طیارے کے سارے کل پرزے صحیح طور پر کام کر رہے تھے اور فیول بھی مناسب تھا۔ پھر فکر و تردد کی کیا بات تھی؟

پینتالیس سالہ پائلٹ عبدالرزاق اناڑی نہیں

تھا۔ ریکارڈ کے مطابق وہ اب تک چودہ ہزار گھنٹوں کی پرواز کر چکا تھا اور اس نے طوفانِ باد و باراں کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ 16 جنوری 2002ء کی سہ پہر کو فلائٹ GK.421 اس کے اندازے کے مطابق سلامتی کے ساتھ لینڈ کرنے والی تھی۔ اس کے ایک گھنٹے بعد وہ جکارتا میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ہوگا۔ وہ جب کسی لمبی پرواز سے واپس آتا تھا تو اس کے پانچوں بچے اس کا استقبال کرتے تھے۔ اس کے بعد ان کی فرمائشوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ عبدالرزاق کو یہ سب بہت اچھا لگتا تھا اور وہ اسے زندگی کے حُسن سے تعبیر کرتا تھا۔

اس نے اپنے دائیں جانب نگاہ کی، یہ دیکھ کر اسے یک گونہ اطمینان ہوا کہ اس کا معاون پائلٹ ہریادی گوناوان مستعد بیٹھا پینل بورڈ کی طرف متوجہ ہے۔ وہ انڈونیشیا انٹرنیشنل کی متعدد فلائٹوں پر ایک دوسرے کے ساتھ رہ چکے تھے اور ان کی کارکردگی کو بہتر تسلیم کیا جاتا تھا۔

اچانک بارش شروع ہوگئی تو طیارے کے ونڈ اسکرین سے ہوا کا ایک زبردست جھونکا آٹکرایا۔ ''میں نے طیارے کی رفتار 280 کردی ہے۔'' عبدالرزاق نے اپنے معاون گوناوان کو بتایا۔ پھر اس نے پینل پر لگا ہوا ایک بٹن دبایا تاکہ اینٹی آئس سسٹم اسٹارٹ ہو جائے۔ اس سسٹم کے اسٹارٹ کرنے سے طیارے کی مشینری گرم ہو جاتی تھی اور طیارے پر جمنے والی برف پگھلنے لگتی تھی۔ برف یا پانی جمے رہنے سے اس کا وزن خطرناک حد تک بڑھ جاتا تھا۔

چند منٹ بعد جب طیارے کی بلندی کم ہو کر سات ہزار فٹ رہ گئی تو اچانک کاک پٹ میں ایک زوردار دھماکا ہوا اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ طیارے کے وہ دونوں انجن جو ایک لمحہ پیشتر گھن گرج کے ساتھ اپنا کام انجام دے رہے تھے، دفعتاً خاموش ہوگئے۔

پائلٹ عبدالرزاق نے دماغ کو پُرسکون رکھتے ہوئے ایک لیور کو آگے بڑھایا، تاکہ انجن دوبارہ جاگ جائیں۔ اس کے بعد دوسرا لیور بڑھایا مگر اس وقت اس کی حیرت میں اضافہ ہوگیا جب اس کا کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ سراسیمگی کی ایک ہلکی سی لہر اس کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ انجن اچانک کیوں خاموش ہوگئے تھے اور ان میں کیا خرابی پیدا ہوگئی تھی؟

''گیجوں کی طرف دیکھو۔'' اس نے گوناوان سے کہا۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انجنوں میں آگ لگ چکی ہے۔''

یہ سن کر اس کے معاون کی آنکھیں فرطِ خوف سے پھیل گئیں۔ عبدالرزاق نے ایل سی ڈی مونیٹر کی طرف دیکھا جن کا اسکرین سادہ ہو چکا تھا۔ وہ گیج جو انجن سے نکلنے والی گیس کے درجات، ٹربائین کی رفتار اور ہر پوائنٹ کے دباؤ کو ظاہر کرتے ہیں، ان پر کوئی ریڈنگ نہیں آرہی تھی اور اس کی سوئی صفر پر تھی۔ گویا گیجوں کا تعلق ان تمام حصوں سے منقطع ہو چکا تھا۔

عبدالرزاق ششدر رہ گیا۔ وہ بائیس سال سے پائلٹ تھا اور اسے فضائی پرواز کا وسیع تجربہ تھا، لیکن اس نے کبھی نہیں سنا تھا کہ اچانک طیارے کا انجن فیل ہو جائے اور وہ بے یار و مددگار رہ جائے۔ پچاس ٹن کا وہ طیارہ انجنوں کے فیل ہونے سے ایک سادہ سا گلائڈر بن چکا تھا جو طوفانِ باد و باراں میں چون مسافروں اور عملے کے چھ افسران کو لے کر پرواز کر رہا تھا۔ وہ ہر منٹ میں تین ہزار فٹ نیچے آرہا تھا۔

عبدالرزاق کا دل ہیجانی رفتار سے دھڑکنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ چند منٹ بعد طیارہ جاوا کی گنجان آبادی پر گر جائے گا اور ایک ہولناک تباہی اس کا مقدر ہوگی۔

☆☆☆

مرکزی سیکشن میں بیٹھے ہوئے چھبیس سالہ فرحان سپنگت کو واضح طور پر محسوس ہوگیا کہ طیارے کی رفتار دھیمی پڑ چکی ہے اور وہ لمحہ بہ لمحہ نیچے آرہا ہے۔ وہ انجینئرنگ لیکچرار تھا۔ اس نے خود کو تسلی دی کہ کچھ نہیں ہوا ہے، یہ اس کا واہمہ ہے۔ اس نے اپنی حاملہ بیوی کا ہاتھ تھام لیا اور اسے تھپتھپانے لگا۔ ''طیارہ تھوڑی دیر بعد لینڈ کرنے والا ہے۔'' اس نے اطمینان دلایا۔ تاہم وہ خود بے چینی محسوس کر رہا تھا۔

ان سے سات قطاروں بعد ستائیس سالہ دیوی ملینا بیٹھی تھی۔ اسے بھی طیارے میں گڑبڑ کا احساس ہوا۔ اس لیے کہ انجن خاموش تھے اور ٹربائین بہت شور مچا رہا تھا۔ اس کا دل انجانے وسوسوں سے دھڑک اٹھا۔ اس نے اپنے دو سالہ بیٹے کی گردن کے گرد بازو حمائل کر دیے۔

☆☆☆

''ایمرجنسی چیک لسٹ شروع کر دو۔'' عبدالرزاق نے گوناوان کو ہدایت دی۔ گوناوان نے تھروٹل کو پیچھے کھینچ لیا اور پھر اسٹارٹر لیور کا ہینڈل گھمانے لگا تاکہ انجنوں کو دوبارہ اسٹارٹ کیا جاسکے۔ یہ ان کی آخری کوشش تھی۔ اس کے بعد کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ اسٹارٹر اس موقع پر کچھ نہ کر سکا اور پینل کی سوئیاں صفر سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ وہ مایوسی میں ڈوب گئے۔ طیارے کو بچانے کی کوئی ترکیب ان کے دماغوں میں نہیں آرہی تھی۔

''کہیں سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہو رہا ہے۔'' گوناوان نے اپنے پائلٹ کو بتایا۔ ''سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا کیا

جائے؟''

''اے پی یو کو اسٹارٹ کر کے دیکھو۔'' رزاق نے کہا۔

اے پی یو طیارے کی دم کے نزدیک ایک چھوٹا سا انجن تھا جو بیٹریوں سے چلتا تھا۔ اس معاون انجن سے طیارے کی لائٹیں اور ائرکنڈیشن چلتے تھے جب طیارہ گراؤنڈ پر کھڑا رہتا تھا۔ تاہم اس کی اضافی طاقت کے زور پر بڑے انجنوں میں طاقت دے کر انہیں اسٹارٹ کیا جاسکتا تھا۔ تکنیکی زبان میں اسے کک اسٹارٹ کہتے ہیں۔

معاون پائلٹ نے طیارے کا سوئچ آف کیا تو کاک پٹ اور مسافروں کے استعمال کے لیے لگی ہوئی لائٹیں آنِ واحد میں آف ہوگئیں اور طیارے میں تاریکی چھا گئی اور اس کا ائرکنڈیشنر ساکت و صامت ہوگیا۔ اے پی یو طیارے میں جان ڈالنے سے قاصر رہا اور کسی کوتاہی یا کمی کی وجہ سے طیارے کا اندرونی بجلی کا نظام بھی فیل ہوگیا۔

گوناوان نے ٹرانسمیٹر کو آن کیا اور جلدی جلدی کہنے لگا۔ ''میں فلائٹ فورٹو ون سے بول رہا ہوں۔ ہمارے طیارے کے انجن فیل ہو چکے ہیں، لہٰذا ہماری مدد کی جائے۔ مے ڈے۔ مے ڈے۔''

دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ چند لمحوں بعد اسے احساس ہوا کہ طیارے کا ریڈیو ٹرانسمیٹر بھی بیکار ہو چکا ہے۔ اب وہ کسی سے رابطے میں نہیں تھے اور کوئی ان کی بگڑتی ہوئی حالت سے واقف نہیں ہوسکتا تھا۔ قسمت نے انہیں ایک ایسے تاریک چوراہے پر لا کھڑا کیا تھا جہاں سے کسی طرف جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

ان کا طیارہ اس وقت چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا، جب کہ رفتار 240 ناٹ تھی۔ ببل گیج سے ظاہر ہو رہا تھا کہ طیارہ ہمواری سے پرواز کر رہا ہے۔ جہاں تک زمین پر ٹیک کر کریش ہونے کا سوال تھا تو ان کے پاس صرف پانچ منٹ تھے۔

رزاق جکارتا کے غریب والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اور روحانیات پر یقین رکھتا تھا۔ طیارے کو بچانے کے لیے اس کے پاس دعائیں تھیں یا پھر اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ اسے ائرپورٹ تک لے جائے گا اور ایمرجنسی لینڈنگ کرے گا۔

☆☆☆

جب طیارے کی تمام اندرونی لائٹیں بجھ گئیں تو کریو چیف دسونو کو تشویش ہوئی اور اس نے کاک پٹ کی طرف جا کر دروازہ کھولا اور پائلٹ سے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ طیارے کی لائٹیں کیوں بجھ گئیں؟''

چند چیزیں

حافظ ابوہمام ولید بن شجاع محدث، کوفی اپنے شاگردوں کے سامنے تقریر کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا: ''لوگو! یوں تو بہت سی بُرائیاں بہت سے لوگوں کے لئے بہت بُری ہیں لیکن چند چیزیں چند آدمیوں کے لئے بہت بُری ہیں۔''

کسی شاگرد نے پوچھا: ''کون سی چیزیں کن آدمیوں کے لئے؟''

ابن شجاع کوفی نے جواب دیا: ''حکمرانوں کے لئے تنگ ظرفی، قاضیوں کے لئے جھوٹ، علماء کے لئے فریب، زاہدوں کے لئے غصہ، امراء کے لئے لالچ، فقراء کے لئے غرور اور بوڑھوں کے لئے تمسخر۔''

''طیارے کے انجن کام نہیں کر رہے ہیں۔'' رزاق نے جواب دیا۔

''تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟'' دسونو نے پوچھا۔ اسے پائلٹ کی بات پر اعتبار نہیں آیا تھا۔

''میں اس وقت سنجیدہ ہوں۔'' رزاق بولا۔

دسونو نے کاک پٹ سے نکل کر طیارے کے عملے کو یہ خبر دی اور پھر پبلک ایڈریس سسٹم پر مسافروں کو بتانا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ بجلی منقطع ہونے کی وجہ سے ناکارہ ہو چکا ہے۔ اس نے ہر قطار میں جا کر لوگوں سے اپیل کرنا شروع کر دی کہ وہ اپنی سیٹ بیلٹس باندھ لیں۔ اس کے بعد سوچنے لگا کہ ایمرجنسی لینڈنگ کے وقت کیا کچھ کیا جاتا ہے؟

طیارے میں بظاہر کوئی ہیجان نہیں تھا۔ سب سکون سے اپنی نشستوں پر بیلٹ باندھے بیٹھے اپنی سلامتی کے لیے دعا مانگ رہے تھے۔ انہیں اللہ پر یقین تھا اور وہ جانتے تھے کہ مصیبت میں اسے ہی یاد کرنا چاہیے۔ ایک عورت قرآن پاک کی چند سورتوں کی بلند آواز سے قرات کرنے لگی۔

☆☆☆

''اگر ہم جنوب کی طرف چلیں تو اُدھر سمندر ہے۔ ہم وہاں ہنگامی طور پر طیارے کو لینڈ کر سکتے ہیں۔'' معاون پائلٹ نے بتایا۔ ''ائرپورٹ تک نہیں پہنچا جاسکتا۔''

رزاق نے اثبات میں سر ہلایا اور اس سے اتفاق کیا۔ سمندر وہاں سے پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اگر طیارہ وہاں پہنچ جاتا تو ان کی جانیں بچ سکتی تھیں۔ اس لیے کہ طیارہ سطحِ آب پر تیس منٹ کے لیے ٹھہر سکتا تھا۔ اس دورانیے میں سارے مسافروں کو طیارے سے نکالا جاسکتا تھا۔

رزاق نے کنٹرول کالم کے ''یو'' نما ہینڈل کو گھماتے ہوئے سوچا کہ فضائی ہوا کی بنا پر طیارے کا ہائڈرالک سسٹم

کام کر رہا ہے، ورنہ طیارہ کسی پکے ہوئے پھل کی طرف سیدھا زمین پر گر جاتا۔ جب اس کا انجن ہی نہ چل رہا ہو تو پھر یہ توقع کیوں کر کی جاسکتی ہے کہ وہ فضا میں تیرتا رہے گا؟

جب طیارہ بادلوں سے نکلا تو رزاق کو نیچے گھنی آبادی نظر آئی۔ چھوٹے بڑے مکانات دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ”یہ کالائن ہے۔“ اس کے معاون نے بتایا۔ ”ساحلی علاقے کی آبادی۔ زیادہ تر یہاں مچھیرے رہتے ہیں۔“ اس نے بلندی دیکھ کر بتایا۔ ”اس وقت ہماری بلندی سات ہزار فٹ ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ ہم سمندر تک نہیں پہنچ سکیں گے۔“ رزاق نے کہا۔

”تو پھر کیا کرنا چاہیے؟“ اس کے معاون نے پوچھا۔

”ایک ترکیب گراؤنڈ لینڈنگ کی ہے، لیکن اس سے بھاری جانی نقصان ہوگا۔ کچھ کہنا دشوار ہے کہ کتنے لوگ زندہ بچیں گے۔“ اس نے مایوسی سے کہا۔

”مگر پھر؟“

”کیوں نہ طیارے کو کسی دریا، جھیل یا تالاب میں اتار دیا جائے۔“ اچانک رزاق کے دماغ کا بلب روشن ہوگیا۔

”ہاں، یہ مناسب رہے گا۔“ اس کے معاون نے تائید کی۔

بالآخر ایک دریا انہیں نظر آگیا۔ وہ طیارے کی لمبائی کا دوگنا تھا چنانچہ طیارہ وہاں لینڈ کیا جاسکتا تھا۔ دریا پر دو جگہوں پر لکڑی کے پل بنے ہوئے تھے۔ یہ پل دریا کو عبور کرنے کے لیے تھے۔ لیکن ان کے لیے مصیبت بننے والے تھے اس لیے کہ طیارے کو ان کے درمیان میں اتارنا تھا۔ اندازے کی تھوڑی سی غلطی بھی ہوجاتی تو طیارہ ان میں سے کسی پل کے اوپر گر پڑتا اور انہیں مکمل تباہی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ اس کے علاوہ طیارے کا پاور یونٹ سے رابطہ ختم ہوچکا تھا اس لیے اسے منچلا بنانا ممکن تھا اور کسی وقت بھی کچھ ہوسکتا تھا۔ رزاق کو اپنے اعصاب پر کنٹرول تھا اور وہ نامساعد حالات میں بالکل نہیں گھبراتا تھا، لیکن اس لمحے اس کا دل اندیشوں سے دھڑکنے لگا۔

”اس وقت ہماری بلندی ساڑھے چار ہزار فٹ اور رفتار 240 ناٹ فی گھنٹہ ہے۔“ گوناون نے بتایا۔

کاک پٹ کی کھڑکی سے آبادی کے لوگ، مکانیں جھونپڑیں اور گھوڑے واضح نظر آرہے تھے۔

”کیپٹن طیارے کو چاول کے کھیتوں میں لینڈ کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ اس کے معاون نے پوچھا۔ ”کیا وہ محفوظ جگہ نہیں ہے؟“

”نہیں۔ اس کی نسبت دریا زیادہ محفوظ ہے۔“ رزاق بولا۔ ”کریش لینڈنگ کے لیے پانی سے بہترین کوئی چیز نہیں ہے۔“

رزاق نے کنٹرول کالم کو گھمایا تو وہ اس دریا کی طرف جانے لگا۔

”طیارے کا کنٹرول سسٹم درست ہے؟“ گوناون نے پوچھا۔

”ہاں، ایک بائڈرائلک سسٹم درست حالت میں ہے جس کی وجہ سے ہم سفر کر رہے ہیں اور طیارہ فضا میں تیر رہا ہے، ورنہ وزنی پتھر کی طرح زمین پر گر پڑتا۔“

”بلندی تین ہزار فٹ۔“ اس کے معاون نے بتایا۔

رزاق جانتا تھا کہ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، لہٰذا اس نے طیارے کو گھڑی کی سوئیوں کے مطابق گھمایا اور اس دریا کی سیدھ میں لے آیا۔ ”مسافروں سے التماس ہے کہ وہ اپنا حوصلہ بلند رکھیں اب ہم کریش لینڈنگ کر رہے ہیں۔“ اس نے کاک پٹ کے دروازے کی طرف منہ کر کے کہا۔

”طیارے کی بلندی ڈیڑھ ہزار فٹ پر آچکی ہے۔“

☆☆☆

دسو نے اپنا سیٹ بیلٹ مضبوطی سے باندھ لیا اور برے حالات کے لیے خود کو تیار کرنے لگا۔ طیارے کے باقی ماندہ مسافروں کو معلوم نہیں تھا کہ طیارہ کریش لینڈنگ کرنے والا ہے۔

فرحان سپنگت نے کھڑکی سے نیچے نگاہ ڈالی تو اس نے دیکھا کہ طیارہ تیزی سے نیچے جا رہا ہے اور زمین ان کے قریب آتی جا رہی ہے۔

دیوی ملینا کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور وہ اپنے بچے کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی۔ اس نے فرط محبت سے اپنے بچے کو بار دوں ں میں بھر لیا۔

☆☆☆

رزاق نے اپنے سابقہ تجربات کو بروئے کار لاتے ہوئے، طیارے کو ان دو پلوں کے درمیان کر لیا اور اسے نیچے لے آیا۔ ایسے طیاروں کی لینڈنگ کے لیے محفوظ ترین رفتار ڈیڑھ سو ناٹ تھی۔ چنانچہ رزاق نے پاؤں کے پاس لگا ہوا ایک لیور کھینچا تو طیارے کے پروں میں پھیلاؤ پیدا ہوگیا اور طیارے کی رفتار کم ہوگئی۔ پھر رزاق نے طیارے کی چونچ کو ایک بٹن کے ذریعے سے جھکا دیا۔ عام حالت میں وہ چونچ اٹھی رہتی ہے۔

طیارہ مطلوبہ رفتار سے تیز تھا اس لیے وہ جب نیچے آیا

اور دریا کی سطح سے ٹکرایا تو پانی میں ایک زبردست چھپاکا ہوا اور بہت سا پانی اچھل کر دریا سے باہر جا گرا۔

طیارے میں سوار بچے اور عورتیں سراسیمگی میں چیخنے چلانے لگے۔ انہیں اتنا زبردست جھٹکا لگا تھا کہ وہ اگلی نشستوں سے ٹکرا گئے تھے۔ کئی مسافروں کی سیٹ بیلٹس ٹوٹ گئی تھیں، اس لیے وہ سیٹوں سے گر پڑے تھے۔ طیارہ دریا کی سطح پر دور تک پھسلتا رہا اور اس کے بعد عین درمیان میں ٹھہر گیا۔

رزاق اور گوناون پوری طرح محفوظ تھے۔ چند لمحوں تک وہ ساکت رہے اس کے بعد گوناون نے مسکرا کر کہا۔ ”اللہ کا شکر ہے کہ ہم زندہ ہیں۔“

☆☆☆

اس واقعہ میں تیئس افراد زخمی ہوئے، لیکن معجزانہ طور پر صرف ایک فرد موت سے ہمکنار ہوا، جو چھبیس سالہ فضائی میزبان سواتی انگرا گینی تھی۔ گاؤں والوں کو اس کی لاش طیارے سے کافی دور ایک مقام سے ملی۔ باقی سب بچ گئے یا بچا لیے گئے۔ دریا سے تیر کر نکلنا مسافروں کے لیے دشوار ثابت نہیں ہوا تھا۔

مارچ 2002ء میں ان دونوں پائلٹوں کو صدر انڈونیشیا میگاوتی سوکارنو پوتری نے بلند حوصلگی اور اعلیٰ وقتی کا سب سے بڑا ایوارڈ پیش کیا۔

گرودا آپریشن کے ڈائریکٹر ردوی ہارڈونو نے انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”جو کارنامہ عبدالرزاق نے انجام دیا ہے، وہ غالباً لاکھوں میں ایک پائلٹ دے پاتا ہوگا۔ ان عوامل کو مدنظر رکھیے کہ طیارے کے انجن فیل ہوچکے تھے، طیارہ نہایت تیزی سے زمین کی طرف آرہا تھا، جہاں اسے لینڈ کیا گیا وہ جگہ بہت تنگ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان کے ہاتھ میں کوئی طیارہ نہیں بلکہ کاغذ سے بنا ہوا کوئی کھلونا تھا جسے انہوں نے سلامتی کے ساتھ اتار لیا۔“

☆☆☆

ماہرین اب تک اس کی وجہ جاننے سے قاصر ہیں کہ اس طیارے کے دونوں انجن یکا یک کیوں فیل ہوگئے اور اس کا ری اسٹارٹ سسٹم کیوں ناکارہ ہوگیا؟ اس سلسلے میں ایک تھیوری پر سب نے اتفاق کیا کہ جب پائلٹ نے اینٹی آئس سسٹم کو چالو کیا تو اسے تاخیر ہوچکی تھی۔ برفیلی ہوا نے فیول سسٹم کو اس سے پہلے ہی ناکارہ کر دیا تھا جس کی وجہ سے طیارے کو فیول کی سپلائی منقطع ہوچکی تھی۔

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ

مارچ 2011ء کے شمارے کی ایک دلکش جھلک
کھیل اور کھلونے
دولت اور شہرت کے ماہین رسا کشی اور صلاحیتوں کا استحصال...
ہنر مندوں کی عجیب آزمائش... سفاک حقیقتوں کی نقاب کشائی کرتے ہوئے آخری صفحات پر منظر امام کا ایک نیا انداز
تخت نشیں بزم نشیں
ابتدائی صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم سے چند بادشاہ گروں کا قصۂ عبرت... جو آنے والے کل سے بے خبر اپنی طاقت پر گھمنڈ کیے بیٹھے تھے... دوسرا اور آخری حصہ
حضرت یوشع بن نونؑ
اولاد ابراہیمؑ..... حضرت یوشع بن نونؑ کی زندگی اور دوسرے انبیائے کرام کے واقعات سے حیرت انگیز مماثلت... رضوانہ ساجد کے قلم سے ایک اور شاہکار
جھوٹی گواہی
مکافات عمل پر مشتمل کچھ ضمیر فروشوں کی روداد...
مرزا امجد بیگ کا ایک مضبوط کیس لینے سے صاف انکار
اس کے علاوہ
واپسی، اناڑی، محفل شعر و سخن، آپ کے خط
منجانب
ش سفیر ادیب، ضیا تسنیم بلگرامی، تنویر ریاض، سلیم انور، کاشف زبیر اور مریم کے خان کی دلچسپ تحاریر آپ کی منتظر

سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط نمبر 47

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہناز، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش جھوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری نہیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکار سی اپنی محسوس ہوتی۔ کہ آؤ ہمیں دیکھو۔ مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب۔ ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن و دل کو بھٹکاتا ہے، حذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسود کی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سراب لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بچپن میں جب سراب حقیقت لگتے تھے اور معمول کی زندگی سے فرار اچھا لگتا تھا۔ گرمیوں میں بھری دوپہر میں خاموشی سے گھر سے نکل کر درختوں کی چھاؤں تلے نہر کے کنارے لیٹ کر کہانیاں پڑھنا اچھا لگتا تھا۔ جب سردیوں کی تاریک اور طویل راتوں میں لحاف میں دبک کر خواب دیکھنا اور برسات میں گاؤں کی کچی سڑک پر ننگے پاؤں گھومنا اچھا لگتا تھا۔ پھر یہ سنہری دور ختم ہو گیا۔ بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے تاکہ میں بھی اپنے بھائیوں کی طرح آرمی جوائن کر سکوں جبکہ میں آرمی میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ بابا ایک روایتی باپ تھے، سخت اور اولاد کو اپنی ملکیت سمجھنے والے۔ میرے انکار کو انہوں نے

انا کا مسئلہ بنالیا۔ خوبصورت بچپن کے بعد وہ بہت مشکل دور تھا۔ اس دور میں میرے لیے واحد اچھی یاد سویرا ہے جو ہمارے گھر آئی اور خاموشی سے اس کا ایک حصہ بن گئی۔ پھر وہ میرے دل کا ایک حصہ بھی بن گئی لیکن اس سے پہلے کہ میں اس کے لیے بابا اور ماں جی کے سامنے دست سوال دراز کرتا وہ میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی اور میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ یہاں سے زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ تعلیم مکمل کر کے میں نے کاروبار شروع کیا۔ سفیر، مونا اور ندیم جیسے دوست ملے اور زندگی ایک ڈھب سے گزرنے لگی لیکن پھر ایک پرلطف سفر سے اپنے دوستوں کے ساتھ مری سے واپس آتے ہوئے ایک معمولی سے حادثے نے میری زندگی کا رخ بدل دیا۔ نادر علی کا اپنے اوباش دوستوں سمیت ہم سے ٹکراؤ ہو گیا تھا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ دشمنی اور دربدری کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو دراز ہوتا چلا گیا۔ حویلی اور سویرا کی زندگی سے نکلنے کے بعد میں نے بڑی محنت سے اپنی بکھری زندگی کو سمیٹا تھا لیکن کچھ کم ظرف گھٹیا لوگوں نے مجھ سے یہ پرسکون زندگی بھی چھین لی۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے لوگ میرے دشمن ہو رہے تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست بھی تھے۔ راجا عمر دراز جیسا ذہین اور بااثر میرا مہربان بن گیا تھا اور اس کے بعد ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار کر کے دور تک چلی گئی تھیں۔ میں قسمت کے ہاتھ میں کھلونا بن گیا اور قسمت مجھے کسی منہ زور سمندری لہر کی طرح اپنے دوش پر لیے پھرتی رہیں۔ کئی معرکے سر کیے اور پھر قسمت مجھے نیپال لے گئی۔ وہاں کے ایک جرائم پیشہ گروہ کے سربراہ کو یرغمال بنا کر میں چین پہنچنے کے لیے برف پوش پہاڑوں میں پہنچ گیا مگر قسمت نے پھر ایک کھیل کھیلا اور میرا ٹکراؤ بھارتی فورسز سے ہو گیا۔ مگر میں نے ان کو ان کی اوقات بتادی اور اپنی سرحد میں داخل ہو گیا۔ پاکستان میں داخل ہوتے ہی فتح خان سے ٹکراؤ ہوا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرون ملک کی طرف بڑھ رہا تھا کہ فتح خان نے دوبارہ مجھے گھیرنے کی کوشش کی۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر لے جا رہا تھا کہ میں نے موقع کا فائدہ اٹھا کر اس کے ساتھیوں کو زخمی کر دیا۔ فتح خان فرار ہو گیا۔ میں اپنے ساتھی بیتو کے ساتھ ایک قصبے میں پہنچا۔ وہاں سے کرائے کی گاڑی میں اسلام آباد کے لیے چل پڑا لیکن وہ گاڑی راستے میں ہی خراب ہو گئی۔ ایک جوڑے نے ہمیں لفٹ دے دی مگر راستے میں احساس ہو گیا کہ ہمیں اغوا کیا جا رہا ہے۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ ایک نیم پاگل ڈاکٹر تھا جو مرشد سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ اس کی قید سے فرار ہو کر اپنے دوست کے یہاں پہنچا تو وہاں فتح خان پہلے سے موجود تھا۔ اس نے مجھے بے ہوش کر دیا۔ جب آنکھ کھلی تو میں اپنی آبائی گھر میں تھا۔ گھر پہنچ کر پتا چلا کہ میرے ایک بھائی کو مرشد نے قتل کروا دیا ہے۔ میں نے بدلہ لینے کی خاطر اس کے کارواں پر فائرنگ کر دی اور خاموشی سے گھر واپس آ گیا۔ میری بھانجی شمی اپنے ددھیال جا رہی تھی کہ اس کی کار پر فائرنگ ہوئی۔ فائرنگ سے اس کا منگیتر بری طرح زخمی ہو گیا۔ اسے دیکھنے میں اسپتال پہنچا۔ راہداری میں رفیق بھائی، معین اور شمی نظر آ گئے۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر کھڑا تھا اس نے کچھ کہا تھا کہ شمی نے اپنا سر تھام لیا۔ وہ چکرا کر گرنے لگی تھی کہ رفیق بھائی نے اسے سنبھال لیا۔ شمی یہ سن کر گھبرا گئی تھی کہ عتیق خطرے میں ہے۔ میں نے عبداللہ کے ساتھیوں کو عتیق کی حفاظت کے لیے بلا لیا تھا۔ انہیں رفیق بھائی کے ساتھ کر دیا تھا کہ وہ گھر کی حفاظت بھی کرتے رہیں پھر میں جیپ لے کر نکل پڑا۔ ایک جگہ رک کر مرشد سے فون پر رابطہ کر کے کہا کہ تم نے میرے گھر کی عورتوں پر فائرنگ کرا کر بزدلی دکھائی ہے، اس کا بدلہ میں ضرور لوں گا۔ ابھی کچھ دور گیا تھا کہ ایک کالے رنگ کی کار نے فائرنگ شروع کر دی۔ میں نے انہیں قابو میں کر کے اگلوا لیا کہ وہ شریف کے آدمی تھے۔ میں اپنی حویلی میں پہنچا۔ ابا اماں باتیں کر رہے تھے کہ سویرا کی شادی مجھ سے کرا دی جائے گی، میں ابھی حویلی سے جانا نہیں چاہتا تھا مگر شام میں ابا نے آ کر کہا کہ فوراً تم حویلی سے کہیں اور چلے جاؤ، پولیس تلاشی کے لیے آ رہی ہے۔ انہوں نے ایک جیپ منگوا دی تھی جس کا ڈرائیور ایاز ایک بہادر شخص تھا۔ میں راستے میں ایک ریسٹورنٹ پر کھانے کے لیے رکا تو وہاں ایک ایم پی اے ملک عارف نے جیپ کو ٹکر مار دی۔ ایاز اس سے الجھ گیا، میں ملک عارف کو پستول کے زور پر اپنے ساتھ لے آیا۔ راستے میں دو چار سوال پوچھ کر اسے بے ہوش کر دیا اور اسلام آباد آ گیا۔ عبداللہ نے بتایا کہ شہلا رضوی کی نگرانی کرنے والے نے اطلاع دی ہے کہ کوئی گیلری سے کود رہا تھا جسے اندر والوں نے پکڑ لیا۔ اس کی تصویر بھی لے لی گئی تھی۔ تصویر دھندلی تھی۔ مجھے شک ہوا کہ وہ بیتو ہے۔ میں شہلا رضوی کے بنگلے میں داخل ہو گیا۔ بیتو وہاں موجود تھا۔ فتح خان کو بے ہوش کر کے میں ساتھ لے آیا۔ اسے اور بیتو کو عبداللہ کے حوالے کیا اور اسپتال کے لیے نکل پڑا۔ عتیق کے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک لمبے بالوں والا شخص عتیق کے آکسیجن ماسک کو کھول رہا ہے۔ میں نے للکارا تو وہ کھڑکی سے کود کر بھاگا۔ اس کے پیچھے میں بھی کود گیا مگر وہ نہ ملا پھر میں اپنی کار میں بیٹھا ہی تھا کہ پیچھے سے گردن پر پستول کی نال آ لگی۔ (اب آگے پڑھیں)

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ کیجیے

اس کی منحوس صورت کے ساتھ ہی پستول بھی نظر آیا تھا اس لیے میں نے کوئی حرکت کرنے سے گریز کیا۔ ”تم ذلیل..... شخص۔“

وہ مسکرایا۔ ”ہاں..... قسمت دیکھو شہباز ملک..... میں نے چھپنے کے لیے جو گاڑی چنی وہ تمہاری نکلی۔“

”تم مجھے جانتے ہو؟“

”تمہیں کون نہیں جانتا۔“ اس نے کہا اور حکم دیا۔ ”گاڑی مری ہائی وے کی طرف موڑ لو۔“

مری ہائی وے یہاں سے خاصے فاصلے پر تھی اس لیے میں نے اطمینان محسوس کیا۔ ابھی میرے پاس خاصا وقت تھا۔ اس نے اسپتال سے ذرا دور آتے ہی پستول میرے سر پر رکھ دیا اور بولا۔ ”اپنا پستول اور موبائل میرے حوالے کر دو۔“

میں نے خاموشی سے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ ”تمہیں مرشد نے بھیجا ہے؟“

”کون مرشد؟“ اس نے انجان بننے کی کوشش کی۔

”اپنے والد ثانی سے اتنے بے خبر ہو تم؟“

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ”بکواس مت کرو۔“

میں ہنسا۔ ”تب تم بھی انجان مت بنو۔ مرشد تمہارا آقا

افسوس کہ اس کی طرح اس کے آدمیوں میں بھی جرات نہیں ہے۔“

”جرات کی بات مت کرو۔ ابھی تم مجھے جانتے نہیں ہو۔“ اس کا لہجہ سرد ہو گیا۔

”ہاں تمہاری جرأت میں نے خود ملاحظہ کی ہے، ایک بے بس نوجوان کو مارنے کی کوشش کر رہے تھے۔“

”مجھے اس کا حکم دیا گیا تھا؟“ اس نے گویا صفائی پیش کی۔

”گویا تم مرشد کے اشارے پر دم ہلانے والے کتے ہو۔“ میں نے اسے اشتعال دلانے کی کوشش کی لیکن وہ خاموش رہا۔ غالباً وہ مجھ سے اچھی طرح واقف تھا اس لیے اشتعال میں آنے سے گریز کر رہا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی جو اتفاق سے اس کے ہاتھ لگی تھی۔ اگر وہ مجھے مرشد کے حوالے کر دیتا تو مرشد اسے سر آنکھوں پر بٹھاتا۔ اس لیے وہ میری طرف سے پوری طرح ہوشیار تھا۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”تمہیں میرے نام سے کیا کام ہے؟“ وہ کھردرے لہجے میں بولا۔

”میں جاننا چاہتا ہوں کہ کون ہے جس نے مجھے اتنی آسانی سے قابو میں کر لیا۔ وہ کام کیا جو مرشد کی ساری فوج مل کر بھی نہیں کر سکی۔“

وہ میری باتوں میں آ گیا۔ ”میرا نام فاضلی ہے۔ میں مرشد کا خاص آدمی ہوں۔“

میں چونکا۔ ”تم فاضلی ہو؟“

”ہاں تم میرے بارے میں جانتے ہو؟“

”خاص نہیں بس نام سنا ہوا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ اب مری ہائی وے کچھ دور تھی اور ہم اسلام آباد کے ایک [illegible] علاقے سے گزر رہے تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ اسلام آباد کی اہم ترین شاہراہیں بھی خالی نظر آتی تھیں لیکن اب [illegible] کے ساتھ یہ شہر بھی پُرہجوم ہو گیا ہے۔ اہم [illegible] کے علاوہ عام سڑکوں پر بھی خاصا ہجوم نظر آنے لگا [illegible] اس وقت مجھے مرشد کے اس چمچہ خاص کی فکر تھی۔ وہ [illegible] کسی ٹھکانے کی طرف لے جا رہا تھا اور ایک بار [illegible] جاتا تو گلوخلاصی مشکل ہو جاتی اس لیے مجھے جو [illegible] راستے میں ہی کرنا تھا۔ پُرہجوم سڑک پر کچھ کرنے کا [illegible] جاتا لیکن اس کے بعد پولیس سے بھی نمٹنا

فیض کی زندگی کے شب و روز

پیدائش..... 1911ء
حفظِ قرآن (پہلے دو پارے)، 1915ء
اردو فارسی عربی کی ابتدائی تعلیم 1916ء
اسکول میں داخلہ، 1921ء
میٹرک پاس کیا..... 1927ء
پہلی غزل..... 1928ء
انٹرمیڈیٹ..... 1929ء
بی اے، بی اے آنرز..... 1931ء
ایم اے..... 1933ء
پہلا مضمون شائع ہوا..... 1934ء
عربی میں ایم اے..... 1934ء
انگریزی کے استاد مقرر ہوئے (امرتسر)، 1935ء
ادبِ لطیف کی ادارت..... 1938ء
شادی..... 1941ء
نقشِ فریادی کی اشاعت..... 1941ء
فوجی ملازمت..... 1942ء
پہلی بیٹی سلیمہ کی پیدائش..... 1942ء
دوسری بیٹی منیزہ کی پیدائش..... 1945ء
پاکستان ٹائمز اور امروز کی ادارت..... 1947ء
گرفتاری اور طویل قید..... 1951ء
دستِ صبا کی اشاعت..... 1952ء
قید سے رہائی..... 1955ء
چین کا سفر، زنداں نامے کی اشاعت..... 1956ء
بمبئی کا سفر..... 1957ء
دوبارہ گرفتاری، پہلی بار فلمی گانے..... 1958ء
سیکریٹری آرٹس کونسل، لاہور..... 1959ء
لندن، ماسکو، ہنگری، کیوبا، لبنان، الجیریا، مصر کی سیاحت اور لینن انعام..... 1962ء
میزان کی اشاعت..... 1963ء
پرنسپل عبداللہ ہارون کالج کراچی..... 1964ء
دستِ تہ سنگ کی اشاعت..... 1964ء
ادارۂ یادگارِ غالب کا قیام..... 1968ء
روس کا سفر..... 1968ء
سروادیٔ سینا کی اشاعت..... 1971ء
چیئرمین نیشنل کونسل آف دی آرٹس..... 1972ء
الماتا کی افریقی ایشیائی ادبی کانفرنس میں شرکت، 1973ء
فلپائن، انڈونیشیا کا سفر..... 1973ء
لوٹس کے مدیر بنے..... 1977ء
انتقال..... 1984ء

پڑتا۔ میں پولیس کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ میری نظر فیول کیج کی طرف گئی۔ اس کا کانٹا آخری سرے سے کچھ پیچھے تھا میں نے فاضلی سے کہا۔

"پیٹرول بھروانا ہے۔"

"بھروا لو لیکن کوئی غلط حرکت مت کرنا۔" اس نے مجھے خبردار کیا۔

"کوئی غلط حرکت کر کے مجھے پھنسنا ہے کیا؟" میں نے کہا۔ "اگر تم مجھے جانتے ہو تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ پولیس مجھے تلاش کر رہی ہے۔"

"جانتا ہوں اور اسی لیے تمہیں پولیس سے بچا کر لے جا رہا ہوں۔" اس نے دانت نکال کر کہا لیکن یہ مسکراہٹ نہیں تھی بلکہ یوں کہنا زیادہ بہتر ہو گا کہ کسی بھیڑیے نے دانت نکالے تھے۔ وہ مجھے کسی ہمدردی کی وجہ سے پولیس سے بچا کر نہیں لے جا رہا تھا بلکہ مرشد علی کے لیے لے جا رہا تھا اور وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرتا اس کا مجھے اچھی طرح علم تھا۔ میں نے نظر آنے والے پہلے پیٹرول پمپ پر گاڑی روک لی۔ دن کا وقت تھا اور وہاں اچھی خاصی لائن لگی تھی۔ فاضلی نے دھیمی آواز میں پھر مجھے خبردار کیا۔

"کوئی چکر مت کرنا ورنہ میں گولی چلانے میں دیر نہیں کروں گا۔"

میں خاموش رہا۔ اب تک میں مرشد کے حوالے سے جتنے لوگوں سے ملا تھا ان میں سب سے خطرناک مجھے یہی شخص لگا تھا۔ اس کی پھرتی اور حاضر دماغی میں خود دیکھ چکا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ مرشد کے پاس ایسے لوگ بھی تھے۔ حالانکہ اس میں حیرت کی بات نہیں تھی ایسے لوگ دولت کے لیے سب کچھ کرتے ہیں اور مرشد کے پاس دولت بے حساب تھی۔ اپنے بے شمار ناکارہ بندے آزمانے کے بعد اسے شاید عقل آ گئی تھی اور اب اس نے کچھ کام کے آدمی بھی رکھ لیے تھے اور ان میں ایک فاضلی بھی لگ رہا تھا میں نے اچانک پوچھا۔

"مرشد کے لیے کب سے کام کر رہے ہو؟"

"دو سال....." وہ کہتے کہتے رک گیا۔ میں نے پھر نہیں پوچھا کیونکہ میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے منہ سے اقرار کر لیا تھا۔ اس دوران میں میری باری آ گئی تھی اور میں نے پیٹرول بھرنے والے کو چابی دیتے ہوئے کہا۔ "ٹنکی فل کر دو۔"

اس نے ڈھکن کھولا اور پائپ لگا دیا۔ فاضلی میری پشت سے لگا ہوا تھا تاکہ پیٹرول پمپ بھرنے والے کو نظر نہ آئے حالانکہ رنگین شیشوں کے پیچھے ویسے بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ چند منٹ میں ٹینک فل کر کے پمپ بوائے نے رقم لی اور کھلے لینے جا رہا تھا کہ فاضلی نے عقب سے کہا۔ "باقی تم رکھ لو۔"

پیٹرول بوائے کا منہ کھل گیا تھا کیونکہ میں نے اسے ہزار کا نوٹ دیا تھا اور پیٹرول شاید چھ سو کا تھا۔ میں نے بادل ناخواستہ فاضلی کی تائید کی۔ "ٹھیک ہے تم رکھ لو۔"

"اب چلو۔" فاضلی نے حکم دیا تو میں نے کار آگے بڑھا دی۔ "تم نے کچھ زیادہ ہی دریا دلی نہیں دکھائی ہے۔"

"ہاں کیونکہ شاید پھر تمہیں اس رقم کی ضرورت نہ ہو۔"

کچھ دیر بعد ہم راول ڈیم چوک پر تھے۔ مری بائی پاس ویسے تو راولپنڈی سے شروع ہو جاتی ہے لیکن اصل مری بائی پاس یہاں سے شروع ہوتی ہے اور بھارہ کہو کے بعد مارگلہ کی پہاڑیاں آ جاتی ہیں اور یہ سلسلہ بتدریج بلند ہوتے ہوتے مری کے پہاڑوں سے جا ملتا ہے۔ فاضلی نے حکم دیا۔

"دائیں طرف مڑ جاؤ۔"

دائیں طرف سڑک چنڈی کی طرف بھی جاتی تھی اور پھر ایک راستہ معروف چک شہزاد کی طرف نکلتا ہے۔ یعنی وہ علاقہ جہاں سی ڈی اے نے پولٹری اور فش فارمنگ کے لیے زمین مخصوص کی تھی لیکن وہاں بااثر سیاست دانوں اور امراء نے اس زمین پر قبضہ کر کے اپنے محلات اور فارم ہاؤسز بنا لیے اور اب ... یہ علاقہ جنت نظیر بن گیا ہے کیونکہ یہاں سرکاری خرچ پر ہر وہ سہولت مہیا کی گئی ہے جو اسلام آباد میں ان لوگوں کو میسر ہیں۔ فاضلی مجھے ان دو جگہوں میں سے کہیں لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی توقع کے برخلاف میں نے کار کو سیدھا رکھا اور اس کی رفتار بھی تیز کر دی۔

"یہ کہاں جا رہے ہو؟" اس نے غرا کر کہا۔

"جہاں میری مرضی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"گاڑی واپس کرو ورنہ....."

"ورنہ تم مجھے گولی مار دو گے۔" میں نے سکون سے کہا۔

"میں سچ مچ گولی مار دوں گا۔" اس نے کہا اور پستول میرے سر سے لگا دیا۔

"تو مار دو لیکن مرشد کو کیا جواب دو گے۔ اسے میری لاش درکار ہو گی تو تم مجھے اسپتال سے نکلتے ہی گولی مارنے ہو۔"

"لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تمہیں ہر قیمت پر زندہ لے کر جاؤں گا اگر تم نے گاڑی نہیں موڑی تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔"

"ضرور کر دو۔" میں نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔

ابھی اب ساٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے جا رہی تھی جو اس سڑک پر خاصی زیادہ تھی کیونکہ یہاں موڑ تھے اور سامنے سے گاڑیاں آ رہی تھیں۔

"رفتار کم کرو۔" پہلی بار اس کے لہجے میں اضطراب محسوس ہوا۔

"جیسا تم کہو۔" میں نے رفتار مزید بڑھا دی اور اسپیڈو میٹر کی سوئی ستر کے آس پاس لرزنے لگی تھی۔

"تمہارا دماغ خراب ہے ابھی سامنے سے کوئی گاڑی آ جائے تو....." اس نے کہنا چاہا کہ سامنے سے ایک چھوٹا ٹرک نمودار ہوا۔ یہاں سڑک مڑ رہی تھی اس لیے جب ٹرک نظر آیا تو فاصلہ بہت کم رہ گیا تھا۔ میں نے رفتار کم کیے بغیر کار کو بائیں طرف کاٹا اور ٹرک والے نے دائیں طرف کاٹا اور دونوں ایک دوسرے کو تقریباً چھوتے ہوئے گزر گئے تھے۔ اس کے بعد میں نے بہ مشکل کار کو ڈھلان پر چڑھنے سے روکا اور سڑک پر سیدھا کیا لیکن اس دوران میں کار کی رفتار ایک بار بھی کم نہیں کی تھی۔

"تمہارا دماغ خراب ہے۔" اس نے چلا کر کہا۔

"ابھی مارے جاتے۔"

"مارا تو اس صورت میں بھی جاؤں گا جب تمہارے ساتھ جاؤں گا تو کیوں نہ اپنے ساتھ ایک دشمن کو لے کر مروں۔" میں نے کہا اور رفتار مزید بڑھا دی اور اب سوئی اسی پر تھی۔ نئی چمچماتی کار ہے لیکن اس کا پک اپ اور روڈ گرپ بہت اچھی ہے۔ یہ رفتار تو کشادہ اور سیدھی ہائی وے پر بھی زیادہ ہوتی ہے لیکن اس سڑک پر تو خودکشی کے مترادف تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ فاضلی خوف زدہ ہو گیا تھا اس نے ایک دہشت کے عالم میں پستول میری گردن سے لگا دیا۔ اس کا ہاتھ لرز رہا تھا۔

"رفتار کم کرو ورنہ میں تم کو گولی مار دوں گا۔"

"اس کے بعد ہم دونوں ایک ساتھ مریں گے تمہارا کیا خیال ہے اگر میں مر گیا تو کار بچ جائے گی۔" میں نے پرسکون انداز میں کہا لیکن اندر سے میں بھی ڈر گیا تھا۔ وہ گولی چلا سکتا تھا۔ میں نے رفتار بتدریج کم کر لی تھی اور اب یہ ستر پر آ گئی۔ بہرحال وہ لمحہ گزر گیا جب وہ ڈر کر مجھے شوٹ کر سکتا تھا۔ اس کی عقل میں بات آ گئی تھی کہ اگر اس نے مجھے مار دیا تو اتنی رفتار پر کار کے حادثے میں اس کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے اس نے گولی چلانے سے گریز کیا۔ اس نے پستول کا دباؤ کم کر دیا اور آہستہ سے بولا۔ "تم چاہتے کیا ہو؟"

"میں کسی قیمت پر مرشد کے ہاتھ نہیں آنا چاہتا ہوں۔"

"اس کا حکم ہے کہ تمہیں زندہ پکڑنے کی کوشش کی جائے لیکن اگر تم ہاتھ نہ آؤ تو تمہیں مار دیا جائے۔"

"تم کوشش کر سکتے ہو لیکن اس کے بعد تم بھی نہیں بچو گے۔"

"ٹھیک ہے میں تمہیں ابھی شوٹ نہیں کرتا ہوں لیکن کار کہیں نہ کہیں تو روکو گے۔"

بھارہ کہو کی آبادی آ گئی تھی۔ یہاں ٹریفک کے ہجوم کی وجہ سے رفتار زیرو کرنا پڑی تھی لیکن یہ اتنی بھی کم نہیں تھی کہ اسے کچھ کرنے کا موقع ملتا۔ آبادی کے پاس سے گزرتے ہی میں نے رفتار پھر بڑھا دی تھی۔ "ابھی میرے پاس کوئی دو گھنٹے کے سفر کا ایندھن ہے اس سے پہلے میں کہیں نہیں رکوں گا۔"

"اس سڑک پر کئی جگہیں ایسی آئیں گی جہاں تمہیں رکنا پڑے گا۔"

"جب وہ آئیں گی تو دیکھا جائے گا۔" میں نے بے پروائی سے کہا مگر میں فکرمند ہو گیا تھا، یہ ڈرامہ زیادہ دیر چلنے والا نہیں تھا۔ واقعی میں کہیں نہ کہیں رکنے پر مجبور ہو جاتا اور اس کے بعد یہ مجھے شوٹ بھی نہ کرتا تب بھی بے ہوش کر سکتا تھا اور اس کے بعد میں اس کے قبضے میں ہوتا یعنی مرشد کے قبضے میں چلا جاتا۔ اسی سے بچنے کے لیے تو میں اتنے جتن کر رہا تھا۔ "ویسے اگر میں اس سے پہلے ہی گاڑی کسی کھائی میں گرا دوں تو؟"

اس نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ "تم مجھے خودکشی کرنے والے تو نہیں لگتے۔"

اس کی بات درست تھی میرے دشمن بھی جانتے تھے کہ میں آخری دم تک مقابلہ کرنے والا شخص ہوں اور خودکشی نہیں کر سکتا۔ میں نے گہری سانس لی۔ "ٹھیک ہے دیکھتے ہیں ہم میں سے کون جیتا ہے۔"

وہ عقب میں پوری طرح ہوشیار تھا اور جب میں نے رفتار بڑھائی تو اس نے سیٹ بیلٹ باندھ لی تھی۔ میں نے تو پہلے ہی سیٹ بیلٹ باندھ رکھی تھی۔ مارگلہ کی پہاڑیاں شروع ہو گئی تھیں اور خطرناکی میں یہ مری کی پہاڑیوں سے کم نہیں تھیں بلکہ ان سے زیادہ ہی ہیں کیونکہ مری میں درختوں کی بہتات ہے اور اکثر سڑکوں کے کنارے درخت ہیں اگر کوئی گاڑی سڑک سے اترے تو یہ درخت اسے کھائی میں گرنے سے بچاتے ہیں۔ مارگلہ کی پہاڑیاں درختوں سے خالی ہیں اور سیکڑوں فٹ کی گہرائی تک کوئی روک نہیں ہے اگر گاڑی

یہاں سے نیچے جائے تو اسے روکنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ یہاں سڑک پہاڑوں کے ساتھ چلتی ہے اور کشادہ ہونے کے ساتھ حدِ نظر بھی ہے یعنی سامنے سے آتی گاڑی دور سے نظر آجاتی ہے البتہ کچھ مقامات ایسے ہیں جہاں حدِ نظر محدود ہو جاتی ہے اور سامنے سے آتی گاڑی کا پتا نہیں چلتا ہے۔ ایک ایسے ہی مقام پر اچانک سامنے سے ایک بڑی بس نمودار ہوئی اور سڑک پر گنجائش کم تھی' میں نے بے ساختہ بریک لگائے اور تصادم سے بچنے کے لیے کار کو کچے میں اتار لیا۔ بس برابر سے دھواں اڑاتی گزر گئی تھی۔ اس دوران میں رفتار بہت کم رہ گئی تھی اور کار نے ڈھلان سے رگڑ بھی کھائی تھی۔ فاضلی اسی موقع کی تلاش میں تھا۔ میں دھچکے سے آگے آیا اور جب واپس پیچھے آیا تو اس نے میرے سر پر اپنا پستول آزمایا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میں سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے دوسرا وار کیا اور دل کے ساتھ میرا ذہن بھی تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ آخری خیال یہ تھا کہ اب ہوش آیا تو اگلی دنیا میں یا مرشد کے عقوبت خانے میں ہوں گا۔

☆☆☆

رفتہ رفتہ میرے حواس بحال ہوئے' مجھے یوں لگا جیسے میں گہرے تاریک سمندر سے سطح پر آرہا ہوں۔ یہ بے ہوشی بھی عجیب شے ہے جب یہ حواس پر قبضہ کرتی ہے تو ہر بار انسان ہوش میں آتے ہوئے کچھ نیا محسوس کرتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ میرے سر میں قیامت کا درد ہوگا۔ کیونکہ فاضلی نے نہایت بے دردی سے وار کیے تھے۔ میرا سر یقیناً پھٹ گیا تھا لیکن میں سکون کی کیفیت میں تھا۔ اس سے مجھے شبہ ہوا کہ میں اس دنیا سے گزر گیا تھا۔ اس دنیا میں میرے لیے بھلا سکون کہاں تھا۔ میں ایک صاف ستھرے لیکن سادہ بستر پر لیٹا تھا اور میرے جسم پر میرا ہی لباس تھا۔ اس کمرے میں سوائے اس بستر کے اور کچھ نہیں تھا۔ میرے سر پر خاصی پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں اور اس کا مطلب تھا کہ میرا سر اچھا خاصا پھٹا تھا۔ کمرا بتا رہا تھا کہ یہ قید خانہ ہے ورنہ نارمل کمرے میں کچھ فرنیچر تو ہوتا ہے۔ چھت پر ایک بلب جل رہا تھا اور کمرے میں سردی کا احساس بہت کم تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا، اتنے سکون کی وجہ یہ تھی کہ میرا باقاعدہ علاج ہوا تھا اور مجھے کوئی طاقت ور درد کش دوا دی گئی تھی جس کی وجہ سے مجھے درد محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے اپنا بازو دیکھا تو مجھے نس میں انجکشن کا نشان نظر آیا۔ میرا لباس پورا تھا البتہ جوتے غائب تھے۔ میں نے جھک کر بستر کے نیچے دیکھا تو مجھے ایک لمحے کو چکر آگیا تھا۔ جوتے بستر کے نیچے نہیں تھے۔ میرا خالی پیٹ بتا رہا تھا کہ میں کم سے کم دس بارہ گھنٹے سے بے ہوش تھا۔ جب میں اسپتال سے نکلا تھا تو ایک بج رہا تھا اور دو بجے میں نے ہوش و حواس کی دنیا کو خیر باد کہا تھا۔ اس لحاظ سے رات کے بارہ تو بج چکے تھے۔

اس بند کمرے میں پتا نہیں چل رہا تھا کہ باہر رات تھی یا دن اور نہ ہی یہاں کوئی گھڑی لگی تھی۔ میری کلائی سے گھڑی اتار لی گئی تھی۔ موبائل پہلے ہی فاضلی نے لے لیا تھا۔ اب پرس بھی غائب تھا، ان لوگوں نے سوائے تن کے کپڑوں کے اور کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے پٹی کو چھوا تو سر میں درد کی لہر اٹھی اور اس نے مجھے سمجھا دیا کہ درد کا عفریت رخصت نہیں ہوا ہے سر میں موجود ہے۔ میں سیدھا لیٹ گیا۔ میں نے دروازہ چیک کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ میں مرشد کے قبضے میں آچکا تھا لیکن اس نے مجھے اس طرح آرام سے کیوں رکھا تھا اور میرے علاج معالجے کی زحمت کیوں اٹھا رہا تھا، یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔

رفتہ رفتہ میرے حواس مکمل طور پر میرے قابو میں آگئے لیکن میں لیٹا رہا اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ ممکن ہے یہاں میری نگرانی کے لیے کوئی کیمرا ہو اور ان کو پتا چل جائے کہ مجھے مکمل ہوش آگیا ہے۔ میں ان کا ردِعمل جاننا چاہتا تھا۔ کوئی نصف گھنٹے بعد دروازے پر آہٹ ہوئی اور میں بے ہوش بن گیا۔ دروازہ کھلا اور کچھ افراد اندر آئے۔ آنے والوں میں سے ایک نے میری نبض دیکھی اور بولا۔ ''نبض تو ٹھیک چل رہی ہے' اسے اب تک ہوش میں آجانا چاہیے۔''

''تب کیا معاملہ ہے ڈاکٹر' اسے ہوش کیوں نہیں آرہا؟'' ... میں نے مرشد علی کی آواز سنی تو میرا دل چاہا کہ بے ہوشی ختم کر کے اس کی گردن دبوچ لوں۔ میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا تھا۔

''میں نے پہلے بھی کہا تھا اسے اسپتال لے جائیں شاید کیس سیریس ہے۔'' ڈاکٹر دبے لہجے میں بولا۔ ''ویسے تو وائٹل سائن ٹھیک ہیں لیکن دماغ کی چوٹ کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا۔''

اب میری سمجھ میں آیا کہ میری اتنی دیکھ بھال کیوں ہو رہی تھی۔ فاضلی نے جو وار کیے تھے ان کا اثر زیادہ تھا اور شاید مجھے ہوش نہیں آیا تھا۔ اس لیے ڈاکٹر کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ مرشد نے ڈاکٹر کی بات پر کہا۔ ''یہ ممکن نہیں ہے ورنہ تم کو کیوں بلاتا۔''

''میں کوشش کر رہا ہوں۔'' ڈاکٹر عاجزی سے

بولا۔ ''ابھی انجکشن دیتا ہوں اور پھر بھی ہوش نہیں آیا تو یہ معاملہ میرے بس سے باہر سمجھئے گا۔''

اس نے کوئی انجکشن نکالا اور اس کی سوئی میرے بازو میں ٹھونک دی۔ ''اس کا ردِعمل چند منٹ میں ظاہر ہو جائے گا۔''

''مجھے معلوم نہیں تھا یہ بندہ اتنا نازک نکلے گا۔'' فاضلی کی آواز آئی۔

''بکو مت۔'' مرشد نے خفگی سے کہا۔ ''میں نے خود دیکھا ہے اس کا سر بری طرح پھٹا ہے اور تم کو جس کام سے بھیجا تھا وہ بھی نہیں کر سکے۔''

''اس کی وجہ بتا چکا ہوں۔'' فاضلی دبے انداز میں بولا۔ وہ ڈاکٹر کے سامنے اس موضوع پر بات نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ڈاکٹر کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ باہر کا آدمی تھا۔ خود مرشد کو بھی احساس تھا اس لیے اس نے زیادہ نہیں کہا۔ اب وہ خاموشی سے انجکشن کے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے یہ سن کر اطمینان محسوس کیا تھا کہ عتیق محفوظ تھا اور فاضلی نے اس کی جان لینے کی جو کوشش کی تھی وہ ناکام رہی تھی۔

جب ڈاکٹر نے میرے بازو میں انجکشن لگایا تھا اس وقت میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب مجھے ہوش میں آجانا چاہیے ورنہ یہ ڈاکٹر نہ جانے میرے ساتھ کیا سلوک کرتا اور کون کون سے انجکشن میرے جسم میں گھونپتا رہتا۔ کوئی پانچ چھ منٹ بعد میں نے چہرے کے عضلات کو ہلانا شروع کر دیا جیسے میں نیند سے جاگ رہا ہوں اور چند منٹ بعد میں نے سر بھی ہلانا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''اسے ہوش آرہا ہے جناب۔''

ان لوگوں کا صبر آزمانے کے لیے میں کچھ دیر کو ساکت ہوا تھا۔ فوراً ہی مرشد کی اضطرابی آواز آئی۔ ''یہ تو پھر بے ہوش ہو گیا۔''

''نہیں یہ عارضی کیفیت ہے۔'' ڈاکٹر نے یقین سے کہا۔ ''اصل میں چوٹ بہت گہری ہے۔''

میں نے دل ہی دل میں فاضلی کو برا بھلا کہا جس نے نہ جانے میرے سر کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ چند منٹ بعد میں نے دوبارہ حرکت شروع کر دی اور اس بار آنکھیں بھی کھول دیں لیکن ساکت پڑا رہا اور چھت کو گھورتا رہا۔ ڈاکٹر نے میری آنکھوں میں اپنی ٹارچ سے روشنی ڈالی اور بولا۔ ''آنکھ کی پتلیاں ردِعمل دکھا رہی ہیں۔''

اس بار مرشد سامنے آیا اور ذرا جھک کر بولا۔ ''شہباز ملک۔''

میں سپاٹ سے انداز میں اسے دیکھتا رہا۔ مرشد نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ ''یہ اس طرح کیوں دیکھ رہا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم جناب۔'' ڈاکٹر نے کسی قدر بے زاری سے کہا پھر میری طرف جھکا۔ ''تمہیں اپنا نام یاد ہے۔''

''نام۔'' میں نے خواب ناک لہجے میں کہا۔ ''میرا نام کیا ہے؟''

''میرا خیال ہے اس کی یادداشت عارضی طور پر متاثر ہوئی ہے۔'' ڈاکٹر نے میری اداکاری سے متاثر ہو کر فوراً مجھے سرٹیفکیٹ دیا۔ فاضلی جو مجھے غور سے دیکھ رہا تھا اس نے مرشد سے کہا۔

''مجھے تو ڈراما لگ رہا ہے۔''

اپنا سرٹیفکیٹ جھٹلائے جانے پر ڈاکٹر نے اسے خفگی سے دیکھا۔ ''ڈاکٹر میں ہوں یا تم ہو؟''

''تم سے ایک بندہ ہوش میں نہیں آرہا تھا تم کس قسم کے ڈاکٹر ہو؟''

''لڑو مت۔'' مرشد نے رعب سے کہا اور ڈاکٹر سے بولا۔ ''اگر اس کی یادداشت گم گئی ہے تو اسے بحال کرو۔''

''جناب دنیا کی کوئی دوا یا علاج ابھی تک گم ہونے والی یادداشت کے سلسلے میں کارگر نہیں ہوا ہے' اسے رفتہ رفتہ سب یاد آئے گا۔''

''یا فلمی انداز میں اس کے سر پر ویسے ہی چوٹ لگائی جائے گی اور اس کی غائب ہونے والی یادداشت واپس آجائے گی۔'' فاضلی نے طنز کیا۔

''لگتا ہے تم اسے مارنا چاہتے ہو۔'' ڈاکٹر نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''اس کا سر نازک ہو رہا ہے اور اس پر مزید کوئی چوٹ جان لیوا بھی ہو سکتی ہے۔''

خدا نے اس ڈاکٹر کی صورت میں میرے لیے رحمت کا فرشتہ بھیج دیا تھا جس نے فی الحال مجھے مرشد اور اس کے گرگوں کے عتاب سے بچا لیا تھا۔ اس نے مرشد سے کہا۔ ''جناب ذرا سا برا سلوک نہ صرف اسے مار سکتا ہے بلکہ اس کے ذہن پر اتنا بڑا اثر بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ہمیشہ کے لیے یادداشت یا ذہنی توازن کھو سکتا ہے۔''

مرشد اس دوران میں میرا معائنہ کر رہا تھا اور میری کوشش تھی کہ میرے چہرے پر تاثرات یا جذبات کی ہلکی سی رمق بھی نہ آئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مرشد عیار ترین شخص تھا اور وہ میرے ذرا سے تاثر سے بھانپ جاتا کہ میں ڈراما کر رہا تھا اس لیے میں معصوم صورت بنا کر لیٹا رہا۔ کمرے میں سوائے ان تین افراد کے اور کوئی نہیں آیا تھا۔ جب ڈاکٹر چپ ہوا تو اس نے سب کو باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ ان کے

جانے کے بعد دروازہ بند ہوگیا۔ نگرانی کے خوف سے میں ایسے ہی لیٹا رہا تھا۔ چند منٹ بعد وہ سب دوبارہ آئے۔ فاضلی نے آتے ہی کہا۔

''یہ ڈراما کر رہا ہے آپ کے عتاب سے بچنے کے لیے۔''

''اگر یہ ڈراما کر رہا ہے تو میں ڈاکٹری چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔'' ڈاکٹر نے برافروختہ ہو کر کہا۔

''بکومت۔'' فاضلی جارحانہ انداز میں بولا۔ ''یہ ابھی بولے گا۔''

مرشد ایک طرف خاموش کھڑا تھا۔ فاضلی نے اچانک پستول نکال لیا پستول دیکھ کر ڈاکٹر تیزی سے اس کی طرف جھپٹا۔ ''یہ کیا کر رہے ہو تم میرے سامنے ایک مریض کو نہیں مار سکتے۔''

''ہٹ جاؤ سامنے سے۔'' فاضلی نے ڈاکٹر کو دھکیلنے کی کوشش کی لیکن وہ چٹان کی طرح اس کے سامنے ڈٹ گیا تھا۔

''آپ دیکھ رہے ہیں جناب؟'' اس نے چلا کر مرشد سے کہا۔

''تو بتا ہے یا پہلے تیرے سر میں سوراخ کروں۔'' فاضلی نے پھنکار کر کہا اور ڈاکٹر کے اوپر سے پستول کا رخ میری طرف کر دیا اور میرا جسم تن گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے روکنے کی کوشش کی اور اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ فاضلی کے ہاتھ سے پستول نکلا اور اچھل کر بستر پر میرے پاس آ گرا۔ مرشد ابھی تک کچھ کرنے کے بجائے خاموشی سے میرا جائزہ لے رہا تھا اور پستول جب میرے پاس آ کر گرا تب بھی اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا اور اس کی اسی حرکت نے میرا بھاٹا پھوٹنے سے بچا لیا۔ میری چھٹی حس نے مجھے بروقت خبردار کیا اور میں پستول اٹھاتے اٹھاتے رک گیا تھا۔ اس کے بجائے میں نے خوف زدہ نظروں سے پستول کی طرف دیکھا اور یوں اس سے ذرا دور سرک گیا جیسے یہ پستول کے بجائے کوئی بچھو ہو جو مجھے ڈنک مارنے والا ہو۔ فاضلی نے ڈاکٹر کو ایک طرف دھکیلا اور لپک کر پستول اٹھا لیا۔ میں نے دیکھا ڈاکٹر فاتحانہ انداز میں مسکرایا تھا، اس نے مرشد کی طرف دیکھا تو اس نے سر کو خفیف سی جنبش دی اور پھر وہ تینوں خاموشی سے باہر چلے گئے۔ میں نے گہری سانس لی۔ یہ ان لوگوں کا ڈراما تھا جس میں فاضلی اور ڈاکٹر اداکار تھے اور اس ڈرامے کا اسکرپٹ رائٹر اور ہدایت کار مرشد علی تھا۔ پستول یقیناً خالی تھا اور فاضلی نے جان بوجھ کر میری طرف پھینکا تھا تاکہ پتا چلے کہ میری یادداشت سچ مچ گم ہوئی ہے یا میں ان کو دھوکا دے رہا ہوں۔

سچی بات تھی کہ میں جب ہوش میں آیا تو میرے ذہن کے کسی گوشے میں نہیں تھا کہ میں یادداشت گم ہونے کا ڈراما کروں گا لیکن اس کی راہ خود ان لوگوں نے مجھے سجھائی تھی اور پھر میرا امتحان لے کر انہوں نے مجھے مزید پکا کر دیا تھا۔ مرشد کا رویہ بھی معنی خیز تھا۔ اسے میری یادداشت سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے تھا۔ بلکہ اسے تو شاد باد بجانے چاہیے تھے کہ میں اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔ میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو مرشد مجھ سے معلوم کرنا چاہتا ہو۔ لیکن حالات کے بارے میں کیا کہا جا سکتا تھا۔ ممکن ہے کوئی ایسی بات ہوئی ہو جس کی وجہ سے مرشد اب میرے بارے میں فکرمند تھا۔ دوسری صورت میں مجھے اس کے جلادوں کا سامنا کرنا ہوتا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ میں اداکاری جاری رکھوں گا۔ میں ذہنی طور پر خود کو مضبوط کرنے لگا اور ان ممکنہ اقدامات کا سوچنے لگا جو مرشد میری یادداشت کی بحالی کے لیے کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے ذہنی بحالی کا انجکشن دیا تھا اور اس کے بعد دردکش دوا کا اثر کم ہونے لگا جس سے سر کی تکلیف میں اضافہ ہو گیا۔ اب رہ رہ کر ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ایسی ہی کچھ ٹیسیں پیٹ میں بھی اٹھ رہی تھیں کیونکہ مجھے کھانا کھائے بہت دیر گزر چکی تھی۔ ان تینوں کے جانے کے کوئی ایک گھنٹے بعد دروازہ کھلا اور ایک شخص اندر آیا۔ اس نے ایک چھوٹا سا ڈونگا اٹھا رکھا تھا۔ اس نے وہ لا کر بستر پر میرے پاؤں کے پاس رکھ دیا اور بدتمیزی سے بولا۔ ''لے کھالے۔''

میں نے اٹھ کر دیکھا تو اس میں سادہ دال اور چاول تھے۔ ساتھ میں ایک چمچ تھا۔ میں نے چکھ کر دیکھا۔ بدذائقہ تھے لیکن بہرحال کھانے کے قابل تھے اس لیے میں نے کسی نہ کسی طرح انہیں حلق سے اتار لیا۔ اس دوران میں ڈونگا لانے والا وہیں موجود رہا تھا۔ وہ کوئی نچلے درجے کا ملازم تھا جسے بے دھڑک میرے پاس بھیج دیا گیا تھا اگر میں اسے مار بھی دیتا تو مرشد کا کچھ نہ جاتا۔ میں نے کھانے کے دوران اس سے پوچھا۔

''یہ کون سی جگہ ہے اور وہ کون ہے جس نے سر پر پگڑی پہنی ہوئی ہے؟''

''تو جہنم میں ہے۔'' اس نے پھر بدتمیزی سے کہا۔ ''وہ موت کا فرشتہ ہے۔''

''اور تم جہنم کے فرشتے ہو؟''

''بکو اس نہ کر جلدی کھا کر دے تیرے باپ کا نوکر نہیں ہوں جو یہاں کھڑا رہوں۔''

میں نے ڈونگا خالی کر دیا۔ اس نے لپک کر ڈونگا اٹھایا دروازے پر دستک دی۔ باہر سے دروازہ کھلا اور وہ باہر نکل گیا۔ پیٹ میں کچھ گیا تھا تو اس کی ٹیسیں تو معدوم ہو گئی تھیں لیکن سر کی ٹیسوں میں اضافہ ہو رہا تھا، میں نے مناسب سمجھا کہ آنکھ بند کر کے لیٹ جاؤں۔ لیکن فی الحال سکون سے بیٹھنا میرے مقدر میں نہیں تھا۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور فاضلی اندر آ گیا۔ اس نے میرے پاس آ کر دھیمے لہجے میں کہا۔ ''شہباز تم مرشد کو بے وقوف بنا سکتے ہو مجھے نہیں۔''

''کیوں نہیں بنا سکتا۔'' میں نے خلوص سے کہا۔ ''اگر تم کہو تو تمہیں بھی بنا سکتا ہوں۔ ویسے یہ مرشد کون ہے؟''

''تمہارا باپ ہے۔''

''میرا باپ ہے۔'' میں نے الجھ کر کہا۔ ''لگتا تو نہیں ہے۔''

فاضلی شاید سوچ کر آیا تھا کہ اسے میرے ڈرامے کی حمایت سامنے لانی ہے اس لیے اس نے مجھے ذہنی طور پر راحت دینے کے لیے بکواس شروع کر دی۔ میں پہلے ہی اس مرحلے کے لیے تیار تھا اس لیے نارمل ردِعمل کے بجائے میں نے حالات کی مناسبت سے احتجاج کیا۔ ''اے تم مجھے گالیاں کیوں دے رہے ہو؟''

اس پر اس نے مزید بکواس کی اور ان میں بعض باتیں ایسی تھیں کہ میرے لیے خود پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس کا سر توڑ دوں لیکن اس کے بجائے میں نے بھی ایک بے بس شخص کے انداز میں کلاسیکل گالیاں دیں اور اس کا منہ پھیر جواب دے گیا۔ وہ غرا کر میری طرف آیا تھا کہ دروازہ کھلا اور مرشد نے اسے آواز دی۔ ''واپس آ جاؤ۔''

فاضلی اپنے آقا کے حکم پر دم دبا کر باہر چلا گیا اور اس کے فوراً بعد ڈاکٹر اندر آیا۔ اس نے میرے سر کی ڈریسنگ کھول کر بھی اور زخم کی بحالی سے مطمئن ہو کر اس پر معمول کی پٹی کر دی۔ اس فلمی اسٹائل کی پٹی سے نجات پا کر میں نے بھی اطمینان کا سانس لیا تھا۔ اس نے زخم خشک کرنے والا پاؤڈر لگایا اور اوپر سے چپکنے والی پٹی لگا دی تھی۔ پھر اس نے مجھے دو عدد کیپسول زخم میں سے ایک اینٹی بایوٹک تھا اور دوسرا یقیناً درد کا۔ یہ کہہ کر جیسے ہی اس نے انجکشن لگایا مجھے غنودگی آنے لگی اس کے باہر جانے سے پہلے میں سو چکا تھا۔

میں سو کر اٹھا تو خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا لیکن ساتھ ہی پیٹ میں دباؤ بتا رہا تھا کہ جلد مجھے فراغت کے مرحلے سے گزرنا ہوگا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ بجایا اور اس وقت تک بجاتا رہا جب تک دوسری طرف سے کسی نے سخت لہجے میں پوچھ نہیں لیا۔ ''کیا ہے کیوں شور کر رہا ہے؟''

''مجھے باتھ روم جانا ہے۔''

''کچھ دیر رک جا۔'' باہر والے نے کہا اور کوئی دس منٹ بعد دروازہ کھل گیا، باہر دو مسلح افراد موجود تھے۔ ان میں ایک بولنے والا بھی تھا اس کا انداز مجھے اس کے بولنے سے ہوا۔ اس نے باہر آنے کو کہا اور میں باہر آ گیا۔ وہ مجھے اس کمرے سے ذرا دور ایک چھوٹے سے غلیظ لیٹرین تک لائے۔ میں دل پر جبر کر کے اندر گیا اور یہ سوچ کر گیا کہ اب کم سے کم چوبیس گھنٹے سے پہلے یہاں نہیں آؤں گا۔ مجھے جس کمرے میں رکھا گیا تھا یہ لیٹرین اس سے باہر راہداری کے آخری سرے پر تھا۔ میری یہ خواہش پوری نہیں ہوئی کہ میں اپنے قید خانے کا محل وقوع جان سکوں۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے لگا جیسے میں زیرِ زمین کسی جگہ قید ہوں۔ مرشد مجھے کسی کھلی جگہ رکھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا جہاں سے میں فرار ہو جاؤں، اس نے مجھے قید رکھنے کے فول پروف انتظامات کیے ہوں گے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ میں موقع ملتے ہی فرار ہو جاؤں گا۔

اس ڈرامے کے باوجود صورتِ حال نہایت سنگین تھی۔ پاکستان آنے کے بعد میری ساری جدوجہد کا نقطۂ نظر مرشد سے بچنا تھا۔ ایک بار میں اس کی گرفت میں آ جاتا تو میرا کھیل تقریباً ختم ہو جاتا۔ میں آزادانہ کام ہی اس کے خلاف کچھ کر سکتا تھا اور اسے مجبور کر سکتا تھا۔ میں اس کی گرفت میں آ گیا تھا اور اب میرے ساتھ کیا ہونا تھا یہ صرف خدا ہی جانتا تھا۔ لیٹرین سے آتے ہی ڈاکٹر دوبارہ آ گیا تھا۔ اس نے میرا معائنہ کیا اور میرے بازو میں پھر ایک انجکشن لگایا اور سر پر نئی پٹی کر کے رخصت ہو گیا۔ میں نے اس سے کئی سوالات کیے لیکن اس نے ہر سوال کا خاموشی سے جواب دیا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے پھر دال چاول مہیا کیے گئے اور یہ کھانا بتانے کے لیے کافی تھا کہ مرشد کے دل میں میرے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں تھا۔ وہ کسی مجبوری کی وجہ سے فی الحال سختی سے گریز کر رہا تھا۔ وہ وجہ بھی جلد سامنے آ جاتی۔

مجھے عبداللہ کا خیال آیا اس نے غائب ہونے کے بعد مجھے تلاش کرنے کی کوشش کی ہوگی اور اگر اسے خالی گاڑی مل گئی ہوگی تو اسے معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں دشمن کے ہتھے چڑھ گیا ہوں۔ کھانا دینے والا کچھ دیر بعد واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں زنجیر تھی اور اس سے منسلک بند ہو جانے والی ہتھکڑی تھی۔ اس نے زنجیر دیوار میں لگے کنڈے سے منسلک کی اور پھر اس کا کڑے والا سرا میری کلائی میں ڈال دیا۔ اب میں بیڈ پر لیٹ سکتا تھا لیکن اس کے آخری سرے تک ہاتھ نہیں

لے جاسکتا تھا۔ زنجیر کوئی تین فٹ لمبی تھی اور میری آزادی محدود ہوگئی تھی۔ جب وہ اپنا کام کرکے گیا تو اس کے جاتے ہی مرشد علی آگیا تھا۔ اس نے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے یہ انتظام کیا تھا کیونکہ اس کے ساتھ کوئی محافظ نہیں تھا جو اس کو بچاتا۔

"شہباز ملک۔" اس نے مجھ سے محفوظ فاصلے پر کھڑے ہوکر کہا۔ "میرا خیال ہے تم اداکاری کررہے ہو۔"

میں خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے پھر کہا۔ "مجھے فتح خان چاہیے۔"

"تو لے لو۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ تمہارے پاس ہے۔"

"میں کسی فتح خان کو نہیں جانتا۔"

"بکواس مت کرو تم جانتے ہو۔" وہ غرانے لگا تھا۔ "ابھی میرے جلاد جب تمہارے جسم سے بوٹی بوٹی کرکے گوشت اتارنا شروع کریں گے تو تمہیں سب یاد آجائے گا۔"

اگر میں کہوں کہ اس کی دھمکی نے مجھے خوف زدہ نہیں کیا تو یہ غلط ہوگا۔ میں اس کے قبضے میں تھا اور اس کے پاس بچ بچ کے جلادوں کی کمی نہیں تھی۔ اس کے ایک اشارے پر میرے ساتھ اس سے کہیں زیادہ برا سلوک ہوسکتا تھا لیکن میں نے اپنا تاثر برقرار رکھا تھا۔ میں اسے یوں دیکھتا رہا جیسے اس کی دھمکی میرے سر سے گزر گئی ہو۔ میرا رویہ اس بچے جیسا تھا جسے سانپ ایک خوب صورت جانور لگتا ہے اور وہ اس کی ہلاکت خیزی سے بے خبر ہوتا ہے۔ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے میں نے شکایتی انداز میں کہا۔ "یہ دیکھو مجھے باندھ دیا ہے۔"

مرشد علی بھنا گیا تھا۔ "ابھی تمہارے ساتھ جو ہوگا تم باندھنا بھول جاؤ گے۔"

میں کسمسایا۔ "تم کون ہو؟ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہو؟"

"شہباز ملک میں نہیں مان سکتا کہ سر کی ایک معمولی سی چوٹ نے تمہاری یادداشت چھین لی ہے۔ مجھے یقین ہے تمہیں سب یاد ہے بس تم ڈراما کر رہے ہو لیکن یاد رکھو تم اس طرح بچ نہیں سکو گے۔ ابھی تمہیں دکھایا جائے گا کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوسکتا ہے اور پھر تمہارے پاس صرف ایک دن کی مہلت ہوگی۔"

مرشد نے کہا اور اپنا عبا لہراتا ہوا کمرے سے رخصت ہوگیا۔ میں اس کے آخری الفاظ پر غور کر رہا تھا۔ مجھے کچھ دکھایا جانا تھا۔ کیا دکھانے کے لیے کہیں لے جایا جاتا۔

میرے اندر امید جاگی تھی۔ اس صورت میں مجھے فرار کا موقع مل سکتا تھا لیکن مجھے باہر نہیں نکالا گیا۔ اس کے بجائے کچھ دیر بعد مرشد کے دو تنومند آدمی ایک دبلے اور کمسن لڑکے کو لے کر اندر گھس آئے۔ لڑکا رو رہا تھا اور تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ ڈرے چھوٹے الفاظ میں ان لوگوں سے رحم کی اپیل کر رہا تھا لیکن اس کو لانے والے گونگے اور بہرے جلاد تھے، وہ نہ کسی کی فریاد سنتے تھے اور نہ کسی بات کا جواب دیتے تھے۔ انہوں نے لڑکے کو باندھ کر اوندھے منہ فرش پر لٹا دیا اور اس کے جسم پر موجود کپڑے الگ کرکے اسے بالکل برہنہ کردیا۔

میرا دل اندر سے جکڑنے لگا تھا اور مجھے لگا جیسے ابھی کوئی خوف ناک منظر میرے سامنے آنے والا ہو۔ لیکن جو منظر سامنے آیا وہ میری سوچ سے بھی زیادہ خوف ناک تھا۔ لڑکے کو لانے والے جلادوں نے اسے بے بس کرکے فرش پر ڈال دیا اور اس کے بعد ان میں سے ایک باہر جاکر دو ڈنڈے لے آیا۔ ان میں سے ایک لڑکے کی کمر پر بیٹھ گیا اور دوسرے نے فوراً ہی ڈنڈا گھما کر لڑکے کے تلوے پر مارا۔ اسے خبر ہی نہیں تھی اور ہڈی ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ لڑکے نے فلک شگاف چیخ ماری تھی۔ وہ تڑپا لیکن اس کے اوپر بیٹھا شخص کم سے کم بھی سو کلو گرام وزنی تھا۔

مارنے والے نے فوراً دوسرا وار کیا اور لڑکے کا دوسرا پاؤں بھی تلوے سے توڑ دیا۔ اس بار لڑکے کی چیخیں نہیں رکی تھیں اور پھر وہ مستقل چیختا چلا گیا۔ کیونکہ ڈنڈے والا مستقل اس کے پیروں پر ڈنڈے مار رہا تھا۔ میں نے دہل کر کہا۔ "ظالمو! یہ کیا کر رہے ہو؟"

لیکن وہ بہرے تھے یا بہرے بنے رہے۔ دونوں کی مکمل توجہ اپنے کام کی طرف تھی۔ بیٹھنے والے نے لڑکے کو مکمل طور پر قابو کر رکھا تھا۔ وہ تڑپ بھی نہیں سکتا تھا جبکہ دوسرا مشینی انداز میں اپنا کام کر رہا تھا۔ وہ ایسے روبوٹ بنے ہوئے تھے جن میں انسانی حس نہیں ہوتی۔ ان کو پتا نہیں ہوتا کہ وہ جس چیز کو توڑ پھوڑ رہے ہیں وہ کوئی ناکارہ مشین ہے یا انسان ہے۔ ایسا ہی رویہ ان کا بھی تھا۔ میرا چیخنا چلانا دونوں سنتے ان پر تو لڑکے کی چیخوں کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈنڈے والے نے لڑکے کے پیروں کی بیشتر ہڈیاں توڑ دی تھیں اور اب اسے چھوڑ بھی دیا جاتا تب بھی وہ نہیں چل سکتا تھا۔ دوسرا جلاد اس پر سے اٹھ گیا اور اس نے دوسرا ڈنڈا سنبھال لیا۔ میرا دل لرزنے لگا کہ ابھی نہ جانے اور کیا کچھ دیکھنا پڑے گا۔ لڑکا ہوش میں تھا اور بار بار میں دفعہ آیا تو وہ کراہ رہا تھا۔ اس دوران میں میں بھی ان کو اور ان کے آقا کو

للچائی دیتا رہا تھا لیکن میں نے ایک بار بھی مرشد یا کسی کا نام لینے کی غلطی نہیں کی تھی۔ مجھے ابھی طرح معلوم تھا کہ مجھے یہ سب دکھانے کے دو مقاصد تھے۔ ایک تو یہ کہ میں جذبات میں آکر کھل جاؤں اور دوسرے مجھے پتا چل جائے کہ مرشد میرے ساتھ کیا کچھ کرواسکتا تھا۔

وہ دونوں دوسرے مرحلے کی تیاری کر رہے تھے اور اس دوران میں وہ لڑکے کے اوپری جسم پر ڈنڈوں سے ہلکی ہلکی ضربیں لگا رہے تھے۔ پھر ان میں سے ایک نے لڑکے کی کمر پر ضرب لگائی۔ وہ تڑپا اور پھر فلک شگاف انداز میں چیخنے چلانے لگا۔ جلاد نے پھر ضرب لگائی اور اس کے ساتھ ہی دوسرا بھی شامل ہوگیا۔ دونوں باری باری اسے ضربیں لگا رہے تھے۔ وہ مار رہے تھے اور ان کی کوشش تھی کہ وہ بے ہوش بھی نہ ہونے پائے اس کے لیے وہ اسے نازک جگہ ضرب لگانے سے گریز کر رہے تھے۔ ان کا نشانہ زیادہ تر گوشت اور ہڈیاں تھیں۔ اس کے پیروں کی ہڈیاں درجنوں جگہوں سے ٹوٹ گئی تھیں اور اس کی جان بچ بھی جاتی تب بھی اس کی ہڈیوں کو دوبارہ کا کوئی آرتھوپیڈک سرجن ٹھیک نہیں کرسکتا تھا۔ اب وہ اس کی کمر اور شانوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اس کے شانوں کی ہڈیاں بھی توڑ دی تھیں۔ لڑکا ابھی ہوش میں تھا لیکن اس میں چیخنے کی ہمت باقی نہیں رہی تھی وہ سسک رہا تھا۔ جلادوں کے ہاتھ رک گئے۔

"ظالمو! بس کرو کیا اسے مار دو گے؟" میں نے چلا کر کہا۔

ظالموں پر میری آواز کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ اب وہ ڈنڈا ڈولیے سے لڑکے پر ستم کا نیا پہاڑ توڑنے جا رہے تھے، انہوں نے اسے سیدھا کیا۔ ایک جلاد نے ڈنڈا بلند کرکے پوری طاقت سے اس کے گھٹنے پر مارا۔ اس کی ہڈی نیچے سے ٹوٹ چلی تھی اس بار سامنے والی چھپنی بھی چکنا چور ہو گئی۔ لڑکے کی سسکی ذرا تیز ہوئی تھی۔ وہ نیم غشی میں تھا اور اس سے پہلے وہ مرجاتا جلاد اسے زیادہ سے زیادہ تکلیف دینا چاہتے تھے۔ وہ پے در پے اس پر ڈنڈے برسانے لگے۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ مگر ڈنڈے اس کے جسم سے ٹکرانے اور اس کی دھیمی کراہوں کی آوازیں تو میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں کانوں پر ہاتھ رکھ کر ان آوازوں کی شدت کم کرسکتا تھا لیکن انہیں مکمل طور پر نہیں روک سکتا تھا۔

نہ جانے کب وہ لڑکا مرگیا اور یہ اس کے مردہ جسم پر اپنی ستم گری کرتے رہے۔ اس کی ایک ایک ہڈی توڑ دی۔ اس کا سر پاش پاش کردیا۔ اس کا گوشت ڈنڈوں سے یوں کوٹ کر قیمہ کردیا جیسے دھوبی ڈنڈے سے کپڑے کا میل کچیل نکالتا ہے۔ کمرے میں خون کے چھینٹے ہی چھینٹے تھے اور جہاں لڑکے کی لاش تھی وہاں کی زمین لہو سے سرخ ہوگئی تھی۔ جب جلادوں نے اپنا کام کرلیا تو وہ لڑکے کی لاش ایسے ہی چھوڑ کر وہاں سے چلے گئے۔ میرا دماغ گھوم رہا تھا اور مجھے شدید قسم کی متلی محسوس ہو رہی تھی۔ میں دیر سے آنکھیں بند کیے بیٹھا ہوا تھا۔ جب وہ چلے گئے تو میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ میرے سامنے تصور سے بھی زیادہ بھیانک منظر تھا۔ لڑکے کے جسم کو لاش کہنا بھی درست نہیں تھا۔ وہ تو کچلی اور مسلی ہوئی کوئی چیز تھی۔ جس کا ایک عضو بھی صحیح سلامت نہیں تھا۔ اس کا سرخون، گوشت، ہڈیوں اور مغز کا ایک ملغوبا بن گیا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے مجھے متلی کا احساس ہوا اور میں نے منہ بستر سے نیچے کرتے ہوئے الٹی کردی اور ایک دو لمحے کو مجھے چکر آگیا تھا۔ نہ جانے کیسے میں بستر سے نیچے گرنے سے محفوظ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے شدت سے کمزوری کا احساس ہوا تھا۔

میں سمجھتا تھا کہ حالات نے مجھے سخت جان بنا دیا ہے۔ میں نے اتنی لاشیں اور اتنے پامال جسم دیکھے تھے کہ اب انسان کو اس روپ میں دیکھنا میرے لیے مشکل نہیں رہا تھا لیکن اس ایک منظر نے میری ساری خوش فہمی دور کردی تھی۔ میں بالکل بھی سخت جان نہیں تھا۔ ایک معمولی لڑکے کی کچلی مسلی لاش نے میرے اندر کی کمزوری کو ایک جھٹکے سے نکال کر باہر کھڑا کردیا تھا۔ میں بالکل بھی مضبوط نہیں تھا۔ میں کتنی ہی دیر بستر پر پڑا ہانپتا رہا اور خود سے لڑتا رہا۔ میرا مقابلہ ایسے لوگوں سے تھا جو کسی انسان کو اتنی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔ میں کس طرح ان لوگوں سے لڑ سکتا تھا؟ اس دن پہلی بار مجھے خیال آیا کہ میری مرشد علی سے لڑائی بے سود ہے۔ میں کسی طور بھی اس سے مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔

دروازہ کھلا کچھ لوگ اندر آئے وہ لاش کو تھیلے میں ڈال کر لے گئے۔ اس کے بعد صفائی کرنے والے آئے، انہوں نے فرش پر پانی مار کر لڑکے کا خون اور جسم کی باقیات صاف کیں۔ دس پندرہ منٹ میں کمرا دھو دھلا کر بالکل صاف کیا اور واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں لڑکے کی لاش اٹھائی جاچکی تھی لیکن میرے ذہن نے مجھے دکھایا کہ لاش وہیں پڑی ہے۔ میں نے جلدی سے آنکھیں بند کرلیں اور کچھ دیر بعد کھولیں تو کمرا صاف تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ چند منٹ پہلے تک میں جو دیکھتا رہا تھا وہ ہوا ہی نہیں تھا۔ میں نے خود کو تسلی دی کہ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا

اور میں نے خواب دیکھا تھا۔

لیکن میرے اندر سے کوئی کہہ رہا تھا یہ خواب نہیں تھا ابھی میرے سامنے ایک جیتا جاگتا انسان بہت اذیت سے اپنی زندگی سے محروم کیا گیا ہے۔ ایک بار میں نے ایک ناکارہ ہو جانے والی کار کو کرشر میں ڈال کر اسے اسکریپ کرتے دیکھا تھا۔ اس نے کار کی صورت ختم کر کے اسے ایک دھاتی بکس کی شکل دے دی تھی۔ اس انسان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اسے اس کی انسانی صورت سے محروم کر کے گوشت اور ہڈیوں کا ایک ڈھیر بنا دیا گیا تھا۔ میرے دماغ کے سیلف ڈیفنس سسٹم نے اس وقت مجھے سوچنے کی صلاحیت سے محروم کر دیا تھا ورنہ میں شاید ہمیشہ کے لیے نہیں تو عارضی طور پر ضرور پاگل ہو جاتا۔ نہ جانے کتنی دیر میں اسی طرح خالی ذہن کے ساتھ بیٹھا رہا، جب مرشد علی اندر آیا تو میں نے اسے سچ مچ اجنبی نظروں سے دیکھا تھا۔ چند لمحے تک تو مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کون تھا اور پھر میں نے اسے پہچانا۔

''تم..... تم نے ایسا کیوں کیا؟''

''کیا..... کیوں کیا؟'' اس نے انجان بن کر پوچھا۔

میں دکھی ہو رہا تھا۔ ''اس بے چارے لڑکے کا کیا قصور تھا، وہ تو شاید پندرہ سولہ برس کا تھا؟''

''ہاں یہی عمر تھی اس کی۔'' مرشد نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''لیکن اس کی کم عمری سے اس کے جرم پر کوئی فرق نہیں آتا تھا۔''

''کیا کیا تھا اس نے...؟''

''اس حرامزادے نے سرِ عام سب کے سامنے مجھے گالیاں دی تھیں۔'' مرشد کا چہرہ یہ کہتے ہوئے بگڑ گیا تھا۔ اگرچہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے نزدیک یہ کتنا بڑا جرم تھا۔ یہ فرعون صفت لوگ تھے جو اس زمین پر خود کو خدا سمجھتے تھے۔ لیکن میں نے حیرانی کا اظہار کیا۔

''صرف گالیاں دینے پر تم نے اسے اتنی سفاکی سے مروا دیا۔ ایسا تو درندے بھی نہیں کرتے ہیں۔''

اس نے بدمزگی سے مجھے دیکھا۔ ''اس کے کیے کی یہ سزا بہت کم ہے، کاش کہ میں ان سب کے سامنے یہ سزا دلواتا جن کے سامنے اس نے مجھے گالیاں دی تھیں۔''

''وہ بے چارہ غریب اور معمولی سا لڑکا لگ رہا تھا، وہ تمہیں کیسے گالیاں دے سکتا تھا۔''

''اس نے دی تھیں، میرے منہ پر دی تھیں۔ اس کا خیال ہے کہ اس کی ماں کے اغوا اور آبروریزی میں میرا ہاتھ تھا۔''

''تو تمہارا ہاتھ نہیں تھا؟'' میں نے سادگی سے پوچھا تو اس کے چہرے پر ایک عیارانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

''اگر تھا بھی تو یہ اتنی بڑی بات تو نہیں تھی اور اس کی ماں کون سی پارسا تھی۔ علاقے کے ہر آدمی سے اس نے یاری لگا رکھی تھی لیکن جب اس کی لاش ملی تو اس کا پلا مجھ پر بھونکنے چلا آیا۔''

بات واضح تھی۔ اس لڑکے کی ماں مرشد اور اس کے آدمیوں کی چیرہ دستی کا نشانہ بنی تھی۔ پھر انہوں نے اسے قتل بھی کر دیا۔ اس پر لڑکے نے غم و غصے سے پاگل ہو کر مرشد کو سب کے سامنے گالیاں دیں۔ وہ بے چارہ یہی کر سکتا تھا اور اسے بھی معلوم تھا کہ اس کے بعد اس کے ساتھ کیا ہوگا۔ گویا اپنی ماں کی موت اور بے آبروئی کا ممکنہ حد تک بدلہ لینے کے لیے وہ اپنی جان پر کھیل گیا تھا۔ مرشد نے اس کی موت سے دو فائدے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ایک تو اسے مروا کر اپنے انتقامی جذبات کی تسکین کر لی اور دوسرے اس نے مجھے بھی بتا دیا کہ اگر میں راہِ راست پر نہ آیا تو وہ میرے ساتھ بھی ایسا کر سکتا تھا۔

''تم لوگ جرائم پیشہ ہو۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''لوگوں کو مارتے اور اغوا کرتے ہو۔''

''بکو مت۔'' وہ بولا۔ ''ہم عزت دار گدی نشین ہیں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''عزت دار لوگ ایسی حرکتیں نہیں کرتے ہیں۔ تم تو مجھے کوئی سکہ بند بدمعاش لگ رہے ہو۔''

''چلو ایسا ہی سہی..... تم نے دیکھ لیا کہ میں اپنا مفاد حاصل کرنے کے لیے کس حد جا سکتا ہوں۔ مجھے ہر صورت فتح خان چاہیے۔''

''تم نے پہلے بھی اس کا ذکر کیا تھا، یہ شخص کون ہے اور تمہیں کیوں چاہیے؟''

''میرا اس سے ایک کام ہے۔'' اس نے مبہم انداز میں کہا۔ ''شہباز ملک.....''

میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''کیا میرا نام شہباز ہے؟''

''ہاں تمہارا نام شہباز ہے۔'' اس نے دانت پیس کر کہا۔

''اور تمہارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام..... ہے۔'' اس بار اس نے بے قابو ہو کر اپنے لیے ایک ناپاک نام تجویز کیا، میں ہنس دیا تھا۔

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن یہی بات جب اس لڑکے نے کہی تو تم نے اسے مروا دیا۔''

مرشد شاید پچھتا رہا تھا کہ وہ میرے سامنے یوں بے قابو کیوں ہوا۔ میں اس کا دشمن تھا اور وہ میرے سامنے ذرا رکھ رکھاؤ سے رہنا چاہتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اس رکھ رکھاؤ کی اس نے خود ایسی کم تیسی کر دی تھی۔ اب وہ پھر سے اپنا نقاب اوڑھنے کی فکر میں تھا۔ میں نے چٹکی لی۔ ''کیا میں سب کے سامنے تمہیں اسی نام سے پکاروں تو تم میرے ساتھ بھی یہی سلوک کرواؤ گے؟''

اس نے آہستہ سے کہا۔ ''میرا نام مرشد علی ہے۔''

''مرشد علی..... یہ سچ ہے مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں یاد ہے لیکن تمہارا طرزِ عمل بتا رہا ہے کہ ہم آپس میں دشمن ہیں۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں تم میرے بدترین دشمن ہو اور تم نے مجھے شدید نقصان پہنچائے ہیں۔ یقین کرو تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک اس کا وجود میرے کتوں کے معدے میں جا کر ہضم ہو چکا ہوتا۔''

''لیکن تم نے میرے ساتھ مہربانی کی اور مجھے اب تک زندہ رکھا ہے۔'' میں نے طنز کیا۔ ''اگرچہ میں یادداشت کھو چکا ہوں لیکن عقل نہیں کھوئی ہے۔ تم بے سبب کسی پر مہربانی کرنے والے شخص نہیں ہو۔''

''تم نے ٹھیک کہا۔'' اس کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔ ''مجھے تم سے ایک کام ہے اور اگر تم میرا کام نہیں کرو گے تو تم میرے لیے بے کار ہو اس صورت میں، میں تمہیں نادر کے حوالے کر دوں گا۔''

''نادر کون... یہی منحوس صورت جلاد جنہوں نے اس لڑکے کو قتل کیا ہے؟'' میں نے انجان بن کر کہا۔

اپنے بھائی کی شان میں گستاخی پر اس کا چہرہ پھر بگڑ گیا تھا لیکن اس نے خود پر قابو پا کر میری معلومات میں اضافہ کیا۔ ''نادر میرا بھائی ہے جو تمہاری وجہ سے ہمیشہ کے لیے معذور ہو کر بستر پر پڑا ہے۔''

''میری وجہ سے کیوں؟'' میں نے معصومیت سے پوچھا۔

''تم نے اس پر فائر کیا تھا جس سے اس کی ریڑھ کی ہڈی متاثر ہوئی اور اس کا جسم مفلوج ہو گیا۔ اب اسے ڈاکٹروں نے مکمل طور پر جواب دے دیا ہے اور ابھی اسے معلوم نہیں ہے کہ تم میرے قبضے میں آ گئے ہو ورنہ وہ آسمان سر پر اٹھا لے گا اور مجھے تمہاری جان بچانا دشوار ہو جائے گا۔''

''خوب یعنی تم میری جان بچانا چاہتے ہو؟'' میں نے طنزیہ لہجہ برقرار رکھا۔

''یہ حقیقت ہے، میں تم سے دشمنی ختم کرنا چاہ رہا ہوں۔''

''نادر کے ہوتے ہوئے؟''

''ہاں اس کا مسئلہ نہیں ہے، میں اسے باہر بھیج دوں گا وہ اب وہیں رہے گا اور اس کی جتنی بھی زندگی ہے وہ عیاشی سے گزارے گا پھر اسے تمہاری پروا نہیں ہوگی۔ میں اسے بتاؤں گا کہ میں نے تمہیں مار دیا ہے تو وہ اس بات پر یقین کر لے گا۔''

''لیکن سوال وہی ہے تم مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہو جبکہ تم یہ کام سچ مچ کر سکتے ہو بلکہ اپنے معذور بھائی کے ہاتھ سے کروا سکتے ہو۔ وہ بھی خوش ہو جائے گا۔''

''میں تمہیں بتا چکا ہوں، مجھے فتح خان چاہیے۔''

''یہ کون ہے اور اس کا مجھ سے کیا تعلق ہے؟''

''یہ تمہارا دشمن اور میرا ساتھی ہے اور اس وقت تمہارے قبضے میں ہے۔''

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''تو کیا میں بھی تمہاری طرح کا کوئی گینگسٹر ہوں۔ میں بھی دشمنوں کو اغوا کرتا ہوں۔''

''تم اس معاملے میں مجھ سے بہت آگے ہو۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ''یہ تو میری قسمت ہے کہ تم میرے آدمی کے ہاتھ اتفاق سے آ گئے۔''

''ٹھیک ہے میں مان لیتا ہوں کہ فتح خان میرے پاس ہے لیکن میں نے اسے کہاں رکھا ہے، مجھے بالکل نہیں معلوم۔ مجھے اس بارے میں کچھ بھی یاد نہیں ہے۔''

''مجھے شک ہے تم یادداشت غائب ہونے کا ڈھونگ رچا رہے ہو۔'' اس نے ایک بار پھر صاف گوئی سے کہا۔

''لیکن یہ حقیقت ہے مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔''

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا۔ ''شہباز تمہارا یہ ڈراما زیادہ دیر نہیں چلے گا۔''

''نہیں، اسٹار پلس سے آنے والے سوپ ڈرامے تو بہت طویل عرصے تک چلتے ہیں۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''تمہیں اسٹار پلس یاد ہے۔'' اس نے طنز کیا۔

''پتا نہیں، بہت ساری باتیں یاد ہیں۔ بس اپنے بارے میں بھول گیا ہوں۔''

وہ جانے کے لیے مڑا پھر رک کر بولا۔ ''شہباز ملک اس پر سنجیدگی سے سوچنا، تمہارے پاس وقت کم ہے۔ بہتر ہے میری بات مان لو اور فتح خان کو میرے حوالے کر دو تو میں تمہیں جانے دوں گا۔''

''تمہاری بات سے لگ رہا ہے فتح خان تمہیں ساتھی

ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے کسی مطلب سے واپس چاہیے۔"

"اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔" اس نے کہا اور حسب عادت لبادہ لہراتا ہوا کمرے سے رخصت ہو گیا۔ میں بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اکیلے ہوتے ہی مجھے پھر اس مظلوم لڑکے کی یاد آئی جس کی ماں اس سے چھین لی گئی تھی اور جب اس نے قاتلوں کو گالیاں دیں تو انہوں نے اسے بھی عبرت ناک انداز میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مجھے آج بھی حیرت ہوتی ہے کہ وہ سب میں نے کس طرح برداشت کیا اور مرشد کے ساتھ نارمل ہو کر بات کرتا رہا تھا۔ یہی نہیں میں نے اپنی اداکاری بھی برقرار رکھی تھی اور مرشد کا شک رفتہ رفتہ کم ہونے لگا تھا۔ جب وہ مجھے دھمکی دے کر گیا تھا تب بھی اس کے لہجے میں سختی نہیں تھی۔ یعنی اس کا امکان کم تھا کہ مجھے اس کی طرف سے کسی تشدد آمیز کارروائی کا نشانہ بننا پڑے۔ اصل خطرہ یہ تھا کہ نادر کو میری یہاں موجودگی کا علم ہو جاتا تو وہ یقیناً پاگل ہو جاتا اور ممکن ہے اس کی ضد کے آگے مرشد مجبور ہو جاتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ مرشد کیوں فتح خان کو اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا تھا۔ ایک ممکنہ وجہ تو یہ ہو سکتی تھی کہ پرانا ساتھی ہونے کے ناتے مرشد اسے میری قید سے چھڑانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ وجہ میرے حلق سے نہیں اتر رہی تھی۔ مرشد تعلق پالنے والوں میں سے نہیں تھا۔ فتح خان اہم شخص سہی لیکن مرشد کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اگر وہ میری قید میں تھا تو مرشد کو اس سے کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے تھی اور اگر وہ اسے آزاد کرانے کی کوشش کرتا تو کم سے کم میری قیمت پر آزاد کرانے کی کوشش نہ کرتا کیونکہ میں اس کے لیے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ میں اس کے لیے ایک ایسا دشمن بن چکا تھا جو اب اسے براہِ راست ناقابلِ تلافی قسم کے نقصانات پہنچا سکتا تھا اور میں اسے اس کا عملی مظاہرہ کر کے بھی دکھا چکا تھا۔

دوسرا خیال یہ تھا کہ مرشد علی ان ہیروں کے چکر میں ہے جو ایک طرح سے فتح خان کے قبضے میں تھے۔ کیونکہ ان ہیروں کے بارے میں دنیا کا ایک ہی شخص جانتا تھا کہ وہ کہاں موجود ہیں یعنی برٹ شا اور یہ برٹ شا اس وقت فتح خان کی قید میں تھا۔ شاید اس بات کا مرشد علی کو بھی علم تھا اور اب وہ اس فکر میں تھا کہ کسی طرح فتح خان سے برٹ شا کو حاصل کر لے اور پھر ان ہیروں تک رسائی حاصل کرے جن کی مالیت کوئی پچیس کروڑ ڈالر تھی اور اب اس مالیت میں یقیناً کئی گنا اضافہ ہو گیا ہو گا۔ اگر پاکستانی روپوں میں ان کی قیمت نکالی جاتی تو وہ دسیوں ارب روپے بنتے۔

مرشد کتنا ہی دولت مند سہی لیکن دولت کی اہمیت اس کے نزدیک کسی مفلس سے بھی زیادہ تھی۔ اسے دولت کی ضرورت نہیں تھی لیکن اس کی ہوس ضرور تھی اور ہیرے سب کو للچاتے ہیں۔ میری سمجھ میں یہی ایک وجہ آ رہی تھی جس کے لیے مرشد علی فتح خان کو اپنے قبضے میں لینے کے لیے بے چین تھا اور اس کے لیے مجھ جیسے دشمن کو بھی رعایتیں دے رہا تھا۔ اگرچہ مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ فتح خان کو حاصل کر کے بھی مجھے چھوڑے گا۔ فی الحال تو وہ مجھ سے فتح خان کو حاصل کرنا چاہتا تھا اور وہ ایک بار اس کے قبضے میں آ جاتا تو وہ میرے ساتھ کچھ بھی کرنے کے لیے آزاد ہوتا۔

وقت گزرتا گیا۔ کھانا لانے والے نے حسبِ معمول مجھے دال چاول مہیا کیے۔ ان کا معیار گھٹیا تھا اور اپنے لیے کوئی بھی اس طرح کا کھانا نہیں بناتا ہے۔ مجھے لگا جیسے یہ جگہ کوئی جیل تھی اور یہاں کھانے کا یہی مینو تھا۔ تین ٹائم یہی ملتا تھا۔ تیسری بار ڈاکٹر کوئی دس بارہ گھنٹے بعد آیا تھا۔ اس نے میرے زخم کا معائنہ کیا اور کسی قدر حیران ہو کر بولا۔ "یہ تو تقریباً بھر گیا ہے اب اس پر پٹی لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"انجکشن کی بھی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"تمہاری مرضی۔" اس نے کہا اور زخم پر دوا لگا کر رخصت ہو گیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ میرے زخم اتنی جلدی کیوں بھر جاتے تھے۔ شاید وہ اسے قدرتی طور پر ایسا سمجھ رہا تھا۔ حالانکہ یہ ان دواؤں کی وجہ سے تھا جو حکیم قاؤس نے مجھے بچانے کے لیے بے تحاشا کھلائی تھیں اور ان کے اثر سے میرے گہرے زخم بھی حیرت انگیز طور پر جلدی بھر جاتے تھے۔ جب کھانے والا دن میں تیسری بار کھانا دینے آیا تو میں نے اس سے کہا۔

"کیا بات ہے یہاں کا مینو یہی ہے رات میں بھی یہی کھانا۔"

"تو تمہارے لیے گوشت لائیں۔" اس نے بگڑ کر کہا۔ وہ منحنی سا لیکن بدتمیز قسم کا شخص تھا اور شاید یہاں قیدیوں سے اسی طرح بات کرنے کا عادی تھا۔ بہرحال اس کی بات سے تصدیق ہو گئی تھی کہ رات ہو چکی ہے۔ ان کی قید میں مجھے یہ دوسری رات تھی۔ اس نے دال چاول کا ڈونگا میرے سامنے رکھا تو میں نے اس کی گردن دبوچی اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کی آواز تو کیا سانس بھی رک گئی تھی اور آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔ اس نے ہاتھ پاؤں مارے تو میں نے اسے یوں پھنسا لیا کہ اس کے لیے ہاتھ پاؤں ہلانا بھی ممکن نہیں رہا

تھا۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔

"تم مجھے جانتے نہیں ہو ابھی میں گلا دبا کر تمہیں مار دوں تو مرشد مجھے کچھ نہیں کہے گا۔ اس لیے میرے ساتھ احتیاط سے بات کیا کرو، سمجھ گئے؟"

میری گرفت نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ واقعی مر کر ہی اس سے نکل سکتا تھا۔ اس نے جلدی سے سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ "اب مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے اگر تم نے درست جواب دیے تو ٹھیک ہے ورنہ میں تمہاری گردن توڑ دوں گا۔"

اس نے پھر جلدی سے سر ہلا کر مجھے تعاون کا یقین دلایا۔ میں نے گرفت ذرا نرم کی لیکن اتنی کہ وہ صرف بول سکے میں نے چلانے کی گنجائش نہیں رکھی تھی پھر بھی اسے خبردار کر دیا۔ "آواز بس اتنی ہو کہ میرے کانوں تک آ جائے اس سے آگے نہ جائے۔"

"تم.... کیا پوچھنا.... چاہتے ہو؟" اس نے سہمی آواز میں کہا۔

"یہ جگہ کون سی ہے؟"

"مرشد بادشاہ کا ڈیرا ہے۔" اس نے کہا۔

میرا خیال تھا کہ شاید میں مرشد ہاؤس میں ہوں لیکن یہ کسی ڈیرے کا ذکر کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "یہ کہاں ہے؟"

اس نے مجھے جو محل وقوع بتایا یہ مارگلہ کی پہاڑیوں میں اسلام آباد کی حدود سے باہر کوئی جگہ تھی۔ یہ ان کا آبائی گھر تھا لیکن اب یہ خاندان راولپنڈی میں مرشد ہاؤس میں رہتا تھا اور اس آبائی جگہ کو دوسرے کاموں کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ "قید خانہ کہاں ہے؟"

"حویلی کے نیچے تہ خانے میں۔" اس نے بتایا۔

"لیکن ادھر سے کوئی فرار نہیں ہو سکتا ہے۔ بہت سارے پہریدار ہیں اور باہر کتے ہیں۔ جس کو نہیں پہچانتے اسے چیر پھاڑ دیتے ہیں۔"

میرا یہ اندازہ درست نکلا تھا کہ کوئی جیل تھی جس میں مرشد کے مخالفین رکھے جاتے تھے اور ان پر تشدد اور سختیاں کی جاتی تھیں۔ اگر یہ مشہور جگہ تھی تو یقیناً دوسرے لوگوں کو اس کا علم ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اس آدمی سے ممکنہ حد تک معلومات حاصل کر کے اسے چھوڑ دیا اور چھوڑنے سے پہلے اسے سمجھایا۔ "اس واقعے کا کسی سے ذکر مت کرنا ورنہ مرشد کو پتا چل گیا کہ تم نے مجھے یہ سب بتایا ہے تو وہ تمہارے ساتھ کیا سلوک....."

"نہیں جی۔" اس نے لرز کر کہا۔ "میری زبان بند ہے کی آپ بھی مت بتانا۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔"

"میں کیوں بتانے لگا۔ اب تم جاؤ۔"

وہ چلا گیا اور میں نے دال چاول سے ڈنر کیا۔ ابھی دو دن پہلے تک میں راجا عمر دراز کی کوٹھی میں شاندار قسم کے کھانے کھا رہا تھا۔ لیکن یہ میری زندگی کا ایک سائیکل تھا کبھی مزے اور کبھی سزا۔ مرشد نے مجھے کل تک کی مہلت دی تھی۔ اگر چہ ... یہ تو مشکل تھا کہ وہ میرے ساتھ وہی سلوک کرتا جو اس مظلوم لڑکے کے ساتھ کیا لیکن مجھ پر تشدد تو کیا جا سکتا تھا اور وہ اس معاملے میں اتنا مجبور بھی نہیں تھا۔ بس وہ اس وجہ سے رکا ہوا تھا کہ میری اداکاری نے اسے شک میں ڈال دیا تھا۔ اگر میں سچ مچ سب بھول چکا تھا تو مجھ پر تشدد بھی بے سود ہوتا۔ اس کے باوجود مرشد کی احتیاط مجھے حیران کر رہی تھی۔

رات سکون سے گزری اور صبح سویرے جیل کے نگران خود مجھے اس لیٹرین میں لے گئے جہاں جانے کا سوچ کر میری روح فنا ہو رہی تھی اور جانا مجبوری تھی۔ میں رات سے برداشت کر رہا تھا اور اب معاملہ برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ شکر ہے یہ خود آ گئے ورنہ اب میں دروازے تک نہیں جا سکتا تھا جو دروازہ بجا کر ان کو متوجہ کروں۔ یہ لوگ بھی شاید اسی وجہ سے قیدیوں کو بہت کم کھانا پانی دیتے تھے تاکہ اخراج کا مسئلہ دیر سے پیدا ہو۔ تین وقت چھوٹی پلیٹ کے مساوی دال چاول دیے جاتے تھے اور ہر بار ساتھ میں ایک گلاس پانی ملتا تھا۔ اس کے باوجود چوبیس گھنٹے میں ایک بار ٹوائلٹ جانا لازمی ہوتا تھا۔

ویسے پانی کی یہ مقدار اس مقدار سے بہت کم تھی جو ایک آدمی کو چوبیس گھنٹے میں درکار ہوتی ہے۔ میرا اندازہ تھا کہ اس جیل میں چند مہینے گزارنے والے شخص کو لازمی طور پر گردے کی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہو گا۔ پھر کھانے کی مقدار اتنی کم تھی کہ کھانے سے میری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور مشکل سے ایک گھنٹے بعد پھر بھوک لگ جاتی تھی۔ مجھے دو دن میں خاصا فرق محسوس ہونے لگا تھا۔ جو لوگ یہاں مہینے یا اس سے زیادہ عرصے سے ہوں گے ان کا وزن بہت کم ہو گیا ہو گا۔ مرشد کو چاہیے تھا یہاں سلمنگ کلینک کھول لیتا اور لوگوں سے اچھی خاصی فیس بھی وصول کر لیتا لیکن یہ صرف ایک طنزیہ خیال تھا جو میرے ذہن میں آ گیا تھا۔

میں منتظر تھا کہ مرشد آئے گا لیکن دوپہر ہو گئی اور پھر شام ہو گئی لیکن وہ نہیں آیا تھا۔ شاید وہ کہیں پھنسا ہوا تھا اور اس وجہ سے یہاں نہیں آ پایا تھا۔ یہاں بھی وہ شاید صرف میری خاطر آیا ہو گا ورنہ اس کا بیشتر وقت تو مرشد ہاؤس میں گزرتا تھا۔ مرشد تو نہیں آیا لیکن رات کے کھانے میں میرے

ساتھ ہاتھ دکھا دیا گیا۔ جیسے ہی میں نے ڈونگا ختم کیا یک لخت کمرا میری نظروں کے سامنے گھومنے لگا تھا اور میں کوشش کے باوجود خود کو نہ سنبھال سکا۔ میں بستر پر ہی لڑھک گیا تھا۔ دال چاول میں شامل دوا یقیناً زود اثر تھی۔ مجھے زیادہ دیر سوچنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔

☆☆☆

میری آنکھ کھلی تو پہلا احساس شدید سردی کا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ درجہ حرارت نقطہ انجماد سے گر گیا تھا اور سردی کی شدت رگ و پے میں گھسی جا رہی تھی۔ میں بے ساختہ اٹھ بیٹھا تھا۔ یہ ایک پتھر کی دیواروں پر مشتمل کمرا تھا جس میں ایک طرف فولادی دروازہ لگا تھا اور اس کے مخالف سمت دیوار میں کوئی دس فٹ کی بلندی پر روشن دان تھا۔ اس میں شیشہ لگا تھا اور باہر ہلکی سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ یعنی دن نکل آیا تھا لیکن ابھی صبح کا آغاز تھا۔ میں نے چند گہرے سانس لیے تو مجھے ہوا بھی ہلکی محسوس ہوئی تھی اور اس میں نباتات کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ یعنی میں کسی بلند مقام پر تھا۔ کمرے میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ میں فرش پر ایک بھورے اور موٹے سے کمبل پر پڑا تھا اور اس کے علاوہ میرے جسم پر صرف میرے کپڑے تھے۔ اگرچہ یہ بھی گرم کپڑے تھے لیکن سردی جس حساب سے تھی اس حساب سے گرم نہیں تھے۔ یہ اضلام آباد کی سردی کے لحاظ سے تھے اور یہاں تو مری جیسی سردی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کمبل اٹھا کر اپنے گرد لپیٹ لیا اور دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ شکر ہے یہاں میرے پیروں میں میرے جوتے تھے جو یقیناً مجھے یہاں لانے سے پہلے پہنا دیے گئے تھے ورنہ میرے پاؤں ٹھٹھر جاتے۔

کچھ دیر میں جسم ذرا گرم ہوا تو میں نے اٹھ کر دروازہ بجایا۔ فولاد برف سے بھی زیادہ سرد ہو رہا تھا۔ اس پر ہاتھ لگتا تو باقاعدہ تکلیف ہوتی تھی لیکن یہ کام کرنا تھا۔ چند لمحے بعد باہر سے کسی نے کہا۔ ”کیا بات ہے؟“

”میں سردی سے مر رہا ہوں۔“ میں نے چلا کر کہا۔ ”مجھے یہاں سے نکالو۔“

”شکر کرو اندر صرف سردی ہے، باہر آ گئے تو اندر جانے کی آرزو کرو گے۔“ اس آدمی نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ لہجے سے وہ پڑھا لکھا اور کوئی اہم شخص لگ رہا تھا۔

”میں کہاں ہوں؟“

”جہنم میں اور جلد یہاں تمہاری قبر بنے گی اس لیے سردی کے بجائے سکندر نکیر کی فکر کرو۔“ اس نے کہا اور پھر اس کی آواز نہیں آئی تھی۔ میں اسے پکارتا رہا مگر جواب نہیں آیا۔ تھک ہار کر میں واپس اپنی جگہ بیٹھ گیا تھا۔ یہاں فضا میں ایسا سناٹا تھا جیسے آس پاس کوئی ذی روح نہ ہو۔ جبکہ مرشد کے آبائی حویلی والے قید خانے میں ایسا محسوس نہیں ہوتا تھا۔ شاید یہ کوئی ویران جگہ تھی۔ لیکن مرشد نے مجھے یہاں کیوں منتقل کیا۔ کیا میری وہاں موجودگی سے اسے کوئی پریشانی ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے وہ مجھے بلا سبب تو یہاں منتقل نہیں کر سکتا تھا۔ باہر روشنی تیز ہو رہی تھی یعنی سورج نکل آیا تھا۔ صبح ہونے کے ساتھ ہی صبح سے منسلک مخصوص مسائل بھی سر اٹھا رہے تھے اور میں نے ایک بار پھر دروازہ پیٹا اور اس وقت تک پیٹتا رہا جب تک اس آدمی کی آواز نہیں سنائی دی۔

”کیا ہے؟“ اس نے دہاڑ کر کہا۔ دروازے کو اس بار میں نے جوتے سے بجایا تھا اور اس کی اونچی آواز نے میرا دماغ بھی خراب کر دیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے کیا مسئلہ تھا۔ اس نے کہا۔ ”کمرے کے ایک کونے میں دیکھو فرش میں ایک پتھر الگ سے نظر آئے گا اسے ہٹاؤ اس کے نیچے سوراخ ہے جو کرتا ہے اس میں کر لو۔“

میں بھنا گیا تھا۔ ”دھونے کے لیے پانی تو چاہیے ہوگا۔“

اس پر کچھ دیر بعد جب میں کمرے کے اس پتھر کا معائنہ کر رہا تھا اس پر درمیان میں چھوٹا سا لوہے کا کڑا لگا تھا جس سے اس پتھر کو اٹھایا جا سکتا تھا کہ دروازے کا نچلا حصہ ذرا سا کھلا اور اس سے ڈیڑھ لیٹر والی کولڈ ڈرنک کی بوتل اندر آئی جس میں تقریباً برف نما پانی تھا۔ یورپ اور دنیا کے دوسرے سرد علاقوں میں لوگوں میں سردی کی وجہ سے طہارت کا رواج نہیں ہے، وہ کاغذ سے کام چلا لیتے ہیں لیکن ہم مسلمان اس کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ قطب شمالی یا قطب جنوبی پر بھی ہمیں صفائی کے لیے پانی درکار ہوتا ہے۔ اگر برف نما پانی کے بجائے برف بھی ہوتی تب بھی میں اسے ضرور استعمال کرتا۔ اگرچہ میرا برا حال ہو گیا تھا لیکن اس سے صفائی کا جو احساس ہوا اس کی بات ہی الگ تھی۔ پتھر بہت صفائی سے اس سوراخ پر لگا تھا اس لیے کمرے میں ذرا بھی بو نہیں تھی۔ میں نے پتھر دوبارہ جگہ پر لگا دیا اور کمبل اوڑھ کر خود کو گرم کرنے لگا کیونکہ ذرا سی دیر میں صرف ہاتھ اور بعض مخصوص مقامات پر پانی لگنے سے جسم کی ساری حرارت زائل ہو گئی تھی اور میں کوئی ایک گھنٹا کمبل میں رہا تب کہیں جا کر جسم پہلے کی طرح گرم ہوا تھا۔ پھر سورج بلند ہونے سے پہلے بھی سردی نہیں رہی تھی اس لیے میں نے کمبل ایک طرف رکھا اور ورزش کرنے لگا۔ دس پندرہ منٹ تک ورزش کرنے سے جسم تو گرم ہو گیا لیکن ساتھ ہی پیٹ میں بھوک کی اینٹھن بھی شروع ہو گئی تھی۔ پہلے قید خانے میں کم مقدار میں سہی لیکن باقاعدگی سے کھانے کو مل جاتا تھا یہاں کا کچھ پتا نہیں تھا اس لیے میں نے پھر دروازہ بجایا اور اس بار وہ پوچھے بغیر سمجھ گیا تھا۔ جب میں تھک ہار کر کمبل پر جا بیٹھا تو دروازے کا نچلا خانہ کھلا اور اس سے ایک چھوٹی سی پلاسٹک ٹرے اندر آئی۔ اس میں مکئی کی موٹی روٹی اور ایک چائے کا پیالہ تھا جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ جب تک میں دروازے کے پاس پہنچا خانہ بند ہو گیا تھا۔ یہ الگ سے ایک پلیٹ لگی تھی جو باہر کی طرف کھلتی تھی اور اسے باہر سے کنڈی لگا کر بند بھی کیا جا سکتا تھا کیونکہ جب میں نے اسے کھولنے کی کوشش کی تو پلیٹ ٹس سے مس نہیں ہوئی تھی۔ اگر یہ کھلی بھی ہوتی تو میں اس کا کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ کیونکہ یہ مشکل سے چھ انچ چوڑی اور ایک فٹ لمبی تھی۔

مکئی کی روٹی نے تو شکم پری کی تھی لیکن چائے کی گرمی نے مجھے تازہ دم کر دیا تھا۔ میں نے کھا پی کر خدا کا شکر ادا کیا جو اس عالم میں بھی بندے پر مہربان تھا۔ جب میں ناشتا کر رہا تھا تو خانہ کھلا اور اس میں سے ڈیڑھ لیٹر والی ایک بوتل اور اندر آئی اور اس آدمی نے باہر سے کہا۔ ”یہ پینے کے لیے ہے۔ برتن اور خالی بوتلیں اس خانے کے پاس رکھ دینا میں اٹھا لوں گا۔“

میں نے محسوس کیا کہ وہ اس معاملے میں بہت محتاط تھا۔ جب میں خانے سے دور ہوتا تھا تب ہی وہ خانہ کھولتا تھا۔ اگرچہ میں اس خانے سے باہر صرف اسی صورت میں جا سکتا تھا جب میں کوئی بلا ہوتا۔ کوئی انسان چاہے وہ کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو اس خانے سے کسی صورت نہیں نکل سکتا تھا۔ شاید اسے خوف تھا کہ چیز رکھے یا نکالنے کے دوران میں اس کا ہاتھ نہ پکڑ لوں کیونکہ اب ہاتھ تو بہر صورت اندر لانا پڑتا تھا اور میں اس بات سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ جب میں ناشتا کر کے برتن رکھنے گیا تو میں نے اس خانے کا معائنہ کیا اور مجھے خیال آیا کہ اسے کس طرح پتا چلتا ہے کہ میں دروازے سے دور بیٹھا ہوں اور وہ خانہ کھول کر چیز اندر ڈال دیتا ہے۔ میں نے باریک بینی سے دروازے کا جائزہ لیا تو مجھے اس کے درمیان میں موجود باریک سوراخ نظر آ گئے تھے اس سے کمرے میں جھانکا جا سکتا تھا اور وہ ان سے جھانک کر دیکھ لیتا تھا کہ میں دور دیوار کے ساتھ بیٹھا ہوں۔ تب وہ بھرتی سے خانہ کھولتا اور چیز اندر رکھ کر فوراً خانہ بند کر دیتا تھا۔

اتنی احتیاط کی ایک ہی وجہ میری سمجھ میں آئی تھی کہ وہ اس جگہ اکیلا تھا اور اسے میرے بارے میں اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا اس لیے وہ بہت محتاط تھا، مجھے کوئی ایسا موقع نہیں دینا چاہتا تھا جس سے مجھے فرار میں مدد مل جائے۔ میں نے پانی کی بوتل پاس رکھ لی یہ مختلف کولڈ ڈرنک کی بوتل تھی اس لیے پینے اور طہارت کے پانی کی بوتلیں آپس میں ملنے کا امکان نہیں تھا۔ ویسے وہ بوتل میں نے سوراخ والے پتھر کے ساتھ ہی رکھ دی تھی۔ کھا پی کر میں پھر کمبل میں لپٹ کر لیٹ گیا تھا۔ میں نے کمبل یوں لپیٹ لیا تھا کہ میں اس میں پوری طرح چھپ گیا تھا لیکن میں نے ایک جھری چھوڑ دی تھی جس سے مجھے دروازے کا نچلا حصہ نظر آ رہا تھا۔ کوئی دس منٹ بعد اس نے خانہ کھولا اور ناشتے کے برتن باہر کھینچ لیے اور خانہ بند کر دیا۔ اس کام میں اسے مشکل سے دس سیکنڈ لگے ہوں گے، اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اسے اس کام میں مہارت تھی۔ شاید وہ پہلے بھی یہاں قیدیوں کی میزبانی کرتا رہا تھا۔

دن چڑھنے کے ساتھ سردی کا احساس کم ہوتا جا رہا تھا۔ میں کمبل میں لپٹ کر سو گیا تھا۔ پھر میری آنکھ خانے کے بند ہونے کی آواز سے کھلی۔ میں نے کمبل سے جھانکا تو مجھے ایک پلاسٹک کا پیالہ نظر آیا، اس میں چمچ بھی تھا اور اس سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ میں جلدی سے اس کے پاس چلا آیا۔ مجھے خاص بھوک نہیں تھی لیکن اس پیالے سے اٹھتی گرمی بڑی قیمتی تھی۔ میں نے پیالہ کمبل کے اندر کر لیا اور اس گرمی سے لطف اندوز ہونے لگا۔ پیالے میں سادہ دلیہ تھا جس میں ہلکا سا نمک مرچ ڈال دیا گیا تھا اور یہ تقریباً بے ذائقہ تھا لیکن اس دال چاول سے بہت اچھا تھا جو مجھے پہلے والے قید خانے میں ملتا تھا۔ جب دلیا کسی قدر ٹھنڈا ہو گیا تو میں نے اسے کھا لیا۔ خالی پیالہ واپس دروازے کے پاس رکھ دیا جو باہر موجود شخص نے اچانک ہی اٹھا لیا لیکن اس نے خانہ فوراً بند نہیں کیا تھا بلکہ اس نے کوئی چیز اندر رکھی اور پھر خانہ بند کیا تھا۔ اس بار میں نے پھرتی دکھائی لیکن جب تک خانے تک پہنچا وہ بند ہو گیا تھا۔ میں اس چیز کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ ایک موبائل فون تھا۔ میں نے اسے اٹھایا۔ یہ آن تھا، بیٹری پوری تھی اور خاص بات یہ تھی کہ اس پر سگنل بھی آ رہے تھے، اس کا مطلب تھا کہ میں شہر سے دور بالکل ہی کسی ویران جگہ نہیں تھا بلکہ شہر کے پاس ہی تھا۔ میں نے اس پر ایک نمبر ملا کر دیکھا لیکن آگے سے ریکارڈڈ آواز نے بتایا کہ بیلنس نہیں ہے۔ میں واپس آ کر کمبل میں گھس گیا میری سمجھ میں آ رہا تھا کہ یہ موبائل کس لیے مجھے دیا گیا ہے فوراً ہی اس کی تصدیق بھی ہو گئی اور بیل بجی۔ میں نے نمبر دیکھا اور اسے ذہن نشین کر کے کال ریسیو کی۔

”شہباز ملک۔“ دوسری طرف سے مرشد کی آواز آئی۔ ”میرا خیال ہے تم آرام میں ہو گے۔“

"ہاں جتنا کوئی قیدی آرام سے ہوسکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ویسے مجھے یہاں سوائے سردی کے اور کوئی خاص تکلیف نہیں ہے۔"

"تم میری مہربانی کو کہاں مانو گے؟" اس نے طنز کیا۔

"بات یہ ہے مرشد کہ شیطان کی مہربانی اس کا دھوکا ہوتی ہے اور اس کی آڑ میں وہ انسان سے اس کی سب سے قیمتی چیز چھین لیتا ہے۔ تم شیطان تو نہیں ہو لیکن اس کے چھوٹے موٹے چیلے ضرور ہو۔ اس لیے مجھے بیوقوف مت بناؤ اور کام کی بات کرو۔"

"تمہارے انداز سے تو لگ رہا ہے تمہیں سب یاد آ گیا ہے۔" اس نے عیاری سے کہا۔ "کبھی تم میرے بارے میں اتنی روانی سے تبصرہ کر رہے ہو۔"

مجھ سے غلطی ہوئی تھی اصل میں موبائل دیکھ کر میں حیران ہوا تھا اور یہ بات بھول گیا تھا کہ میری یادداشت گم ہے۔ لیکن میں اتنی آسانی سے اس بات کا اقرار کس طرح کرسکتا تھا اس لیے میں نے فوراً جواب دیا۔ "بے شک مجھے پچھلی باتیں یاد نہیں ہیں لیکن تم نے اپنا تفصیلی تعارف کرا دیا ہے۔"

"یعنی تم اپنی بات پر قائم ہو خیر مجھے بھی جلدی نہیں ہے۔"

"یہ بتاؤ کہ مجھے یہاں کیوں منتقل کیا ہے؟"

"اس کی دو وجوہات ہیں، ایک تو میں نے تمہارے لواحقین سے رابطہ کرلیا ہے۔"

"میرے لواحقین۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "کون... کس سے رابطہ کیا ہے؟"

"ایک تو تمہارا چچیرا خاص وکیل ہے، ندیم۔ اس سے رابطہ کیا تھا اور پھر اس کے توسط سے اس راجا کے بچے سے رابطہ کیا تھا۔"

"ان سے کیا بات ہوئی ہے؟"

"فی الحال تو ان کو یہ بتایا ہے کہ تم میرے پاس ہو اور جب مجھے فتح خان مل جائے گا تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔"

"مجھے یہاں بھیجنے کی دوسری وجہ کیا ہے؟"

"جو عمارتیں میری ملکیت ہیں ان کے آس پاس مشکوک افراد نظر آنے لگے تھے اور ایک کار کو روکنے کی کوشش کی تو اس میں موجود افراد نے میرے آدمیوں پر فائرنگ کر دی اور فرار ہو گئے۔ اس واقعے میں میرے دو آدمی ہلاک ہوئے ہیں۔"

"تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ یہ کارروائی میری خاطر کی گئی ہے تمہارے اور دشمن بھی تو ہوں گے۔ دوسرے وکیل تو سمجھ میں آتا ہے یہ راجا کون ہے۔"

"ہے ایک نام نہاد راجا..... تمہاری ہمدردی میں کچھ زیادہ ہی آگے آ گیا ہے۔" مرشد کا لہجہ زہریلا ہو گیا تھا۔ "ابھی میں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی ہے لیکن جس دن....."

"مرشد تم فضول باتیں کرنے کے بجائے ان سے بات کرو اپنے آدمی کو حاصل کرلو اور میری جان چھوڑ دو۔"

"فکر مت کرو۔" اس نے برا مانے بغیر کہا۔ "جیسے ہی مجھے فتح خان ملے گا میں تم کو چھوڑ دوں گا۔"

"تب تم مجھ سے کیا کہنا چاہ رہے ہو۔ جبکہ میں کچھ نہیں جانتا کہ جو تم کہہ رہے ہو وہ درست بھی ہے یا نہیں اور تم میری یادداشت غائب ہونے کا کتنا فائدہ اٹھا رہے ہو۔"

"میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں اس جگہ سے فرار کا خیال بھی مت لانا ایسی کسی کوشش کا مطلب موت بھی ہوسکتی ہے۔"

"میں ڈر گیا۔" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "اور کچھ...؟"

اس نے بھنا کر فون بند کر دیا۔ مجھے لگا جیسے مرشد مجھے مرعوب کرنے کے لیے احمقانہ حرکتیں کر رہا ہے۔ اس نے مجھے بے ہوش کروا کے یہاں منتقل کیا تھا حالانکہ یہ کام وہ ہوش میں بھی کرا سکتا تھا۔ باہر موجود شخص ہماری باتیں سن رہا تھا اس لیے جیسے ہی میں خاموش ہوا اس نے دروازہ بجایا۔

"موبائل خانے کے پاس رکھ دو۔"

"کس خوشی میں۔" میں نے موبائل کا جائزہ لیا۔ "یہ میرے پاس ہی مناسب ہے۔"

"تم شرافت سے دیتے ہو یا....."

"تم لینے کے لیے اندر آ جاؤ گے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "صبح سے تمہاری بہادری کے مظاہرے دیکھ رہا ہوں۔"

"اگر تم نے موبائل یہاں نہیں رکھا تو میں تمہارا کھانا اور پانی بند کر دوں گا۔" اس نے دھمکی دی۔

"شوق سے کرو۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے اب بیٹھے رہو کھانے اور پانی کے بغیر۔" اس نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ مرشد کے آدمی بھی اسی طرح حماقتیں کرنے کے ماہر لگ رہے تھے۔ اول تو اسے موبائل دینا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ مجھے ہینڈ فری پکڑا دیتا اور میں اس سے بات کر لیتا۔ ہینڈ فری میرے کسی کام کا نہیں تھا اور مجھے واپس کرنا ہی پڑتا لیکن موبائل کیوں واپس کرتا۔ جبکہ مجھے اس سے ایک امید کی کرن نظر آئی تھی کہ شاید اس کی مدد سے میں اپنے ساتھیوں سے رابطہ کرسکوں۔ اس زمانے میں

موبائل کمپنیز نے لون کی سہولت متعارف نہیں کرائی تھی جس سے آدمی لون لے کر آرام سے بات کرسکتا ہے۔ یہ عام سا موبائل تھا جس میں اسکرین بھی بلیک اینڈ وائٹ تھی۔ ایسا موبائل کام خوب کرتا ہے۔ اس دور دراز پہاڑی علاقے میں بھی اس کے سگنل آ رہے تھے۔

شام قریب تھی اور سردی میں اب اضافہ ہو رہا تھا۔ میں کمبل میں لپٹ کر بیٹھ گیا تھا لیکن صاف لگ رہا تھا کہ رات بہت مشکل گزرے گی۔ سردی شدت اختیار کر جائے گی۔ ابھی تو اسلام آباد میں بھی بغیر ہیٹر کے گزارہ نہیں تھا، یہاں تو درجہ حرارت لازمی نقطہ انجماد سے نیچے چلا جاتا ہوگا۔ سورج غروب ہوا اور رات ہوگئی۔ موبائل کے مطابق ابھی پانچ بج رہے تھے۔ پہاڑی علاقے میں ویسے بھی تاریکی تیزی سے آتی ہے۔ اسی حساب سے سردی کی شدت میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا تھا۔ میں سر بھی کمبل میں کر کے خود کو گرم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک موبائل کی بیل بجی تو میں اچھل پڑا تھا۔ دوسری طرف مرشد تھا۔ اس نے بلا تمہید کہا۔

"تم نے ابھی تک موبائل واپس نہیں کیا؟"

"اگر موبائل میرے پاس رہتا ہے تو اس کا تمہیں کیا نقصان ہے؟"

"مجھے کوئی نقصان نہیں ہے لیکن تمہیں کوئی فائدہ بھی نہیں ہے۔ موبائل اسے واپس کر دو۔"

"سوری مرشد میں اسے اپنے پاس رکھوں گا بلکہ تم ایسا کرو مجھے کچھ بیٹس بھجوا دو تاکہ میں تم سے بات کر کے وقت گزاری کرسکوں۔"

"شہباز۔" اس کا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔ "تم اپنی مشکلات میں اضافے کے خود ذمے دار ہو گے۔ بعد میں مجھ سے کوئی شکایت نہ کرنا۔"

میں نے اس کے لہجے پر غور کیا۔ اس کے ذہن میں یقیناً کوئی ایسا عمل تھا جس سے وہ مجھے نقصان پہنچا سکتا تھا یا مجھ سے موبائل واپس لے سکتا تھا۔ مجھے ایک موقع نظر آیا تھا اور اگر میں ضد کرتا تو شاید اس موقع سے محروم ہو جاتا۔ میں نے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے میں موبائل واپس کر دیتا ہوں لیکن اپنے آدمی سے کہو میرے ساتھ ذرا بہتر سلوک کرے، اگر مجھے یہاں انگیٹھی مہیا کر دے تو میں سردی میں ٹھٹھرنے سے بچ سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں اس سے کہہ دیتا ہوں۔" اس نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا۔ "تم موبائل اسے واپس کرو۔"

میں نے جا کر دروازہ بجایا۔ "موبائل لے لو۔"

میں نے موبائل وہیں رکھ دیا۔ لیکن میں خود واپس نہیں گیا بلکہ دروازے کے پاس کھڑا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کی آواز آئی۔ "تم اپنی جگہ واپس جاؤ۔"

میں پیچھے ہوا اور طنزیہ انداز میں بولا۔ "تم کچھ زیادہ ہی محتاط نہیں ہو؟"

اس نے جواب دینے کے بجائے پھرتی سے خانہ کھول کر موبائل باہر نکال لیا اور پہلی بار میں نے اس کا ہاتھ دیکھا۔ میں دم بہ خود رہ گیا تھا کیونکہ ہاتھ سونی صدنسوانی تھا۔ لیکن جو شخص باہر سے بولتا تھا اس کا لہجہ تو خالص مردانہ سے کچھ زیادہ ہی تھا تو کیا یہ اس عورت کی آواز تھی۔ ایسا ہوتا ہے کہ بعض عورتوں کی آواز مردانہ قسم کی ہوتی ہے اور اسی طرح بعض مردوں کی آواز میں نسوانیت پائی جاتی ہے۔ خانے سے جس ہاتھ نے موبائل اٹھایا تھا وہ سیدھے کی طرح سفید اور نرم و نازک سا تھا۔ انگلیاں گول اور پتلی گداز تھی۔ ایسا ہاتھ عورت کا ہی ہوسکتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے وہ بہت محتاط تھی اور اسے خوف تھا کہ خانے سے چیزیں اندر باہر کرتے ہوئے میں اس کا ہاتھ نہ پکڑ لوں۔ خانے کے تختے کے باہر چٹخنی لگی تھی جسے سرکا کر تختہ بند کر دیا جاتا تھا اور میں اسے کھول کر باہر نہیں دیکھ سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد خانہ کھلا اور اس سے رات کا کھانا اندر آیا۔ ٹرے میں آلو گوشت اور موٹی روٹی تھی۔ کئی دن کے بعد مجھے ڈھنگ کا کھانا صحیح مقدار میں ملا تھا اور یہ شاید موبائل واپس کرنے کا انعام تھا۔ کھانے کے ساتھ پانی کی تازہ بوتل بھی تھی کیونکہ صبح ملنے والی بوتل میں نے خالی کر دی تھی۔ ساتھ ہی طہارت والی بوتل بھی خالی ہو گئی تھی۔ میں نے وہ بھی دے دی تھی لیکن وہ واپس نہیں ملی تھی۔ جب میں کھا چکا اور برتن واپس رکھ دیے تو اس نے برتن اٹھانے کے ساتھ پانی کی دوسری بوتل بھی اندر کر دی تھی۔ یعنی وہ میرا خیال رکھ رہی تھی۔ اس بار بھی میں نے دیکھ لیا کہ ہاتھ عورت کا تھا۔ دروازے کے عین اوپر ایک بلب لگا تھا۔ شام ہوتے ہی وہ بلب آن ہو گیا تھا یعنی یہاں لائٹ تھی۔

اس جگہ دن میں بھی سناٹا ہی رہتا تھا لیکن رات کو یہ سناٹا اس قدر شدید ہو گیا کہ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے اس دنیا میں اب کوئی باقی نہیں رہا ہے بس میں ہوں اور اس ویران جگہ قید ہوں۔ ایک بار میرے دل میں آئی کہ میں دروازہ بجا کر اس مردانہ آواز والی عورت کو پکاروں لیکن پھر میں نے خود کو روک لیا۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے خود کو کمبل میں لپیٹ لیا اور سونے کی کوشش

کرنے لگا۔ اگرچہ جب میں نے مرشد علی سے انگیٹھی کا مطالبہ کیا تھا تب ہی مجھے یقین تھا وہ یہ بات نہیں مانے گا اور عورت نے مجھے انگیٹھی فراہم نہیں کی تھی۔ شاید اس وجہ سے بھی کہ اس چھوٹے سے خانے سے کوئی انگیٹھی اندر نہیں آسکتی تھی۔

سناٹا شدید ہونے کی وجہ سے میری سماعت بہتر انداز میں کام کرنے لگی تھی۔ کئی بار مجھے محسوس ہوا کہ کوئی دروازے تک آیا ہے اور میرا معائنہ کر کے چلا گیا ہے۔ رات دس بجے ایک بار خانہ کھلا اور اس میں سے چائے کا بھاپ اڑاتا پیالہ اندر آیا۔ خانہ بند ہونے کے بعد میں نے پیالہ اٹھالیا۔ مجھے جو برتن بھی دیا جاتا تھا وہ بہت ہلکے پلاسٹک کا ہوتا تھا جس سے میں کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ یہ پیالہ بھی اتنا ہلکا تھا کہ چائے کی تپش اس سے باہر آکر ہاتھوں کو لگ رہی تھی لیکن اس موسم میں یہ گرمی بھلی لگ رہی تھی۔ چائے اچھی بنی تھی اور اس میں دودھ اور چینی دونوں کم تھے۔ چائے پی کر میں نے خالی پیالہ دروازے کے پاس رکھ دیا۔ اس بار میں کمبل میں لیٹا تو مجھے نیند آگئی تھی۔

صبح چھ بجے روشنی نمودار ہونے لگی تھی اور سردی بدستور غضب کی تھی۔ کمبل کو گول مول کر کے پوری طرح اوڑھ لینے کے بعد بھی سردی لگ رہی تھی۔ سات بجے سورج کی روشنی روشن دان پر نظر آئی۔ یعنی یہ حصہ مشرق کی طرف تھا۔ میں نے بستر سے نکل کر تکیے کے گرد کمبل لپیٹ کر رکھ دیا پھر اٹھ کر ورزش کرنے کی نیت سے اسی سمت چل پڑا جدھر دروازہ تھا۔ ڈنڈ لگاتے ہوئے بستر پر نظر گئی تو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی، ایسا لگ رہا تھا جیسے کمبل میں گٹھڑی بنا کوئی سو رہا ہو۔ آٹھ بجے دروازے کا خانہ کھلا اور کھولنے سے پہلے عورت نے یقیناً جھانک کر دیکھ لیا ہوگا کہ میں کمبل میں لپٹا بے خبر سو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ اندر ڈال کر ناشتے کی ٹرے رکھی اور جیسے ہی اس نے یہ کام کیا میں نے اس کی کلائی تھام لی۔ اس نے تڑپ کر کلائی چھڑانے کی کوشش کی لیکن اتنی دیر میں میری گرفت اتنی سخت ہو چکی تھی کہ اس کی ہڈیاں کڑکڑا گئیں اور اس کے منہ سے تیز کراہ نکلی تھی اور یہ کراہ سوفی صد نسوانی تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ مزید اندر کر لیا اور اس نے بلبلا کر کہا۔

''چھوڑ میرا ہاتھ۔''

''واہ اب تم بالکل عورت والے لہجے میں بول رہی ہو۔''

''میں کہہ رہی ہوں میرا ہاتھ چھوڑو۔'' اس نے خود پر قابو پالیا تھا۔ اگرچہ میری سخت گرفت سے اسے تکلیف ہو رہی تھی لیکن اس کے لہجے سے اس کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا ہاتھ اب کلائی تک اندر تھا اور وہ یقیناً فرش پر لیٹ گئی تھی۔ دودھ ایسا سفید ہاتھ جس میں ہلکی سی گلابیت کی آمیزش تھی اور بہت خوب صورت اور سڈول نسوانی ہاتھ تھا یقیناً اس ہاتھ کی مالکہ بھی اتنی ہی حسین ہوگی لیکن فی الحال مجھے اس کی خوب صورتی سے زیادہ اپنی آزادی کی فکر تھی۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے بھی اسے پکڑ لیا اور سفاکی سے بولا۔ ''مجھے لگ رہا ہے تم کوئی حسین اور نازک عورت ہو لیکن میں تم پر ذرا بھی ترس نہیں کھاؤں گا اور تمہارا یہ ہاتھ جسم سے الگ کر دوں گا۔''

''نہیں۔'' وہ کانپ گئی تھی۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''

''یہ بتاؤ تمہارے علاوہ اور کتنے لوگ ہیں یہاں؟''

''کوئی نہیں۔ بس میں ہوتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے دروازہ کھولو میں اس قید خانے سے آزادی چاہتا ہوں۔''

''دروازے پر تالا لگا ہے اور چابی میرے پاس نہیں ہے۔'' وہ جلدی جلدی کہہ رہی تھی۔ ''خدا کے لیے میرا ہاتھ چھوڑ دو مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔''

میں نے ہاتھ چھوڑنے کے بجائے اسے ہلکا سا جھٹکا دیا۔ ''جھوٹ مت بولو، جب یہاں سب کام تم کر رہی ہو تو ایسا کیسے ہو سکتا ہے اس تالے کی چابی تمہارے پاس نہ ہو۔''

وہ کراہنے لگی تھی۔ ''میں..... سچ کہہ رہی ہوں۔''

''میں نہیں مان سکتا۔ تم نے میری گرفت سے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ میں طاقت ور شخص ہوں اور میں سچ کہہ رہا ہوں تمہارا ہاتھ الگ کر دوں گا۔''

''میں بھی سچ کہہ رہی ہوں۔'' وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ لہجے سے وہ تعلیم یافتہ اور ذہین لگ رہی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ مرشد نے مجھے اس کی قید میں رکھوایا تھا اور وہ یہاں اکیلی میری نگرانی کر رہی تھی۔

''او کے چابی تمہارے پاس نہیں ہے تو پھر کس کے پاس ہے؟''

''کسی کے پاس نہیں ہے۔ ایک اور جگہ رکھی ہے میں اسے ہر وقت لے کر نہیں گھوم سکتی ہوں۔''

میں نے ایک لمحے کے لیے اپنی گرفت نرم نہیں کی تھی حالانکہ میری انگلیاں اس کی نرم جلد میں گڑی جا رہی تھیں اور یقیناً ان جگہوں پر گہرے نشان بن گئے تھے۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''زرین۔'' اس نے جواب دیا۔

''زرین یہ جگہ کہاں ہے؟''

''مری ٹول پلازہ سے ذرا آگے ہے۔''

''تب یہ جگہ یقیناً ویران ہوگی تم اکیلی یہاں کیسے رہ رہی ہو؟''

''میں بالکل اکیلی نہیں ہوں۔ اس جگہ کا ایک چوکیدار بھی ہے لیکن وہ کوٹھی سے باہر ہوتا ہے اسے اندر آنے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ چوکیداری کے علاوہ سامان بھی لاتا ہے۔''

''مرشد سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

میرے اس سوال پر وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی تھی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''اس نے مجھے یہاں رکھا ہوا ہے۔''

اس کا جواب واضح نہیں تھا لیکن اس کا مطلب شاید یہ تھا کہ مرشد نے اسے اپنی داشتہ بنا کر رکھا ہوا ہے اور اس کا اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ایسی صورت میں وہ واضح بتا سکتی تھی لیکن ایک یہی ایسی بات ہے جو عورت بتاتے ہوئے ہچکچاتی ہے چاہے وہ کتنی بے باک کیوں نہ ہو۔ سچ یہ ہے کہ یہ بات سن کر مجھے صدمہ ہوا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ خوب صورت عورت تھی بلکہ اس لیے کہ وہ عورت تھی اور مرشد نے اس کی کسی مجبوری سے فائدہ اٹھایا ہوگا۔ میں نے اس سے اس بارے میں مزید کوئی سوال نہیں کیا۔

''زرین اگر مجھے آزادی نہیں ملے گی تو میں تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گا۔''

''تم کب تک مجھے اس طرح پکڑ کر بیٹھے رہو گے۔'' اس نے گویا مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''جلد چوکیدار یا مرشد کو میری غیر موجودگی کا علم ہو جائے گا۔''

''تم نے کہا کہ چوکیدار کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہے؟''

''ہاں مرشد نے اس پر پابندی لگا رکھی ہے۔'' اس نے ذرا بے لے انداز میں کہا جیسے یہ بات اسے ناگوار گزرتی ہو۔

''یعنی اسے تم پر اعتبار نہیں ہے۔''

''اگر تم اسے جانتے ہو تو وہ ایسا شخص ہے جو اپنی ماں پر بھی اعتبار نہ کرے۔'' اس کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔ ''اگر تم سمجھ رہے ہو کہ مجھے یرغمال بنا کر مرشد کو کسی طرح مجبور کر دو گے تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ میں اس کی غلام ہوں اور میری اس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں ہے۔''

''لہجے سے تم پڑھی لکھی لگتی ہو؟''

''میں نے انٹر تک کالج سے تعلیم حاصل کی ہے۔ پھر بابا کی طبیعت خراب رہنے لگی تو میں اس کے پاس یہاں آگئی۔''

''بابا..... یہاں کیا کرتا تھا؟''

''وہ مرشد کی اس کوٹھی کا چوکیدار تھا لیکن بابا نے کبھی مجھے یہاں آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ میں گاؤں میں اپنی موسی کے پاس رہتی تھی۔''

''جب تم یہاں آئیں تو پھر کیا ہوا؟''

''کیا تمہیں اندازہ نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''مرشد نے بابا کی چھٹی کر دی اور مجھے ملازم رکھ لیا۔ بابا میں انکار کی مجال نہیں تھی۔ پھر شاید اسی صدمے نے اس کی جان لے لی۔ تب سے میں یہاں ہوں۔''

''مرشد نے یہاں قید خانہ بھی بنوایا ہے؟''

''نہیں یہ پیچھے کا ایک کمرا تھا۔ پھر اس نے اس پر لوہے کا دروازہ لگا دیا اور دوسرے کچھ انتظامات کیے اور اس کے بعد کبھی کبھی وہ کسی کو یہاں بھیج دیتا ہے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے یوں سمجھ لو کہ تم یہاں چھٹے یا ساتویں قیدی ہو۔''

ہمارے درمیان گفتگو اسی طرح جاری تھی۔ میں اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا اور وہ اسے کھینچ رہی تھی۔ ''مجھ سے پہلے جو قیدی یہاں آئے ان کا کیا ہوا؟''

''ان میں سے کچھ تو واپس چلے گئے اور کچھ.....'' وہ کہتے ہوئے رک گئی۔ میں نے پوچھا۔

''ہاں کچھ کا کیا ہوا؟''

''ان کا مجھے نہیں معلوم۔'' وہ پریشان ہو گئی۔ ''میں تم سے پہلے ہی بہت باتیں کر چکی ہوں اگر مرشد کو پتا چل گیا تو وہ نہ جانے میرے ساتھ کیا کرے گا۔''

''یقیناً اچھا نہیں کرے گا۔'' میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ ''زرین اگر تم چاہتی ہو کہ مرشد تمہاری کھال نہ اتارے تو تمہیں میرے ساتھ پورا تعاون کرنا ہوگا۔''

''کیسا تعاون؟''

''مجھے یہاں سے آزاد کراؤ۔''

''کیسے اور تمہارا کیا خیال ہے اگر میں نے تمہیں آزاد کرا دیا تو مرشد مجھے بخش دے گا۔''

''تم اسے بتا سکتی ہو میں نے تمہیں کس طرح مجبور کیا۔''

''وہ کسی کی مجبوری سنتا اور مانتا ہے؟''

مجھے دل میں تسلیم کرنا پڑا کہ مرشد واقعی کسی کی مجبوری ماننے والا شخص نہیں تھا۔ اگر اس کے کسی آدمی سے غلطی ہو جائے تو وہ اسے لازمی سزا دیتا ہوگا۔ معاف کرنا اس کی سرشت میں نہیں ہے۔ میں سوچ رہا تھا۔ ''سنو تم کسی طرح چوکیدار کو یہاں بلا سکتی ہو؟''

"نہیں میں نے کہا نا اسے اندر آنے کی اجازت نہیں ہے۔"

"ہنگامی حالات میں بھی نہیں؟"

"کیا مطلب؟"

"دیکھو اگر تم چلاؤ تو کیا وہ تمہاری آواز سن کے بھی باہر بیٹھا رہے گا؟"

"نہیں..... شارق فوراً اندر آجائے گا۔" اس نے بے ساختہ کہا۔

اس نے جس طرح شارق کا نام لیا تھا اور اس کے بارے میں اظہارِ خیال کیا تھا' مجھے لگا ان دونوں کے درمیان کوئی تعلق تھا۔ میں نے انجان بن کر کہا۔ "کیوں اسے تم سے ایسی کیا ہمدردی ہے جو وہ تمہاری آواز سن کر فوراً دوڑا آئے گا؟"

"سب مرشد کی طرح سنگ دل نہیں ہوتے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ اس کا ایک مطلب تو عام تھا لیکن ایک مطلب یہ بھی تھا کہ مرشد اس سے متاثر ہوئے بغیر اسے صرف اپنی داشتہ بنائے ہوئے تھا لیکن شارق اسے پسند بھی کرنے لگا تھا لیکن یہ اندازہ تھا جو غلط بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "شارق کو آواز دو۔"

"نہیں۔" وہ بولی۔ "اسے اس معاملے میں شامل نہ کرو ورنہ مرشد کا عتاب اس پر بھی آئے گا۔"

"فی الحال تم مرشد کے بجائے میرے عتاب کی فکر کرو۔ اگر مجھے آزادی نہ ملی تو تمہارا ہاتھ تمہارے جسم سے ضرور آزاد ہو جائے گا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "تمہیں شاید غلط فہمی ہے کہ میں نرم دل ہوں۔ کیا مرشد نے تمہیں میرے بارے میں بتایا نہیں ہے؟"

"بتایا ہے۔" وہ کراہی۔ "مرشد نے بتایا تھا تم بہت سفاک انسان ہو اور اگر تمہیں موقع مل گیا تو تم مجھے قتل بھی کر سکتے ہو۔"

"اس نے درست کہا ہے، اپنی آزادی کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ اب تم اسے آواز دے رہی ہو یا....." میں نے اس کا ہاتھ ذرا سا مروڑا تو اس نے بے ساختہ چیخ ماری تھی۔ "یہ صرف ٹھونہ ہے اگر میں نے تمہارا ہاتھ اوپر کی طرف کھینچ لیا تو اس کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔"

"نہیں خدا کے لیے۔" وہ رونے والے انداز میں بولی۔ "تم جیسا کہو گے میں کروں گی لیکن میں تمہیں آزاد نہیں کرا سکتی۔ یہ میرے بس میں نہیں ہے۔"

"بالکل ہے تم شارق کو آواز دو اور اس سے چابی منگوا کر تالا کھول دو۔"

"شاید میری آواز اس تک نہ پہنچے۔"

"زرین مجھے مجبور مت کرو تمہارا ہاتھ توڑنے سے پہلے میں صرف یہ چھوٹی انگلی توڑ دوں تو تمہارا واویلا سن کر خود مرشد دوڑا آئے گا۔" میں نے کہا اور تجربے کے طور پر اس کی چھوٹی انگلی پکڑ کر پیچھے کی طرف دی تو وہ چلا اٹھی تھی۔ "شاباش اسی طرح چیخو۔"

"شارق۔" اس نے چلا کر کہا۔

"ذرا زور سے۔" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

"شارق۔" اس بار اس نے سچ مچ پورا زور لگایا اور اس کا نتیجہ بھی حوصلہ افزا رہا۔ باہر سے کسی مرد کے چلانے کی آواز آئی۔

"زرین۔"

"شارق جلدی آؤ۔" زرین چلائی۔

اس کے بعد کچھ دیر دونوں فلمی اسٹائل میں چلا چلا کر ایک دوسرے کا نام پکارتے رہے۔ پھر شارق نے آگاہ کیا کہ دروازہ اندر سے بند ہے وہ کیسے آئے؟ زرین نے اسے دیوار پھلانگ کر آنے کا مشورہ دیا۔ ایک منٹ بعد شارق اندر آگیا تھا اس کی آواز پاس سے آئی تھی۔ "تم کہاں ہو؟"

"میں یہاں قیدی والے کمرے کے پاس ہوں اس نے مجھے پکڑ لیا ہے۔ کمرے کے تالے کی چابی لے کے آؤ۔"

یہ سن کر شارق تیزی سے اندر آیا اور زرین کو میری گرفت میں دیکھ کر مضطرب ہو گیا' اس نے مجھے دھمکی دی۔ "چھوڑ اسے ورنہ گولی مار دوں گا۔"

"کیسے؟..... میں تو اندھا ہوں اور اگر تم نے کسی طرح سے گولی مار بھی دی تو اس وقت تک میں اس کا ہاتھ توڑ چکا ہوں گا۔"

"شارق..... اس کی بات مان لے۔" زرین رونے لگی۔ "مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔"

حالانکہ میں نے اسے مضبوطی سے ضرور پکڑا تھا لیکن اب میری گرفت تکلیف دینے والی نہیں تھی۔ یہ بات غالباً اس نے شارق کو متاثر کرنے کے لیے کہی تھی اور وہ فوراً متاثر ہو گیا۔ اس نے گھبرائے انداز میں کہا۔ "اسے چھوڑ دو میں چابی لا رہا ہوں۔"

"ایک منٹ رکو تم مجھے کس چیز سے گولی مار رہے تھے؟"

"میرے پاس پستول ہے۔"

"وہ پستول زرین کے حوالے کر دو اور زرین تم پستول مجھے دو گی۔"

"میں پستول نہیں دے سکتا۔" شارق نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا۔

"تم نے مجھے کیا بے وقوف سمجھا ہے۔ اگر پستول تمہارے پاس ہو گا تو مجھے تالا کھولتے ہی گولی مار دو گے۔ شرافت سے پستول زرین کو دے دو ورنہ....." میں نے بات ادھوری چھوڑ کر زرین کا ہاتھ ذرا کھینچا تو اس نے ایسی چیخ ماری کہ میرے کان بھی جھنجھنا گئے تھے۔ شارق جلدی سے بولا۔

"اچھا میں دیتا ہوں۔ اسے تکلیف مت دو۔"

میں نے ایک بار پھر محسوس کیا کہ ان دونوں میں کوئی چکر تھا اور شارق اگر صرف چوکیدار ہوتا تو اسے زرین کی اتنی پروا نہیں ہوتی جبکہ اسے مرشد کا خوف زیادہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اس وقت میری ساری حسیات ان پر مرکوز تھیں کہ کسی طرح میں پستول حاصل کر کے تالا کھلوا لوں اس کے بعد ہی یہاں سے میری آزادی کی راہ ہموار ہو سکتی تھی۔ شارق کی بات سن کر میں محتاط ہو گیا تھا میں نے زرین سے کہا۔

"پستول نال سے پکڑ کر اندر کرنا اور کوئی چکر مت چلانا ورنہ تم بھگتو گی۔"

لیکن اس کی جان پر بنی تھی۔ اس نے شرافت سے پستول نال سے پکڑ کر اندر کی طرف بڑھا دیا اور میں نے جلدی سے اس پر قبضہ کر لیا۔ پستول لوڈ تھا اور بہترین قسم کا ہتھیار تھا۔ میں نے اس کا رخ ایک طرف کر کے فائر کر دیا۔ بند کمرے میں اس کا دھماکا کم سے کم نہیں تھا۔ کچھ دیر کے لیے میرے کان بند ہو گئے تھے پھر زرین کے چلانے کی آواز آئی۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟"

"چیک کر رہا ہوں کہ یہ کام کرتا ہے یا نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اب شارق سے کہو چابی لا کر تالا کھول دے۔"

"وہ چابی لینے گیا ہے۔" زرین بولی۔ میں نے گرفت دوبارہ نرم کر دی تھی۔ اب وہ سکون سے تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "تم بہت ظالم آدمی ہو تمہیں عورت پر رحم نہیں آتا ہے۔"

"آتا ہے لیکن خود پر زیادہ آتا ہے۔ ویسے یقین کرو مجھے خود بھی کسی عورت کو تکلیف دیتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے لیکن اس وقت مجبوری ہے۔"

"مرشد کو کسی عورت کو تکلیف دیتے ہوئے بالکل رحم نہیں آتا۔"

"وہ مرشد ہے اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا....."

میں نے جواب دیا اسی لمحے شارق چابی لے آیا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔

"میں نے دروازہ کھول دیا ہے۔" اس نے کہا۔ "زرین کو چھوڑ دو۔"

"شاباش اب تم اوندھے منہ زمین پر لیٹ جاؤ۔" میں نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر کہا۔ "دروازے کے بالکل سامنے لیٹنا۔ اگر مجھے تم نظر نہیں آئے تو اس کی سزا زرین کو ملے گی۔"

"میں لیٹ گیا ہوں۔" شارق نے کہا تو میں نے ذرا سا دروازہ کھولا اور وہ سامنے نظر آیا۔ اس کے دونوں ہاتھ سامنے ہی پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے زرین کا ہاتھ چھوڑا اور پھرتی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ یہ مختصر سی راہداری تھی۔ زرین اپنا ہاتھ تھامے دیوار سے لگی کھڑی تھی اور شارق فرش پر اندھے منہ لیٹا ہوا تھا۔ میں زرین کو دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ حسین ہو گی لیکن وہ حسین ترین عورت تھی۔ بلکہ اسے عورت کہنا بھی درست نہیں تھا۔ وہ عمر کے لحاظ سے لڑکی تھی مشکل سے بائیس برس کی ہو گی۔ شہابی رنگت اور سر سے پاؤں تک جیسے کسی سانچے میں ڈھالی گئی تھی۔ اس نے سردی کی مناسبت سے ویلویٹ کا سوٹ اور اوپر سویٹر پہن رکھا تھا۔ سوئیٹر اس کو بالکل فٹ تھا اور اس کی نازک بدنی کو ظاہر کر رہا تھا۔ وہ میری نظر محسوس کر کے شرما گئی تھی لیکن اس نے شارق کی وجہ سے سوال کسی اور طرح کیا۔

"اب تم کیا چاہتے ہو؟"

"پہلے تو رہائی چاہتا تھا۔" میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ صیاد ایسا ہو گا تو کبھی رہائی کی خواہش نہ کرتا۔"

زرین کا چہرہ مزید گلابی ہو گیا تھا۔ ہر حسین عورت کی طرح اس نے میرے الفاظ کو نذرانہ حسن سمجھ کر قبول کر لیا تھا اور اس کا بالکل بھی برا نہیں منایا تھا۔ البتہ پیچھے لیٹے شارق نے برا منایا تھا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ "اب تم جا سکتے ہو؟"

شارق بھی کم عمر نوجوان تھا۔ اس کی عمر چوبیس سے زیادہ نہیں تھی اور وہ چھریرے جسم اور اچھے نقوش کا حامل لڑکا تھا۔ اگر چہ وہ کسی طرح زرین کے لائق نہیں تھا۔ اس کی جہالت اس کے چہرے پر لکھی تھی جبکہ زرین تعلیم یافتہ بھی تھی۔ شاید مرشد جیسے خبیث آدمی کی قید نے اسے شارق کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ میں نے اس کی کمر پر پاؤں رکھا۔

"برخوردار مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے یہ مجھے

تم نہیں بتاؤ گے۔ ابھی تو تم اٹھ کر اندر جاؤ۔" میں نے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

"میں اندر۔؟" اس نے یوں تعجب سے کہا جیسے یہ کوئی ناقابلِ یقین بات ہو۔

"ہاں تم اب اٹھ جاؤ۔"

وہ اٹھ گیا اور اس نے زرین کی طرف دیکھا۔ "تم ہم دونوں کو یہاں بند کر جاؤ گے؟"

میں نے محسوس کیا اس کے لہجے میں خوف کے بجائے دلچسپی تھی جیسے زرین کے ساتھ قید ہونا بھی کوئی خوش کن بات ہو۔ "تم دونوں کو نہیں صرف تمہیں۔" میں نے کہا اور اسے دروازے کی طرف دھکیل دیا اور اس سے پہلے وہ سنبھلتا میں نے لات مار کر اسے اندر کیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ وہ تڑپ کر واپس آیا اور دروازہ پیٹنے لگا۔ "دروازہ کھولو۔"

میں نے تالا لگا کر چابی اپنے قبضے میں لے لی۔ زرین سہمے انداز میں یہ سب دیکھ رہی تھی۔ میں نے شارق سے کہا۔ "ذرا دیر آرام سے بیٹھو جاتے ہوئے میں تمہیں آزاد کر جاؤں گا۔"

لیکن اس نے شور جاری رکھا۔ میں نے زرین کو وہاں سے چلنے کا اشارہ کیا۔ راہداری کے آخر میں دروازہ تھا اور ایک دروازہ قید خانے کا تھا گویا یہ بس اسی مقصد کے لیے تھی۔ دروازے کے دوسری طرف ایک خوب صورت نشست گاہ تھی جس میں وال ٹو وال دبیز قالین بچھا تھا اور برما ٹیک کا فرنیچر تھا۔ مرشد علی کی کسی رہائش گاہ کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ ذرا دیر میں میں نے زرین کے ساتھ ساری کوٹھی دیکھ لی تھی۔ یہ زیادہ بڑی نہیں تھی مشکل سے ایک کنال رقبے پر تھی جس میں اس کا بڑا سا لان اور گیراج بھی شامل تھا۔ کوٹھی میں تین بیڈ رومز تھے اور ایک سرونٹ کوارٹر بھی تھا۔ شارق کی رہائش کوٹھی کے باہر مین گیٹ کے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے میں تھی جس سے کوٹھی کے اندر صرف ایک کھڑکی کھلتی تھی۔ گویا مرشد نے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ چوکیدار اپنی مرضی سے کوٹھی کے اندر نہیں آ سکتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے حیرت تھی کہ اس نے کس طرح زرین جیسی خوب صورت عورت کو اس ویرانے میں ایک چوکیدار کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ میں نے لان پر نکل کر دیکھا آس پاس کوئی اور عمارت نہیں تھی۔ میں نے زرین سے پوچھا۔

"یہاں آس پاس کوئی آبادی ہے؟"

"ہاں ادھر ہمارا گاؤں ہے؟"

میں چونکا۔ "ہمارا کیا شارق بھی تمہارے گاؤں کا ہے؟"

"ہاں وہ میرے چچا کا لڑکا ہے۔"

ایک لمحے کو مجھے متلی آیا تھا، وہ بے غیرت اس کا چچازاد تھا اور مرشد کے لیے چوکیداری کر رہا تھا جو اس کی چچا زاد بہن کو داشتہ بنائے ہوئے تھا۔ زرین کو دیکھنے سے پہلے مجھے جو تھوڑا بہت شک تھا اب وہ بھی نہیں رہا تھا۔ مرشد جیسے عیاش کے لیے ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ زرین جیسی حسین لڑکی کو چھوڑ دیتا۔ کوٹھی ذرا بلندی پر تھی اور مجھے کوشش کے باوجود مری شاہراہ نظر نہیں آئی تھی۔ میں نے زرین سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے سامنے پہاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کے پیچھے ہے۔"

گویا مری شاہراہ وہاں سے کوئی تین چار کلومیٹرز کے فاصلے پر تھی۔ میں نے کوٹھی کے آس پاس کا معائنہ کیا۔ اس کے تین طرف ڈھلان تھی اور چوتھی طرف آمد و رفت کے لیے سڑک بنی تھی۔ یہ پتھروں سے بنائی ہوئی سڑک تھی جو مرشد نے شاید خود بنوائی تھی۔ زرین توقع کر رہی تھی کہ میں اب رخصت ہو جاؤں گا لیکن اس کی توقع کے خلاف میں کوٹھی کے اندر آ گیا۔ میں نے اس سے موبائل فون کا پوچھا۔ "تمہارے پاس موبائل فون ہوگا؟"

"بس وہی ہے جو تم کو دیا تھا۔"

"لیکن اس میں تو بیلنس ہی نہیں ہے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "شارق کے پاس ہے؟"

"پتا نہیں ویسے میں نے کبھی دیکھا نہیں۔" اس نے کہا۔

میں اسے لے کر اندر آیا اور شارق سے پوچھا۔ "تمہارے پاس موبائل ہے؟"

"نہیں غریب آدمی موبائل کہاں سے رکھے۔" اس نے تلخی سے کہا۔

"غریب آدمی موبائل نہ سہی لیکن غیرت ضرور رکھے۔" میں نے اسے جواب دیا اور زرین کو لے کر باہر آ گیا۔ میں نے ایک لمحے کو بھی اسے اپنی نظروں سے اوجھل ہونے نہیں دیا تھا۔ "کچن کہاں ہے مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

زرین مجھے کوٹھی کے بہترین کچن میں لے آئی، یہاں تمام جدید سہولتیں تھیں جن میں مائیکرو ویو اوون اور ایل ای ڈی سلیب بھی شامل تھا۔ وہاں پکانے کے لیے بہت کچھ تھا۔ میں نے اسے انڈے ابالنے اور ساتھ میں چائے بنانے کا حکم دیا۔ وہ کام میں لگ گئی اور میں ایک طرف کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"تم کب سے مرشد کے پاس ہو؟"

وہ میرے سوال میں چھپے معنی کو سمجھ گئی تھی کیونکہ اس کا

چہرہ سرخ ہو گیا تھا لیکن یہ شرم نہیں تھی بلکہ خفت تھی۔ اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ "دو سال سے ہوں۔"

"تم نے کبھی اس کی قید سے آزاد ہونے کی کوشش کی یا سوچا یا پھر اس قید میں خوش ہو؟"

اس نے تڑپ کر میری طرف دیکھا اور مجروح لہجے میں بولی۔ "کوئی عورت ایسی قید میں خوش ہو سکتی ہے۔"

"یہاں تمہارا گاؤں ہے تمہارے رشتے دار ہیں ان کے ہوتے ہوئے مرشد نے تم پر کس طرح قبضہ جما رکھا ہے۔"

"وہ سب بے غیرت ہیں۔ مرشد سے ڈرتے ہیں۔" اس نے نفرت سے کہا۔ "میرے چچازاد بھائی کو تم نے دیکھ لیا ہے۔"

"میں نے محسوس کیا ہے وہ تم میں دلچسپی رکھتا ہے۔"

"ہاں رکھتا تو ہے لیکن وہ بھی مرشد سے ڈرتا ہے۔"

"اگر وہ تم سے سچ مچ کی محبت کرتا ہے تو اسے اب تک مرشد کو قتل کر دینا چاہیے تھا۔"

"ہمارے ہاں کوئی مرشد یا اس کے کسی معمولی آدمی کے لیے بھی اس طرح نہیں سوچ سکتا ہے۔" وہ بے دلی سے بولی۔

"وہ تمہیں لے کر بھاگ تو سکتا تھا؟"

زرین ہچکچائی پھر اس نے کہا۔ "میں نے کئی بار اس سے کہا لیکن وہ نہیں مانتا، اس کا کہنا ہے اس ملک میں ہم کہیں بھی مرشد سے محفوظ نہیں ہوں گے۔ وہ ہر جگہ ہمیں تلاش کر لے گا۔"

"بکواس کرتا ہے وہ..... مرشد کوئی خدا ہے نعوذ باللہ..... جو اس کی پہنچ ہر جگہ ہو۔ میری اس سے دشمنی ہے لیکن وہ آج تک میرا کیا بگاڑ سکا ہے۔"

وہ خاموشی سے کام کرتی رہی شاید اسے بھی اندازہ تھا کہ شارق اسے بے وقوف بنا رہا تھا اور بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کی کوشش کر رہا تھا۔ زرین اس کے لیے ایک رشتہ نہیں بلکہ صرف ایک حسین عورت تھی جو اس کے آقا کی داشتہ تھی اور خوش قسمتی سے آقا نے اسے اس کی چوکیداری پر مامور کر دیا تھا اور وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر تقرب لگانا چاہتا تھا۔ بہرحال یہ ان لوگوں کا مسئلہ تھا اور میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ زرین نے انڈے ابال کر میرے سامنے رکھ دیے اور میں ان کو نگلنے لگا اس دوران میں چائے بھی تیار ہو رہی تھی۔ جب تک میں نے چار عدد انڈے نوش جاں کیے چائے بھی آ گئی اور میں اس کے گرم گرم گھونٹ حلق سے اتارنے لگا۔ زرین مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔

"تم مجھے یونہی چھوڑ جاؤ گے؟"

"تو پھر کیسے چھوڑ کر جاؤں؟"

"مجھے ساتھ لے چلو..... یہاں مرشد میری کھال اتار دے گا۔ وہ بہت ظالم آدمی ہے، ایسے ایسے ظلم کرتا ہے کہ میں مرنے کے قریب ہو جاتی ہوں اور ایسا وہ پیار میں کرتا ہے جب سزا دے گا تو....."

"مس زرین یہ میرا مسئلہ نہیں ہے تم اسے جو چاہے بتا سکتی ہو۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔

"خدا کے لیے۔" وہ گڑگڑائی۔ "میں سچ کہہ رہی ہوں وہ بہت ظالم ہے۔ میں تمہیں اس کے ظلم کے نشانات دکھاؤں۔"

"نہیں..... نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا لیکن وہ اس سے پہلے ہی اپنا سویٹر اتار چکی تھی اور پھر اس نے رخ پھیرتے ہوئے اپنی قمیص بھی اوپر کر دی۔ مخمل کی قمیص تلے بس کی کھال بھی نکلی تھی لیکن اس پر مرشد کی دہشتوں کے نشان پوری طرح نمایاں تھے۔ یہ جلانے، کاٹنے اور بھنبھوڑنے کے نشانات تھے جو بتا رہے تھے کہ ایک صاحبِ اختیار مرد ایک مجبور عورت کے ساتھ کیا کر سکتا ہے۔

"پلیز شرٹ نیچے کر لو۔" میں نے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ "مجھے مرشد کی بربریت بتانے کے لیے اپنا بدن دکھانے کی ضرورت نہیں ہے، اس کی درندگی کو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"

اس نے قمیص نیچے کر لی اور بھیگے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اس سے زیادہ گہرے زخم میرے جسم کے سامنے والے حصے پر ہیں۔"

میں نے گہری سانس لی اور کسی قدر درشت لہجے میں بولا۔ "میں نے کہا نا مجھے یہ سب دکھانے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ بتانے کی ضرورت ہے صرف یہ کہہ دینا کافی ہے تم مرشد کی داشتہ ہو۔"

وہ شرمندہ ہو گئی تھی۔ مجھے بھی اپنے الفاظ کی بے رحمی کا احساس ہوا۔ میں نے معذرت کر لی۔ "معاف کرنا..... اصل میں میں اس وقت مزاج کا آدمی نہیں ہوں۔ مجھے عورت کی عزت کرنا سکھایا گیا ہے۔"

"تب تم مجھے اس جہنم سے نکال کر نہیں لے جا سکتے؟" اس نے سویٹر پہنتے ہوئے التجا کی۔

"میں کہاں لے جا سکتا ہوں۔ میں تو خود در بدر پھر رہا ہوں اور تم نے خود کوشش کیوں نہیں کی؟"

"میں اکیلی عورت کہاں جا سکتی ہوں اور تم دیکھ رہے ہو مقدر نے مجھے کیسا بنایا ہے، کیا میں کہیں مردوں سے بچ کر

سکون سے رہ سکتی ہوں۔ اگر میں یہاں سے بنا سوچے سمجھے نکل جاتی تو آج ایک مرشد کے بجائے نہ جانے کتنے مرشدوں کا شکار ہوتی۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو جب تک تقدیر تمہارے لیے آسانی نہیں کرتی ہے، تمہیں یہیں رہنا چاہیے۔"

"بس یہی سوچ کر یہاں سے نہیں نکلی۔ لیکن اب تم ایک امید بن کر آئے ہو۔ تم مرشد کے دشمن ہو، طاقت ور بھی ہو تم مجھے پناہ دے سکتے ہو۔ تم یقین کرو میں دو وقت کے کھانے اور تن کے کپڑوں کے علاوہ اور کچھ نہیں مانگوں گی۔ میں ملازمہ بن کر رہ لوں گی۔"

"زرین میں تمہیں نہیں لے جا سکتا۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "ابھی مجھے خود نہیں معلوم کہ میں کہاں جاؤں گا۔ تمہیں بچانے کے لیے میں یہ کر سکتا ہوں کہ تم دونوں کو بند کر جاؤں۔"

"شارق کے ساتھ۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "نہیں ...میں اس کے ساتھ بند ہونا پسند نہیں کروں گی۔"

"وہ تمہارا چچا زاد بھائی ہے۔"

"بے شک ہے لیکن وہ میرے لیے اچھے ارادے نہیں رکھتا ہے ابھی تک تو اسے مرشد کا خوف اور میرا رویہ مجبور کرتا رہا ہے لیکن اگر میں اس کے ساتھ بند ہوئی تو شاید وہ اس موقع سے فائدہ اٹھائے۔"

پہلے میرا خیال تھا کہ زرین نے مرشد کے دیے موقع سے فائدہ اٹھا کر چوکیدار سے تعلقات قائم کر رکھے تھے لیکن اب مجھے پتا چلا کہ وہ اندر سے شریف عورت ہی ہے۔ مرشد سے تعلق اس کی مجبوری ہے اور اس سے اس کی شرافت پر کوئی حرف نہیں آتا ہے اور اسی وجہ سے وہ شارق میں دلچسپی لینے کے باوجود اس سے وہ تعلق قائم کرنے کو تیار نہیں تھی جس کی ہمارا معاشرہ اور مذہب اجازت نہیں دیتا ہے۔ اپنی عزت کے خوف سے وہ یہاں رہنے اور شارق کے ساتھ ایک کمرے میں بند ہونے کو تیار نہیں تھی۔ میں تذبذب میں تھا کہ اس کی بات کا کیا جواب دوں۔ سچ تو یہ تھا کہ اس کے سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے چائے کا مگ نیچے رکھا اور کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی تھی۔ میں نے سمجھ لیا کہ میں اسے نہیں لے جا سکتا تھا اور نہ اس کی کوئی اور مدد کر سکتا تھا۔

"مجھے افسوس ہے زرین، میں چاہنے کے باوجود تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

وہ میرے ساتھ باہر تک آئی۔ "تو کیا تم مجھے ایسے ہی چھوڑ جاؤ گے؟"

"ہاں تو اور کیسے چھوڑ کر جاؤں؟"

"تم مجھے باندھ جاؤ تاکہ مرشد کو کسی حد تک یقین دلا سکوں کہ میں نے اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ تعاون نہیں کیا تھا بلکہ مجبوری میں کیا تھا۔"

"ٹھیک ہے ویسے تمہارے ہاتھ کا نیل بھی یہ بتانے کے لیے کافی ہے۔"

"مرشد جیسے شخص کے لیے کافی نہیں ہے۔"

میں اسے اندر لایا اور اس کے اپنے دوپٹے سے اس کے ہاتھ اور پیر باندھ دیے۔ یہ کام خاصا مشکل تھا کیونکہ دوپٹا بھی ریشمی تھا اور اس کی جلد بھی اس لیے گرہ مضبوطی سے نہیں آ رہی تھی اور میں زیادہ کس کر نہیں باندھنا چاہتا تھا اسے تکلیف ہوتی۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ چکنے کے دوران میں اس کے قریب ہر تو اس کی جسمانی کشش واضح ہونے لگی تھی اور میں گھبرا رہا تھا بہرحال کسی نہ کسی طرح میں نے اسے باندھ ہی دیا۔ میرا ارادہ تھا کہ یہاں سے نکلنے کے بعد کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر مرشد کو کال کر کے بتا دوں گا کہ میں اس کے آدمیوں کو بے بس کر کے نکل آیا ہوں۔ زرین کو باندھ کر میں نے کہا۔ "بس کچھ دیر برداشت کر لو، پھر مرشد کے آدمی آ کر تمہیں آزاد کر دیں گے۔"

"ہو سکتا ہے زندگی کی قید سے ہی آزاد کر دیں۔" اس نے تلخی سے کہا۔ "ویسے بھی مرشد کا دل اب مجھ سے بھر گیا ہے اور ایسا لگ رہا ہے وہ مجھ سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔"

"مرشد جیسے لوگ کسی کا لحاظ نہیں کرتے ہیں۔ اگر اسے تم سے جان چھڑانی ہوتی تو وہ اب تک یہ کام کر چکا ہوتا۔ ویسے میرا نہیں خیال کہ وہ کبھی تمہیں چھوڑنا پسند کرے گا۔"

"کیوں؟" اس نے سادگی سے پوچھا۔

"کیونکہ میں نے دنیا بھر کی عورتیں دیکھی ہیں لیکن تمہاری جیسی خوب صورت عورتیں بہت کم دیکھی ہیں۔ میرا نہیں خیال کہ کوئی شخص تم سے جان چھڑانا چاہے گا، چاہے وہ مرشد جیسا عیاش ہی کیوں نہ ہو۔"

وہ شرمائی تھی اور پھر بولی۔ "لیکن مرشد انسان نہیں ہے جو کسی عورت کی خوب صورتی سے ہمیشہ کے لیے متاثر ہو جائے۔ وہ ایک ایسا درندہ ہے جسے گوشت کھانے سے مطلب ہے اور اس کا دل بہت جلد بھر جاتا ہے۔"

میں نے اس بارے میں اس سے بحث نہیں کی کیونکہ ایک تو بندے کو مرد عورت کے تعلقات کا صرف زبانی کلامی علم تھا اور اس کی باریکیوں کا تو بالکل پتا نہیں تھا دوسرے میں

مرشد کے بارے میں یقیناً اتنا نہیں جانتا تھا جتنا کہ یہ عورت یا لڑکی جانتی تھی۔ میرا کام ہو چکا تھا اس لیے میں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ "مجھے امید ہے مرشد تمہارے ساتھ برا سلوک نہیں کرے گا۔"

"وہ بے وقوف نہیں ہے۔" زرین نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "وہ جان جائے گا کہ میں نے تمہیں کس طرح آزاد کرایا اور اس کے بعد وہ شاید مجھے معاف نہ کرے تم اس کے لیے بہت اہم آدمی ہو۔"

یہ تو میں بھی جانتا تھا کہ میں مرشد کے لیے کتنا اہم تھا اور میرے فرار کے بعد اس کا عتاب یقیناً ان دونوں پر نازل ہوتا۔ خاص طور سے زرین اس کے غصے کا نشان بنتی کیونکہ اسی نے شارق کو آواز دے کر باہر سے بلوایا تھا جس کے بعد میں آزاد ہو گیا۔ میں تذبذب میں پڑ گیا تھا۔ میرے اندر سے کوئی کہہ رہا تھا کہ پہلی فرصت میں یہاں سے نکل بھاگو لیکن دوسری طرف میرا ضمیر اس مجبور اور مظلوم عورت کو اس طرح چھوڑ کر جانے کی اجازت نہیں دے رہا تھا جو بعد میں یقینی طور پر اس کے عتاب کا نشانہ بنتی۔ لیکن میں اسے ساتھ لے کر کہاں پھرتا۔ اچانک مجھے خیال آیا میں اسے عبداللہ والی کوٹھی میں رکھوا سکتا تھا اگر عبداللہ اسے ملازم نہ بھی رکھتا تو اسے کہیں اور ملازمت دلوا سکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اس کی بندشیں کھول دیں۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟"

"میں نے فیصلہ بدل دیا ہے اب تم میرے ساتھ چل رہی ہو، میں کوشش کروں گا کہ تمہیں کہیں نوکر رکھوا دوں۔"

"سچ۔" وہ خوش ہو گئی۔

"ہاں لیکن اس سے آگے میری ذمے داری نہیں ہو گی۔ مرشد سے بچنا بھی تمہارا کام ہو گا۔"

"مجھے منظور ہے ایک بار اس جہنم سے نکل جاؤں تو سب کر لوں گی بس مجھے کھڑے ہونے کے لیے پاؤں بھر زمین چاہیے۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ زیادہ ہی خوش فہم ہو رہی تھی۔ ہمارے معاشرے میں اگر عورت کسی مرشد سے نہ بھی چھپ رہی ہو تب بھی اس کے لیے اکیلے زندگی گزارنا بہت مشکل کام ہے خاص طور سے جب وہ زرین کی طرح بے پناہ حسن بھی رکھتی ہو۔ لیکن یہ سب بعد کے معاملات تھے، ابھی تو یہاں سے نکلنا تھا۔ اسے کھولنے کے بعد میں نے اسے مشورہ دیا۔ "اپنی جو چیزیں لینی ہیں ساتھ لے لو۔"

وہ لپک کر ایک کمرے میں گئی، میں اس کے پیچھے تھا۔ اگرچہ میں نے اس کی مدد کا فیصلہ کیا تھا لیکن ابھی میں اس پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے ایک الماری کھولی اور اس میں موجود سارے کپڑے نکالنا شروع کر دیے۔ میں نے بوکھلا کر کہا۔

"اوہ بی بی یہ کیا کر رہی ہو... بس ضرورت کے چند کپڑے رکھ لو۔"

اس پر جب اس نے ضرورت کے کپڑے نکالنا شروع کیے تو میں نے جھپٹ کر رخ دوسری طرف کر لیا۔ اس نے ایک چھوٹا بیگ نکالا اور اس میں ساری چیزیں بھر لیں۔ اس نے چپل پہن رکھی تھی، میں نے اشارہ کیا۔ "اگر مضبوط جوتے ہیں وہ پہن لو کیونکہ ہمیں پیدل جانا ہو گا۔"

اس نے جوتے نکال کر پہن لیے۔ ہم باہر آئے تو اس نے شارق کے بارے میں پوچھا۔ "اس کا کیا ہو گا؟"

"کیا اسے بھی لے کر چلنا ہے؟" میں بھنا گیا۔

"نہیں..... میں تو ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔" وہ میرے لہجے سے ڈر گئی۔ اس بار میں نے نرمی سے کہا۔

"اسے یہاں کچھ نہیں ہو گا۔ جلد یہاں سے کوئی آ کر اسے نکال لے گا آگے اس کی قسمت کہ مرشد اسے معاف کرتا ہے یا نہیں۔"

شارق کے لیے اس کے دل میں نرم گوشہ تھا اس لیے وہ اس کے بارے میں فکر مند ہو رہی تھی۔ لیکن اس نے مجھ سے دوبارہ نہیں کہا۔ ہم باہر آئے اور ابھی ہم لان میں گیٹ سے دور تھے کہ مجھے سڑک پر ایک بڑی گاڑی مڑتی دکھائی دی۔ خطرے کے احساس کے ساتھ میں نے زرین کی طرف دیکھا تو وہ خود بھی پریشان لگ رہی تھی۔ اس نے میرے سوال کرنے سے پہلے کہا۔ "یہ مرشد کے لوگ ہیں میں اس گاڑی کو پہچانتی ہوں۔"

اب سامنے سے جانا ممکن نہیں رہا تھا اول تو ان کی نظر سے بچ کر نہیں جا سکتے تھے دوسرے سڑک پر پکڑے جانے کا زیادہ امکان تھا۔ "اس جگہ سے نکلنے کا کوئی اور راستہ ہے؟"

"نہیں تین طرف ڈھلان ہے اور اس سے اترنا بہت مشکل کام ہے۔" اس نے انکار کیا۔ لیکن میں اس سے پہلے بھی اس قسم کے مشکل کام کرتا رہا تھا۔ میں نے پہلے گیٹ کو اندر سے بند کیا اور پھر اس کے ساتھ کوٹھی کے عقبی حصے میں آیا۔ یہاں دیوار کے پاس کچھ زمین تھی لیکن اس کے بعد ڈھلان ایسے نیچے گئی تھی کہ بس اللہ ہی اللہ تھا۔ میں نے زرین سے کہا۔ "تم اس ڈھلان سے اتر سکتی ہو؟"

"میں کوشش کرتی ہوں۔" اس نے ڈر کر کہا۔

"بس تو چلو۔" میں نے اس کا بیگ دیوار کے دوسری طرف پھینک دیا اور پھر اسے کمر سے پکڑ کر اوپر اٹھانے کی کوشش کی لیکن اس کی مخملی قمیص اور جلد نے پھسل کر کوشش ناکام بنا دی۔ میں نے خفیف ہو کر گھوڑا بننا منظور کیا اور اس سے کہا۔ "میری کمر پر چڑھ کر دوسری طرف کود جاؤ۔"

وہ دیوار پر چڑھ گئی لیکن دوسری طرف نہیں اتری اسے ڈر لگ رہا تھا میں دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کودا اور پھر سہارا دے کر اسے بھی اتار لیا۔ جب اس نے پہلی بار عملی طور پر اس ڈھلان کو دیکھا تو اترنے سے صاف انکار کر دیا۔ "میں اس سے نہیں جا سکتی۔"

"اگر تم نہیں گئیں تو یہیں رکو میں جا رہا ہوں۔ بعد میں مرشد اور اس کے جلادوں کو جواب دیتی رہنا۔"

مرشد اور اس کے جلادوں کے تصور نے اسے لرزا دیا تھا اور اس کا انکار فوراً اقرار میں بدل گیا۔ "میں چلتی ہوں۔"

"شاباش۔" میں نے اس کا بیگ اٹھا لیا۔ "میرے پیچھے آؤ اور آواز مت نکالنا بے شک کھائی میں بھی گر جاؤ۔"

میں نیچے اترنے لگا۔ یہ ڈھلان دیکھنے میں خطرناک لگ رہی تھی درحقیقت اتنی خطرناک نہیں تھی کیونکہ اس میں پتھر بھی ابھرے ہوئے تھے اور جھاڑیاں بھی تھیں جن کو پکڑ کر آرام سے نیچے اترا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ آسانی تو میرے لیے تھی کیونکہ مجھے اس قسم کی ڈھلانوں پر چڑھنے اور اترنے کا وسیع تجربہ تھا۔ زرین کو اس قسم کا تجربہ نہیں تھا اگرچہ وہ ایک پہاڑی گاؤں کی رہنے والی تھی لیکن اس نے شاید ہی کبھی ایسی ڈھلان پر قدم رکھا ہو اور اس نے فوراً اس کی تصدیق بھی کر دی۔ اس نے کانپتی آواز میں کہا۔

"میں کبھی ایسی پہاڑی سے نہیں اتری۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ "یہ اتنی بھی مشکل نہیں ہے۔"

"لیکن اس نے فوراً پکسل کر میری بات کو غلط ثابت کیا وہ میرے پاس سے ہوتی نیچے جا رہی تھی کہ میں نے اسے پکڑ لیا ورنہ اس کا سفر دو ڈھائی سو فٹ سے پہلے رکنے والا نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے چیخ ضبط کی اور مجھ سے لپٹ کر تھر تھر کانپنا شروع کر دیا۔ "میں... میں نہیں اتر سکتی۔"

"تم اتر سکتی ہو۔" میں نے کہا۔ "اچھا میں تم کو سہارا دیتا ہوں۔"

اب میں خود اترنے کے ساتھ اسے بھی سہارا دے رہا تھا نتیجے میں میری رفتار نصف بھی نہیں تھی۔ بہرحال اب میں کیا کر سکتا تھا، یہ مصیبت میں نے خود گلے لگائی تھی۔ مصیبت صرف گلے لگنے سے مطمئن نہیں تھی بلکہ ذرا سا لڑکھڑاتے ہی وہ پیر تسمہ پا کی طرح مجھ سے چمٹ جاتی تھی اور ہر بار مجھے لاحول ولا قوۃ... کا ورد کرنا پڑتا تھا۔ اسے احساس بھی نہیں تھا لیکن مجھے تو تھا۔ شاید اللہ نے ہر مرد کے اندر عورت کو محسوس کرنے کی ایسی حس رکھی ہے جو موت کے منہ میں بھی کام کرتی رہتی ہے۔ میرے اندر بھی یہ برابر کام کر رہی تھی اور زرین کے ساتھ تو کچھ زیادہ ہی کام کر رہی تھی۔ زرین کا بیگ میرے لیے مشکل کر رہا تھا کیونکہ اس کو لٹکانے والی صرف ایک بیلٹ تھی جس سے اسے شانے سے لٹکایا جا سکتا تھا۔ اگر اس کے پشت پر لٹکانے والے اسٹرپ ہوتے تو میرے لیے بہت آسانی ہو جاتی۔ ایک مشکل جگہ سے اترتے ہوئے زرین لڑکھڑائی تو میں نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی اور بیگ میرے شانے سے پھسل کر نیچے جانے لگا۔ اگر میں اسے روکنے کی کوشش کرتا تو زرین نیچے جاتی اس لیے میں نے بیگ گرنے دیا اور زرین کو پکڑ لیا۔ اس نے فریاد کی۔ "میرا بیگ..."

"شکر کرو بیگ کی جگہ تم نہیں گئیں۔" میں نے کہا۔ بیگ لڑھک کر ایک ایسی جگہ اٹک گیا تھا جہاں سے اسے حاصل کرنا بہت مشکل تھا۔ اس دوران میں دشمن کنارے تک آ گیا۔ ابھی ہم نصف راستے پر تھے یعنی کوئی ڈیڑھ سو فٹ نیچے آئے تھے کہ اوپر سے کسی کے چلانے کی آواز آئی۔ "او مے میدے ادھر تھلے دیکھ۔"

"کتھے تھلے۔" میدے نے چلا کر کہا۔ "اتھے آ کر مرنا اے۔"

"موت تجھے آ رہی ہے کام کرتے ہوئے۔" پہلے والے نے کہا۔ "دیکھ ادھر اپنی بے بے دے یارنوں۔"

زرین نے بلاوجہ لرزنا شروع کر دیا۔ "ان کو پتا چل گیا ہے وہ آ رہے ہیں۔"

"ابھی اوپر ہیں اور ہم ان کو نظر نہیں آ رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن جلدی ازدواگر ان کی نظر پڑ گئی تو وہ پکڑنے کے بجائے اوپر سے گولی مار دیں گے۔"

اس بار ہم ذرا تیزی سے نیچے گئے کیونکہ ڈھلان کسی قدر بہتر ہو گئی تھی اور زرین بھی اب خود اتر رہی تھی۔ اس لیے مزید پانچ منٹ بعد ہم نیچے پہنچ گئے تھے اور اسی لمحے اوپر موجود افراد کی نظر میں آ گئے۔ انہوں نے چلانے کے ساتھ فائرنگ بھی شروع کر دی تھی۔ تین سو فٹ کی دوری کچھ خاص نہیں ہوتی ہے لیکن خوش قسمتی سے ان کے پاس رائفلیں نہیں تھیں۔ ان کے پاس پستول اور شاٹ گن تھیں جن کی مار

ہی نہیں آ رہا تھا اور اس کا سینہ دھکنی کے طرح ہو رہا تھا سلیک جگہ وہ رک گئی۔

"اب... مجھ سے... نہیں... چلا... جا رہا۔" اس نے رک رک کر کہا۔

کیونکہ مجھے عقب میں آنے والوں کا کوئی نشان نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے میں نے رک جانا مناسب سمجھا لیکن کھلی جگہ کے بجائے میں زرین کو ایک جھاڑی کی اوٹ میں لے آیا۔ کچھ دیر میں اس کی سانس بہتر ہوئی تو اس نے کہا۔ "میں تمہارے لیے بھی مصیبت بن گئی ہوں۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔"

"نہیں اگر میں نہ ہوتی تو تم نکل چکے ہوتے۔ تمہاری سانس بالکل ٹھیک ہے اور میرا حال دیکھ رہے ہو۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ میرے بچ نکلنے یا نہ نکلنے کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

میرے جواب سے اس کے چہرے پر رونق آ گئی تھی۔ "یعنی تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے؟"

"ظاہر ہے ورنہ تم کو وہاں سے لے کر کیوں نکلتا میں کوئی فیصلہ کر کے اسے ترک کرنے کا عادی نہیں ہوں۔"

"تم نے یقیناً مرشد کو بہت پریشان کیا ہوا ہے؟"

"یہ تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ وہ میرے پیچھے پاگل ہو جائے گا، جب اسے اطلاع ملے گی کہ میں ایک بار پھر اس کی گرفت سے نکل گیا ہوں۔"

"تم پہلے بھی اس کے ہاتھ آ چکے ہو؟" زرین نے حیرت سے کہا۔

"کئی بار اور ہر بار فرار میں کامیاب رہا۔"

"تم قسمت والے ہو ورنہ میں نے بڑے بڑوں کو مرشد کے سامنے مجبور ہی دیکھا ہے۔ اسی کوٹھی میں اسلام آباد کا ایک بڑا سرکاری افسر بھی قید ہو کر آیا تھا اور وہ مرشد کے سامنے روتا گڑگڑاتا تھا۔ اس نے مرشد کا کوئی کام کرنے سے انکار کر دیا۔ مرشد نے اسے اغوا کروالیا اور وہ اس سے کتے جیسا سلوک کرتا تھا۔ کام تو اس نے کسی اور سے کروالیا تھا لیکن اس افسر کو سزا بھی دی۔"

"اس کا کیا ہوا؟"

"مجھے نہیں معلوم لیکن اسے کوٹھی سے زندہ سلامت ہی لے جایا گیا تھا۔ مجھے کوٹھی سے باہر کی باتوں کا علم نہیں ہوتا ہے۔"

"مرشد پہلے سے زیادہ طاقتور ہو گیا ہے لیکن ایسے لوگوں کے بارے میں میرا ایمان ہے کہ یہ کتنے ہی طاقتور

ہو جائیں۔ ایک پل کی مار ہوتے ہیں۔ وہ پل جوان کی موت کا ہوتا ہے اور جسے یہ کسی صورت ٹال نہیں سکتے۔" میں نے کہتے ہوئے جھاڑی کے باہر کا معائنہ کیا اور یہی چیز کام آ گئی۔ مرشد کے آدمی نیچے آ چکے تھے اور ہمارے رکنے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ خاصے قریب آ گئے تھے۔ میں نے زرین کو جھاڑی کے اندر کھینچ لیا اور سرگوشی میں کہا۔

"کوئی حرکت مت کرنا اور نہ آواز نکالنا وہ قریب آ گئے ہیں۔"

دہشت اور پکڑے جانے کے خوف سے زرین کی بڑی بڑی آنکھیں مزید پھیل گئی تھیں۔ لیکن وہ میری ہدایت کے مطابق ساکت اور خاموش ہو گئی۔ یہ زیادہ بڑی جھاڑی نہیں تھی لیکن اس کے ایک طرف چٹان تھی؛ ہم جھاڑی اور چٹان کے درمیان میں تھے۔ میں نے زرین کو اندر کر دیا اور خود سامنے والے حصے میں تھا اگر کوئی اس طرف آ جاتا اور جھاڑی کے اندر جھانکتا تو میں بلا تامل اسے شوٹ کر دیتا۔ ان کی آوازیں قریب آ گئی تھیں۔

"ادے وہ تو ادھر نہیں ہیں۔" میدے کو پکارنے والے اور مجھے اس کا والد قرار دینے والے نے کہا۔

"اتنی جلدی وہ کہیں نہیں جا سکتے۔" مجھے فاضلی کی آواز آئی تو میرا دل رک گیا۔ عام لوگوں کی بات الگ تھی؛ میں ان سے آسانی سے نمٹ سکتا تھا لیکن فاضلی بہت تیز بندہ تھا اور اس کا مقابلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ میری وجہ سے مرشد نے فوری طور پر اسے روانہ کیا تھا۔ لیکن اسے کیسے اندازہ ہوا کہ میں قید سے نکل گیا ہوں؟ اس سوال کا فوری جواب بھی مل گیا۔ شارق کی آواز آئی۔ "تم لوگوں نے آنے میں دیر کی ورنہ میری کال ملتے ہی چل پڑتے تو اسے نکلنے کا موقع نہ ملتا۔"

"بکواس نہ کر۔" فاضلی نے اسے ڈپٹا۔ "تجھے معلوم ہے کہاں سے آئے ہیں۔ اور تو نواب کا بچہ کیا کر رہا تھا۔ تجھے اس کام کے لیے رکھا گیا تھا؟"

"میرا کیا قصور ہے اگر زرین کو کچھ ہو جاتا تو مرشد بادشاہ نے مجھے نہیں چھوڑنا تھا۔"

"وہ تو اب بھی نہیں چھوڑے گا۔ تجھے معلوم ہے کون بندہ کوٹھی سے فرار ہوا ہے۔ اگر زرین اس کے ساتھ نہ بھاگتی تو مرشد اسے بھی نہیں چھوڑتا۔ بہر حال اب تو تیار ہو جا۔"

میں نے اپنی حماقت پر خود کو دل میں سنائیں۔ مجھے شارق کی بات پر یقین کرنے کے بجائے اس کی تلاشی لینی چاہیے تھی۔ اس کے پاس موبائل فون تھا اور اس نے مرشد کو اطلاع دے دی۔ وہ صحیح کہہ رہا تھا۔ فاضلی اور اس کے ساتھی دیر سے آئے تھے کیونکہ اسے کمرے میں بند کرنے کے بعد بھی میں کوئی پون گھنٹا کوٹھی میں رہا تھا۔ لیکن میری قسمت اچھی تھی ورنہ میں دوبارہ وہیں پکڑا جاتا۔ اب بھی صورت حال اچھی نہیں تھی۔ آس پاس دشمن پھیلے ہوئے تھے اور وہ جھاڑیوں کی تلاشی لے رہے تھے۔ لیکن ان کا زور دوسری طرف ڈھلان پر واقع جھاڑیوں کی طرف تھا اس طرف اتفاق سے یہ ایک ہی بڑی جھاڑی تھی اس لیے ان کے خیال میں ہم یہاں چھپنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ ہم نے کوشش بھی نہیں کی تھی۔ ہم تو یہاں ستانے کے لیے رکے تھے۔ فاضلی اور شارق کو اتنے قریب پا کر زرین کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ وہ چٹان اور میرے درمیان سمٹی جا رہی تھی۔ میں نے پستول بالکل تیار کر لیا تھا، اگر ان میں سے کوئی اس جھاڑی کی طرف آتا تو فوراً آن جہانی بنا دیتا۔ مجھے فاضلی کو مار کر زیادہ خوشی ہوتی۔ اس نے عتیق کو مارنے کی کوشش کی تھی اور مرشد کے آدمیوں میں وہ مجھے سب سے زیادہ خطرناک لگا تھا۔ اگرچہ فتح خان اس سے زیادہ خطرناک تھا لیکن وہ مرشد علی کا خاص آدمی نہیں تھا بس اس کے لیے کام کرتا تھا اور فاضلی اسی کے لیے کام کرتا تھا۔ ایسے شخص سے جلد از جلد چھٹکارا ہی ٹھیک تھا۔

لیکن ان دونوں یا میری قضا نہیں آئی تھی اس لیے وہ وہاں سے ہٹ کر آگے جانے لگے۔ ان کے ساتھ کم سے کم نصف درجن افراد تھے۔ اتنے لوگوں سے مقابلہ نہایت دشوار تھا وہ بھی صرف ایک پستول کے ساتھ۔ اس لیے میری کوشش تھی کہ ایسی نوبت نہ آئے۔ مگر ساتھ ہی مجھے یقین تھا کہ وہ اس جھاڑی کی تلاشی بھی ضرور لیں گے۔ زرین پشت سے مجھ سے اس طرح چپکی ہوئی تھی کہ جیکٹ کے باوجود میں اس کے وجود کی نرمی اور لطافت محسوس کر رہا تھا۔ اس میں نہ اس کا قصور تھا اور نہ میرا کیونکہ یہاں جگہ ہی اتنی تھی۔ پھر اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"مجھے لگ رہا ہے ادھر چٹان میں خلا ہے۔"

"کہاں؟" میں نے سر گھما کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن جھاڑی کے اس حصے میں روشنی نہ ہونے کی وجہ سے مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"میرا ہاتھ چلا گیا تھا اس خلا میں۔" اس نے وضاحت کی۔ "شکر ہے میری چیخ نہیں نکلی۔"

خواتین کو بلاوجہ بھی چیخ مارنے کی عادت ہوتی ہے اور وہ بھی ایک خاتون تھی۔ میں نے اسے ایک طرف کرنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں جھاڑی ہلنے لگی اور میں یک دم ساکت ہو گیا۔ جھاڑی ہلانے کا مطلب آپریشن بھی ناکام

دوسرے فوراً متوجہ ہو جاتے۔ میں نے اس سے کہا۔ "تم پیچھے ہو کر اس خلا کا جائزہ لو۔"

"نہیں۔" اس نے منمنا کر کہا۔ "اس میں کوئی کیڑا یا چوہا ہوگا۔"

"تو وہ تمہیں کھا نہیں جائے گا۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ "مجھے جانے کے لیے تم پر سے گزرنا پڑے گا اور اس دوران میں جھاڑی ہلی تو ان لوگوں کو پتا چل جائے گا اور وہ ہمیں گولی مار دیں گے۔"

"تم مجھ پر سے گزر جاؤ۔" اس نے اجازت دے ہی۔ مجبوراً مجھے اس پر سے جانا پڑا تھا۔ یہ بڑا صبر آزما مرحلہ تھا کیونکہ ایک طرف مجھے جھاڑی کو ہلنے سے بچانا تھا تو دوسری طرف اس کے نرم و نازک جسم کو اپنے اور چٹان کے بیچ میں پسنے سے بھی محفوظ رکھنا تھا لیکن میری اولین ترجیح جھاڑی سے بچنا تھا اس لیے سارا تاسف اسے برداشت کرنا پڑا۔ وہ صبر سے برداشت بھی کر رہی تھی لیکن بعض نازک مقامات پر اس کی ہلکی سی کراہ بھی نکل جاتی تھی۔ خدا خدا کر کے میں اس پر سے گزر کر چٹان کے دوسری طرف پہنچا اور اس خلا میں جھانکا تو پہلے مجھے مایوسی ہوئی تھی؛ یہ اتنا چھوٹا لگ رہا تھا کہ اس میں میں تو کیا شاید زرین بھی نہیں جا سکتی تھی۔ پھر میں نے سوچا کہ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے میں جسم کو توڑ مروڑ کر اس خلا میں داخل ہوا۔ جسم دیواروں میں بری طرح پھنس رہا تھا، رگڑ سے کپڑے پھٹ رہے تھے اور جہاں جسم تھا اس کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ خلا تنگ تھا لیکن اس میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ میں نے ممکن حد تک اندر ہو کر زرین کو آواز دی۔

"تم بھی آ جاؤ لیکن بہت تنگ جگہ ہے۔"

وہ آئی اور میری نسبت وہ آسانی سے اس خلا میں سما گئی۔ ایک تو اس کا جسم چھریرا تھا دوسرے اس میں لچک زیادہ تھی۔ چٹان میں یہ سوراخ صدیوں سے جاری موسمی تغیرات کی وجہ سے ہوا تھا۔ سردی، گرمی، بارش اور کبھی کبھی کی برف باری سے چٹان پھیل اور سکڑ کر ٹوٹتی رہی اور بالآخر اس میں خلا بن گیا جو وقت کے ساتھ ساتھ چوڑا ہوتا چلا گیا تھا۔ فطری علاقوں میں سانپ اور چٹانوں کے اس قسم کے سوراخوں میں چھوٹے جانور کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے یہاں پر بھی تھے۔ کچھ دیر بعد زرین نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔

"میرے پاؤں پر کچھ چل رہا ہے۔"

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا اور تسلی دی۔ "لال بیگ ہوگا۔"

میری توقع کے عین مطابق اس نے چیخ مارنے کی کوشش کی لیکن میں پہلے ہی ہاتھ رکھ چکا تھا۔ خواتین کی دنیا میں لال بیگ، چھپکلی اور چوہے سے بڑا درندہ کوئی نہیں ہے۔ میں نے بڑی بڑی بہادر خواتین کو جو اپنے مجازی خدا سے بھی نہیں ڈرتی ہیں ان کو دہشت سے تھر تھر کانپتے دیکھا ہے۔ زرین بھی مچل رہی تھی اور اگر میں اس کا منہ چھوڑ دیتا تو وہ چیخیں مار کر سب کو بلا لیتی۔ یقیناً لال بیگ کے علاوہ بھی اس کے جسم پر مزید کیڑے مکوڑے چل رہے ہوں گے جو میرے جسم پر بھی چل رہے تھے۔ خلا تنگ ہونے کی وجہ سے میرا اس کے منہ پر جما ہاتھ کہنی سے ایک نامناسب مقام پر ٹکا ہوا تھا اور میں شرمندہ ہو رہا تھا اسے اس کا ہوش بھی نہیں تھا کہ میری کہنی کہاں ہے۔

میرے کان باہر سے آتی آوازوں پر لگے تھے اور اب اس جھاڑی کی باری آ گئی تھی۔ وہ لوگ اسے کھنگال رہے تھے۔ یہ میدے اور شیدے قسم کے لفنگے تھے جو کام کم کر رہے تھے اور ان کی زبان زیادہ چل رہی تھی اور جو گفتگو وہ اس وقت کر رہے تھے اس کا ایک لفظ بھی اشاعت کے قابل نہیں۔ وہ ذہنی طور پر دیوالیا لوگ تھے۔ میرا غصے سے برا حال تھا کیونکہ میرے ساتھ ایک عورت بھی..... یہ سب سن رہی تھی اور بات بھی اس کے بارے میں تھی۔ کاش کہ میں اکیلا ہوتا تو ان کی زبانیں کھینچ لیتا۔ زرین بھی کیڑے مکوڑوں کا خوف بھول گئی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر وہ دونوں اپنے اندر کی غلاظت باہر نکالتے رہے۔ جب وہ دفع ہوئے تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ زرین رو رہی تھی۔ میں نے ہاتھ اس کے منہ سے ہٹا لیا۔

"مجھے افسوس ہے۔"

"تمہیں کیوں افسوس ہے۔" اس نے تلخی سے کہا۔ "میں ہوں ہی اس قابل..."

"فضول باتیں نہ کرو اگر تم اس قابل ہوتیں تو کیا میں تمہیں لیے پھر رہا ہوتا۔ میں نے تم میں کچھ دیکھا ہے تب ہی اپنی جان کی پروا کیے بغیر تمہیں ساتھ لیا ہے۔ یہ بھونکنے والے کتے ہیں ان کی پروا کرو گی تو زندگی حرام ہو جائے گی۔" میں نے کسی قدر برہمی سے کہا۔

"سچ کہہ رہے ہو، کیا تمہارے نزدیک میں اچھی عورت ہوں؟"

"اتنی ہی اچھی جتنی کہ وہ عورت ہو سکتی ہے جسے سوائے اس کے باپ، بھائی اور شوہر کے کسی نے نہ دیکھا ہو۔ تمہارے ساتھ جو ہوا اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔ اگر پاگل کتا آدمی کو کاٹ لے تو قصور آدمی کا ہوتا ہے یا کتے کا۔"

میری باتوں سے اس کی اعصابی کشیدگی کم ہونے لگی تھی اور ان حرامزادوں کی باتیں سن کر وہ ہسٹریا کے قریب پہنچ گئی تھی اور اگر وہ کچھ دیر اور یہاں رہتے تو شاید اسے دورہ پڑ جاتا۔ لیکن اب یہ ہسٹریا اشکوں میں ڈھل کر بہنا کسی شور کے نکل رہا تھا۔ وہ میرے شانے سے سر ٹکائے بے آواز روتی رہی اور میں دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتا رہا کہ اس نے مجھے توفیق دی کہ میں ایک عورت کو ظلم اور ناانصافی کے ماحول سے نکال سکوں۔ ہم کوئی نصف گھنٹا اس چٹانی خلا میں رہے تھے اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ فاضلی اور اس کی پارٹی دفع ہو گئی ہے تو میں نے پہلے زرین کو نکلنے کو کہا۔ وہ آرام سے نکل گئی۔ اصل مشکل مجھے پیش آئی تھی۔ میری جیکٹ دو جگہ سے پھٹ گئی اور جسم پر کئی خراشیں آ گئی تھیں۔ زرین کو کم رگڑ کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن حالت اس کی بھی زیادہ اچھی نہیں تھی۔ اس کا سویٹر اور شانے رسے میں پھٹ گئی تھی۔ ایک کہنی سے خون جھلک رہا تھا۔ ابھی ہم جھاڑی میں ہی تھے میں نے زرین سے کہا۔ ''تم یہیں رکو میں ذرا باہر کا جائزہ لے لوں۔ اگر کوئی ایسی بات ہوئی تو میں ان لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے دور نکل جاؤں گا اور اگر میں تم سے بچھڑ جاؤں تو تم اسلام آباد والے بس پر پہنچ جاؤ گی؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''کوشش کروں گی۔ کیا تم مجھے چھوڑ جاؤ گے؟''

''نہیں میں احتیاطاً کہہ رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور پھر اسے عبداللہ کی کوٹھی کا پتا یاد کرایا۔ جب اس نے ذہن نشین کر لیا تو میں نے اس سے کہا۔

''تم شہر پہنچنے کے بعد کسی بھی ٹیکسی یا رکشے میں بیٹھ کر یہاں پہنچ سکتی ہو تمہیں صرف پتا بتانا پڑا۔''

''لیکن میرے پاس رقم نہیں ہے۔''

''اس کی فکر مت کرو۔ وہاں پہنچ کر تم صرف میرا نام لو گی۔ میں ہوں یا نہ ہوں تمہیں وہاں پناہ مل جائے گی۔''

''کیا ہے تم مجھے چھوڑ کر بھاگنے کی سوچ رہے ہو؟'' وہ رونے والے لہجے میں بولی۔

''نہیں بابا میں حفظِ ماتقدم کے طور پر کہہ رہا ہوں۔''

''کیا کس کا کہہ رہے ہو؟'' اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

''احتیاطاً۔'' میں نے مختصراً کہا اور جھاڑی سے باہر نکل آیا۔ سورج خاصا بلند ہو گیا تھا اور اس کی روشنی میں دور تک صاف نظر آ رہا تھا۔ اگر کوئی اس جگہ... کہیں سے چھپ کر نگرانی کر رہا تھا تو میں کہہ نہیں سکتا تھا لیکن سامنے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ جگہ دو پہاڑوں کے درمیان ایک کسی قدر چوڑی گھاٹی کی صورت میں تھی۔ آگے جا کر یہ ایک پہاڑی ڈھلان پر ختم ہو رہی تھی جس کے پار میرے اندازے کے مطابق مری شاہراہ کو ہونا چاہیے تھا اور اگر وہ وہاں نہ بھی ہوتی تو ہمیں اس جگہ سے تو نکلنا تھا۔ ہم جتنا مرشد علی کی کوٹھی سے دور جاتے اتنا ہی محفوظ ہو جاتے۔ میں نے اسے آواز دی۔

''باہر آ جاؤ۔''

زرین باہر آئی اور ہم تیزی سے آگے روانہ ہو گئے۔ اتنی دیر کے آرام نے اسے تازہ دم کر دیا تھا۔ اس لیے وہ پوری طرح میرا ساتھ دے رہی تھی۔ میں تیز قدمی کر رہا تھا اور اسے میرا ساتھ دینے کے لیے بھاگنا پڑ رہا تھا۔ مگر وہ احتجاج کیے بغیر بھاگ رہی تھی۔ اسے معلوم تھا اس زحمت سے وہ مستقل طور پر ایک بڑے عذاب سے بچ جائے گی جو مرشد کی صورت میں اس کی زندگی پر مسلط تھا۔ ہم کوئی نصف گھنٹے تک بھاگتے رہے اور اس کے بعد زرین کی ہمت جواب دے گئی اور وہ ہانپتے ہوئے رک گئی۔

''مجھے کچھ دیر سانس لینے دو۔''

''لے لو لیکن ہم پانچ چھ منٹ سے زیادہ نہیں رک سکتے۔''

زرین کا جسم اس دوران میں نیون ہو گیا تھا اور وہ پہلے سے بہتر لگ رہی تھی۔ اس بار اس کا سانس بھی جلد معمول پر آ گیا اور ہم نے دوبارہ سفر شروع کر دیا۔ اس بار ہم سامنے نظر آنے والی چوٹی کے دوسری طرف اترنے والی ڈھلان پر رکے تھے۔ یہاں سے مارگلہ کی پہاڑیاں دور تک پھیلی نظر آ رہی تھیں لیکن مری ہائی وے نظر نہیں آئی شاید وہ مزید کسی پہاڑی کے دوسری طرف تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ سلسلہ پیر سہاوا کی طرف جاتا تھا لیکن ہم اتنا طویل سفر نہیں کر سکتے تھے۔ شہر تک رسائی کے لیے سب سے قریبی راستہ مری ہائی وے ہی تھا۔ لیکن مجھے خدشہ تھا کہ مری ہائی وے پر مرشد کے آدمی ہماری تاک میں ہوں گے اور ممکن ہے پولیس کو بھی ہمارے بارے میں بتا دیا گیا ہو۔ اس صورت میں مری ہائی وے کی طرف جانا خطرے سے خالی نہیں تھا اور جاننا بھی ضروری تھا۔

''سڑک یہاں ہے؟'' زرین ایک اور پہاڑی کو دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

''میرا خیال ہے اس پہاڑی کے پار ہے۔''

''یعنی ایک پہاڑی اور...'' وہ کراہی۔ اس نے اپنا پھٹا سویٹر کسی طرح اوپر کر لیا تھا۔

''جانا تو ہے ورنہ تم جانتی ہو ان پہاڑوں میں رات ہو

گئی تو کل صبح ہماری لاشیں ملیں گی اکڑی ہوئی۔"

"تم صحیح کہہ رہے ہو۔" اس نے جھرجھری لی۔ "رات کو بہت زیادہ سردی ہو جاتی ہے۔"

"اس لیے چلنا شروع کر دو تاکہ رات سے پہلے کسی جگہ پہنچ جائیں۔" میں نے کہا اور ڈھلان سے اترنا شروع کر دیا۔ وہ میرے پیچھے آ رہی تھی۔ اب وہ ان راستوں کی عادی ہو چلی تھی اور آسانی سے چل رہی تھی۔ مجھے صرف مشکل مقامات پر اسے سہارا دینا پڑتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ خود میرے لیے مشکل مقام یہی ہوتا تھا۔ مسلسل سفر نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ اس کے باوجود اس کی کشش میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ میں کوشش کرتا تھا کہ اس سے قریب جانے سے گریز کروں لیکن اس سفر میں ایسا ممکن نہیں تھا۔ دوپہر تک ہم ڈھلان سے اتر آئے تھے اور اگلی پہاڑی کی ڈھلان چڑھ رہے تھے۔ پھر مجھے ایک نالا سا نظر آیا جس نے پہاڑ کو کاٹ کر اپنا راستہ بنا لیا تھا اور اس سے گزر کر ہم آسانی سے دوسری طرف جا سکتے۔ میں نے اس کے بارے میں بتایا تو زرین خوش ہو گئی تھی کیونکہ اس کو پیاس سے اس کی جان جا رہی تھی لیکن نالے میں جانے کا فیصلہ سوچ سمجھ کر کرنا تھا کیونکہ ایسا ممکن تھا آگے کہیں یہ بند ملے اور ہمیں پلٹ کر واپس آنا پڑے۔ مگر زرین کی حالت کے پیش نظر میں نے نالے کا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا رخ بتا رہا تھا کہ کہیں نہ کہیں سے یہ مری بائی وے کے نیچے سے گزرے گا۔ موسم خشک ہونے کی وجہ سے نالے میں پانی نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس لیے اس میں سفر کرنا مشکل نہیں تھا۔ ہم اس میں اترے تو یک دم ہی آس پاس کے سارے مناظر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ یعنی اب ہم بھی دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے، اگر کوئی دیکھ رہا تھا۔ نالا شارٹ کٹ نہیں تھا کیونکہ یہ بہت گھوم پھر کر جا رہا تھا۔ لیکن اس میں ہم نسبتاً آسانی سے سفر کر سکتے تھے۔ البتہ جہاں کہیں پتھر تھے وہاں ذرا مشکل آ رہی تھی لیکن نالے کے کنارے ریتیلے تھے اور اس میں سفر کرنا کوہ پیمائی کرنے کی نسبت آسان ہی تھا۔ جہاں کہیں نالے کی گہرائی زیادہ تھی وہاں پانی جمع تھا اور ہم نے اس سے اپنی پیاس بجھائی۔ سرد موسم کے باوجود اتنی مشقت کرنے سے پیاس لگنا لازمی تھی۔

ہمیں چلتے ہوئے دو گھنٹے ہو گئے تھے اور سورج سر پر سے گزر کر اب مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ زرین ایک بار پھر تھکنے لگی اور اس نے میری طرف دیکھا۔ "اب مجھ سے مزید نہیں چلا جا رہا ہے۔"

"ہمت کرو ہمیں شام سے پہلے پہلے اس نالے سے نکلنا ہے ورنہ اس میں رات ہو گئی تو سوچو سردی سے کیا حال ہو گا۔"

"کچھ دیر تو رک جاؤ۔" اس نے التجا کی تو میں نے سر ہلایا اور ایک طرف نالے کے اندر اگے درخت کے تنے سے ٹیک گیا۔ وہ سامنے دھوپ میں ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ وقت گزاری کے لیے وہ مجھ سے میرے بارے میں پوچھنے لگی اور میں حتی الامکان جھوٹ بولے بغیر اس کے سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ کوئی نصف گھنٹے بعد میں نے اسے اٹھا دیا۔ اس نے کہا۔ "ابھی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔"

درحقیقت یہ مشکل سفر اس کے لیے بہت زیادہ مشکل تھا۔ وہ نازک اندام عورت تھی جسے اب مشقت کرنے کی عادت بھی نہیں رہی تھی۔ درویش سے وہ مرشد کی کوٹھی میں پرآسائش اور آرام کی زندگی گزارتی رہی ہے۔ اس لیے یہ اچانک مشقت کچھ زیادہ ہی سخت ثابت ہوئی تھی۔ مجھے اس پر ترس آ رہا تھا لیکن میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "بس بہت آرام ہو گیا۔ اب چلو ہمیں رات سے پہلے کسی ٹھکانے پر پہنچنا ہے۔"

وہ بادل ناخواستہ چلنے لگی۔ اس کا انداز خود کو گھسیٹنے والا تھا۔ میں نے سہارا دینے کے لیے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ شاید میرے سخت لہجے پر ہوا تھا۔ پر میں انجان بنا چلتا رہا۔ کم سے کم اس طرح وہ چل تو رہی تھی۔ اگر میں اس سے نرمی سے بات کرتا تو وہ پھر بیٹھ جاتی۔ شام تیزی سے قریب آ رہی تھی۔ دسمبر کے آخر میں اس علاقے میں سورج پانچ بجے ہی ڈوب جاتا ہے۔ پہاڑوں میں رات اور بھی پہلے اتر آتی ہے۔ کوٹھی میں مجھے موبائل لینے کا خیال نہیں آیا تھا ورنہ اس سے وقت دیکھا جا سکتا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس وقت چار بج رہے تھے۔ نالے کے اندر سے روشنی غائب ہو چکی تھی اور جہاں دونوں طرف سے جھاڑیاں جھکی ہوئی تھیں وہاں تو تاریکی آ چکی تھی۔ یہ نالا شیطان کی آنت کی طرح چلا جا رہا تھا اور اب تک نہ تو کوئی پل آیا تھا اور نہ آس پاس کوئی آبادی محسوس ہوئی تھی۔ زرین نے خاصی دیر بعد کہا۔ "یہ نالا کب ختم ہو گا؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ تم قریبی گاؤں کی سوچو جہاں زیادہ پتا ہونا چاہیے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"میں کبھی ادھر نہیں آئی۔"

میں اب نالے سے نکلنے کا سوچ رہا تھا کیونکہ اس میں ہم بالکل اندھے تھے اور پھر باہر پھیلتی تاریکی کا اثر اندر نہیں زیادہ تھا اور صاف لگ رہا تھا کچھ دیر میں نالا اندھیرے میں

ڈوب جائے گا اور ہم اس میں ٹھوکریں کھاتے پھریں گے۔

"میرا خیال ہے ہمیں نالے سے نکلنا چاہیے۔"

وہ خوش ہو گئی۔ "یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ یہاں سے نکلیں گے تو کوئی راستہ نظر آئے گا۔"

ایک نسبتاً کم ترچھی ڈھلان ہے میں پہلے خود اوپر چڑھا اور پھر زرین کو ہاتھ سے پکڑ کر اوپر کھینچ لیا۔ وہ حیران ہوئی تھی۔ "تم تھکے ہوئے ہو لیکن کتنی آسانی سے مجھے اوپر کھینچ لیا۔"

"اتنا نہیں تھکا ہوں کیونکہ گزشتہ کچھ عرصے سے زندگی اسی طرح بھاگ دوڑ میں گزر رہی ہے، اب میں عادی ہو گیا ہوں۔" میں نے بے پروائی سے کہا اور آس پاس دیکھا۔ ہم نہ جانے کہاں نکل آئے تھے۔ یہاں چھوٹے بڑے ٹیلے تھے جن کے درمیان سے نالا گھومتا ہوا جا رہا تھا اور دور پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ مری شاہراہ مغرب کی طرف ہونی چاہیے تھی۔ میں نے ڈوبتے سورج کی طرف اشارہ کیا۔ "ہمیں اس طرف جانا ہو گا۔"

خوش قسمتی سے ہم مغرب والی سمت نالے سے باہر آئے تھے ورنہ ہمیں ایک بار پھر نالے میں اتر کر اسے کراس کرنا پڑتا۔ زرین کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ خود میری حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ مگر میں نے اس سے سچ کہا تھا۔ اب میں ایسے حالات کا عادی ہو گیا تھا۔ میں جلد از جلد کسی ایسی جگہ پہنچ جانا چاہتا تھا جہاں میں عبداللہ سے رابطہ کر سکتا اور اسے معلوم ہو جاتا کہ میں مرشد کی قید سے نکل آیا ہوں اور وہ فتح خان کو اس کے حوالے نہ کرے۔ اول تو مجھے یقین تھا کہ عبداللہ ایسی حماقت نہیں کرے گا جب تک وہ اس کی تصدیق نہیں کر لے گا کہ میں قید میں ہوں یا نہیں اور دوسرے وہ اپنی صوابدید پر فتح خان کو نہیں چھوڑ سکتا تھا جب تک میں یارا جا عمر دراز سے واضح حکم نہ دیں۔ پھر بھی میں اس سے رابطہ کر لینا چاہتا تھا۔ زرین کچھ دیر بعد رک گئی۔ اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔

"اب نہیں چلا جا رہا مجھے لگ رہا ہے میں گر جاؤں گی۔"

سورج غروب ہو چکا تھا اور تاریکی تیزی سے چھا رہی تھی۔ ہم بالکل نہیں رک سکتے تھے۔ مجبوراً میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے سہارا دیا۔ میں اس سے جتنا دور رہنا چاہ رہا تھا قدرت مجھے اتنا ہی پاس لا رہی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ میں اس کی کشش کا اسیر ہو گیا تھا اور اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے جب سے اس کی کشش کو محسوس کیا تھا میں اس سے دور رہنے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ میں بندہ بشر ہوں اور میں نے کبھی اس معاملے میں بے پروائی نہیں کی۔ کیونکہ عورت کے معاملے میں انسان اسی وقت ٹھوکر کھاتا ہے جب وہ اس کی طرف سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ اس کے لمس سے ایک لمحے کو میرا وجود سنسنا اٹھا تھا۔ شاید اس کی نسوانی حس نے اسے میرے احساسات سے آگاہ کر دیا تھا اس نے آہستہ سے کہا۔ "شہباز تم بہت اچھے انسان ہو۔"

"نہیں میں صرف انسان ہوں اور انسان خطا کا پتلا ہے۔"

"نہیں تم اچھے انسان ہو۔" اس نے اصرار کیا۔ "اتنی دیر سے میں تمہارے ساتھ ہوں اور تم نے مجھے چھوا بھی ہے لیکن ایک بار بھی تم نے مجھے غلط نظروں سے نہیں دیکھا۔"

"ایسا نہیں ہے، میں نے تمہیں پسند کی نظر سے تو دیکھا ہے۔" میں نے شرارت سے کہا۔ وہ شرما گئی۔

"مجھے معلوم ہے کوئی شخص مجھے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھ ہی نہیں سکتا۔" اس کے لہجے میں یقین آ گیا۔ اسے اپنی خوب صورتی کا خوب علم تھا۔ "تم نے مجھے پسند کی نظر سے ضرور دیکھا ہے لیکن اس مردانہ نظر سے نہیں دیکھا جو صرف عورت کا جسم دیکھتی ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" میں نے کہا۔ "میرے پاس وہ نظر ہے بھی نہیں..... نہیں میں شاید غلط کہہ گیا ہوں۔ وہ نظر تو ہر مرد کے پاس ہوتی ہے لیکن شریف مرد کے پاس صرف ایک عورت کے لیے ہوتی ہے جو اس کی بیوی ہوتی ہے اور بدمعاش کے پاس ہر عورت کے لیے ہوتی ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں تم ایک اچھے انسان ہو۔"

اگرچہ میری اس قسم کی گفتگو سے ذرا کوفت ہوتی ہے لیکن زرین کو یہ گفتگو اچھی لگ رہی تھی اور اس کا مورال بڑھانے کے لیے میں اس سے بات کر رہا تھا۔ اس کا اچھا اثر نکلا بہت سارا راستہ ان ہی باتوں میں گزر گیا اور اس دوران میں تاریکی چھا گئی۔ اسی لحاظ سے سردی کی شدت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا مگر اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ہمیں سڑک مل گئی۔ نظر نہ آنے کے باوجود اس سے گزرنے والی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس کا انعکاس بتا رہا تھا کہ سڑک کس طرف ہے۔ میں نے زرین کو اس بارے میں بتایا تو وہ باتیں بھول کر سڑک تک جانے کے لیے بے تاب ہو گئی تھی۔ ہمارے قدم تیز ہو گئے۔ سڑک تک پہنچنے کی بے تابی اور پھر تاریکی نے ہمیں زمین کی طرف سے بے پروا کر دیا تھا۔ اس بے پروائی کا خمیازہ مجھے بھگتنا پڑا تھا۔ چلتے ہوئے میرا پاؤں کسی چیز میں گیا اور گھٹ کی آواز کے ساتھ مجھے لگا جیسے میرا پاؤں کسی مگر مچھ

کے جبڑے میں آ گیا ہو۔ ہلکی سی چیخ کے ساتھ میں نے پاؤں چھڑانے کی کوشش کی اور سنبھلتے سنبھلتے بھی نیچے گر گیا۔ زرین نے چیخ ماری۔

''شہباز کیا ہوا؟''

میں اس چیز کو ٹٹول رہا تھا اور میرے بدترین خدشات درست ثابت ہو رہے تھے۔ میرے پاؤں کو ایک شکنجے نے جکڑ لیا تھا۔ اس کا فولادی جبڑا میرے پاؤں کو ٹخنے سے ذرا اوپر سے پکڑے ہوئے تھا اور اس کے دندانے میرے پاؤں میں اتر گئے تھے۔ اس سے خون رس رہا تھا۔ مجھے ہڈی کا تو نہیں معلوم تھا لیکن تکلیف شدت کی تھی۔ زرین نیچے بیٹھ کر ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھ رہی تھی۔ اس نے دہشت زدہ ہو کر پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''شکاری پھندا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ چابی سے کھلتا ہے۔''

''چابی کہاں ہے؟'' اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

''اس کے پاس جس نے ..... اسے لگایا ہے۔'' میں نے تکلیف برداشت کرتے ہوئے کہا۔ ''زرین سڑک کچھ دور ہے تم جا کر مدد لا سکتی ہو۔''

''میں اکیلے.....'' وہ ڈر گئی تھی۔

''ہاں تو کیا لشکر بھیجوں تمہارے ساتھ۔'' میں جھنجلا گیا تھا۔ اصل میں یہ حادثہ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ کچھ دیر کے لیے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ شاید اس وجہ سے بھی میں زرین سے سخت لہجے میں بات کر گیا تھا۔ وہ ایک لمحے کو چپ ہوئی پھر کھڑی ہو گئی۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو میں نے احمقانہ بات کی تھی۔ میں جا کر کسی کو مدد کے لیے لاتی ہوں۔''

''لیکن احتیاط سے کوئی اور مسئلہ نہ بن جانے۔'' میں نے اسے سمجھایا اور وہ سمجھ کر سختی سے بولی۔

''میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے کیونکہ میرے پاس گنوانے کو کچھ بھی نہیں ہے۔''

اس سے پہلے میں اسے کچھ کہتا وہ سڑک کی طرف بڑھ گئی۔ میں موسم کی مناسبت سے ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اتنی دیر میرے ساتھ رہ کر وہ مجھ سے اینچ ہو گئی تھی اس لیے زور دکھا رہی تھی۔ سڑک یہاں سے پاس تھی لیکن نظر نہیں آ رہی تھی البتہ اب گاڑیوں کی روشنیوں کے ساتھ ان کی آوازیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے ٹٹول کر پھندے کا جائزہ لیا۔ اس علاقے میں لومڑیاں اور گیدڑ عام ملتے ہیں اور مقامی لوگ ان کی کھال کے چکر میں اس قسم کے پھندے ان جگہوں پر لگا دیتے ہیں جہاں ان جانوروں کا گزر ہوتا ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ پھندا ایسی جگہ نہ ہو جہاں سے انسانوں کا گزر ہوتا ہے۔ یہ جگہ بھی ایسی ہی تھی یہاں سے لوگوں کا گزر نہیں تھا بس میں شامت کا مارا یہاں سے گزرا اور اس مصیبت میں پھنس گیا۔ پھندا وزنی نہیں تھا شاید دو کلو گرام کا ہو گا لیکن یہ زنجیر کے ساتھ زمین سے منسلک تھا اور میں اس زنجیر کو نہیں نکال سکتا تھا۔

زرین سڑک کی طرف چلی گئی تھی کیونکہ اس کا ہیولا نظر آنا بند ہو گیا تھا۔ مجھے خدشہ ستانے لگا۔ زرین غیر معمولی حسین تھی اور اس ویرانے میں وہ کسی اوباش کو روک لیتی اور اس کی نیت زرین پر خراب ہو جاتی تو یہ نیا مسئلہ بن جاتا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کاش میں اسے پستول دے دیتا۔ اگرچہ اسے چلانا نہیں آتا تھا۔ البتہ اس کی زرین کے ہاتھ میں موجودگی بڑے بڑوں کو نیت کی خرابی سے باز رکھ سکتی تھی۔ مگر اب وہ جا چکی تھی اور میں اسے آواز دے کر بھی نہیں بلا سکتا تھا۔

کبھی کبھی انسان کچھ سوچتا ہے اور وہ ہو جاتا ہے۔ ابھی مجھے خیال آیا تھا کہ سڑک کی طرف سے زرین کی چیخ سنائی دی۔ چیخ نسوانی تھی اس لیے میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ زرین کی چیخ ہے۔ میں نے چلا کر پوچھا۔ ''زرین کیا ہوا ہے؟''

جواب میں اس کی دوسری چیخ سنائی دی اور اس کے چند لمحے بعد اس کا ہیولا نمودار ہوا وہ تاریکی اور نا ہموار زمین کی پروا کیے بغیر دوڑتی چلی آ رہی تھی۔ پھر اس کے پیچھے دو مردانہ ہیولے نمودار ہوئے۔ میں نے پستول نکال لیا اور ان کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ زرین کے بالکل پیچھے تھے اور اگر میں گولی چلاتا تو زرین کو لگنے کا امکان تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے ڈری ڈری آوازیں نکال رہی تھی جبکہ اس کے پیچھے آنے والے اسے رکنے کو کہہ رہے تھے۔ ان کا انداز ڈرانے والا تھا۔ وہ اسے روکنا چاہ رہے تھے۔ زرین ان سے آگے تھی اور اس کی رفتار بھی خوف نے تیز کر دی تھی۔ اس کے پیچھے آنے والے اس سے ..... تھے اور شاید مست بھی تھے لیکن زرین کی بدقسمتی کہ اس کا پاؤں کہیں اٹکا اور وہ قلابازی کھا کر گری۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتی یا میں اس کے تعاقب میں آنے والوں پر گولی چلاتا انہوں نے زرین کو چھاپ لیا تھا۔ اس نے چیخ ماری۔

''چھوڑو مجھے۔''

''ایسے کیسے چھوڑ دیں تجھے۔'' ان میں سے ایک بولا۔

لہجے سے وہ نشے میں لگ رہا تھا۔ ''کتنے دنوں بعد تو ایسا مال ملا ہے۔''

''یار مزے آ جائیں گے۔'' دوسرے کی ابھی سے باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں زرین سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے اور شاید اس کی مزاحمت سے بھی لطف اٹھا رہے تھے۔ ابھی تک ان کی نظر مجھ پر نہیں گئی تھی۔ زرین نے پھر چیخ ماری۔

''شہباز..... مجھے بچاؤ۔''

''اوئے یہ شہباز کون ہے؟'' پہلا والا چونکا۔

انہوں نے پہلی بار آس پاس کا معائنہ کیا تو ان کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ دوسرے نے پہلے والے سے کہا۔ ''اسے تو بکر میں اسے دیکھتا ہوں۔''

میں نے اب تک گولی نہیں چلائی تھی کیونکہ وہ زرین کے پاس تھے اور اس تاریکی میں نشانہ چوک جانے کا امکان تھا۔ اس لیے میں خون کھولنے کے باوجود صبر سے ان کے زرین سے الگ ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ دوسرا میری طرف آنے لگا۔ اس موقع پر زرین نے حماقت کی۔ اس نے چلا کر کہا۔ ''شہباز ان کو گولی مارو۔''

''اوئے یہ مسلح ہے۔'' دوسرا بولا اور پلٹ کر بھاگا تھا کہ میں نے عقب سے اس پر فائر کیا۔ گولی اس کے جسم کے درمیانی حصے میں اتر گئی تھی۔ وہ چیخ مار کر گرا اور زمین پر تڑپنے لگا۔ جس نے زرین کو پکڑ رکھا تھا۔ اس نے اسے چھوڑ دیا اور بے ساختہ سڑک کی طرف بھاگا۔ اسے اپنے ساتھی کا خیال بھی نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اس پر گولی چلانے سے گریز کیا کیونکہ پھر زرین درمیان میں آ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر میری طرف بھاگی اور پاس آتے ہی لپٹ گئی۔ میرا پاؤں بلا تو میں کراہا تھا۔

''میرا پاؤں.....''

اس نے میری بات سنی نہیں وہ کانپتے ہوئے بولی۔ ''تم نے مجھے ان درندوں سے بچا لیا۔''

''ان میں سے ایک مارا گیا ہے۔'' میں نے فکرمندی سے کہا۔ ''اس کا ساتھی جا کر پولیس کو بلا لائے گا۔''

پولیس کا نام کر وہ بھی پریشان ہو گئی تھی۔ ''پولیس تو مرشد کی ساتھی ہے وہ ہمیں اس کے حوالے کر دے گی۔''

''سنو ہمیں پولیس یا کسی اور کے یہاں آنے سے پہلے نکلنا ہو گا۔''

اس ایک تجربے کے بعد وہ سہم گئی تھی۔ اس نے سڑک کی طرف جانے سے انکار کر دیا۔ ''میں اب نہیں جاؤں گی۔''

''پلیز ہمت کرو۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''ضروری نہیں ہے سب بدمعاش ملیں۔ اچھے لوگ بھی تو ہوتے ہیں۔''

''میں نہیں جاؤں گی۔'' اس نے رونا شروع کر دیا۔ ''یہ دنیا اتنی گندی کیوں ہے۔ عورت کو دیکھ کر اسے ایک ہی خیال کیوں آتا ہے۔''

اب میں اسے دنیا اور خاص طور سے مردوں کی دنیا کے بارے میں نہیں سمجھا سکتا تھا۔ ''زرین پلیز میری حالت کا خیال کرو۔ میرا پاؤں پھندے میں پھنسا ہوا ہے، کہیں دنیا کی بڑی ہے۔ ایسا کرو یہ پستول رکھو اور اگر اس بار کوئی بدمعاشی دکھانے کی کوشش کرے تو اسے شوٹ کر دینا۔''

اس نے پستول لے لیا۔ اس دوران میں جب اسے سمجھا رہا تھا تو ہماری توجہ گولی کھا کر گرنے والے کی طرف نہیں رہی تھی اور وہ کس وقت خاموشی سے وہاں سے کھسک گیا اس کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ جب میں نے اس طرف دیکھا تو وہ غائب تھا۔ میں نے اضطراب سے کہا۔ ''زرین وقت کم ہے جلدی کرو ورنہ ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔''

پستول لینے کے باوجود اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ سڑک کی طرف جائے۔ میں نے اس کا ہاتھ دبایا۔ ''زرین شاباش ہمت کرو، تم ایک بہادر لڑکی ہو۔ مرشد سے جان بچانی ہے تو تمہیں ہمت کرنا ہی ہو گی۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''میں... میں کوشش کرتی ہوں۔''

وہ سڑک کی طرف چلی گئی۔ اس بار اس کی چال میں تیزی کے بجائے ہچکچاہٹ تھی۔ ابھی چند لمحے پہلے اس نے مردوں کا ایک اور روپ دیکھا تھا اور مجھے اس کے اندر کی کیفیت کا اندازہ تھا اس کے باوجود وہ ہمت کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اسی لمحے مشرق سے چاند نے سر اٹھایا۔ یہ چھٹی یا ساتویں کا چاند تھا یعنی آدھا تھا اور اس کی روشنی بہت زیادہ نہیں تھی لیکن جتنی بھی تھی اس سے کم سے کم آس پاس کا منظر صاف نظر آنے لگا تھا۔

مجھے دبئی والوں کا خیال آیا۔ وہ غائب تھے اور اب میں بھی غائب ہو گیا تھا۔ میرے دشمن میری قید میں تھے اور میں ان کی قید میں چلا گیا تھا۔ قدرت مہربان ہوئی تو قید سے نکل گیا تھا لیکن اب اس پھندے میں آن پھنسا تھا۔ سوچتے سوچتے میں چونکا نہ جانے کتنا وقت گزر گیا تھا۔ زرین کو گئے ہوئے کم سے کم ایک گھنٹا ہو چکا تھا اب تک اسے واپس آ جانا چاہیے تھا لیکن وہ نہیں آئی تھی۔ ایک بار مجھے خیال آیا کہ وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے لیکن میں نے فوراً اس خیال کو مسترد کر دیا کیونکہ جہاں تک میں نے اسے سمجھا تھا وہ مجھے اس طرح

چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔ وہ یقیناً کسی مشکل میں پڑ گئی تھی۔

کچھ دیر اور گزری اور مجھے لگا کہ مجھے اپنے لیے خود ہی کچھ کرنا تھا۔ میں نے پھندے کا جائزہ لیا۔ یہ مضبوط لوہے کا تھا اور بغیر چابی یا آری کے اسے کھولنا ناممکن تھا۔ میں نے زنجیر کا جائزہ لیا جو زمین میں گڑی ہوئی تھی ' اسے کھینچ کر نکالنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں پھندا ہلا تو مجھے تکلیف سے چھٹی کا دودھ یاد آ گیا تھا اور میں نے بے ساختہ پھندا لگانے والے کی شان میں اعلیٰ درجے کی گستاخیاں کیں۔ اس کا زاویہ بدلا اور یہ ایک اور تکلیف دہ مرحلہ ثابت ہوا لیکن اس سے میں اس پوزیشن میں آ گیا کہ بغیر پھندا ہلائے زنجیر کھینچ سکوں۔ میں نے آزاد پاؤں زمین پر ٹکایا اور زنجیر کو زور سے کھینچا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ زنجیر آسانی سے نکلتی چلی گئی تھی۔ ظاہر ہے لگانے والے نے اسے لوہڑی یا گیدڑ کی طاقت کے لحاظ سے زمین میں لگایا ہوگا کہ وہ پھندے میں پھنسنے کے بعد اسے کھینچ کر نہ لے جائیں۔ میری طاقت ان سے زیادہ ہی تھی اس لیے زنجیر نکل آئی تھی۔ پھندا زنجیر سمیت کوئی تین کلوگرام وزنی ہوگا۔ میں نے سیدھا ہو کر اسے اوپر کیا اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ میرے پاؤں پر زور آ رہا تھا اگر ہڈی کو نقصان ہوا ہوتا تو اس پاؤں پر زور ڈالنا ناممکن تھا۔ لیکن جب میں نے قدم آگے بڑھایا تو ٹیس اٹھی تھی۔ میں نے برداشت کرتے ہوئے چند قدم اٹھائے اور اس کے بعد تکلیف قابلِ برداشت ہو گئی تھی۔ لیکن یہ اتنی بھی قابلِ برداشت نہیں تھی۔ بس اتنا تھا کہ میں رک نہیں رہا تھا اور سڑک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب قدم بڑھاتا تو زنجیر چھنکتی تھی۔ اس ویرانے میں ایسی آوازیں بڑی خطرناک ہوتی ہیں اور بے خبر افراد اسے آسانی سے کسی چڑیل کے پازیب کی آواز سمجھ سکتے تھے۔ میں نے سڑک کی طرف دیکھا۔ میں قدم قدم کر کے سڑک کی طرف جا رہا تھا۔ چاند نکل آنے سے راستہ نظر آنے لگا تھا اور اب میرا پاؤں کسی گڑھے میں جانے کا امکان نہیں تھا۔ شام ہونے کے بعد مری ہائی وے پر ٹریفک کم ہو گیا تھا اور وقفے کے بعد کسی گاڑی کی روشنی نمودار ہوتی تھی۔

رک رک کر اور تکلیف برداشت کرتا میں کسی طرح ہائی وے تک پہنچ ہی گیا تھا۔ میرے دل میں کہیں امید تھی کہ شاید زرین مجھے سڑک پر مل جائے لیکن جب میں سڑک تک پہنچا تو مجھے دھچکا لگا تھا۔ زرین وہاں نہیں تھی۔ دونوں طرف کوئی سو گز تک سڑک صاف نظر آ رہی تھی اور اس پر کوئی ذی روح نہیں تھا۔ سوائے میرے، میں نے چلا کر زرین کو آواز دی۔

''تم کہاں ہو؟''

لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ میں نے کئی بار اسے آواز دی اور جب کوئی رسپانس نہیں ہوا تو میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ایک بار پھر غلط گاڑی کو روک بیٹھی تھی اور گاڑی والوں نے اس بار اسے فرار کی مہلت نہیں دی تھی۔ یقیناً اسے پستول استعمال کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ وہ اس میں اناڑی تھی اور اگر دوسرے کھلاڑی تھے تو انہوں نے بہ آسانی اس پر قابو پا لیا ہوگا۔ میں نے مایوسی سے سر جھکا اس عورت کی قسمت خراب تھی۔ اسے مرشد کے قبضے سے نکال کر لایا تو وہ کسی اور مرشد کے قبضے میں چلی گئی تھی۔ میں نے سر جھکا کر سڑک کی طرف دیکھا۔ مجھے امید تھی کہ یہاں سے کوئی نہ کوئی گاڑی گزرے گی جس میں مجھے لفٹ مل جائے گی۔ مگر ابھی کوئی گاڑی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میری قسمت کہ جب سڑک سے دور تھا تو گاڑیاں گزر رہی تھیں اور جب یہاں تک آیا تو کوئی گاڑی نہیں تھی۔

زرین غائب تھی لیکن میں اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا تھا اس لیے میری توجہ اب اپنی طرف تھی مجھے کسی سے مدد حاصل کر کے یہاں سے نکلنا تھا اس کے بعد ہی میں زرین کے لیے کچھ کر سکتا تھا۔ ایک لمبے کو مجھے خیال آیا کہ وہ کہیں مرشد علی کے آدمیوں کے ہتھے تو نہیں چڑھ گئی ہے۔ لیکن اس صورت میں وہ مجھے بھی تلاش کرنے آتے۔ انہیں اصل میں تو میری تلاش تھی۔ زرین تو ان کو خود مل جاتی اور نہ بھی ملتی تو مرشد کو یقیناً اس کی اتنی پروا نہیں ہوتی۔ البتہ میرے لیے وہ پاگل ہو رہا ہوگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مری والی سائیڈ سے ایک گاڑی کی روشنیاں نمودار ہوئیں۔ گاڑی دیکھ کر میں نے زور شور سے ہاتھ ہلائے اور جب گاڑی قریب آئی تو آواز بھی دی تھی۔

''اے.....رکو.....میری مدد کرو۔''

لیکن اس کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی اور وہ زن سے میرے پاس سے گزر گئی تھی۔ مایوسی کے ساتھ میں نے اس کو خوب سنائیں۔ پھر اسی لمحے گاڑی کے بریک پُرشور انداز میں چرچرائے۔ وہ رکی اور پھر ریورس ہو کر تیزی سے میرے پاس آ کر رکی۔ اس کا اگلی نشست والا شیشہ نیچے ہوا۔ اندر تاریکی تھی اور اس تاریکی سے ایک جانی پہچانی آواز آئی۔ ''آپا.....شہباز صاحب۔''

سنسنی خیز واقعات اگلے شمارے میں پڑھیے

بیت بازی

(اکبر بیگ، جرمنی کا جواب)

محمد عماد.....حیدر آباد

یاد آتا ہے تو کیوں اس سے گلہ ہوتا ہے
وہ جو اک شخص ہمیں بھول چکا ہوتا ہے

ثنا ابرار.....مظفر گڑھ

یہ کس کی یاد میں ہم آج مسکراتے ہیں
جہان بھر کا تبسم مزاج ہے برہم

تسنیم احمد.....ایبٹ آباد

یہ بات طے ہے کہ دکھ بے وفا نہیں ہوتے
کبھی سفر پہ جو نکلو تو ساتھ غم رکھنا

(جام اکبر، ماہرہ کا جواب)

ناہید ابڑو.....ہالہ نیو

نامرادی کا یہ عالم ہے کہ اب یاد نہیں
تو بھی شامل تھا کبھی میری تمناؤں میں

(سید محمد عباس، لاہور کا جواب)

اعجاز احمد خالد.....لاہور

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے

(کوثر ملک، ساہیوال کا جواب)

مظفر علی خاں.....لاہور

وسائل بیچ کر غیروں کے ہاتھوں
مسائل کا مداوا ڈھونڈتے ہیں

(زریں تاج، شادی پور کا جواب)

مرزا اسفار بیگ.....حیدر آباد

محبتوں میں دکھاوے کی دوستی نہ ملا
اگر گلے نہیں ملتا تو ہاتھ بھی نہ ملا

صباحت ملک.....رحیم یار خان

محبت رنگ ہے ایسا کہ روکے نہیں رکتا
کبھی پھولوں میں نکھرے گا کبھی تاروں میں چمکے گا

منیر خیال.....شادی پور

مجھ سے تو لغزشیں ہوئیں حالات کے طفیل
بدلا ہے وہ بھی وقت کی رفتار کی طرح

نورین ظفر.....رحیم یار خاں

مجھے فریب نہ دو میری خواہشوں سے کہو
نہ یاد آئیں پرانی محبتوں سے کہو

صدف ممتاز.....اوکاڑہ

مدتوں ذہن میں گونجوں گا سوالوں کی طرح
تجھ کو یاد آؤں گا گزرے ہوئے سالوں کی طرح

انعم فراز.....میر پور خاص

مل گئے ہو تو چلو رسم زمانہ ہی سہی
ورنہ اب پرسشِ احوال سے کیا ہوتا

(اقرا بانو ناگوری، کراچی کا جواب)

رانا محمد سجاد.....مظفر گڑھ

یہ کس نے سہمی ہوئی فضا میں ہمیں پکارا
یہ کس نے آواز دی کہ آؤ اداس لوگو

(ارباز سرحدی، کوئٹہ کا جواب)

عقیل الرحمن کھاٹاں.....بھاد نگر

بت خانے سے دل اپنے اٹھائے نہ گئے
کعبے کی طرف مزاج بھی لائے نہ گئے

(اسد اللہ، ثروب کا جواب)

فرحت عباسی.....لاڑکانہ

اب آدمی کی خیر خدا ہی کے ہاتھ ہے
دیکھا ہے میں نے وقت کی آنکھوں میں اضطراب

(عبدالکریم آغا چوہان، دادو)

عدنان حسین.....لاہور

اب کہاں جائیں تیرے درد کے مارے اے دوست
کلفتِ زیست تیری یاد تک آ پہنچی ہے

محمد احمد احسن.....دادو

آئینہ دیکھا تو دل سے یہ صدا آئی نہاں
عمر بھر ساتھ رہے پھر بھی شناسا نہ ہوئے

محمد عماد.....لطیف آباد، حیدر آباد

استاد کی عظمت کو ترازو میں نہ تولو
استاد تو ہر دور میں انمول رہا ہے

نازیہ احسن.....خانیوال

اب تک دلِ خوش فہم کو تجھ سے ہیں امیدیں
یہ آخری شمع بھی بجھانے کے لیے آ

(نادیہ عبول، کراچی کا جواب)

میاں ساجد علی.....دوا کھڑی گوجرہ

یہ سوچ کر پلکوں میں چھپا لیتا ہوں آنسو
گر کر یہ میری آنکھوں سے بے گھر نہ ہو جائیں

نسرین رعنا.....فیصل آباد

یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

(ڈاکٹر وحید نفیس شاقب، بھکر کا جواب)

خالدہ فرحین.....شیخوپورہ

آ سناؤں میں تجھے حالِ دلِ زار اپنا
عبرت آموز ہے سن لے کہ ترے کام آئے

شیریں امتیاز پراچہ.....بلکوال منڈی بہاؤالدین

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

راجا شاقب نواز شاقب.....رتی ٹبی ساہیوال

اے رند ہم نہ کہتے تھے تجھ کو یہ دردِ عشق
برباد کر کے چھوڑے گا، دیکھا وہی ہوا

(محمد سعید قاسمی، چکوال کا جواب)

وزیر محمد خان.....بلتستان

یاد آتا ہے روز و شب کوئی
ہم سے روٹھا ہے بے سبب کوئی

(سلمان رفیق، کراچی کا جواب)

حسن راجا.....جھنگ

مہربانی نہ سہی اک زخم ہی دے دو
محسوس تو ہو کہ کوئی ہمیں بھولا نہیں ہے

(راجا شاقب نواز شاقب، ساہیوال کا جواب)

ملک جمیل احمد.....شیخوپورہ

یہی خوشبو جو مجھے گھر سے اٹھا لائی تھی
اب کسی طور پلٹ کر نہیں جانے دیتی

جاوید اختر انصاری.....کراچی

یہ ہے وہ موجۂ پایاب جو سر سے گزرے
حسرتیں ریگتی پھرتی ہیں اب ان راہوں میں

(زرین مجید، کا جواب)

محمد طلحہ جان سرہندی.....میرپور خاص

وہ وقت ہے کہ علم حق ہے علم شیطنیت میں گم
وہ وقت ہے کہ آدمی کا آدمی شکار ہے

نائلہ ثمرین.....مظفر گڑھ

واسطہ ہم سے تو پہلے ہی وہ کم رکھتے ہیں
وہ ہی ہیں جو محبت کا بھرم رکھتے ہیں

انتخاب عالم زبیری.....لاہور

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتحِ زمانہ

(ملک ثاقب شاد تونسوی، حویلیاں کا جواب)

اشفاق شاہین.....کراچی

یہ کیسی دھند میں ہم تم سفر آغاز کر بیٹھے
تمہیں آنکھیں نہیں ملتیں ہمیں چہرہ نہیں ملتا

عطیہ پروین.....چکوال

یونہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں

(سلمیٰ شاہین، میرپور خاص کا جواب)

محمد خورشید شاہد غور غشتوی.....حضرو

رہبروں کے ضمیر مجرم ہیں
ہر مسافر یہاں لٹیرا ہے

ارشاد حسین.....میانوالی

رات ہے اور تیری یادیں ہیں
روشنی آ رہی ہے روزن میں

(لبنیٰ یاسمین، لطیف آباد کا جواب)

سعید احمد چاند.....کراچی

یاد کر کے اور بھی تکلیف ہوتی تھی عدیمؔ
بھول جانے کے سوا اب کوئی چارہ نہ تھا

(رانا محمد سجاد، شاہ جہاں کا جواب)

اقرا بانو ناگوری.....کراچی

اختصار اک پیش نامہ ہے زوالِ ملک کا
اتحاد قوم و ملت کا جتن کرتے رہو

بیت بازی کا اصول ہے، جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر حذف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدِنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

بادِ سموم

عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم!
میں ایک ڈاکٹر ہوں، صبح سے شام تک میرے پاس مریض آتے رہتے ہیں۔ ہر مریض کی الگ کہانی ہوتی ہے جو دلچسپ بھی ہوتی ہے۔ لیکن میں جس مریض کی کہانی کے ساتھ حاضر ہوئی ہوں یہ اپنی نوعیت کی انوکھی ہے کہ اس کی وجہ سے میری زندگی کا رخ بدل گیا۔ میں نے دانستہ اپنا اصل نام نہیں دیا ہے لیکن کہانی میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے، تمام واقعات بلاکم وکاست بیان کردیئے ہیں۔ اگر آپ نے اسے شائع کردیا تو میں مشکور رہوں گی۔

ڈاکٹر شائستہ
(کراچی)

طیارے نے پاکستان کی سرزمین کو چھوا تو میرا دل خوشی و مسرت کے بے پایاں جذبات سے بری طرح دھڑکنے لگا۔ میں پانچ سال بعد وطن لوٹ رہی تھی۔ یہ پانچ طویل سال میں نے اپنے وطن سے دور رہ کر کیسے گزارے تھے، یہ میرا دل ہی جانتا تھا۔ میں تو ایم بی بی ایس کرنے کے بعد ہی اپنا کلینک کھولنا چاہتی تھی لیکن میرے پروفیسرز نے مجھے مشورہ دیا کہ تم جیسی ذہین طالبہ کو مزید تعلیم حاصل کرنا چاہیے کہ تمہارے پاس طب کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کے لیے وسائل بھی ہیں۔

میں نے پاپا سے اس بات کا تذکرہ کیا تو وہ لمحے بھر کو اداس ہوگئے۔ وہ میری دوری کیسے برداشت کرسکتے تھے۔

میری امی کا انتقال اس وقت ہوگیا تھا جب میں صرف تین سال کی تھی۔ پھر پاپا نے محض میری وجہ سے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ انہوں نے مجھے ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا تھا۔ وہ اپنی بے پناہ مصروفیات سے نہ جانے کیسے میرے لیے وقت نکال پاتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے کبھی مجھے ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔

وہ شہر کے چند بڑے بزنس مین میں سے ایک تھے، چاہتے تو میری پرورش اور نگہداشت کے لیے ایک چھوڑ کئی آیاؤں اور گورنسز کا بندوبست کرسکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا بھی نہیں کیا۔ یوں سمجھ لیں کہ انہوں نے مجھے ہتھیلی کا پھالا بنا کر پالا تھا۔ ان کے بے انتہا لاڈ پیار کے باوجود میں دوسری امیرزادیوں کی طرح بگڑی نہیں تھی۔

پھر پاپا کے دوستوں نے بھی انہیں مشورہ دیا کہ شائستہ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جانے دو۔ یہ دور اسپیشلائزیشن کا دور ہے۔ عام ایم بی بی ایس ڈاکٹر تو ملک میں بے شمار ہیں لیکن کسی بھی شعبے میں مہارت رکھنے والے ڈاکٹروں کی آج بھی کمی ہے۔

یوں پاپا نے دل پر پتھر رکھ کر مجھے بیرونِ ملک جانے کی اجازت دے دی۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ جب تم پاکستان لوٹو گی تو تمہارے لیے ایک شاندار اسپتال تیار ہوچکا ہوگا۔

میں گائناکولوجی میں مہارت حاصل کرنے کے بعد وطن لوٹ رہی تھی۔ پاپا اور ان کے دوست انکل احسن میرے استقبال کے لیے موجود تھے۔

میں والہانہ انداز میں پاپا سے لپٹ گئی اور بولی "پاپا میں نے آپ کو بہت مس کیا۔"

"ارے ابھی دو مہینے پہلے ہی تو اتنا رقم سے مل کر آیا تھا۔" انکل احسن نے کہا "اس کے باوجود تم آنسو بہا رہی ہو؟"

میں نے آنسو پونچھتے ہوئے انکل کو سلام کیا۔ انہوں

نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولے ''امتیاز! ہماری گڑیا ماشاء اللہ بڑی ہوگئی ہے۔''

''ہاں احسن! آج تو اس میں مجھے فرزانہ کی جھلک نظر آرہی ہے۔'' پاپا نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

میں ایک دفعہ پھر ان سے لپٹ گئی ''پاپا، آئی لو یو۔'' میں نے پاپا کا دھیان بٹانے کو کہا ورنہ وہ مما کو یاد کر کے پھر گم صم ہو جاتے۔ فرزانہ میری مما کا نام تھا۔

''کاش، میں تمہارا پاپا ہوتا۔'' نزدیک سے گزرتے ہوئے ایک نوجوان نے زیرِ لب کہا جسے صرف میں سن سکی۔

انکل احسن نے قہر آلود نظروں سے اس چھچھورے نوجوان کو گھورا تو مجھے احساس ہوا کہ انکل بھی اس کی بکواس سن چکے ہیں۔

''اے مسٹر!'' انکل نے درشت لہجے میں اس نوجوان کو پکارا ''ذرا یہاں تشریف لائیے۔''

''جی فرمائیے۔'' وہ نوجوان ڈھٹائی سے نزدیک آ کر بولا۔

اس نے ڈھیلی ڈھالی جینز پہن رکھی تھی جو اس کی ایڑیوں کے نیچے آرہی تھی، ٹی شرٹ پر ''آئی ایم دا بیسٹ'' جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ اس کے بڑے بڑے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اگر اس کے جسم پر معقول لباس ہوتا تو وہ خاصا خوش شکل نظر آتا۔

اس کے ساتھ اسی جیسا ایک نمونہ اور بھی تھا۔ اس کا جسم کسرتی تھا اور اپنے جسم کی نمائش کے لیے اس نے سلیولیس (بغیر آستینوں کی ٹی شرٹ) پہن رکھی تھی اور اس کے بٹن نیچے تک کھلے ہوئے تھے۔

اس نے توہین آمیز لہجے میں کہا ''جلدی بولیں انکل! ہم سے کیا کام ہے؟ ہمارے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔''

انکل احسن کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ انہوں نے اس باڈی بلڈر کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے جینز والے نوجوان سے درشت لہجے میں پوچھا ''کیا بکواس کی تھی تم نے؟''

''انکل، ذرا تہذیب کے دائرے میں رہ کر بات کریں۔ آپ شاید مجھے جانتے نہیں ہیں، پھر میں نے ایسی کون سی بات کہہ دی جو آپ اتنے آگ بگولا ہو رہے ہیں؟''

''نام کیا ہے تمہارا؟'' انکل نے بھنا کر پوچھا۔

''ارے نام میں کیا رکھا ہے انکل! آپ مجھے جس نام سے چاہیں بلا سکتے ہیں۔''

انکل نے اچانک اس کے منہ پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ ائرپورٹ وزیٹرز لاؤنج گونج اٹھا۔

''تو نے..... تو نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا؟'' وہ اچانک ''آپ'' سے ''تو'' پر آ گیا۔ ''تو شاید نہیں جانتا کہ میں میرا باپ وفاقی کابینہ کا منسٹر ہے۔''

انکل نے دوسرا تھپڑ پہلے سے بھی زیادہ زور سے مارا اور بولے ''میں تو اسے جانتا ہوں، تیرا باپ مجھے اچھی طرح نہیں جانتا..... اب بتا، تو نے کیا بکواس کی تھی؟''

''کیوں اپنی زندگی سے عاجز آ گیا ہے؟'' وزیر زادے نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔

انکل نے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے ایک سب انسپکٹر اور دو سپاہیوں کو اشارے سے بلایا۔

وہ تینوں بہت تیزی سے وہاں پہنچے اور انکل کو زوردار انداز میں سیلوٹ کرنے کے بعد بولے ''یس سر!''

''ان دونوں کو لے جا کر حوالات میں بند کر دو۔''

''ابے، تو ہے کون؟'' منسٹر کا بیٹا بولا۔

''تمیز سے بات کرو۔'' سب انسپکٹر نے اسے بری طرح جھڑک دیا ''احسن صاحب، ڈی آئی جی کرائمز ہیں۔''

لڑکے کے چہرے پر ایک لمحے کو ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ پھر وہ فوراً سنبھل گیا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا سیل فون نکال لیا۔

سب انسپکٹر نے جھپٹ کر نہ صرف سیل فون اس کے ہاتھ سے چھینا بلکہ اس کی گدی پر زوردار چانٹا بھی رسید کر دیا۔ پھر اس نے سپاہیوں کو حکم دیا ''ان دونوں کو اٹھا کر موبائل میں ڈال دو۔''

وہ دونوں بکتے جھکتے اور خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

اس واقعے سے میری طبیعت مکدر ہوگئی تھی۔ میں نے افسردگی سے کہا ''انکل، ان پانچ برسوں میں یہاں کچھ بھی تو نہیں بدلا بلکہ لوگوں کے رویے میں مزید شدت پیدا ہوگئی ہے۔''

''یہ کبھی بدل بھی نہیں سکتا۔'' پاپا نے کہا ''تم نے دیکھا نہیں، وہ کسی عام آدمی کا نہیں بلکہ ایک وفاقی وزیر کا بیٹا تھا۔ جب تک ہمارے حکمران قانون کی پاسداری نہیں کریں گے، اس وقت تک کچھ بھی نہیں بدلے گا۔'' پھر وہ ہنس کر بولے ''خیر، یہ تماشے تو روز کا معمول ہیں۔ تم اب گھر چلو گی یا یہیں کھڑے کھڑے ملک کے معاشرتی انحطاط پر غور کرتی رہو گی؟''

دوسرے دن ناشتے کے بعد پاپا مجھے وہ اسپتال دکھانے لے گئے جو انہوں نے میرے لیے تعمیر کرایا تھا۔ اسپتال شہر کے بہترین علاقے میں تھا۔ تین منزلہ شاندار عمارت تھی۔ اسے دیکھ کر میں خوشی سے پاگل ہوگئی۔

اس میں ہر منزل پر ایک جنرل وارڈ بھی تھا۔ اس کے علاوہ اوپر نیچے تقریباً بیس کمرے تھے۔ اسپتال کے احاطے میں خوبصورت سا کیفے ٹیریا بھی تھا۔ جدید ساز و سامان سے آراستہ ایک لیبارٹری بھی تھی۔

یوں سمجھیں کہ اسپتال ہر طرح سے تیار تھا، بس اس کا افتتاح ہونے کی دیر تھی۔

میں سب سے پہلے تو ملک کے بہترین ڈاکٹرز کو دگنے معاوضے پر وہاں لے آئی۔ پیرامیڈیکل اسٹاف کے سلسلے میں بھی میں نے بہترین افراد کا انتخاب کیا۔ یوں ایک ہی مہینے میں میرے اسپتال کا افتتاح ہوگیا۔ پاپا نے اسپتال کا نام الشافی میٹرنٹی ہوم اینڈ جنرل اسپتال رکھا تھا۔

چند ہی مہینے میں میرا اسپتال شہر کے نمایاں اسپتالوں میں شمار ہونے لگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں چوبیس گھنٹے میں سے اٹھارہ گھنٹے اسپتال میں گزارتی تھی۔ میری وہاں ہمہ وقت موجودگی کے باعث اسٹاف بھی بہت مستعد رہتا تھا۔

سال بھر گزرنے کے بعد میرا نام شہر کی پانچ بہترین گائنا کولوجسٹ میں لیا جانے لگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کرم تھا کہ ڈلیوری کے انتہائی پیچیدہ کیس بھی میں نے بہت خوش اسلوبی سے حل کیے تھے۔

ہر چند کہ مجھے پیسا کمانے کی کوئی ہوس نہیں تھی، اس کے باوجود گویا ہُن برس رہا تھا۔ اسپتال کے چالیس بستروں میں سے دس میں نے غریب، نادار اور مستحق مریضوں کے لیے وقف کر دیے تھے۔ ان مریضوں سے کسی بھی مرحلے پر کوئی پیسا نہیں لیا جاتا تھا۔

میری شہرت دیکھ کر الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا نے میرے انٹرویوز شائع کیے، مجھے ٹی وی کے ٹاک شوز میں بھی بلایا جاتا تھا۔

اس دن میں بہت زیادہ تھک گئی تھی۔ میں نے صبح سے لے کر سہ پہر چار بجے تک مسلسل سات آپریشن کیے تھے۔

میری اسسٹنٹ ڈاکٹر نوشین نے مجھے مشورہ دیا ''ڈاکٹر صاحبہ! آپ اسپتال کے بجائے گھر جا کر آرام کریں۔ یہاں ڈلیوری کا کوئی پیچیدہ کیس آ گیا تو آپ اپنی تھکن بھول کر ایک مرتبہ پھر اوٹی کی طرف دوڑ پڑیں گی۔''

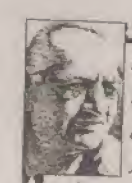

ایک دن علی الصباح جب وہ چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے سگریٹ کے دھوئیں کے بادل بنا رہے تھے، میں نے ان سے کہا ''فیض صاحب، یہ بتائیں آخر آپ نے یہ صبر و ضبط کہاں سے سیکھا اور اسے اس طرح عادت ثانیہ بنا لیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ کبھی آپ کو کسی دشمنی کی بات پر بھی مکدر ہوتے نہیں دیکھا۔''

وہ مسکرائے اور کہنے لگے ''یہ تو تم بھی کر سکتی ہو مگر تم تو رونے لگتی ہو۔''

میں نے کہا ''آپ کی شاعری کے بارے میں نازیبا الفاظ کہہ رہے تھے پھر وہ کون سا منہ لے کر آپ سے خوش خلقی سے دوست بن کر ملتے ہیں۔''

فیض مسکرا دیے ''ارے بھئی، یہ معمولی باتیں ہیں انسان کو معاف کر دینا چاہیے، ہوتی آئی ہے...''

سحاب قزلباش کے مضمون ''ستارۂ وفا'' سے اقتباس

اس کا مشورہ معقول تھا، میں نے ہنس کر کہا ''اچھا بابا، جاتی ہوں لیکن کسی بھی ایمرجنسی.....''

''کی صورت میں فوراً آپ کو کال کی جائے اور ذرا سی بھی غفلت نہ کی جائے۔'' ڈاکٹر نوشین نے مسکرا کر میرا جملہ پورا کر دیا ''ڈاکٹر شائستہ! یہاں مجھ سمیت چھ کوالیفائیڈ گائنا کولوجسٹ ہیں۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں۔''

میں نے باتھ روم میں جا کر اپنا منہ دھویا، بال سنوارے اور اپنا ہینڈ بیگ لے کر پارکنگ کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے ریموٹ سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر سیٹ بیلٹ باندھنے کے بعد گاڑی کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔

میں اسپتال سے نکل کر مین روڈ پر آئی اور کچھ دور چلنے کے بعد میں نے دائیں طرف مڑنے کا اشارہ دے دیا۔

''ادھر نہیں، بائیں طرف چلیں۔'' اچانک ایک کرخت آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

میں بری طرح اچھل پڑی، اسٹیئرنگ پر میرے ہاتھ کانپ کر رہ گئے۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا، عقبی سیٹ پر دو نقاب پوش تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا ریوالور یا پستول تھا۔ اس کی نال نقاب پوش نے میری گدی پر رکھ دی تھی۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے؟'' میں نے حیرت اور خوف کے ابتدائی جھٹکے سے سنبھل کر کہا۔

"یہ بے ہودگی نہیں ہے بلکہ آٹومیٹک پستول ہے ڈاکٹر صاحبہ!" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا "اور یہ بے آواز چلتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی آپ مرنا نہیں چاہیں گی اس لیے گاڑی کو بائیں طرف موڑ دیں۔"

"تم کیا سمجھتے ہو؟ اگر میں مرگئی تو تم زندہ بچو گے؟" میں نے بھنا کر کہا۔

"ہمارا تو کام ہی مرنا اور مارنا ہے۔ ہمیں اپنی جان کی پروا ہوتی تو اس بھری پُری سڑک پر آپ کو کہیں لے جانے کی کوشش کرتے؟"

"لیکن تم لوگ ہو کون اور مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"بس اب خاموش رہو۔" دوسرے نقاب پوش نے مجھے بری طرح جھڑک دیا "میں عورتوں پر ہاتھ اٹھانے کا قائل نہیں ہوں لیکن زبان دراز عورتوں پر ہاتھ اٹھا بھی دیتا ہوں۔ بس اب خاموشی سے ڈرائیونگ کرو۔"

میں نے بھی سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔ نہ جانے وہ کون لوگ تھے اور مجھے کہاں لے جا رہے تھے؟ یہ تو طے تھا کہ ان لوگوں نے مجھے تاوان کے لیے اغوا کیا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ میں ایک ارب پتی باپ کی بیٹی ہوں اور میرے ذاتی اکاؤنٹ میں لاکھوں روپے موجود ہیں۔

میں نے کچھ دیر بعد کہا "دیکھو، اگر تم لوگوں نے تاوان....."

"تو بھونکنا بند نہیں کرے گی؟" دوسرا نقاب پوش درشت لہجے میں بولا، پھر وہ اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا "اب یہ ایک لفظ بھی زبان سے نکالے تو اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کے عقبی سیٹ پر ڈال دینا اور اسٹیئرنگ خود سنبھال لینا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو راجا بھائی!" پستول بردار نے کہا "ڈاکٹر شائستہ بہت معزز خاتون ہیں۔ ان کے ساتھ جاہلوں والا سلوک مت کرو۔"

"فریدے!" راجا دہاڑ کر بولا "اب تو مجھے سمجھائے گا کہ کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا ہے۔ تجھ سے جتنا کہا جائے، اتنا ہی کر۔"

اب ہماری گاڑی کا رخ نیشنل ہائی وے پر تھا۔ گویا وہ لوگ مجھے کراچی سے باہر لے جا رہے تھے۔

"گاڑی روکو۔" اچانک راجا نے کہا۔

میں نے سڑک کے کنارے گاڑی روک دی۔

"تم صبح سے بھوکی ہوگی ڈاکٹر!" خلافِ توقع راجا نے نرم لہجے میں کہا "مجھے خوشی ہے کہ تم نے ہمارے لیے زیادہ مسئلہ پیدا نہیں کیا ورنہ خواہ مخواہ کی پریشانی ہوتی۔" پھر وہ اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا "فریدے! ڈکی میں کچھ کھانے پینے کا سامان بھی رکھا تھا میں نے۔"

"کھانے پینے کا سامان!" میں نے حیرت سے کہا۔ "میری گاڑی کی ڈکی میں؟"

"ہاں، جب ہم تمہاری گاڑی کے لاک کھول کر اندر بیٹھ سکتے ہیں تو ڈکی کھولنا کیا مشکل ہے ڈاکٹر صاحبہ!" راجا نے کہا "مجھے معلوم تھا کہ سفر لمبا ہے۔ تمہیں کچھ کھانے کی ضرورت بھی پڑے گی۔"

"مجھے کچھ نہیں کھانا ہے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "تمہیں جتنا بھی پیسا چاہیے، وہ تمہیں مل جائے گا لیکن خدارا، مجھے میرے گھر چھوڑ دو۔ پاپا نے اب تک کراچی سے لے کر اسلام آباد تک حکومت کے ہر اہلکار کو ہلا کر رکھ دیا ہوگا اور تم شاید یہ بھی نہیں جانتے کہ ڈی آئی جی کرائمز....."

"تمہارے پاپا کے خاص دوست ہیں۔" راجا نے جملہ پورا کر دیا۔ "ہم ان خطرات سے ڈرتے تو ایسا کام ہی کیوں کرتے؟"

اس دوران میں فرید ڈکی سے خاصی بڑی ایک باسکٹ نکال لایا تھا۔ اس میں کھانے پینے کا سامان وافر مقدار میں موجود تھا۔ چکن سینڈوچز تھے، برگرز تھے، چکن بروسٹ تھا اور فنگر چپس تھے۔

راجا نے ٹوکری میرے سامنے رکھ دی اور بولا "ڈاکٹر صاحبہ، شروع کرو۔"

وہ چیزیں دیکھ کر میری بھوک چمک اٹھی تھی، میں نے صبح سے صرف دو تین کپ چائے ہی پی تھی۔

میں نے سوچا ان جرائم پیشہ افراد سے نمٹنے کے لیے مجھے توانائی کی ضرورت ہوگی۔ بغیر کھائے پیے تو میں اپنا ہی نقصان کروں گی۔

میں نے باسکٹ میں سے مختلف چیزیں نکال کر کھانا شروع کر دیں۔

"یہ ہوئی نا بات۔" فرید نے مسکرا کر کہا "ڈاکٹر صاحبہ! آپ عام عورتوں سے بہت مختلف ہیں۔"

میں نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔ پھر راجا نے تھرمس میں سے کافی نکالی اور کپ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے بلا حیل و حجت کافی کا کپ لے لیا۔ مجھے اس وقت کافی کی شدید طلب محسوس ہو رہی تھی۔ حالانکہ تھرمس میں رکھی ہوئی چائے اور کافی کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہی کافی میرے لیے ایک نعمت تھی۔

کئی گھنٹوں کے بعد کھانا کھانے سے مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

اس دوران میں وہاں سے کئی گاڑیاں اور دوسری ٹرانسپورٹ گزری لیکن ان میں بیٹھے ہوئے افراد نے ہمیں دیکھا بھی ہوگا تو یہی سمجھے ہوں گے کہ ہم سفر کے دوران میں رک کر کھا پی رہے ہیں۔

پھر مجھے نیند کا بہت زبردست جھونکا آیا اور میری آنکھیں خود بہ خود بند ہو گئیں۔ پھر شاید میں نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائی تھی یا اسٹیئرنگ پر سر اوندھا کر کے جھک گئی تھی، مجھے کچھ یاد نہیں۔

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو کچھ دیر تک تو یہ یاد ہی نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں۔ میرا خیال تھا کہ میں اپنے بیڈ روم میں ہوں لیکن میرا بیڈ روم ہل کیوں رہا تھا؟

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں اپنے بیڈ روم میں نہیں بلکہ کسی گاڑی میں ہوں، میں جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس وقت میں اپنی ہی گاڑی کی عقبی نشست پر تھی۔ پھر لمحوں میں مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ وہ لوگ مجھے گن پوائنٹ پر کہیں لے جانا چاہ رہے تھے، پھر انہوں نے مجھے کھانے پینے کا سامان دیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ ان لوگوں نے کافی میں مجھے کوئی خواب آور دوا دی تھی کیونکہ کافی پیتے ہی مجھے بہت زبردست نیند آنے لگی تھی۔

میں نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ اس وقت شام کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ گویا مجھے سفر کرتے ہوئے آٹھ گھنٹے ہو چکے تھے۔ جون کا مہینا تقریباً آدھا گزر چکا تھا۔ گرمی بہت شدید تھی۔ میری گاڑی اگر ائرکنڈیشنڈ نہ ہوتی تو میرے لیے تندور بن جاتی۔ سورج اب غروب ہونے ہی والا تھا۔

"تم لوگ آخر مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔

"ارے، ڈاکٹر صاحبہ کو ہوش آ گیا۔" راجا نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "ڈاکٹر صاحبہ، آپ خود ہی اپنا دوپٹا اپنی آنکھوں پر باندھ لیں اور خاموشی سے بیٹھی رہیں۔"

"میں ایسا کچھ بھی نہیں کروں گی۔" میں نے سخت لہجے میں کہا "مجھے بتاؤ کہ تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو ورنہ میں تم سب کو مار دوں گی۔ سڑک پر ابھی اتنا ٹریفک تو ہے کہ میری چیخ پکار سن کر کوئی نہ کوئی میری طرف متوجہ ہو جائے گا۔"

گاڑی راجا ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے جھٹکے سے گاڑی روک دی اور اپنے ساتھی سے بولا "فریدے! ڈاکٹر صاحبہ کی

کیا آپ
لبوب مُقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟
کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مُقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مُقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مُقوّی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک
المسلم دارلحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

آنکھوں پر پٹی باندھ دے۔ دولت کی پٹی تو ان کی آنکھوں پر پہلے ہی بندھی ہوئی ہے۔''

فرید گاڑی سے باہر نکلا اور عقبی نشست کا دروازہ کھول کر میرے دوپٹے سے میری آنکھیں باندھنے لگا۔

''ٹھہر جا فرید ے!'' راجا نے کہا اور میلا کچیلا، گندا سا تیل میں ڈوبا ہوا ایک ٹکڑا میری آنکھوں کے سامنے لہرا کر بولا۔ ''پہلے ڈاکٹر صاحبہ کے حلق میں یہ کپڑا ٹھونس دے تاکہ یہ شور نہ مچا سکیں۔''

وہ کپڑا دیکھ کر ہی مجھے ابکائی آ گئی۔ میں نے جلدی سے کہا ''میں اب کچھ نہیں بولوں گی۔ میرے منہ میں یہ غلیظ کپڑا مت ٹھونسو۔''

''چلیں، ہم آپ کی بات اعتبار کیے لیتے ہیں۔''

فرید نے میرا دوپٹا لے کر اچھی طرح میری آنکھوں پر باندھ دیا۔ گاڑی ایک مرتبہ پھر روانہ ہو گئی۔ پھر گاڑی بائیں طرف مڑی تو اس کے دھچکوں سے مجھے احساس ہوا کہ اب ہم پختہ سڑک چھوڑ کر کچے میں چل رہے ہیں۔ وہ کچا راستہ بھی خاصا ہموار تھا۔ شاید وہاں سے بھی لوگوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔

''مجھے یہ تو بتا دو کہ.....'' میں بولتے بولتے ایک دم خاموش ہو گئی۔ مجھے اچانک اس غلیظ کپڑے کا خیال آ گیا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹا مزید چلنے کے بعد گاڑی کی رفتار سست ہونے لگی، پھر وہ رک گئی۔ پھر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھلا اور کسی نے نرمی سے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے نیچے اتار لیا۔

مجھے اتارنے والا مجھے ہدایت بھی دیتا جا رہا تھا۔ آگے سیڑھیاں ہیں، ذرا احتیاط سے چلیں۔ اب سیدھی چلیں۔ وہ شخص فرید تھا۔ میں نے اسے آواز سے پہچان لیا۔ پھر مجھے ایسا لگا جیسے میں ٹائلوں والے چکنے فرش پر چل رہی ہوں۔ وہ غالباً کوریڈور ہی تھا۔ کچھ دیر چلنے کے بعد فرید نے مجھے دائیں طرف مڑنے کا اشارہ کیا، پھر اس نے میری آنکھوں کی پٹی کھول دی۔

وہ کوئی آراستہ خواب گاہ تھی۔ کمرے میں نہایت بیش قیمت بیڈ تھا، دیواروں پر دبیز پردے تھے اور فرش پر انتہائی قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے۔ وہاں ایک جدید قسم کی ڈریسنگ ٹیبل بھی موجود تھی جس پر میک اپ کے تمام لوازمات موجود تھے۔ بیڈ کے مقابل دیوار کے ساتھ انتہائی قیمتی صوفہ سیٹ رکھا ہوا تھا، جس کا کور چرمی تھا۔

فرید نے مجھے کمرے میں چھوڑ کر باہر سے دروازہ بند کر دیا۔

میں بری طرح جھنجلا گئی اور دروازہ پیٹ ڈالا لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے وہاں کوئی موجود ہی نہ ہو یا پھر سب بہرے ہوں۔

مجھے حیرت تھی کہ اس ویرانے میں بجلی کہاں سے آ گئی کیونکہ کمرے میں ائر کنڈیشنر چل رہا تھا۔ میں نے سوچا، ممکن ہے ان لوگوں نے مجھے دھوکا دینے کے لیے اتنا لمبا سفر طے کیا ہو اور دوبارہ کراچی آ گئے ہوں۔

میں نے کھڑکی کا پردہ اٹھا کر دیکھا تو دور دور تک بھیانک اندھیرا تھا۔ کمرے سے باہر جانے والی روشنی میں مجھے گھنا جنگل نظر آیا۔

میں تھک ہار کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ میں صبح سے آپریشن میں مصروف رہی تھی۔ اس کے بعد میرا تمام وقت سفر میں گزرا تھا۔ بے ہوشی کی دوا سے مجھے نیند تو آ گئی تھی لیکن تھکن برقرار تھی اور جسم بری طرح ٹوٹ رہا تھا۔

اچانک کمرے کے باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی، پھر دروازہ آہستگی سے کھل گیا۔

میں نے آنے والے کو دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ اتنا ہی خوبصورت اور مقناطیسی شخصیت کا مالک تھا۔ اس کا قد دراز اور جسم کسرتی تھا۔ شاید وہ پابندی سے جم جانے کا عادی تھا۔ اس کی رنگت سرخ و سفید تھی اور چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں جو اس کی مردانہ وجاہت میں مزید اضافہ کر رہی تھیں۔ اس نے سفید بے داغ قمیص اور نیوی بلیو پینٹ پہن رکھی تھی، پیروں میں انتہائی قیمتی اور نفیس جوتے تھے۔ وہ اتنے چمک دار تھے کہ ان میں اپنا عکس آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔

میں ایک لمحے کو تو یہ بھی بھول گئی کہ مجھے یہاں کن حالات میں لایا گیا ہے۔ وہ شخص تھا ہی اتنا پُرکشش، بالکل میرے تراشے ہوئے آئیڈیل کی طرح۔

میں نے اچانک اس سے پوچھا ''تو یہ لوگ آپ کو بھی اغوا کر کے لائے ہیں؟''

میری بات سن کر وہ مسکرایا تو پہلے سے بھی زیادہ حسین لگا۔

''آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

وہ شخص اب کھل کر ہنسا تو مجھے اس کے موتیوں جیسے چمک دار دانت دکھائی دیے۔ اس نے عام لہجے میں کہا ''ڈاکٹر صاحبہ! یہ لوگ آپ کو میرے ہی حکم سے یہاں لائے ہیں۔''

میں اس کی خوبصورت آواز اور دلکش انداز گفتگو میں کھو گئی پھر چونک کر بولی ''آپ کے حکم سے؟''

''جی ہاں، میرے حکم سے۔'' وہ نرم لہجے میں بولا ''ویسے

ان لوگوں نے آپ کے ساتھ کوئی بدسلوکی تو نہیں کی؟''

''یہی کیا کم بدسلوکی ہے کہ مجھے گن پوائنٹ پر یہاں لایا گیا ہے۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا ''آپ کو اندازہ ہے کہ اس وقت میرے ڈیڈی پر کیا گزر رہی ہوگی؟ انہوں نے قانون نافذ کرنے والے ہر ادارے کو بلا کر رکھ دیا ہوگا۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا ''کہ آپ کی تلاش میں پورے کراچی کی پولیس سرگرم عمل ہے۔ ڈی آئی جی کراچنر آپ کی تلاش میں پیش پیش ہیں لیکن کیا کروں، یہ خطرہ تو مول لینا ہی تھا۔''

''اپنی گفتگو، رکھ رکھاؤ اور نشست و برخاست سے تو آپ اعلیٰ تعلیم یافتہ لگتے ہیں۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آیا ہے کہ آپ ہی کے حکم سے مجھے یہاں لایا گیا ہے۔''

''میں پڑھا لکھا لگتا نہیں ہوں بلکہ پڑھا لکھا ہوں بھی۔'' اس نے جواب دیا ''میں نے یونیورسٹی میں انگریزی ادب میں ایم اے کیا ہے۔ میں تو انگریزی ادب ہی میں ڈاکٹریٹ کرنا چاہ رہا تھا لیکن حالات نے موقع نہیں دیا۔''

''آپ یہ بتائیے کہ آپ کو کتنا تاوان چاہیے۔ آپ میرے ڈیڈی کو فون کریں، آپ جتنی رقم بھی مانگیں گے، وہ آپ کو دے دیں گے۔''

''پہلی بات تو یہ ہے کہ اس ویرانے میں کوئی بھی نیٹ ورک کام نہیں کرتا۔ اس کے لیے مجھے پندرہ بیس میل دور جانا ہوگا۔ دوسری بات یہ کہ میں نے آپ کو تاوان کے لیے اغوا نہیں کیا ہے۔''

''پھر..... پھر..... کیا چاہتے ہیں؟''

''مجھے اس وقت ایک انتہائی ماہر اور باصلاحیت گائناکولوجسٹ کی ضرورت ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''آپ کو ضرورت ہے۔'' ماحول کی کشیدگی کے باوجود بے اختیار مجھے ہنسی آ گئی۔

''آپ ہنستی رہا کریں ڈاکٹر صاحبہ! ہنستے ہوئے آپ بہت اچھی لگتی ہیں۔'' اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا پھر موضوع بدل کر بولا ''آپ لمبا سفر کر کے آئی ہیں۔ پہلے آپ فریش ہو جائیں، پھر باتیں ہوں گی۔ باتھ روم میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ آپ کے لیے ایک نیا جوڑا بھی وارڈ روب میں لٹکا ہوا ہے۔''

اس نے یوں کہا جیسے میں اس کی جان ہوں اور سیر و تفریح کے لیے وہاں آئی ہوں۔

''میں ابھی تھوڑی دیر میں حاضر ہوتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور باوقار انداز میں چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

میں کافی دیر تک یونہی گم صم بیٹھی رہی اور سوچتی رہی کہ یا اللہ! کیا میرا آئیڈیل مجھے اس روپ میں ملنا تھا۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آیا تھا کہ اس جیسے خوبرو، ذہین اور باوقار شخص کا تعلق مجرموں سے ہو سکتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ ابھی وہ ہنستا ہوا آئے گا اور کہے گا کہ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ میں تو صرف آپ سے ملنا چاہ رہا تھا۔ آپ کے اسپتال میں تو اتنی تفصیلی ملاقات ممکن ہی نہیں تھی اس لیے میں نے آپ کو یہاں بلوا لیا۔

مجھے اپنے قیامت خیز حسن کا احساس بھی تھا اور اس پر غرور بھی۔ اب تک نہ جانے کتنے خوبرو اور دولت مند لڑکے، میرے ساتھی ڈاکٹر اور کئی مریض میرے عشق میں مبتلا ہو چکے تھے لیکن ان میں ایسے پُرکشش چہرے اور باوقار شخصیت والا کوئی بھی نہ تھا۔ کیسی ستم ظریفی تھی کہ وہ مجھے ملا بھی تو کہاں؟ میں تو اس کی شخصیت کے سحر میں ایسی گم ہوئی تھی کہ اس کا نام تک پوچھنا بھول گئی تھی۔

باتھ روم میں ٹھنڈے اور گرم پانی کی لائنیں دیکھ کر مجھے پھر حیرت ہوئی۔ آخر اس ویرانے میں اس شخص نے ایسی جدید طرز تعمیر کا انتظام کیسے کیا ہوگا۔

گرم پانی سے غسل کرنے کے بعد میری طبیعت کی ساری کسل مندی دور ہو گئی، مرجھایا ہوا چہرہ ایک مرتبہ پھر تر و تازہ گلاب کی طرح دمکنے لگا۔

میں نہ چاہتے ہوئے بھی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ گئی اور غیر شعوری طور پر ہلکا پھلکا میک اپ کر لیا۔ میں اس وقت بالکل بھلا بیٹھی تھی کہ میری حیثیت ایک مغویہ کی ہے۔

ہیئر ڈرائر سے میں نے بال خشک کیے اور انہیں یونہی کھلا چھوڑ دیا۔ گھنے اور چمک دار بالوں نے میری پوری پشت اور شانے چھپا لیے۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت وہ شخص بھی مجھے دیکھے گا تو مجھ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا ''یس!''

دروازہ کھلا اور خوبصورت سی ایک لڑکی کھانے کی ٹرالی دھکیلتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بہت خوبصورت آواز میں ٹھہر ٹھہر کر بولی ''کھانا کھائیں میڈم! آپ تو یوں بھی صبح سے بھوکی ہیں۔ خرم صاحب نے کہا ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ کو کسی بھی قسم کی تکلیف نہیں ہونا چاہیے۔''

''کون خرم!'' میں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔

''آپ یہاں خرم صاحب ہی کی مہمان ہیں۔'' اس نے بہت مودب انداز میں کہا ''وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو آپ سے ملاقات کر کے گئے ہیں۔'' اس نے کھانے کی ٹرالی

اقوالِ زرّیں

- اس دن پر رو، جو تیری عمر کا گزر گیا اور اس میں کوئی نیکی نہیں کی ——— حضرت ابوبکر صدیقؓ
- بدبخت وہ شخص ہے جو خود تو مر جائے اور اس کا گناہ نہ مرے یعنی کسی بُرے کام یا بُری رسم کی بنیاد رکھ جائے ——— حضرت ابوبکر صدیقؓ
- کسی کے خُلق پر اعتماد نہ کر جب تک غصے کے وقت اسے آزما نہ لے ——— حضرت ابوبکر صدیقؓ
- کم بولنا حکمت ہے، کم کھانا صحت ہے، کم سونا عبادت ہے اور لوگوں کے کم ملنا عافیت ہے ——— حضرت عمرؓ
- طالبِ دنیا کو علم دین سکھانا راہزنوں کے ہاتھ تلوار فروخت کرنا ہے ——— حضرت عمرؓ
- سخی اللہ کا دوست ہے اگرچہ فاسق ہو، بخیل دشمن خدا ہے اگرچہ زاہد ہو ——— حضرت عمرؓ
- مت رکھ امید کسی سے مگر اپنے رب سے، مت ڈر کسی سے مگر اپنے گناہ سے ——— حضرت عثمانؓ
- اگر تو گناہ پر آمادہ ہے تو ایسا مقام تلاش کر جہاں خدا نہ ہو ——— حضرت عثمانؓ
- جانور اپنے مالک کو پہچانتا ہے لیکن انسان اپنے خدا کو نہیں پہچانتا ——— حضرت عثمانؓ
- گناہوں پر نادم ہونا ان کو مٹا دیتا ہے اور نیکیوں پر مغرور ہونا ان کو برباد کر دیتا ہے ——— حضرت علیؓ
- علم مال سے بہتر ہے کیونکہ وہ تمہاری حفاظت کرتا اور تم مال کی حفاظت کرتے ہو ——— حضرت علیؓ
- جو لوگ تجھ سے زیادہ علم رکھتے ہیں ان سے حاصل کر اور جو تجھ کم علم ہیں ان کو علم سکھا ——— حضرت علیؓ

مرسلہ: شگفتہ ناز، برنالہ فیصل آباد

بھی لیتے ہیں؟ مہمانوں کو کھانا سرو کرنا شاید پرسنل اسسٹنٹ کی ذمے داری نہیں ہوتی؟" میرا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

"آپ درست فرما رہی ہیں ڈاکٹر صاحبہ!" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "لیکن خرم صاحب کے خاص اور وی آئی پی قسم کے مہمانوں کو سرو کرنا میری ذمے داری ہے۔"

"آپ نے تو اب تک اپنا نام بھی نہیں بتایا؟" میں نے پوچھا۔

"میرا نام فائزہ ہے۔" وہ مسکرا کر بولی "اور پلیز، اب کھانا شروع کریں، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

اس نے پلیٹ سیدھی کر کے خود ہی میرے لیے سالن نکالنا شروع کر دیا۔

"فائزہ! کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ خرم صاحب مجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟"

وہ ایک لمحے کو جھجکی، پھر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ دروازے پر دستک دے کر خرم اندر آ گیا۔

فائزہ جلدی سے بولی "آپ کو جو کچھ پوچھنا ہے، آپ خود ہی خرم صاحب سے پوچھ لیں۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئی۔

میں نے خرم کو غور جائزہ لیا۔ اس وقت وہ کاٹن کے کلف دار سفید بے داغ شلوار سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا "ڈاکٹر صاحب! میں جانتا ہوں، آپ صبح سے بھوکی ہیں پلیز کھانا شروع کریں۔"

"پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ مجھے کیوں اغوا کیا گیا ہے۔ آپ کو میرے ڈیڈی سے کتنا تاوان چاہیے؟"

"میں آپ کو کتنی دفعہ بتاؤں کہ اس سلسلے میں اغوا کا لفظ استعمال مت کریں۔ ہم کسی بھی غیر قانونی یا ناجائز مقصد کے لیے آپ کو یہاں نہیں لائے ہیں۔ ہمیں آپ کی ضرورت ہے اور وہ کام صرف آپ ہی کر سکتی ہیں۔ کام مکمل ہونے کے بعد آپ کو باعزت طور پر آپ کے گھر پہنچا دیا جائے گا اور آپ کے اس تعاون کا بھی خاطر خواہ معاوضہ دیا جائے گا جو آپ ہمیں دیں گی۔" اس نے حسب معمول نرم لہجے میں کہا۔

"اب وہ کام بھی بتا دیں جس کے لیے آپ کو مجھ جیسی ایک ڈاکٹر کی ضرورت پڑ گئی۔" میں کوشش کے باوجود اپنے طنز کو نہ چھپا سکی۔

"آپ پلیز پہلے کھانا کھائیں، پھر آپ کو کام بھی بتا دیا جائے گا۔"

"نہیں مسٹر خرم!" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "میں

اس وقت تک کھانے کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گی جب تک آپ مجھے یہاں لانے کا مقصد نہیں بتائیں گے۔" میں نے کچھ توقف کیا پھر بولی "اور اس بات کی گیارنٹی ہے کہ آپ کام ہونے کے بعد مجھے واپس پہنچا دیں گے؟"

میری بات سن کر خرم بے اختیار ہنسنے لگا اور بولا "آپ کو شاید اب تک یقین نہیں آیا کہ میں ہی یہاں کا باس ہوں۔ میرے تمام ساتھی بھی میری طرح پڑھے لکھے ہیں اور مہذب ہیں۔"

"جی ہاں، ان میں سے ایک کی شائستگی کا مظاہرہ تو میں بھی دیکھ چکی ہوں۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"آپ فرید کی بات کر رہی ہیں یار اجا کی؟"

"فرید تو خاصا معقول آدمی ہے لیکن یہ آدمی راجا انتہائی بدتہذیب اور جاہل ہے۔ اسے تو خواتین سے بات کرنے کی بھی تمیز نہیں ہے۔"

"مجھے علم ہوا تھا کہ اس نے آپ کے ساتھ بدسلوکی کی تھی۔ میں اسے اس کی سزا بھی دے چکا ہوں اور اس کی طرف سے معافی چاہتا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو میں ..... اسے بھی آپ سے معافی مانگنے پر مجبور کر سکتا ہوں۔"

"نہیں خرم صاحب! مجھے اس کا رویہ نا گوار گزرا تو میں نے آپ سے کہہ دیا۔ یوں بھی اغوا اور جرائم کی وارداتوں میں آپ مجرموں سے کسی عالمانہ گفتگو یا خوبصورت طرزِ عمل کی توقع تو نہیں رکھ سکتے۔"

"ڈاکٹر صاحبہ! میں نے عرض کیا تھا کہ میرے ساتھیوں کی اکثریت تعلیم یافتہ ہے۔ ان میں چند ایسے لوگ ہیں جو تعلیم سے بے بہرہ ہیں لیکن ہم سب میں ایک قدر مشترک ہے کہ ہم سب معاشرے کے کچلے ہوئے، ٹھکرائے ہوئے لوگ ہیں اور سچ کہوں تو ہماری اعلیٰ تعلیم اور بڑی بڑی ڈگریاں ہی ہماری سب سے بڑی دشمن ہیں ورنہ ..... وہ بات کرتے کرتے خاموش ہو گیا "آپ نے ابھی تک کھانے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ کھانا تو بالکل ٹھنڈا ہو گیا۔" پھر اس نے بلند آواز میں کہا "فائزہ!"

دوسرے ہی لمحے سیاہ کومل سی وہ لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔

"باتوں میں ڈاکٹر صاحبہ کا کھانا ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ اسے پلیز گرم کر کے لے آؤ۔"

"اس بے چاری کو کہاں زحمت دیں گے خرم صاحب! میں ....."

لیزر

لیزر روشنی کی ایک خاص قسم ہے۔ عام روشنی کی طرح لیزر بھی ایک طرح کی برقی مقناطیسی توانائی ہے۔ البتہ عام روشنی مختلف طول موج (Wavelength) اور تعدد (Frequency) والی لہروں پر مشتمل ہوتی ہے جبکہ لیزر یکساں طول موج اور تعدد کی حامل ہوتی ہے۔

عام روشنی کی شعاع (Beam) فاصلے کے ساتھ پھیلتی جاتی ہے لیکن لیزر فاصلے کے ساتھ بہت کم پھیلتی ہے اسی لیے اسے بہتر طور پر مرکوز کیا جا سکتا ہے اور یہ کسی چھوٹی سی جگہ پر اپنی توانائی منتقل کر سکتی ہے۔ اسی وجہ سے لیزر کو "یک جہت" بھی کہا جاتا ہے۔ لیزر میں تمام برقی مقناطیسی موجیں ایک دوسرے سے مکمل طور پر ہم آہنگ (Coherent) ہوتی ہیں۔

لیزر میں شامل موجیں اتنی زیادہ ہم آہنگ ہوتی ہیں کہ اوسطاً دس ہزار کھرب موجوں میں سے کوئی ایک موج ہی مختلف ہوتی ہے۔ لیزر ان چیزوں میں سے ہے جو بنیادی سائنس میں تحقیق کی اہمیت ثابت کرتی ہیں۔

لفظ "لیزر (Laser)" اتنا عام ہو چکا ہے کہ آج ہم اسے کسی چیز کا نام سمجھتے ہیں حالانکہ یہ Light Amplification by Stimulated Emission of Radiation کا مخفف ہے، جس کا مطلب ہے "اشعاع کے برانگیختہ اخراج سے روشنی کی افزودگی" یہ دقیق اصطلاح سمجھنے کے لیے ہمیں ایٹم کی ساخت اور برقی مقناطیسی توانائی کی ہیئت پر غور کرنا پڑے گا۔

انتخاب: نبیلہ اظہر، کراچی

"زحمت کیسی! مائیکرو ویو اوون میں ایک منٹ بھی نہیں لگے گا۔" فائزہ مسکراتے ہوئے کھانے کی ٹرالی لے گئی۔

"خرم صاحب!" میں نے سنجیدگی سے کہا "آپ نے اب تک یہ نہیں بتایا کہ مجھے گن پوائنٹ پر یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ اگر آپ کے ساتھیوں میں سے کوئی بیمار ہے تو میں اس کا زیادہ بہتر علاج نہیں کر سکوں گی۔ ہاں معمولی نزلے، بخار اور اسی قسم کی دوسری عام بیماریوں کا علاج کر سکتی ہوں لیکن ان بیماریوں کا علاج تو کوئی بھی جنرل پریکٹیشنر کر سکتا ہے۔ آپ

جانتے ہیں کہ میں گائنا کولوجسٹ ہوں اور۔۔۔۔''

''آپ کو اسی لیے یہاں لایا گیا ہے۔'' خرم نے سنجیدگی سے کہا اور پہلی دفعہ اس کے پُرکشش چہرے پر فکر و تردّد کے اثرات ظاہر ہوئے ''میں نے یہاں آپ کو اپنی بیوی کے لیے بلایا ہے۔''

مجھے ایسا لگا جیسے میرے اندر چھناکے سے کچھ ٹوٹ گیا ہو۔ گویا جس شخص کو میں اپنا آئیڈیل سمجھ رہی تھی، وہ کسی اور کا تھا۔

میں نے اپنے جذبات کو بہ مشکل تمام چھپایا اور آہستہ سے بولی ''کہاں ہیں آپ کی وائف اور انہیں کیا تکلیف ہے؟''

''آپ پہلے کھانا کھالیں۔'' اس نے فائزہ کے کمرے میں داخلے پر کہا ''کھانا کھا کر آرام کریں۔ آپ کے چہرے پر شدید تھکن کے آثار ہیں، سارہ سے آپ صبح مل لیجیے گا۔''

☆☆☆

دوسری صبح خاصی خوشگوار تھی۔ جنگل میں گھرا ہوا وہ بنگلا بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ میں تو سحر خیزی کی عادی تھی۔ علی الصباح ہزاروں پرندوں کی سریلی آوازوں کا شور مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا اور تھوڑی دیر کے لیے میں بھلا بیٹھی تھی کہ میں یہاں مہمان نہیں بلکہ ایک قیدی ہوں۔

خرم بھی غالباً منہ اندھیرے اٹھنے کا عادی تھا۔ وہ بنگلے کے داخلی دروازے سے بھاگتا ہوا آیا تو میں سمجھ گئی کہ وہ جاگنگ کر کے آیا ہے۔ پھر اس نے اپنے ایک ساتھی کی مدد سے لان میں کچھ دیر ایکسرسائز کی۔ وہ ایکسرسائز سے فارغ ہوا تو فائزہ ایک ٹرے میں جوس کا گلاس اور دوسرے ہاتھ میں تولیا لیے کھڑی تھی۔

جوس پیتے ہوئے اچانک اس کی نظر لان کے اس گوشے میں پڑی جہاں میں کھڑی تھی۔ وہ جوس کا گلاس لیے ہوئے میری طرف چلا آیا اور حیرت سے بولا ''ڈاکٹر صاحبہ! آپ واقعی اتنی صبح بیدار ہو جاتی ہیں یا رات بھر نیند نہیں آئی؟''

''مجھے رات کو بہت پُرسکون نیند آئی۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''میں صبح فجر کی نماز کے لیے اٹھ جاتی ہوں۔ اب آپ ذرا مجھے مریضہ سے ملوا دیں تو میں دیکھوں کہ انہیں کیا بیماری ہے؟''

''سارہ بیمار نہیں ہے بلکہ وہ امید سے ہے۔ ڈلیوری دو تین دن میں متوقع ہے۔'' خرم نے جواب دیا۔

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

اسی وقت فائزہ میرے لیے بھی جوس کا گلاس لے آئی۔

''اس سے پہلے ایک لیڈی ڈاکٹر ہر ہفتے، دس دن کے بعد سارہ کے معائنے کے لیے آتی تھی۔ اس کا اندازہ ہے کہ سارہ کا کیس خاصا پیچیدہ ہے۔ اسی لیڈی ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اس کیس کو صرف تین لیڈی ڈاکٹرز ہی حل کر سکتی ہیں، ڈاکٹر رخسانہ اقبال، وہ اس وقت ایک سیمینار کے سلسلے میں پاکستان سے باہر ہیں۔ دوسری ڈاکٹر انیتا ہیں جو لاہور میں رہتی ہیں۔ انہیں یہاں لانا ناممکن تو نہیں تھا لیکن مشکل ضرور تھا۔ یوں بھی انہیں لاہور سے یہاں تک لانے میں خاصا وقت درکار تھا۔

تیسری ڈاکٹر آپ ہیں مس شائستہ!'' خرم نے کہا، پھر وہ اچانک جذباتی ہو گیا ''ڈاکٹر صاحبہ! پلیز میری سارہ کو بچالیں۔ میں جب تک زندہ رہا، آپ کا احسان مند رہوں گا۔'' اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں نم ہو گئیں۔ پھر وہ مسکرا کر بولا ''میں بھی عجیب آدمی ہوں۔ مریضہ کو اٹھائے بغیر نہ جانے کیا کیا بولے جا رہا ہوں۔'' وہ برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا ''آپ پہلے ناشتا کر لیں۔ پھر میں آپ کو سارہ سے ملواتا ہوں۔''

''خرم صاحب! میں ایک ڈاکٹر ہوں، یہ کھانا، ناشتا وغیرہ میرے لیے زیادہ اہم نہیں ہے، مریضہ میرے لیے زیادہ اہم ہے۔ آپ مجھے سارہ کے پاس لے چلیں۔''

خرم نے بے نیازی سے شانے اچکائے اور بولا ''آئیے تو پہلے سارہ ہی کا معائنہ کر لیں۔''

میں نے سارہ کو دیکھا تو دیکھتی رہ گئی۔ وہ واقعی بہت حسین تھی اور خرم ہی جیسے کسی شخص کی رفاقت کی اہل تھی۔ اس کا چاند سا مکھڑا گھنے، چمک دار اور سیاہی مائل براؤن بالوں میں دمک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک ملکوتی مسکراہٹ تھی اور اس احساس سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا کہ وہ عنقریب ماں بننے والی ہے۔

میں نے خرم اور فائزہ کو کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

خرم باہر جاتے ہوئے بولا ''ڈاکٹر! فائزہ ایک تربیت یافتہ نرس ہے اور یہ تین سال تک کراچی کے ایک معروف میٹرنٹی ہوم میں ملازمت کر چکی ہے۔''

''اوہو، آپ تو چھپی رستم نکلیں فائزہ!'' میں نے ہنس کر کہا۔

پھر میں نے سارہ کا تفصیلی چیک اپ کیا۔ وہاں اسٹیتھسکوپ سے لے کر ہر وہ چیز موجود تھی چیک اپ کے دوران جس کی مجھے ضرورت پڑ سکتی تھی۔ وہ کمرا بھی کسی کلینک

جیل کے سیاست خانے میں ہفتہ کے ہفتہ جو حجام ہمارے بال تراشتا تھا، ہم نے اس کے عجیب و غریب حلیے کی وجہ سے اس کا نام حاتم طائی رکھ چھوڑا تھا۔ ایک دن میں نے اور ظہیر کاشمیری نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ چوری چکاری بُرا کام ہے، وغیرہ وغیرہ۔ وہ ہمارے سامنے زمین پر بیٹھ گیا اور بڑی پُراسرار آواز میں بولا ''آپ لوگ یونین وونین بناتے رہتے ہیں مگر افسوس ہے کہ آپ نے ہم لوگوں کی کوئی یونین نہیں بنائی حالانکہ ہمیں اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ چوروں کی یونین اس لیے بھی ضروری ہے کہ بعض چور بالکل لاوارث ہوتے ہیں۔ ان کا نہ کوئی مقدمہ لڑتا ہے نہ کوئی ان سے ملاقات کرنے آتا ہے۔ اگر یونین ہو تو مقدمہ لڑے، ان کو ضرورت کا سامان پہنچائے اور ان کی خبرگیری کرتی رہے۔''

ظہیر کاشمیری نے کوئی جواب نہ دیا تو حاتم طائی نے کہا ''چور دنیا میں سب سے زیادہ مظلوم ہوتا ہے۔ جب اسے کوئی اور ذریعہ میسر نہیں آتا تو وہ پیٹ پالنے کیلیے چوری کرتا ہے اس لیے اس کی یونین آپ کو بنانی ہی پڑے گی۔ پریذیڈنٹ آپ ہی بن جائیے۔''

''کال کوٹھری'' سے ایک اقتباس ——— حمید اختر

کا چیک اپ روم ہی لگ رہا تھا۔

مجھے سارہ کے ابتدائی معائنے کے بعد ہی علم ہو گیا کہ اس کا کیس خاصا پیچیدہ ہے۔

معائنے سے فارغ ہو کر میں کمرے سے باہر نکلی تو خرم باہر کوریڈور میں ٹہل رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولا ''ڈاکٹر! کیسی کنڈیشن ہے سارہ کی؟''

''اس کی کنڈیشن بہتر ہے خرم صاحب!'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ مریضہ کے دو تین بہت ارجنٹ ٹیسٹ ہوں گے۔ ان کے نتائج کی روشنی میں کوئی حتمی جواب دے سکوں گی۔''

''دو تین ٹیسٹ!'' خرم خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ''ڈاکٹر! کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم ان کے سیمپل لیبارٹری بھجوا دیں۔ میں وہ ٹیسٹ ارجنٹ کرا لوں گا اور ان کی رپورٹ ہمیں آج رات تک مل جائے گی۔''

''مریضہ کے خون اور دوسرے ٹیسٹ کے لیے سیمپل تو لیبارٹری بھیجے جا سکتے ہیں لیکن اس وقت ان کا الٹراساؤنڈ بہت ضروری ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور الٹراساؤنڈ کے لیے مریضہ کو خود ہی جانا پڑے گا۔''

''یہ ناممکن ہے ڈاکٹر صاحبہ!'' خرم نے کہا ''سارہ کی موجودہ حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ اتنا طویل سفر کر سکے، شہر میں قانون کے محافظ میری تلاش میں سرگرداں ہیں۔ سارہ کے الٹراساؤنڈ سے پہلے کوئی اندھی گولی مجھے بھی چاٹ جائے گی۔''

''لیکن اگر مریضہ کا الٹراساؤنڈ نہ ہوا تو ان کے ساتھ ساتھ بچے کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''واہ ڈاکٹر صاحبہ!'' خرم طنز سے بولا۔ ''میں نے تو بہت نام سنا تھا آپ کا کہ آپ گنتی کی چند گائنا کولوجسٹ میں سے ایک ہیں۔ یہ الٹراساؤنڈ وغیرہ تو ابھی چند برس پہلے کی ایجاد ہے، اس سے پہلے ڈاکٹرز کیا کرتے تھے؟''

''کچھ بھی نہیں کرتے تھے۔ اپنی مہارت سے کام کرتے تھے اور کامیابی کے امکانات ففٹی ففٹی تو نہیں سیونٹی تھرٹی ہوتے تھے۔ کیا میں آپ کو یاد دلاؤں کہ اب سے پچیس تیس سال پہلے ڈلیوری کے دوران میں خواتین کی شرح اموات کیا تھی؟''

''ڈاکٹر صاحبہ!'' خرم چیخ کر بولا ''میں آپ کو یہاں پکنک منانے نہیں لایا ہوں۔ اگر میری سارہ کو کچھ ہو گیا تو میں اس شہر کو جہنم کا نمونہ بنا دوں گا پھر آپ بھی یہاں سے زندہ نہیں جائیں گی۔'' اس کا چہرہ جذبات کی شدت سے سرخ ہو گیا۔

''اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میری جان لے کر آپ کی وائف کی جان بچ سکتی ہے تو ضرور ایسا کریں۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

خرم چند لمحے تک خالی الذہنی کے عالم میں مجھے دیکھتا رہا، پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا ''آئی ایم سوری ڈاکٹر! مجھے معاف کر دیں۔ میرا دماغ اس وقت ماؤف ہو رہا ہے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ آپ پلیز میری سارہ کو بچالیں.... پلیز ڈاکٹر!'' وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

ایک لمحے کو مجھے سارہ کی قسمت پر رشک بھی آیا کہ اتنا شاندار مرد، اتنا مضبوط آدمی اس کے لیے یوں بلک بلک کر

رو رہا تھا۔ پھر میرا دل پسیج گیا۔ میں نے کہا ''خرم صاحب! میں بغیر الٹراساؤنڈ کے ڈیلیوری کی کوشش کروں گی لیکن اس میں خاصا رسک ہے۔ اگر آپ یہ رسک برداشت کرنے کو تیار ہیں تو میں اپنی سی پوری کوشش کروں گی۔''

''کیسا رسک ڈاکٹر!'' خرم نے پوچھا۔

''دیکھیے، اگر کوئی پیچیدگی ہوئی تو ماں یا بچے کی جان کو یا دونوں کی جان کو خطرہ ہوسکتا ہے۔''

اس نے معصومیت سے میری طرف دیکھا، پھر بچوں کی طرح بولا ''کوئی ایسا طریقہ نہیں ہوسکتا ڈاکٹر..... کہ ایسا کوئی خطرہ نہ ہو..... یا پھر..... آپ..... صرف سارہ ہی کو بچالیں۔''

''خرم صاحب! میں اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لاؤں گی لیکن نتیجہ تو اس معبود کے ہاتھ میں ہے جس کے قبضے میں ہم سب کی جان ہے۔ بس ایک ہی طریقہ ہے کہ آپ اس معبودِ حقیقی سے اپنی بیوی اور بچے کی سلامتی کے لیے دعا کریں۔ وہ دعاؤں کو قبول فرمانے والا ہے۔ سچے دل سے مانگی ہوئی دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔''

''ٹھیک ہے ڈاکٹر! آپ اپنا کام شروع کریں۔ اگر سارہ کی زندگی ہوئی تو وہ بچ جائے گی۔''

''میرے حساب سے ابھی ڈیلیوری میں چوبیس گھنٹے کا وقت ہے۔ میں آپ کو سارہ کا بلڈ سپیسل دے رہی ہوں۔ کم از کم لیبارٹری میں اسے تو چیک کرالیں۔''

''ہاں، یہ کام تو آج شام تک ہوجائے گا۔'' خرم نے کہا۔

پھر میں نے مختلف ٹیسٹ کے لیے دو تین ٹیوبس میں سارہ کے خون کا نمونہ دیا جسے اس نے فوراً ہی اپنے ایک آدمی کے ذریعے شہر روانہ کردیا۔

''میں کل فجر کی نماز کے بعد سارہ کو انجکشن دوں گی۔ اس کے بعد اصل مرحلہ شروع ہوگا۔'' میں نے کہا۔

پھر ہم لوگ ڈرائنگ روم میں آبیٹھے۔ سارہ گہری نیند سو رہی تھی۔ خرم نے فائزہ کو بھی سونے کے لیے بھیج دیا کہ صبح اس کا تازہ دم ہونا بہت ضروری تھا۔

''خرم صاحب!'' میں نے کہا ''مجھے آپ کی زندگی کے بارے میں جاننے کا کوئی حق تو نہیں ہے لیکن.....''

''میں سمجھ گیا۔'' خرم مسکرا کر بولا ''آپ یہی جاننا چاہتی ہیں کہ میں نے برائی کا یہ راستہ کیوں منتخب کیا؟'' پھر وہ خلا میں تکنے لگا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بولنے کے لیے مناسب الفاظ تلاش کررہا ہو۔

☆☆☆

ہماری زندگی بہت خوش و خرم گزر رہی تھی۔ ہمارا چھوٹا سا خاندان تھا۔ امی ابو، میں اور مجھ سے چھوٹی عالیہ! ابو ایک سرکاری ادارے میں ملازم تھے۔ وہ اپنی محنت اور لگن سے ترقی کرتے ہوئے گریڈ اٹھارہ تک پہنچ چکے تھے۔ ابو چاہتے تھے کہ میں ڈاکٹر بنوں لیکن میرا رجحان ادب کی طرف تھا۔ میں نے یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کرلیا۔ عالیہ ان دنوں انٹرمیڈیٹ کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی۔ وہ انتہائی ذہین لڑکی تھی۔ اس نے محنت بھی بہت کی تھی۔ اسے یقین تھا کہ انٹرمیڈیٹ میں اس کے اتنے نمبر آجائیں گے کہ اسے بہت آسانی سے میڈیکل کالج میں داخلہ مل جائے گا۔ ابو کہتے تھے کہ میرا خواب خرم نے تو پورا نہیں کیا لیکن عالیہ ضرور پورا کرے گی۔

اب یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ مطلوبہ نمبروں سے اس کے صرف بارہ نمبر کم تھے۔ یوں ایم بی بی ایس میں داخلے کے لیے لگنے والی پہلی لسٹ میں اس کا نام نہیں تھا۔ وہ بے چاری بہت افسردہ تھی۔ اس نے دو دن تک برائے نام کھانا کھایا تھا اور ہنسنا تو جیسے وہ بھول گئی تھی۔

امی نے ابو سے کہا بھی کہ آپ اتنی بڑی پوسٹ پر ہیں، آپ کا کوئی تو جاننے والا ہوگا۔ آپ اپنی بیٹی کے لیے تو سفارش کرسکتے ہیں۔

ابو کو بھی اصول پسندی اور ایمان داری کا عارضہ لاحق تھا۔ اس لیے انہوں نے صاف انکار کردیا۔

مجھ سے عالیہ کی حالت دیکھی نہیں جارہی تھی۔ میں اکثر ابو کے دفتر جاتا تھا اور ابو کے باس نعمان صاحب مجھے پسند بھی کرتے تھے۔ میں نے سوچا، میں خود ہی نعمان صاحب سے بات کرتا ہوں۔ ممکن ہے ان کا کوئی جاننے والا عالیہ کی سفارش کرادے۔

میں وہ سرے دن ابو کے آفس پہنچ گیا۔ نعمان صاحب کا کمرا ابو کے کمرے سے کچھ فاصلے پر تھا۔ میں ابو کی نظروں میں آئے بغیر ان سے مل سکتا تھا۔

میں نے چپراسی کے ذریعے نعمان صاحب کو پیغام بھجوایا تو انہوں نے فوراً ہی مجھے بلالیا اور بولے ''خرم بیٹا! خیریت تو ہے، تمہارے ابو سے تو ابھی کچھ دیر پہلے میری ملاقات ہوئی تھی، وہ تو.....''

''انکل! میں خاص طور پر آپ کے پاس ایک کام کے

لیے آیا ہوں لیکن ابو کو اس بات کا علم نہ ہو۔'' پھر میں نے انہیں عالیہ کے بارے میں بتایا۔

میری بات سن کر وہ فوراً ہی مسکرا کر بولے ''ارے، یہ بھی کوئی مسئلہ ہے۔ رفیع الدین صاحب کے ایک فون پر کام ہوجائے گا۔ تمہارے ابو سے بھی ان کی اچھی دوستی ہے۔ میں بھی ان سے بات کرتا ہوں۔'' انہوں نے فون کا رسیور اٹھا کر اپنے پی اے سے کہا ''ذرا رفیع الدین صاحب سے بات کرائیں۔''

دوسرے ہی لمحے رفیع الدین صاحب لائن پر تھے۔ نعمان صاحب نے کہا ''سر، آپ کو تھوڑی زحمت دینا ہے۔ میری بھتیجی عالیہ میڈیکل کالج میں ایڈمیشن لینا چاہ رہی ہے۔ اس کے صرف بارہ نمبر کم ہیں اور..... جی ہاں، صرف بارہ نمبر..... اچھا..... کب..... ٹھیک ہے سر! میں کل صبح اسے آپ کے پاس بھیج دوں گا۔'' فون سے فارغ ہوکر وہ مسکرا کر بولے ''لو میاں خرم، تمہارا کام تو ہوگیا۔ رفیع الدین صاحب ہیلتھ سیکریٹری ہیں اور بہت زندہ دل آدمی ہیں۔ تم کل صبح عالیہ بیٹی کو لے کر ان کے دفتر چلے جاؤ۔ سمجھو کہ تمہارا کام ہوگیا۔''

میں خوشی خوشی وہاں سے نکلا اور سیدھا گھر پہنچا۔ میں نے عالیہ کو یہ خوش خبری سنائی تو وہ بھی خوشی سے پاگل ہوگئی۔

میں دوسرے دن اسے لے کر رفیع الدین صاحب کے دفتر پہنچ گیا۔ وہ واقعی بہت بڑے افسر تھے اور بہت زیادہ معروف بھی تھے۔ انہوں نے ہم دونوں کو اپنے آفس میں تو بلالیا لیکن انہیں ہم سے بات کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً عالیہ کے چہرے پر نظر ڈال لیتے تھے۔ میری بہن بہت خوبصورت تھی۔ اسے جو بھی دیکھتا تھا، دیکھتا رہ جاتا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد رفیع الدین صاحب نے کہا ''خرم بیٹا! یہاں تو بات نہیں ہوسکتی۔ تم ایسا کرو، شام کو عالیہ بیٹی کے ساتھ میرے بنگلے پر آجاؤ۔''

میں شام کو عالیہ کے ساتھ ان کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ ملازم نے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھادیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ ہمارے لیے چائے اور دیگر لوازمات لے آیا۔

ابھی میں چائے پی ہی رہا تھا کہ رفیع الدین صاحب کا ملازم آیا اور عالیہ سے بولا ''عالیہ بی بی! آپ اپنی مارکس شیٹ وغیرہ لائی ہیں؟'' عالیہ نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا ''آپ کو صاحب بلا رہے ہیں۔'' پھر وہ مجھ سے بولا ''سر، آپ اطمینان

آخری الفاظ

انہیں دونوں میں جارج پنجم کا انتقال ہوگیا۔ ہم سے کہا گیا کہ تمام پروگرام روک کر صرف حزنیہ موسیقی نشر کی جائے۔ نیز خبریں پڑھتے وقت لہجہ ایسا رکھیں گویا خود خبریں پڑھنے والے کا کوئی قریبی رشتہ دار فوت ہوگیا ہو۔ آغا اشرف ان دنوں سخت کھانسی کا شکار تھے اس حالت میں انہیں خبریں اور جارج پنجم کی علالت سے موت تک کے حالات و واقعات ریڈیو پر سنانے کا فرض سونپا گیا۔ خبریں پڑھتے ہوئے آغا صاحب اس فقرہ کو ادا کرپائے تھے کہ

''حضور ملکِ معظم نے انتقال سے کوئی پانچ منٹ قبل فرمایا۔''

اچانک آغا صاحب کو کھانسی کا دورہ پڑا انہوں نے کھانسنے کے لیے ہیڈل گھمایا کہ اچانک کا تعلق دوسرے سٹوڈیوز سے کرادیا جہاں سے موسیقی نشر ہوتی تھی عین اس وقت بابا ملنگ خان طبلہ نواز غصہ میں فرمارہے تھے۔

''یہ میری ہتھوڑی کون حرامزادہ لے گیا۔''

اس طرح ریڈیو پر جو فقرہ نشر ہوا وہ یوں تھا۔

حضور ملکِ معظم نے انتقال سے کوئی پانچ منٹ قبل فرمایا ''یہ میری ہتھوڑی کون حرامزادہ لے گیا۔''

سرگزشت ڈائجسٹ کی فلائٹ کی جانب سے ارسال: عبدالشکور، میمن مسجد کراچی

سے چائے پئیں۔ اس پورشن میں کوئی نہیں آتا اس لیے ڈسٹربنس بھی نہیں ہوگی، آرام سے باتیں ہوں گی۔''

عالیہ کے جانے کے بعد مجھے عجیب سی بے چینی شروع ہوگئی۔ دس منٹ، پندرہ منٹ پھر بیس منٹ گزر گئے لیکن عالیہ واپس نہ آئی۔

جب آدھے گھنٹے سے بھی زیادہ گزر گیا تو میں مضطرب ہوکر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اندر جانے کا ارادہ کررہا تھا کہ مجھے عالیہ نظر آئی۔ اس کا حلیہ دیکھ کر میں کانپ کر رہ گیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر خراشیں تھیں، اس کی قمیص جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی اور چہرے پر عجیب سی دہشت اور

آنکھوں میں ویرانی تھی۔

میں نے وحشت زدہ لہجے میں پوچھا ''عالیہ! تو ٹھیک تو ہے، تجھے کیا ہوا ہے؟''

''سب کچھ ختم ہوگیا بھیا..... سب کچھ ختم ہوگیا.....'' وہ مجھ سے لپٹ کر بلک بلک کر رونے لگی۔

''مجھے بتا عالیہ! کیا ہوا ہے؟'' میں نے غیظ و غضب کے عالم میں پوچھا۔

''مجھے میڈیکل میں..... ایڈمیشن..... تو مل گیا ہے..... لیکن..... مجھے اس کی بہت بھاری..... قیمت چکانا پڑی ہے..... اس درندے نے میری..... عزت.....'' الفاظ اس کے حلق میں گویا اٹک گئے۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اردگرد کے تمام منظر غائب ہوگئے اور مجھے ہر طرف خون ہی خون نظر آنے لگا۔

میں جھپٹ کر اس کمرے میں داخل ہوگیا جس میں سے عالیہ نکلی تھی۔ وہ بدمعاش رفیع الدین بیڈ پر نیم دراز تھا۔ اس کے نزدیک ہی تپائی پر شراب کی آدھی سے بھی کم بوتل اور گلاس رکھا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ درشت لہجے میں بولا ''تو اندر کیسے آیا، گیٹ لاسٹ!'' اس کی زبان میں لڑکھڑاہٹ تھی۔

اس کا ہتک آمیز لہجہ سن کر میں مزید بپھر گیا۔ سامنے ہی سائڈ ریک پر ماربل کا ایک بھاری گلدان رکھا ہوا تھا۔ میں نے جھپٹ کر وہ گلدان اٹھالیا اور اس کے سر پر اتنی قوت سے وار کیا کہ اس کی کھوپڑی چیخ گئی۔ میں نے ایک ہی وار پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پے در پے اس کے سر اور چہرے پر پوری قوت سے کئی وار کردیے۔

اس کا چہرہ مسخ ہوگیا اور کھوپڑی بالکل پچک گئی۔ اس کے خون کے چھینٹے میرے کپڑوں پر بھی آئے۔ اس کے مسخ شدہ چہرے پر حیرت سے پھٹی ہوئی دو آنکھیں بہت بھیانک لگ رہی تھیں۔ چند لمحے پہلے تک اس نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ یہ اس کی زندگی کے آخری پل ہیں۔

میں نے تھکے تھکے انداز میں گل دان وہیں پھینکا اور اس کی لاش کو دیکھتا رہا۔ میرا ذہن گویا بالکل ماؤف ہوکر رہ گیا تھا۔

اچانک مجھے عالیہ کا خیال آیا۔ میں دیوانہ وار کمرے سے باہر نکلا۔ عالیہ نیم بے ہوشی کی حالت میں فرش پر پڑی تھی۔ میں نے اسے ہلایا جلایا لیکن وہ ہوش و خرد سے بیگانہ تھی۔ میں وہاں زیادہ دیر رک بھی نہیں سکتا تھا۔ بنگلے کے ملازمین میں سے کوئی بھی اس طرف آسکتا تھا۔

میں نے عالیہ کو اٹھا کر کندھے پر لادا تو اسے ہوش آنے لگا۔

ملازمین کے علاوہ سب سے زیادہ خطرہ مجھے گارڈز کی طرف سے تھا جو بنگلے کے گیٹ پر موجود تھے۔

''میں..... ٹھیک..... ہوں..... بھیا..... مجھے.....''

میں نے عالیہ کو کندھے سے اتارا اور آہستگی سے فرش پر کھڑا کردیا۔

جب وہ آئی تھی تو اس نے جسم پر بڑی سی ایک چادر بھی لپیٹ رکھی تھی۔ وہ چادر اس وقت اس کے جسم پر نہیں تھی۔

میں دوبارہ رفیع الدین کے کمرے میں پہنچا۔ اس کی لاش ابھی تک اسی حالت میں پڑی تھی۔ نزدیک ہی صوفے پر عالیہ کی چادر پڑی تھی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میرے چہرے، ہاتھوں اور کپڑوں پر بھی تو خون کے چھینٹے ہیں۔

میں جھپٹ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ آئینے میں دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ میرے چہرے اور کپڑوں پر خون کے اتنے چھینٹے تھے کہ باہر نکلتے ہی رفیع الدین کے گارڈز مجھے پکڑ لیتے۔

میں نے گرم پانی سے منہ اور ہاتھ دھوئے اور کپڑوں پر سے بھی حتی الامکان خون کے چھینٹے صاف کردیے۔

پھر میں نے باتھ روم سے نکل کر عالیہ کی چادر اٹھائی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

میں نے عالیہ کے بکھرے ہوئے بال ہاتھوں سے سنوارے، چادر کے ساتھ اس کا شولڈر بیگ بھی تھا۔ میں نے بیگ اس کے شانے سے لٹکا کر اسے چادر اوڑھا دی اور اسے لے کر پُراعتماد انداز میں باہر کی طرف چل دیا۔

ہم لوگوں کو دیکھ کر گارڈز نے کوئی تعرض نہیں کیا کیونکہ کچھ دیر پہلے وہ ہمیں اندر جاتا دیکھ چکے تھے۔

بنگلے سے باہر نکلتے ہی مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔ میں عالیہ کو لے کر سیدھا گھر پہنچا۔ امی اور ابو ہمیں اس حالت میں دیکھ کر گھبرا گئے۔

عالیہ نے ابو سے تو کچھ نہیں کہا، امی کو سر کوشیوں میں ساری بات بتادی۔ پھر وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

''ابو!'' میں نے وحشت زدہ لہجے میں کہا ''آپ امی اور عالیہ کو لے کر فوری طور پر یہاں سے نکل اور غائب ہوجائیں۔''

''کیوں؟'' ابو نے مجھے گھورا ''ایسا کیا ہوگیا ہے کہ میں یوں چوروں کی طرح فرار ہوجاؤں؟''

''ابو! میرے ہاتھوں سے ایک قتل ہوگیا ہے۔'' میں نے کہا۔

ابو کے ہاتھ میں اس وقت پانی کا گلاس تھا۔ وہ اچانک ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ حیرت سے بولے۔ ''کیا..... کیا کہا تم نے؟ تمہارے ہاتھوں سے کوئی قتل ہوگیا ہے؟''

''جی ابو!'' میں نے سر جھکا کر کہا، پھر بلا کسی کم و کاست انہیں پوری بات تفصیل سے بتادی۔

''کس نے کہا تھا کہ تم عالیہ کو لے کر اس لوفر آدمی کے گھر جاؤ؟'' ابو درشت لہجے میں بولے ''میں اس گھٹیا شخص کو اچھی طرح جانتا ہوں اور یہ حرکت اس نے پہلی دفعہ نہیں کی ہے۔''

''ابو، مجھے معلوم نہیں تھا کہ رفیع الدین اس قسم کا گھٹیا آدمی ہے۔'' میں نے کہا ''اب پلیز، آپ میری بات مان لیں، پولیس بھی یہاں پہنچنے ہی والی ہوگی۔ آپ نہیں جانتے کہ وہ لوگ قاتل کے لواحقین سے کس قسم کا سلوک کرتے ہیں۔ وہ قاتل کے پورے گھر کو پکڑ کر تھانے لے جاتے ہیں۔''

''تم ہوش میں تو ہو۔'' ابو نے درشت لہجے میں کہا ''اور تم خود کہاں جارہے ہو، جو وہ لوگ ہمیں گرفتار کریں گے۔''

''میں مرجانا بہتر سمجھتا ہوں۔'' میں نے بھنا کر کہا ''میں خود کو قانون کے حوالے نہیں کروں گا۔''

''تو پھر جو تمہاری مرضی میں آئے کرو۔'' ابو درشت لہجے میں بولے ''ابھی تو قتل اشتعال کا نتیجہ ہے۔ تمہیں زیادہ سزا نہیں ہوگی لیکن...''

''لیکن ابو، آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ اس کے بعد ہماری کیا عزت رہ جائے گی۔ میڈیا اس خبر کو نمک مرچ لگا کر شائع کرے گا۔ کورٹ میں عالیہ پر اتنی کیچڑ اچھالی جائے گی کہ مجھے مرنے کے بعد بھی سکون نصیب نہیں ہوگا۔''

''تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو کرو۔'' ابو نے تھکے تھکے لہجے میں کہا ''میری فکر مت کرو۔ میں کوئی نہ کوئی بار ریڈھی والا نہیں کر پولیس مجھے ہانکتے ہوئے تھانے لے جائے گی۔''

ابو سے بحث کرنا فضول تھی۔ میں نے عجلت میں کپڑے بدلے، امی نے جاتے ہوئے کچھ روپے میری جیب میں ٹھونس دیے۔ وہ یوں بلک بلک کر رو رہی تھیں جیسے میری موت واقع ہوگئی ہو۔ عالیہ البتہ گم صم تھی۔ وہ خالی الذہنی کے عالم میں دیواروں کو تک رہی تھی۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تب بھی اس کی حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

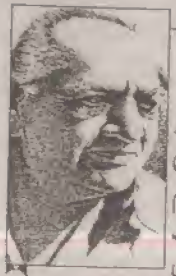

ایک المیہ

ایک روز ہماری اردو ٹیچر مسز شجاع نے حاضری لیتے وقت جب میرا نام سلیمہ فیض پکارا تو رک گئیں۔ کہنے لگیں ''تم فیض احمد فیض مشہور شاعر کی کچھ لگتی تو نہیں ہو؟'' میں نے کھڑے ہوکر کہا ''فیض میرے والد ہیں۔'' ساری کلاس نے میری طرف دیکھا۔ اس ٹیچر نے ابو کے بہت سے شعر سنائے۔ میں شعر سن رہی تھی اور خوش ہورہی تھی۔ میرا دل نہ جانے کیوں ابو کے پیار کے گہرے سمندر میں ہچکیاں لیتا ہوا ڈوب گیا۔ پھر یکایک اس ٹیچر نے ابو کو گالیاں دینی شروع کردیں۔ میں سمجھ نہ سکی، شاید اسے یاد آگیا کہ ابو جیل میں ہیں اور حکومت ان کے خلاف ہے۔ یہ ملازم پیشہ لوگوں کا ازلی المیہ ہے۔

فیض احمد فیض کی بیٹی سلیمہ ہاشمی کی یادداشتوں سے

میں نے گھر کے در و دیوار اور اس کے مکینوں پر الوداعی نظر ڈالی اور گھر سے نکل گیا۔

ابھی میں مین روڈ تک پہنچا ہی تھا کہ مجھے پولیس کی ایک موبائل وین تیز رفتاری سے اپنے گھر کی طرف جاتی نظر آئی۔

اسی وقت ایک بس آگئی اور میں بغیر سوچے سمجھے اس میں سوار ہوگیا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب میں کہاں جاؤں؟ میں نے اپنے دوستوں کے بارے میں سوچا لیکن ان میں سے مجھے کوئی بھی ایسا نظر نہیں آیا جو ابتلا کی اس گھڑی میں میرا ساتھ دے سکتا۔

میں اس بس سے ایسی جگہ اتر گیا جہاں سے مختلف شہروں کے لیے بسیں ملتی تھیں۔

میں میرپور خاص جانے والی ایک بس میں سوار ہوگیا۔ میرے پاس کپڑوں کا صرف ایک بیگ اور جیب میں تقریباً

دو ہزار روپے تھے۔

بس جب تک کراچی کی حدود سے باہر نہیں نکل گئی، مجھے یہی دھڑکا لگا رہا کہ ابھی پولیس والے مجھے ڈھونڈتے ہوئے آئیں گے اور بس رکوا کر مجھے گرفتار کرلیں گے۔

بس جب حیدرآباد کی حدود سے بھی باہر نکل گئی تو میں نے سکون کا سانس لیا لیکن میرا یہ سکون عارضی ثابت ہوا۔ حیدرآباد سے چلنے کے بعد بس نے شاید آدھے گھنٹے کا سفر طے کیا ہوگا کہ مجھے بس کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں سڑک مسدود نظر آئی۔ سڑک پر کٹا ہوا ایک درخت ڈال کر راستہ مسدود کردیا گیا تھا۔

بس کے رکتے ہی دونوں طرف کی جھاڑیوں سے چند آدمی برآمد ہوئے۔ ان کے چہرے وحشت ناک تھے۔ چہروں پر گھنی داڑھیاں تھیں اور شانوں سے کلاشن کوف اور ریوالور لٹک رہے تھے۔

ان میں سے دو آدمی بس میں چڑھ آئے اور بولے۔ ''بابا، کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔ تم لوگ آرام سے بیٹھو، ہاں اگر کسی نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو میں اسے گولی مارنے میں دیر نہیں کروں گا۔ اب اپنے ہاتھ سر پر رکھو اور سب لوگ نیچے اتر آؤ۔ عورتیں نیچے نہ اتریں۔''

لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ کچھ عورتیں تو رونے بھی لگیں۔

''خاموش!'' وہی آدمی چیخ کر بولا جو اب تک ہدایات دے رہا تھا ''چلو، ایک ایک کرکے نیچے اترو۔''

''تم لوگ ہو کون اور ہم پر حکم کیوں چلا رہے ہو؟'' میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

میں جانتا تھا کہ وہ ڈاکو ہیں اور بس کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ میں تو یوں بھی اپنی زندگی سے بیزار تھا۔

''تو کیا اپنی جان سے بیزار ہے؟'' اس آدمی نے پوچھا۔ ''اڑے بابا، ہم ڈاکو ہیں ڈاکو! تجھے اور کچھ پوچھنا ہے؟ پر یہ سمجھ لینا کہ اب تو جو کچھ پوچھے گا، اس کا جواب میں نہیں دوں گا، میری رائفل دے گی۔ میرا نام خمیسو خان ہے بابا خمیسو خان۔ میرا نام سن کر ہی لوگوں کی آدھی جان نکل جاتی ہے۔''

''یہ کھلونے تو اگر کسی بچے کے ہاتھ میں بھی ہوں تو وہ اسی طرح بڑھ چڑھ کر باتیں کرسکتا ہے۔ تو اگر واقعی مرد کا بچہ ہے تو یہ رائفل رکھ دے، پھر بات کر۔ میں بھی دیکھتا ہوں کہ تو کتنا بڑا ڈاکو ہے۔'' مجھے خدشہ تھا کہ ابھی یا تو خمیسو مجھے گولی مار دے گا یا پھر اس کا کوئی آدمی مجھے ڈھیر کردے گا۔

میری بات سن کر خمیسو کا چہرہ غصے کی شدت سے مسخ ہوگیا۔ وہ گرج کر بولا ''لگتا ہے، تو واقعی خودکشی کرنے نکلا ہے یا پھر کوئی پولیسیا ہے مگر پولیس کی اتنی جرأت نہیں ہوسکتی کہ وہ خمیسو خان کا راستہ روکے۔''

''باتیں مت بناؤ خمیسو خان!'' میں نے اسے مزید مشتعل کرنے کی خاطر کہا۔ میں واقعی مرجانا چاہتا تھا۔ پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہونے اور ان کا تذلیل آمیز سلوک برداشت کرنے سے تو بہتر تھا کہ خمیسو خان گولی مار کے میرا قصہ تمام کردے۔

''پہلے تو ہی نیچے اتر جا بابا!'' خمیسو خان گرج کر بولا۔ ''پہلے تیرا حساب کتاب کردوں، باقی لوگوں سے بعد میں نمٹوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے ایک ساتھی کو آواز دی۔ ''پنھل خان، ہی وڈو کو چنگو مرس آ۔'' (یہ کوئی بڑا سورما ہے) اس کا ہاتھ پیر توڑ دے۔''

''واہ سردار!'' میں نے اندازے سے اسے سردار کہا۔ ''لوٹ کا مال تو تم کھاؤ اور جان کا خطرہ ہو تو اپنے ساتھیوں کو داؤ پر لگا دو۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ مجھے غصہ آرہا تھا کہ وہ کم بخت مجھے گولی کیوں نہیں مار دیتا۔

خمیسو خان نے اپنے شانے سے رائفل اتاری اور اپنے ایک ساتھی کی طرف اچھال دی، پھر کرخت لہجے میں مجھ سے بولا ''میں بھی تو دیکھوں کہ تو کتنا بڑا نر بچہ ہے۔''

''سردار! تمہارے بعد تمہارا یہ گروہ یتیم ہوجائے گا۔'' میں نے اسے پھر مشتعل کیا۔

''تو نے اگر مجھے مار دیا تو ان لوگوں کا سردار تو ہوگا۔'' خمیسو نے غضب ناک لہجے میں کہا اور میری طرف جھپٹا۔ مجھے اس سے اس پھرتی کی توقع نہیں تھی۔ وہ تن و توش میں مجھ سے دگنا تھا۔ اگر بروقت میرا پاؤں نہ پھسل جاتا تو وہ مجھے دبوچ کر گیلے کپڑے کی طرح نچوڑ دیتا۔ پاؤں پھسلنے سے یہ ہوا کہ میں عین وقت پر نیچے گر گیا اور وہ اپنے ہی زور میں بس سے ٹکرا گیا۔

میں نے دوبارہ پھرتی سے اٹھنے کی کوشش کی تو میرا سر خاصی قوت سے اس کی ٹانگوں کے درمیان لگا۔ ٹکر اتنی شدید تھی کہ وہ تکلیف کی شدت سے دہرا ہوگیا۔ میں نے اسی جگہ پوری قوت سے ایک لات رسید کردی۔ میرے پیروں میں اس وقت چمڑے کے بھاری سول والے جوتے تھے۔

تکلیف کی شدت سے خمیسو کی آنکھیں ابل پڑیں اور وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح ایک طرف دھڑام سے گر گیا۔

اسی وقت مجھے رائفلیں لوڈ کرنے کی آواز سنائی دی۔ خمیسو خان غضب ناک لہجے میں کراہتا ہوا بولا ''کوئی دیکھ

میں نہ ایندرو'' (کوئی بیچ میں نہیں آئے گا)

اس کے ساتھیوں کی رائفلیں جھک گئیں۔ مجھ پر تو اس وقت جنون سوار تھا۔ ایک خون تو میں کر ہی چکا تھا، دوسرا خون کرنے میں مجھے کیا عار ہوسکتی تھی۔ وہ بھی ایک خوف ناک ڈاکو کا خون جس نے نہ جانے کتنے گھر اجاڑے تھے۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر زوردار ٹھوکر ماری۔ میری ٹھوکر کی زبردست ضرب سے اس کے سامنے کے کئی دانت ٹوٹ گئے۔ دوسری ٹھوکر میں نے اس کے سر پر ماری۔ اس کے سر پر پگڑی تھی اس لیے اسے زیادہ چوٹ نہیں آئی لیکن اس کی پگڑی اچھل کر سر سے اتر گئی اور پھندے کی طرح اس کی گردن میں پڑ گئی۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اس کے سر کو نشانہ بنایا۔

خمیسو خان اس ضرب سے ذبح ہونے والے بکرے کی طرح چلایا ورنہ وہ اب تک تکلیف برداشت کرتا آرہا تھا۔

میں نے اس کی پگڑی کے سروں کو یوں پکڑ لیا کہ اس کے گلے میں پھندا سا پڑ گیا۔ میں نے جھٹکا دے کر اسے اٹھانے کی کوشش کی لیکن میں اس کے بھاری تن و توش کو اٹھا نہ سکا البتہ جھٹکے سے اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ مجھے ایسی آواز آئی تھی جیسے کوئی سوکھی ہوئی لکڑی ٹوٹ گئی ہو۔

خمیسو کی ناک اور منہ سے خون بہنے لگا۔ شاید جھٹکے سے اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ ایک مرتبہ بری طرح تڑپا، پھر ساکت ہوگیا۔

میں اسے چھوڑ کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ کب اس کے ساتھی کی گولی میرے سینے میں پیوست ہوتی ہے لیکن پھر میں نے ایک اور حیرت انگیز منظر دیکھا۔ اس کے تمام ساتھیوں نے آگے بڑھ کر اپنے ہتھیار میرے قدموں میں پھینک دیے اور بولے ''سائیں! آج سے تم ہمارے سردار ہو۔ سائیں خمیسو نے کہا تھا کہ اس کے بعد سردار تم بنو گے۔''

''مجھے ڈاکوؤں کے کسی گروہ کی سرداری کا کوئی شوق نہیں ہے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''سائیں، یہ سائیں خمیسو کی آخری خواہش تھی۔ آپ کو مرنے والے کے الفاظ کا بھی پاس نہیں ہے؟''

''اچھا، پہلے اس بس کو جانے دو۔''

فوراً ہی دو آدمی بس پر چڑھے۔ ان میں سے ایک چیخ کر بولا ''تم لوگ بھول جاؤ گے کہ یہاں کیا ہوا تھا؟''

میرا کیریئر تو تباہ ہو ہی چکا تھا، منزل کا کوئی نشان نہیں تھا۔ گھر واپس جا نہیں سکتا تھا کہ مجھے پتا چل چکا تھا، عالیہ نے خودکشی کرلی ہے۔ امی دل کے دورے کا شکار ہوکر ملک عدم جاچکی ہیں۔ ابو نے تھانوں میں بے عزتی سہتے سہتے قبرستان میں سونے کو ترجیح دے دی ہے اس لیے میں نے ڈاکوؤں ہی کا راستہ اپنا لیا۔

پھر ایک پولیس مقابلے میں میرے بہت سے ساتھی مارے گئے، گروہ منتشر ہوگیا۔ اس مقابلے کے بعد میرا صرف ایک ساتھی بچا تھا۔ ہم لوگ کراچی آگئے۔ یہاں میں نے پڑھے لکھے لیکن معاشرے کے ستائے ہوئے لوگوں کو ملا کر ایک گروہ بنایا اور ڈکیتی، اغوا برائے تاوان، سیاسی جلسوں میں ہنگامہ آرائی کی وارداتیں شروع کردیں۔

شکیل میرا بہت اچھا دوست تھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ کوشش کے باوجود اسے کہیں ملازمت نہ مل سکی۔ اس کے والدین کا انتقال ہوچکا تھا۔ بس ایک بہن تھی۔ اس کے اور میرے حالات ملتے جلتے تھے۔ ایک واردات کے دوران میں اس سے میری ملاقات ہوئی، پھر وہ چند ملاقاتوں کے بعد ہمارے گروہ میں شامل ہوگیا۔ اس نے.... مشورہ دیا کہ مجھے اندرون سندھ کے کسی علاقے میں اپنا کوئی مستقل ٹھکانا بنانا چاہیے۔

عظیم الشان حویلی جو آپ کو نظر آرہی ہے، اس کی زمین شکیل ہی نے منتخب کی تھی اور یہ سندھ کے ایک بڑے جاگیردار کے نام سے خریدی گئی ہے تاکہ پولیس ہم پر انگلی نہ اٹھا سکے۔ وہ جاگیردار بھی کوئی نیک نام نہیں تھا۔ اپنے کئی سیاسی مخالفین کو ہمارے ذریعے راستے سے ہٹا چکا تھا۔ وہ ہمیں تحفظ دیتا تھا لیکن گزشتہ سال اس کا بھی انتقال ہوچکا ہے۔ کئی دوسرے سیاست دان اور جاگیردار ہماری پشت پناہی کو تیار ہیں لیکن اب ہم نے اپنے طور پر کام کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

دو سال پہلے ایک واردات کے دوران میں شکیل مارا گیا۔ اس کی بہن سارہ بے سہارا ہوگئی تو میں نے اس سے شادی کرلی۔ شکیل کا انتقام لینے کے لیے میں نے کئی سیاست دانوں اور پولیس کے بہت سے بڑے افسران کو ٹھکانے لگا دیا۔ یوں پولیس اور قانون نافذ کرنے والے دوسرے ادارے پورے سندھ بلکہ پنجاب میں بھی میری تلاش میں سرگرداں ہیں۔

☆☆☆

وہ اپنی داستان سنا کر خاموش ہوا تو فضا میں ایک گمبھیر خاموشی طاری ہوگئی۔ پھر میں نے گھڑی دیکھی اور بولی ''خرم صاحب! میں نماز ادا کرلوں، اس وقت تک آپ فائزہ کی مدد

سے سارہ کو لیبر روم میں شفٹ کر دیں۔"

☆☆☆

انکل احسن دو راتوں سے جاگے ہوئے تھے۔ وہ اس وقت بھی آفس میں موجود تھے۔ اچانک ان کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف انسپکٹر شہباز تھا۔ اس نے اطلاع دی کہ میں نے ڈاکٹر شائستہ کی گاڑی ٹھٹھہ میں دیکھی ہے۔ میں وہاں لوگوں سے مزید پوچھ گچھ کر رہا ہوں۔ وہاں اتنی قیمتی گاڑیاں چند ایک ہی ہیں۔

انکل احسن نے فوراً پاپا کو اطلاع دی اور وہ دونوں اسی وقت ٹھٹھہ روانہ ہو گئے۔

یہ ساری باتیں مجھے بعد میں انکل نے بتائی تھیں۔

انکل اور ان کے ذہین ماتحت انسپکٹر شہباز نے یہ سراغ لگا لیا کہ میری گاڑی کو کہاں لے جایا گیا ہے۔ پھر انہوں نے بہت رازداری سے اس حویلی کا سراغ لگا لیا جو سندھ کے کسی وڈیرے کے نام تھی۔ اگر میری گاڑی وہاں موجود نہ ہوتی تو شاید وہ حویلی میں گھسنے کی جرأت بھی نہ کرتے لیکن اب میری گاڑی کی بازیابی کا جواز بنا کر وہ حویلی میں داخل ہو سکتے تھے۔

☆☆☆

حویلی کے باہر کچھ گاڑیاں رکنے کی آوازیں آئیں، پھر کوئی میگافون پر بولا "خرم! ہتھیار ڈال دو اور باہر آ جاؤ۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم اس حویلی میں موجود ہو۔"

جواب میں اندر سے کسی نے فائر کیا۔

اسی وقت سارہ نے درد کی شدت سے تڑپتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی "ڈاکٹر! اگر میں مر جاؤں تو تم میرے بچے اور شوہر کو....."

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ باہر سے کسی نے گولیوں کا ایک برسٹ مارا تھا۔ اسی وقت ایک نئی زندگی نے جنم لیا۔

خرم کا بیٹا اسی کی طرح خوبصورت تھا۔ وہ اپنی بھوری بھوری آنکھوں سے اس دنیا کو دیکھ رہا تھا جہاں آتے ہی اس نے گولیوں کی گھن گرج سنی تھی۔

میں نے خرم سے کہا "خرم صاحب! آپ کا کام ہو گیا ہے۔ اب مجھے باہر جانے دیں۔ میں باہر جا کر یہ فائرنگ رکواتی ہوں۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہے ڈاکٹر شائستہ! ڈی آئی جی احسن میرے ساتھ کبھی رعایت نہیں کرے گا۔ میں نے ہر موقعے پر اسے زک پہنچائی ہے۔"

اس کے منع کرنے کے باوجود میں باہر نکل آئی اور چیخ کر بولی "انکل! میں شائستہ ہوں۔ پلیز فائرنگ بند کریں۔"

انکل نے میگافون پر فائرنگ بند کرنے کا حکم دیا لیکن اس وقت تک ایک گولی میرا بازو چھیدتی ہوئی گزر گئی تھی۔

خرم سمجھا کہ میں اس مقابلے میں کام آ گئی۔ اس کے ساتھیوں نے گویا پولیس پر جہنم کا دہانہ کھول دیا۔ پولیس بھی پوری تیاری کے ساتھ آئی تھی۔

آدھے گھنٹے تک وہ علاقہ میدانِ جنگ بنا رہا پھر ایک ایک کر کے خرم کے ساتھی مرنے لگے۔

مجھے گولی لگنے کے بعد خرم کے ساتھی مجھے دوبارہ حویلی میں لے گئے تھے۔

اب صرف وہاں سارہ تھی، خرم تھا اور اس کا نومولود بیٹا!

اچانک سارہ کی حالت بگڑ گئی۔ اس کا بلڈ پریشر بہت تیزی سے گر رہا تھا۔ جب تک میں اس کا کوئی سدِباب کرتی، وہ ہر قسم کے علاج سے بے نیاز ہو گئی۔

خرم اس کی موت پر دہاڑیں مار مار کے رونے لگا اور مجھ سے بولا "ڈاکٹر! میں خود کو قانون کے حوالے کر رہا ہوں ورنہ یہ لوگ میرے ساتھ ساتھ میرے بیٹے کو بھی مار دیں گے۔ اگر ہو سکے تو میرے بیٹے کا خیال رکھ لیجئے گا۔"

یہ کہہ کر وہ باہر نکلا اور چیخ کر بولا "ڈی آئی جی صاحب! میں آ رہا ہوں۔ اپنے لوگوں سے کہہ دیں کہ فائرنگ روک دیں۔"

اچانک باہر سے گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی اور کئی گولیاں خرم کے سینے میں پیوست ہو گئیں۔ وہ تیورا کر گرا تو میں فائرنگ کی پروا کیے بغیر خرم کی طرف بھاگی۔ اس نے ڈوبتے ہوئے لہجے میں کہا "ڈاکٹر..... میرا..... بیٹا..... وہ....." پھر اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

☆☆☆

لوگ سمجھتے ہیں کہ فرخ میرا بیٹا ہے۔ میں اب کس کس کو بتاؤں کہ فرخ بدنام زمانہ ڈاکو خرم کا بیٹا ہے جو ڈاکو تو تھا لیکن برا انسان نہیں تھا۔ میں نے اب زندگی بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور خرم کی اس حویلی کو ایک جدید اسپتال میں تبدیل کر دیا ہے۔ وہاں چھوٹے چھوٹے دیہاتوں اور گوٹھوں کے لوگ علاج کے لیے آتے ہیں اور حویلی کے مالک کو دعائیں دیتے ہیں تو خوشی سے میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ کم از کم خرم کی موت کے بعد تو لوگ اسے اچھے نام سے یاد کر رہے ہیں۔ وہ جس بادِ سموم کا شکار تھا اب وہ بادِ بہاری بن چکی ہے۔

دشتِ جنوں

جناب معراج رسول صاحب

السلام علیکم!

میں ایک بہت برا آدمی ہوں۔ لوگ کہتے ہیں بلکہ یہ سچ ہے کہ میں قاتل بھی ہوں۔ اس وقت میں جیل میں ہوں اور قتل ہی کے جرم میں سزا کاٹ رہا ہوں لیکن یہ سزا جس قتل کے سلسلے میں بھگت رہا ہوں، وہ میں نے کیا ہی نہیں ہے۔ یہ سب میرے ساتھ کیوں ہوا، اسے سمجھنے کے لیے آپ بھی میری روداد پڑھ لیں۔

اکمل

(لاہور)

میں نے سات دن، سات مہینے نہیں بلکہ پورے سات برس پہلے قسم کھائی تھی کہ شاہنواز کو ہر قیمت پر قتل کروں گا۔

میں نے اسے موت کی نیند سلانے کا نہ صرف عہد کیا تھا بلکہ قسم بھی کھائی تھی۔ میں نہ تو اپنا عہد بھولا اور نہ قسم۔ اس کی کمینگی، دھوکا دہی، خود غرضی کا میں بدلہ لینا چاہتا تھا۔ مجھے اس رقم سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی جو وہ بغیر ڈکار لیے ہضم کر گیا تھا۔ اس سے میری دوستی دو ایک برس کی نہیں بلکہ بچپن کی تھی۔ اس نے اس دیرینہ دوستی کو نفرت کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ جبکہ دوستی کا جذبہ اور دوستی دولت پر بھاری ہوتی ہے۔

اس لیے آج مجھے صرف اور صرف اس کی جان کی ضرورت تھی۔ مجھ جیسے شخص کے لیے اس کی کیا کسی بھی شخص کی جان لینا اتنا مشکل نہیں تھا کیونکہ میں جیل واپس جانے کے لیے ہر طرح سے تیار تھا۔ اب مجھے جیل سے باہر کی دنیا کی رونقوں، رنگینیوں اور دلچسپیوں سے کوئی غرض نہیں رہی تھی۔ جیل کی دنیا مجھے پسند آ گئی تھی۔ گو جیل میں مجرموں کی دنیا آباد تھی لیکن ان میں شاہنواز جیسے نہیں تھے۔

میں جیل سے باہر آیا تو میں نے دیکھا کہ ان سات برسوں میں دنیا بہت تیزی سے بدل گئی ہے۔ گرگٹ کے

نگوں کی طرح..... میں سات برسوں کی سزا کاٹ کر آیا تھا۔ اس عرصے میں نہ صرف مہنگائی بہت بڑھ گئی تھی بلکہ خود غرضی بھی۔ حکومت' وزیروں اور ان لوگوں کو جو اسمبلیوں میں بیٹھے ہوئے تھے' انہیں عوام کی تکلیف اور مصائب و پریشانیوں کا کوئی احساس تھا نہ فکر۔ جبکہ وہ عوامی نمائندے تھے اور عوام کا ووٹ لے کر آئے تھے۔ ہر شخص اپنی غرض میں اندھا ہو گیا تھا اور ایک دوسرے کو وحشی درندوں کی طرح کاٹ کھا رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا تھا کہ انسان بڑی تیزی سے انسانیت کے اس ابتدائی دور کی طرف جا رہا ہے جسے اخلاق نے چھوا نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ یہ سب کچھ انسانیت کی آڑ میں کر رہا ہے۔

میرا ایک چھوٹا سا گھر تھا جس میں دو کمرے اور ایک خاصا بڑا صحن تھا۔ یہ صحن اتنا بڑا تھا کہ اس میں تین چار بڑے بڑے کمرے آسانی سے بنائے جا سکتے تھے۔ ایک طرح سے ایک مکان کی خوبصورتی اس کا صحن بھی ہوتا ہے۔ میں اس کی چابی شاہدہ بھابی کو دے کر آیا تھا جو پڑوسن اور میری مرحومہ ماں کی بہت ہی عزیز ترین سہیلی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ میری سزا کی مدت کا سن کر ان کے کسی بیٹے نے ہڑپ کر لیا ہو گا اس لیے کہ اس دنیا میں ہر بات ممکن تھی۔ بھائی' بہن بھائیوں کا مال ہڑپ کر لیتے تھے' میں کیا بیچتا تھا۔ سات برسوں تک ایک عورت کیسے میرے مکان کی رکھوالی کر سکتی تھی؟

پھر بھی میں ایک موہوم سی امید لیے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا تھا۔ سات برسوں میں شاہدہ بھابی کے بارے میں کچھ نہ معلوم ہو سکا تھا کہ وہ حیات ہیں یا نہیں؟ وہ میری ماں سے چھ سات برس بڑی ہی تھیں۔ ان کے حیات ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا۔ حیات ہونے کی صورت میں بھی ان کے جوان لڑکوں کے سامنے ان کی کیا چلتی..... میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر مکان ہڑپ کر لیا گیا ہے تو میں خاموشی سے واپس لوٹ جاؤں گا۔ ان کے اس بے ایمان لڑکے سے جس نے میرا مکان اپنے نام کروا لیا ہو گا' کوئی تعرض نہیں کروں گا۔ یوں بھی اب مجھے اس مکان سے کیا لینا ہے جبکہ اس مکان میں زندگی گزارنی نہیں ہے' آخری سانس تک زندگی جیل میں ہی گزاروں گا۔

میں بس اسٹاپ پر اتر کے ادھر اُدھر دیکھتا ہوا اپنے محلے میں داخل ہوا' یہاں کی دنیا نہیں بدلی تھی۔ میرا محلہ آج بھی ویسا ہی تھا جیسا سات برس پہلے چھوڑا تھا۔ البتہ کہیں کہیں بوسیدہ اور پرانے مکانوں کی جگہ نئے مکانات نے لے لی تھی اور کچھ مکانوں کو توڑ کر ان کی جگہ نئے مکان بنائے جا رہے تھے۔

اپنی گلی میں داخل ہوتے وقت میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ دائیں ہاتھ پر جو مکان تھا وہ نرگس کا تھا۔ نرگس جو نصیر صاحب کی بیٹی تھی۔ نرگس میرے خوابوں کی رانی تھی۔ میں نرگس سے محبت کرتا تھا۔ وہ بھی مجھے دیوانگی کی حد تک چاہتی تھی۔ جس روز عدالت میں میرے مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا تھا' وہ شاہدہ بھابی کے ساتھ مجھ سے ملنے آئی تھی۔ وہ عدالت کا فیصلہ سن کر رونے لگی تھی۔ میں نے نرگس سے کہا تھا کہ تم میرا انتظار نہ کرنا اور شادی کر کے اپنا گھر بسا لینا۔

نرگس نے میری بات کے جواب میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا' بس روتی رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تو اس نے دوپٹا آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔ میں نے نرگس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بڑی محبت سے پھیرا تھا اور پھر سپاہیوں کے ساتھ چل پڑا تو میری آنکھیں بھی چھلک پڑی تھیں۔ میں نے پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اس لیے کہ اسے روتا دیکھ نہیں سکتا تھا۔

میں نے نرگس کو جیل میں بھولنے کی کوشش کی تو اس میں کسی حد تک کامیاب ہو گیا۔ گو کہ یکسر فراموش نہ کر سکا۔ کر بھی کیسے سکتا تھا کیونکہ ہم بچپن کے ساتھ کھیلے ہوئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ اس کی شادی جلد ہو جائے گی۔ اس لیے کہ وہ بہت نازک اور حسین تھی' اتنی ہی پُرکشش بھی اور گاؤں میں ہی نہیں بلکہ اور بھی جگہوں پر اس کے حسن کا چرچا تھا۔ وہ کسی شہزادی سے کم نہیں تھی۔ اس کے علاوہ نیک سیرت' سگھڑ اور سلیقہ مند بھی تھی۔ وہ شخص دنیا کا خوش قسمت ترین شخص ہوتا جسے نرگس کی رفاقت حاصل ہوتی۔

نرگس کے مکان کے سامنے پہنچ کر ماضی میری نظروں کے سامنے حال بن گیا۔ میں نے بڑے دکھ اور کرب سے سوچا کہ نرگس کی شادی ہو گئی ہو گی' وہ دو تین بچوں کی ماں بن گئی ہو گی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ایک حسین اور خوشگوار زندگی گزار رہی ہو گی۔ اس کے شوہر نے اسے بہت خوش اور شہزادیوں کی طرح رکھا ہو گا لہٰذا وہ اپنے گھر میں ہی ہو گی۔ معلوم نہیں اس کی شادی کس سے ہوئی ہو گی' گاؤں کے کسی مرد سے یا باہر کے کسی لڑکے سے۔

میں شاہدہ بھابی کے ہاں پہنچا' وہ مجھے دیکھ کر اتنی حیران اور خوش ہوئیں کہ اگر میری ماں بھی حیات ہوتیں تو شاید اتنی خوش نہ ہوتیں۔ شاہدہ بھابی کے گھر میں بڑی رونق تھی۔ ان کے دونوں بیٹوں کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ بہو بیٹیوں اور ان کے بچے بھی تھے۔ میں نے ماں کی وفات کے بعد انہیں ماں کا رتبہ دیا تھا' وہ بھی مجھے اپنے بچوں کی طرح چاہتی تھیں۔ انہوں نے گلے سے لگا کر خوب پیار کیا۔ میری بلائیں لیں۔ پھر وہ دونوں بہوؤں سے مخاطب ہو کر جو سامنے کھڑی تھیں' بولیں۔

''کھڑی کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو' جلدی سے جاؤ میرے بیٹے کے لیے کھانا لگاؤ۔ سات برسوں کے بعد تو میں اپنے بیٹے کو دیکھ رہی ہوں۔ اس نے اچھا کھانا ایک دن بھی نہیں کھایا ہو گا۔''

میرے دل کے کسی کونے میں ایک آوارہ سا خیال آیا کہ شاہدہ بھابی اتنی محبت' گرم جوشی اور خلوص کا اظہار اس لیے تو نہیں کر رہی تھی کہ میرا مکان ہڑپ کر لیا ہو۔ گاؤں میں شاہدہ بھابی کی بڑی عزت تھی۔ انہیں بھی شاہدہ بھابی کہتے تھے۔ میں نے اپنے مکان پر دہی تالا لگا دیکھا جو میں لگا کر گیا تھا۔ جب میں کھانا کھا چکا تو شاہدہ بھابی نے میرے سامنے مکان کی چابی لا کر رکھ دی۔

''لو بیٹا..... اپنی امانت سنبھالو۔''

میں اپنی سوچ پر دل میں بہت شرمندہ ہوا۔ اس دنیا میں ابھی خلوص' محبت اور جذبے رخصت نہیں ہوئے تھے۔ بے غرض اور عظیم لوگ بھی تھے۔ شاہدہ بھابی جیسی ہستیوں سے شاید یہ دنیا قائم تھی۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

''بیٹا' میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ میں بتا نہیں سکتی کہ تم نے مجھے کس اذیت ناک کرب سے نجات دلائی ہے۔ میں ان سات برسوں میں ایک رات بھی سکون کی نیند نہیں سو پائی ہوں۔''

''کیسی اذیت.....؟'' میں نے حیران ہو کر شاہدہ بھابی کی شکل دیکھی' ان کے چہرے پر بلا کی اداسیت تھی۔

''ایک اذیت ہو تو بتاؤں بیٹے!'' وہ کہنے لگیں ''تمہیں سزا کیا ہوئی' محلے والوں نے میری زندگی عذاب کر دی۔ اس مکان پر ہر کسی کی نیت خراب ہو گئی۔ جسے دیکھو اسے کوڑیوں کے مول خریدنا چاہتا تھا۔ کسی ہزار روپے لے لو' چالیس ہزار روپے لے لو اس مکان کی چابی دے دو۔ ہم اکٹھے سے نمٹ لیں گے جب وہ سزا پوری کر کے آئے گا۔ اور تو اور' میرے بیٹوں کی نیت میں بھی فتور آ گیا۔ میں نے کس طرح سے اس مکان کی حفاظت کی' میرا دل میرا خدا ہی جانتا ہے۔''

''اگر آپ یہ مکان اپنے نام کر لیتیں تو مجھے ذرہ برابر بھی دکھ نہیں ہوتا..... اس لیے کہ آپ میری ماں کی جگہ ہیں۔ میں نے ہمیشہ آپ کو اپنی ماں ہی سمجھا..... اولاد کی ہر چیز ماں کے لیے ہوتی ہے۔ اس مکان کی حیثیت ہی کیا ہے' آپ کی ممتا کی محبت کے نزدیک۔''

''ارے بیٹا! مجھے تمہارا مکان لے کر کرنا کیا تھا..... کیا یہ مکان کافی نہیں ہے اور پھر کس چیز کی کمی ہے جو تمہارے مکان پر نظر رکھتی۔''

پھر مجھے اچانک نرگس کا خیال آیا تو میں نے پوچھا۔ ''نرگس کیسی ہے؟ کیا اس کی شادی ہو گئی..... وہ آج کل ہے کہاں؟''

''ہاں بیٹے..... اس کی شادی کو پورے پانچ برس ہو رہے ہیں۔'' شاہدہ بھابی نے جواب دیا ''اس کے دو بچے بھی ہیں۔ بہت ہی پیارے پیارے' خوبصورت اور گول مٹول۔ اسے شوہر بھی نصیب سے اچھا ملا ہے۔ لیکن وہ غریب آج کل بڑی مصیبت اور پریشانیوں میں گھری ہوئی ہے..... اس کی پریشانی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔''

آخری جملوں سے میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ مجھے کسی گہرے صدمے کا احساس ہوا۔ میں نے دل پر جبر کر کے پوچھا۔

''کیسی مصیبت..... کیسی پریشانیاں؟''

شاہدہ بھابی مجھے بتانے لگیں ''اس کے شوہر نوازش کا کوئی سات آٹھ مہینے پہلے ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ وہ ایک روز شام کے وقت دفتر سے سائیکل پر گھر آ رہا تھا کہ ایک تیز رفتار گاڑی نے اسے ٹکر مار دی۔ گاڑی والا بھاگ گیا۔ دو تین ماہ تک سرکاری اسپتال میں زیر علاج رہ کر گھر آ گیا۔ اس کی ایک ٹانگ اور ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ ابھی تک پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا ہے۔ غریب ایک معذور کی طرح پلنگ پر پڑا رہتا ہے۔ موت کی دعائیں مانگتا رہتا ہے۔ بے چارے کے پاس کچھ ہوتا تو وہ اب تک ٹھیک ہو گیا ہوتا۔''

''نرگس کا گھر کیسے چلتا ہے؟'' میں نے سوال کیا ''کیا نوازش کے والدین اور بھائی بہن یا چچا ماموں وغیرہ ہیں.....؟''

''والدین' چچا ماموں وغیرہ تو نہیں ہیں البتہ دو بڑے بھائی ہیں جو الگ رہتے ہیں۔ اس مصیبت میں اس کے کوئی کام نہیں آ رہا ہے۔ نرگس ایک پرائیویٹ اسپتال میں نرس کا کام کر کے گھر چلا رہی ہے اور شوہر کی خدمت الگ کر رہی ہے۔ بڑی عظیم عورت ہے بے چاری۔''

پھر میں یہ سن کر اپنے گھر چلا آیا۔ میرا گھر صاف ستھرا تھا اور آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ میرے گھر کی ہر چیز جوں کی توں اسی طرح موجود تھی جس طرح میں چھوڑ گیا تھا۔ شاہدہ بھابی پتے دس روز میں..... میرے گھر کی صفائی کرتی رہی تھیں۔ انہوں نے کل ہی اس کی صفائی کی تھی اس لیے گھر بے حد صاف ستھرا تھا۔ میں چونکہ بے حد تھکا ہوا تھا اس لیے سونے کے لیے بستر پر دراز ہو گیا۔

جب میں رات کھانا کھانے کے لیے شاہدہ بھابی کے ہاں گیا تو ان کے دونوں بیٹے موجود تھے۔ وہ بڑی محبت اور خلوص سے ملے۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے ان کے بڑے بیٹے توقیر سے کہا ''میں اپنا مکان فوری طور پر بیچنا چاہتا ہوں' کوئی خریدار ہو تو بتائیں۔''

''کیوں بیٹا! تم اپنا مکان کیوں بیچنا چاہتے ہو؟'' شاہدہ بھابی نے متعجب لہجے میں پوچھا ''یہ تمہارے والدین کی نشانی اور یادگار ہے۔ اب تم آگئے ہو تو از سرِ نو زندگی شروع کر کے گھر بسالو۔''

''نہیں خالہ' میں یہ گھر اس لیے بیچنا چاہتا ہوں کہ میں شہر جا کر اپنی زندگی شروع کرنا چاہتا ہوں۔ میں یہاں رہوں گا تو ساری زندگی مجھ پر انگلیاں اٹھتی رہیں گی۔ مجھ پر ذلت و رسوائی کا جو داغ لگا ہے میں اسے کبھی مٹا نہیں سکوں گا اور نہ لوگ مٹانے دیں گے۔'' میں نے اداسی سے کہا۔

شاہدہ بھابی کے چھوٹے بیٹے صفدر نے پوچھا ''آپ یہ مکان کتنے میں بیچنا چاہتے ہیں؟''

''آپ کے خیال میں یہ مکان کس قیمت پر فروخت ہو سکتا ہے؟'' میں نے سوال کیا ''مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ کیا قیمت ہو سکتی ہے۔''

''جب سے گاؤں میں پکی سڑکیں' نئے مکانات اور کارخانے' فیکٹریاں بنی ہیں تب سے یہاں کے مکان اور زمینوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگی ہیں۔'' توقیر نے میری بات کا جواب دیا ''کاش! ہمارے پاس اتنی رقم ہوتی کہ ہم یہ مکان خرید سکتے۔ کوئی بھی اس مکان کی قیمت تین لاکھ روپے آنکھیں بند کر کے آسانی سے دے دے گا۔ اس لیے بھی کہ یہ کارنر کا مکان ہے' خاصا بڑا بھی ہے۔ جبکہ ہمیں یہ مکان چھوٹا پڑنے لگا ہے۔ برابر کا مکان ہے' اس کی دیوار گرانا ہوگی' مکان بہت بڑا ہو جائے گا۔''

''آپ کے پاس کل کتنی رقم ہے؟'' میں نے توقیر کی طرف دیکھا ''مکان کو کم قیمت پر آپ کے ہاتھ بیچنے پر تیار ہوں۔''

''سوا دو لاکھ روپے ہیں بیٹے!'' توقیر کے بجائے شاہدہ بھابی نے کہا ''کاش! اتنی رقم ہوتی کہ ہم یہ مکان خرید لیتے۔''

''آپ دو لاکھ روپے ہی دے دیجیے گا۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے رقم کی اشد ضرورت ہے۔ دو ایک دن میں مل جائے تو اچھا ہے۔''

''کل صبح دس بجے رقم لے لیجیے۔'' توقیر نے بڑی ممنونیت سے کہا ''ہم آپ کا یہ احسان ساری زندگی بھلا نہ سکیں گے۔''

''پورے سات برس تک اس مکان کی حفاظت کر کے احسان تو آپ لوگوں نے مجھ پر کیا ہے' اگر مجھے رقم کی ضرورت نہ ہوتی تو میں یہ مکان اپنی ماں کے نام کر دیتا۔ آپ بھی تو میری ماں ہیں' مجھے بڑی شرمندگی ہو رہی ہے کہ میں آپ سے رقم لے رہا ہوں۔''

دوسرے دن توقیر نے مجھے دو لاکھ کی رقم ادا کر دی۔ قانونی کارروائی انجام پانے کے دوسرے دن ہی میں نے اپنے اٹیچی کیس میں چند جوڑے اور ضرورت کی چیزیں رکھیں۔ میں نے ان دو دنوں میں پتا چلا لیا تھا کہ شاہ نواز لاہور شہر میں نہیں ہے۔ لاہور شہر میرے گاؤں سے زیادہ دور نہ تھا۔ بس سے ایک گھنٹے کی مسافت تھی۔ اس نے سات برس قبل ہی لاہور چھوڑ دیا تھا۔ مجھے شاہ نواز کو تلاش کر کے اس سے انتقام لینا تھا۔ جیل سے باہر آنے کے بعد نفرت اور انتقام کی آگ بڑی شدت سے بھڑک اٹھی تھی۔

شام کے وقت میں نے ایک کوارٹر نما مکان کے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحوں کے اذیت ناک انتظار کے بعد دروازہ کھلا۔ وقت کی نبض جیسے تھم گئی۔ میری نظروں کے سامنے نرگس کھڑی تھی۔ وہ نرس کی یونیفارم میں ملبوس تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ڈیوٹی دے کر ابھی ابھی گھر پہنچی ہے۔ نرگس' جو کبھی میری محبت تھی' خواب تھی' آج کسی اور کی زندگی کا جزو بن گئی تھی۔ اب وہ میری محبوبہ نہیں تھی' کسی کی بیوی اور بچوں کی ماں بھی تھی۔ اپنے گھر کی عزت تھی۔

اس وقت میرے چہرے پر گئی دنوں کی شیو تھی۔ آسانی سے پہچانا نہیں جاتا تھا۔ میں نے اس لیے شیو نہیں بنائی تھی کہ کوئی شناسا نہ پہچان لے۔ لیکن نرگس نے مجھے فوراً پہچان لیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا دل دھڑک اٹھا ہے اور اس لمحے اس کی آنکھوں میں ان گنت قمقمے روشن ہو گئے ہیں۔ اس کا چہرہ دمک اٹھا تھا۔ پھر دوسرے لمحے نہ جانے کہاں سے احساس کی گھٹا آئی اور اس نے آنکھوں کی روشنی اور چہرے کی دمک کو تہ و بالا کر دیا۔ پھر اس نے دل گرفتہ لہجے میں دریافت کیا ''آپ کب آئے؟''

''تین دن پہلے.....'' میں نے جواب دے کر گہری نظروں سے نرگس کو دیکھا۔ ان سات برسوں میں گردش ایام و حالات نے اس کا رنگ روپ چھین لیا تھا۔ پھر بھی اس میں کسی قدر تازگی موجود تھی۔

نرگس بولی ''اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟''

''اپنا ماضی دیکھ رہا ہوں۔'' میں بولا ''کیا تم مجھے اندر

آنے کے لیے نہیں کہو گی؟''

''تم یہ سمجھ کر اندر آنا کہ یہ میرے والد کا نہیں' میرے شوہر کا گھر ہے۔'' نرگس نے قدرے سپاٹ لہجے میں کہا۔ وہ بے حد سنجیدہ تھی' وہ مجھے ایک نئی اور اجنبی عورت دکھائی دیتی تھی''میں ایک شخص کی بیوی اور اس کے بچوں کی ماں ہوں۔''

''میں یہی جان کر یہاں آیا ہوں۔'' میں مسکرا دیا'' مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ تمہیں ایک بہت اچھا شوہر ملا۔ اس لیے اس سے ملنے چلا آیا۔''

''مگر اکمل.....!'' نرگس کی آواز بھرا گئی تھی اور اس کی آنکھوں میں موتی جھلملانے لگے''میں بڑی بدنصیب ہوں' میری وجہ.....''

''اس دنیا میں صرف تمہی ایک بدنصیب اور دکھی عورت نہیں ہو نرگس!'' میں نے اسے ٹوکا دیا''چلو' یہ آنسو پونچھ ڈالو۔ میں نے کبھی آنسو نہیں دیکھے' سات برس بعد تمہیں دیکھ رہا ہوں' میں یہ آنسو دیکھنے نہیں آیا۔''

نرگس مجھے اپنے ساتھ لے کر اس کمرے میں پہنچی جہاں اس کا شوہر ایک چارپائی پر معذوروں کی طرح پڑا ہوا تھا۔ نرگس کے بچے باپ کے پاس چارپائی کے کنارے بیٹھے ہوئے .... اس سے باتیں کر رہے تھے۔ نوازش نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں نے کہا۔

''میں آپ کی سسرال یعنی نرگس کا پڑوسی ہوں۔'' میں نے جواب دیا''آپ کی شادی سے تین برس پہلے گاؤں چھوڑ گیا تھا۔ تین دن کے لیے آیا ہوں اس لیے سوچا کہ آپ سے اور نرگس سے ملتا چلوں۔''

''آپ نے مجھ پر بڑا کرم کیا۔'' وہ قدرے جذباتی ہو کر بولا''ورنہ کون اس مصیبت کی گھڑی میں کسی کو پوچھتا ہے۔ غیروں کو چھوڑیں' اپنے ہی دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔'' پھر اس کی آواز بھرا سی گئی۔

میں بڑی دیر تک نرگس اور اس کے شوہر سے باتیں کرتا رہا اور اس کے بچوں سے بھی کھیلتا رہا۔ اس کے بچوں نے میرا دل موہ لیا تھا۔ نرگس میرے لیے چائے اور پکوڑے لے آئی تھی۔ نرگس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ پرائیویٹ اسپتال ہے' ڈاکٹر مریضوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں لیکن ملازمین کو تنخواہیں آٹے میں نمک کے برابر دیتے ہیں۔ اسپتال والے اسے ہزار روپے دیتے ہیں۔ بعض وہ مریض جو صحت یاب ہو کر جاتے ہیں' وہ اپنی مرضی' خوشی اور اصرار سے کچھ دے جاتے ہیں لیکن وہ دوسری نرسوں کی طرح ان سے کوئی سوال نہیں کرتی۔ دفتر سے ہر ماہ تنخواہ مل جاتی ہے جو شوہر کی دواؤں پر خرچ ہو جاتی ہے اور اسی سے گھر چل رہا ہے۔ اس کے شوہر کو پوری طرح تندرست ہونے اور چلنے پھرنے کے قابل ہونے میں ایک برس اور لگ جائے گا۔

میں نے چلتے وقت اپنے دستی بیگ میں سے ایک پھولا ہوا لفافہ نکال کر نوازش کی طرف بڑھایا تو اس نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ایک حقیر سا نذرانہ ہے۔ آپ کے ٹھیک ہونے اور ملازمت تلاش کرنے تک نرگس کو ملازمت کی ضرورت نہیں۔''

نوازش نے لفافہ لے کر اس کے اندر جھانکا تو اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ اس نے بھونچکا ہو کر میری طرف دیکھا۔ وہ تحیر زدہ لہجے میں بولا''اس میں تو ہزاروں کی رقم ہے۔ اتنی بڑی رقم کس لیے بھیا۔ نہیں نہیں' میں اتنی بڑی رقم نہیں لوں گا۔''

نوازش کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اس نے لفافہ میری طرف بڑھایا تو نرگس اس کے ہاتھ سے لفافہ لے کر دیکھنے لگی۔

''یہ ڈیڑھ لاکھ کی رقم ہے۔'' میں نے کہا''میں نے اپنا مکان بیچ دیا ہے۔ میں چونکہ یہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں اور پھر میرے پاس رقم کی کوئی کمی نہیں ہے۔ نہ بیوی ہے نہ بچے۔ نہ ماں باپ' بہن بھائی اور قریبی رشتے دار۔ اس دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ نرگس میری پڑوسن ہے کیونکہ میرے محلے میں رہتی ہے اور ایک محلے کے لوگ آپس میں ایک کنبے کی طرح ہوتے ہیں' ہو ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں' لہٰذا انکار مت کیجیے۔''

''ڈیڑھ لاکھ روپے!'' نرگس پر لمحے بھر کے لیے سکتہ سا طاری ہو گیا''یہ.... یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔ میں نے تو خواب میں بھی نہیں دیکھی۔''

''چلو خواب میں نہ سہی' حقیقت میں دیکھ لو۔'' میں مسکرا دیا''یا پھر اسے ایک خواب ہی سمجھو۔'' پھر میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے بڑی گرم جوشی سے نوازش سے مصافحہ کیا۔ اس کے دونوں بچوں کو خوب پیار کیا''آپ مجھے دعاؤں میں یاد کرتے رہیے گا۔''

نوازش میرے اس جذبے' خلوص اور محبت سے متاثر ہو کر آبدیدہ ہو گیا۔ پھر میں کمرے سے نکلا تو نرگس مجھے رخصت کرنے آئی۔ صحن میں پہنچ کر اس نے مجھ سے کچھ کہنا چاہا تو ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ وہ میرے کندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دینے لگی۔ میں نے اسے دلاسا دیا۔

نرگس کی مدد کر کے میرے دل کو جو طمانیت اور مسرت ملی

تھی' وہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں پائی تھی۔ ایسا لمحہ میری زندگی میں نہیں آیا تھا۔ یہ لمحہ میرے لیے سرمایۂ حیات بن گیا تھا۔ میں نے سوچا' اگر میرے پاس اور دولت ہوئی تو میں نرگس کو دے دوں گا۔ اس نرگس کو..... شادی کر کے اسے سکھی رکھنے کے لیے تو میں نے قتل کیا تھا' شاہ نواز نے مجھے سات لاکھ روپے کا لالچ دے کر اپنی بیوی کو میرے ہاتھوں قتل کرایا تھا۔ مجھے سات لاکھ روپے کیا ملتے' سات روپے بھی نہیں ملے تھے۔ البتہ سات برس کی سزا ملی تھی' اور پھر نرگس کی شادی ہو گئی تھی۔ میں نے جو خواب دیکھا تھا وہ کسی آبگینے کی طرح ٹوٹ گیا تھا۔

نوازش سے مل کر خوشی ہوئی تھی' وہ نہ صرف خوبصورت اور وجیہہ تھا بلکہ سیدھا سادا شخص تھا۔ مزاج میں نرمی تھی' صابر و شاکر تھا۔ بر لبِ لاط سے اچھا اور نرگس کے لیے بہترین شوہر تھا۔ مجھے نرگس کے گھر کی خوشیاں عزیز تھیں۔ میں اس خیال سے مسرور ہو رہا تھا کہ نرگس کو اب کہیں ملازمت کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اب اس کے شوہر کا علاج اچھے طریقے سے ہو گا جس سے وہ جلد ہی ٹھیک ہو کر چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا۔ میں نے پچاس ہزار کی رقم اس لیے رکھ لی تھی کہ شاہ نواز کو تلاش کر کے اسے قتل کرنا تھا۔ اس کی تلاش میں جانے کہاں کہاں خوار ہونا پڑے گا۔ اسے قتل کرنے کے بعد جتنی رقم بھی بچ جائے گی وہ میں نرگس کو بھیج دوں گا اور پھر بینک میں میری جو رقم تھی' وہ سات ہزار سے بڑھ کر تیس ہزار ہو گئی تھی۔

☆☆☆

شاہ نواز کی تلاش میں مجھے سات مہینے بہت سارے قصبوں اور شہروں کی خاک چھاننا پڑی تھی۔ فیصل آباد' ہور پنڈی' گوجرانوالہ' اسلام آباد' حیدر آباد اور نواب شاہ بھی گیا تھا۔ اس لیے کہ میرے دو ایک دوستوں نے ان شہروں کی نشاندہی کی تھی۔

میں کھجور سے کراچی جا رہا تھا۔ میرے دل میں کراچی دیکھنے کی بڑی خواہش تھی۔ میرے والد ایک دفعہ مجھے سمندر دکھانے کراچی لے گئے تھے۔ میں وہاں پاکس بے' سینڈ زیٹ اور بہت سے تفریحی مقامات پر گیا تھا۔ کراچی مجھے بہت پسند آیا تھا۔ اس وقت میری عمر اٹھارہ برس تھی۔ پھر میں زیادہ تر شمشن کے دوبارہ کراچی نہ جا سکا تھا۔ میں نے نرگس سے شادی کرنے کے بعد یہاں ہنی مون منانے کا سوچا تھا۔ مگر میرے خواب ادھورے رہ گئے تھے۔ اب انتقام کی آگ مجھے کراچی لے جا رہی تھی۔ اسے کراچی میں ہی قتل کرنے کے سوا چارہ نہیں رہا تھا۔ کراچی کو اس کا مدفن بنا کر میرے سینے میں ٹھنڈک پڑ جاتی۔

میں تیرہ چودہ برس کے بعد کراچی پہنچا تھا۔ یہ شہر پہلے کے مقابلے میں بہت خوبصورت اور رنگین ہو گیا تھا۔ یہ سب سے بڑا اور پُررونق شہر تھا۔ میں نے صدر کے علاقے میں ایک اچھے سے ہوٹل میں کمرا کرائے پر لیا تھا۔ دوسرے دن سے میں نے شاہ نواز کی تلاش شروع کر دی تھی۔ اس کے متعلق میرے علم میں جو بات آئی تھی وہ یہ تھی کہ وہ کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہے۔ سات روز ان علاقوں کی خاک چھاننے کے بعد جہاں دفاتر تھے ایک روز یعنی آٹھویں دن اسے میں نے ایک بے حد قیمتی گاڑی میں جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ میں نے ٹیکسی میں اس کا تعاقب کیا۔ صبح کا وقت تھا۔ وہ اپنے دفتر جا رہا تھا۔ اس کا دفتر ڈیفنس کی ایک کمرشل عمارت کی دسویں منزل پر تھا۔ اس عمارت کے چوکیدار نے مجھے بتایا کہ شاہ نواز کا سیفکس کمپنی میں ڈائریکٹر ہے اور کوئی چار برس سے یہاں ملازمت کر رہا ہے۔

میں شاہ نواز کو قتل کرنے میں جلد بازی سے کام لینا نہیں چاہتا تھا' کیونکہ وہ میری دسترس میں تھا۔ اس کے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ عجلت پسندی میرا کام بگاڑ دیتی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ خطرے کی بو سونگھ کر شکار ہاتھ سے نکل جائے اور پھر مجھے اپنا منصوبہ بھی بنانا تھا۔ میں یہ چاہتا تھا کہ اسے اس طرح سے اس دنیا سے رخصت کروں کہ وہ اپنا دفاع اور مزاحمت نہ کر سکے۔

میں شام کے وقت دفتر کی چھٹی سے تھوڑی دیر قبل اپنے حلیے میں ایسی تبدیلی کر کے آ کھڑا ہوا کہ شاہ نواز مجھے دیکھے تو پہچان نہ سکے۔ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہو گی کہ میں رہا ہو گیا ہوں اور پھر وہ یہ سوچتا ہو گا کہ کراچی میں ہونے کے باعث میں اس کی گرد بھی نہیں پا سکتا۔ ٹھیک پانچ بجے اس عمارت میں جتنے دفاتر تھے ان کی چھٹی ہوئی تو نوجوان لڑکے' مرد' لڑکیاں اور عورتیں غول کی شکل میں باہر آ رہے تھے۔ میں پارکنگ لاٹ میں شاہ نواز کی گاڑی سے قدرے ہٹ کر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے شاہ نواز کو دیکھا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک حسین و جمیل بے حد پُرکشش اور پُرشباب گداز بدن کی ایک عورت تھی۔ وہ شاہ نواز کے ساتھ بڑی انکساری کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس عورت کی حرکات و سکنات اور اس کی آنکھوں میں جو خمار دیکھا تھا اس سے صاف پتا چلتا تھا کہ یہ عورت اس کی

محبوبہ دل نواز ہے۔ شاہ نواز بھی اسے محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

تبھی میرے سامنے سے دو نوجوان لڑکیاں باتیں کرتی ہوئیں گزریں۔ ان میں ایک لڑکی تو درمیانہ قد کی تھی۔ وہ ساڑی میں ملبوس تھی۔ شاید شادی شدہ تھی۔ شادی شدہ لڑکیاں عموماً ساڑی پہنتی ہیں..... دوسری لڑکی اس کے مقابلے میں سرخ و سفید' بڑی پُرشباب اور طرح دار بھی لگ رہی تھی۔ اس نے جو لباس پہن رکھا تھا وہ اس کی حشر سامانیاں واضح کیے دیتا تھا۔ وہ ایسی لڑکی تھی جیسے پکا ہوا آم..... جھولی میں ذرا سے اشارے سے ٹپک سکتا تھا۔ اس قسم کی لڑکیوں کو میں پہلی نظر میں پہچان لیتا ہوں۔ اس لڑکی نے اپنی ساتھی اور میانہ قد والی لڑکی سے کہا ''آخر اس حرافہ نے شاہ نواز صاحب کو پھانس ہی لیا؟''

ان دونوں کی باتیں سن کر میں ان دونوں کے تعاقب میں غیر محسوس انداز سے لگ گیا۔ یہ گنی قدرے سنسان تھی۔ وہ اپنی باتوں میں اس قدر مگن تھی کہ انہیں میرے تعاقب کا احساس نہیں تھا اور نہ ہی اس بات کا خیال تھا کہ قریب سے گزرتا ہوا کوئی ان کی گفتگو سن سکتا ہے۔

''یہ کوئی نئی بات ہے کیا؟'' درمیانے قد والی لڑکی بولی۔

''نجمت! تم جانتی ہو کہ ہمارے ڈائریکٹر صاحب کس قدر رنگین مزاج ہیں۔ وہ اب تک خوابوں کے پیچھے بھاگنے والی کتنی لڑکیوں سے دل بہلا چکے ہیں۔''

''لڑکیاں اور عورتیں خود ہی خراب ہونا چاہتی ہیں؟ آخر کیوں نہ ہوں اس سے بڑے فائدے بھی پہنچتے ہیں اور وہ گھاٹے میں نہیں رہتیں..... اگر یہ کمینی بیچ میں نہ ٹپک پڑتی تو میں نے شاہ نواز کو پھانس لیا ہوتا۔'' اس نے ایک سرد آہ بھری۔

''وہ نہ صرف پرائیویٹ سیکریٹری ہے بلکہ ماڈلنگ بھی کرتی ہے اس لیے صاحب اس کے جال میں پھنس گئے۔'' درمیانے قد والی بولی۔

''میری جان' تو اتنی افسردہ اور مایوس کیوں ہوتی ہے۔ یہ صاحب بھونرا صفت ہیں اور ان کے نزدیک عورت ایک پھول کا ہے۔ مرد کا دل جلد بھر جاتا ہے جیسا کہ تو نے بھی دیکھا اور دیکھتی آ رہی ہے..... یہ سیکریٹری کسی دن دیرے کو پھانس لے گی اور صاحب کو ٹھینگا دکھا دے گی۔ اس دن صاحب کو تمہارا خیال آ جائے گا۔ تم ایک مرتبہ ان کے ساتھ بانکی کی ہٹ میں دو دن رہ چکی ہو پھر یہ سلسلہ جاری کیوں نہیں رہ سکا؟ تو اس..... حرافہ سے کم تو نہیں ہے۔''

''اس لیے کہ مجھے یرقان ہو گیا تھا اور میں نے دفتر سے بیس دن کی چھٹی لے لی تھی۔ اس چھٹی نے معاملہ خراب کر دیا۔''

وہ دونوں گلی سے نکل کر سڑک پر آ گئیں۔ درمیانے قد والی لڑکی نجمت سے ہاتھ ملا کر بس اسٹاپ کی طرف بڑھ گئی۔ نجمت قریب کی ایک ملبوسات کی دکان کی طرف بڑھی اور شوکیس کے سامنے کھڑے ہو کر ملبوسات دیکھنے لگی۔ میں نے تاریک شیشوں کا چشمہ اتار کر جیب میں رکھ لیا۔ میں اس کے پاس جا کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ نجمت نے میری موجودگی محسوس کر کے میری طرف گردن گھما کر دیکھا۔

میں نے بڑے مہذب اور شائستہ لہجے میں اسے مخاطب کیا ''کیا آپ نیشنل کاسمیٹکس کمپنی میں ملازمت کرتی ہیں؟''

نجمت نے چونک کر میری طرف حیرت سے دیکھا اور اپنی صراحی دار گردن اثبات میں ہلا دی ''جی ہاں۔''

''اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ کا کچھ قیمتی وقت لینا چاہتا ہوں۔ کیا خیال ہے' سامنے والے ریسٹورنٹ میں چل کر کچھ باتیں کر لیں؟''

سامنے کے ایف سی ریسٹورنٹ تھا۔ کئی اور ریسٹورنٹ بھی تھے لیکن میں نے کے ایف سی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ملازمت پیشہ لڑکیوں اور عورتوں کو ایسے مہنگے ریسٹورنٹس میں کوئی مدعو کرے تو وہ خوش ہو جاتی ہیں اور یہ ان کی کمزوری ہوتی ہے۔ اس لیے وہ ایک دم خوش ہو گئی۔ اس لیے بھی کہ اسے مجھ جیسے مرغے کی ضرورت تھی تاکہ آج کی شام پُرلطف اور خوب گزرے۔ وہ بغیر کسی تذبذب اور ہچکچاہٹ کے خوش دلی سے بولی ''چلیے۔''

میں اس کے ساتھ اس ریسٹورنٹ کے وسیع و عریض ہال میں داخل ہوا۔ ماحول بڑا خوابناک تھا۔ وہ بے حد جوان اور طرح دار تھی۔ چال بھی مستانہ تھی۔ انگ انگ سے مستی ابلی پڑتی تھی۔ ایک گوشے میں ایک میز تھی جس کے گرد دو کرسیاں تھیں۔ میں نے اس کی طرف پانچ سو کا نوٹ بڑھا کر کہا۔ ''پلیز' آپ کچھ خیال نہ کریں جو پسند ہو میرے اور اپنے لیے بھی لیتی آئیں۔''

وہ ایک بڑی ٹرے میں لوازمات سجا کر لے آئی' جب وہ میرے سامنے بیٹھ گئی تو میں نے اس سے اپنا تعارف کرایا۔

''میرا نام شاہد چوہدری ہے۔ میں لاہور سے سیر و تفریح کی غرض سے آیا ہوں۔ یہاں میرا کوئی شناسا اور رشتے دار نہیں ہے۔''

''میرا نام نجمت چوہدری ہے۔ میرا تعلق جہلم سے ہے۔ میں یہاں ملازمت کر رہی ہوں۔'' نجمت نے کہا۔

میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے کوئی تعرض نہ کیا۔ اس کے سڈول اور گداز ہاتھ کے لمس نے میرے سارے بدن میں سنسنی بھر دی۔ ایک لطیف اور انوکھا لمس جو میں نے سات برس بعد محسوس کیا تھا۔ اس کے ہاتھ کے لمس سے میرے اندر سات برسوں سے سویا ہوا مرد ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ مجھے اگر عیاشی کرنا ہوتی تو میں لاہور میں بھی کر سکتا تھا۔ میرے پاس رقم کی کمی نہ تھی۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے بتایا تھا کہ کراچی شہر میں ڈیفنس' گلشن' گلستان جوہر اور گلشن اقبال میں ہر عمر' ہر قسم اور ہر جگہ کی لڑکیاں دل بستگی کے لیے مل جاتی ہیں۔ جیب بھاری ہو تو راہ چلتی لڑکیاں بھی بستر کی زینت بن جاتی ہیں۔ یہ وہ لڑکیاں ہوتی ہیں جو سراب کے پیچھے اندھا دھند بھاگتی ہیں۔ معاشرہ اور لڑکیاں اس قدر خراب ہو چکے ہیں کہ تصور کرنا محال ہے۔

دوسری طرف ایسی لڑکیوں کی بھی اکثریت ہے جو غلط راستے کی طرف دیکھتی بھی نہیں ہیں۔ میں اس وقت اپنا منصوبہ کھوٹا کرنا نہیں چاہتا تھا' شاہ نواز سے انتقام لینا میرا اولین مقصد تھا۔ میرے پاس ستر اسی ہزار کی رقم جو تھی وہ اب ساٹھ ہزار رہ گئی تھی۔ مجھے لڑکی کی طلب نہیں تھی' شاہ نواز کی ضرورت تھی۔ میں جتنی دیر تک بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہا اس سے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ ایسا پکا ہوا پھل ہے جو میری جھولی میں ٹپک سکتا ہے۔ نجمت نے اپنی بے تکلف اور ہمراز کہلی سے راستے میں جو گفتگو کی تھی' اس نے میری مشکل آسان کر دی تھی۔ میں نے شاہ نواز کے بارے میں پوچھنا شروع کیا۔ نجمت نے مجھے شاہ نواز کے بارے میں اتنا کچھ بتا دیا تھا کہ میں سات برس میں بھی معلوم نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے نجمت کو اس کے گھر پر ڈراپ کیا' اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ میں اسے ریسٹورنٹ سے سی ویو لے گیا تھا جہاں ہم نے چہل قدمی بھی کی تھی۔ جب میں ہوٹل پہنچا تو بہت خوش تھا۔ میں کپڑے تبدیل کر کے بستر پر دراز ہو گیا اور شاہ نواز کے بارے میں سوچنے لگا۔ نجمت نے مجھے بتایا تھا کہ شاہ نواز کی بیوی جمیلہ ایک خوبصورت اور پیاری سی عورت ہے۔ شوہر پرست بھی ہے۔ اس کے باوجود شاہ نواز کی کمزوری نوجوان لڑکیاں اور عورتیں ہیں۔ آج کل اپنی پرائیویٹ سیکریٹری شبنم کے ساتھ خوب رنگ رلیاں منا رہا ہے۔ اس بات کا امکان نظر آتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر شبنم سے شادی کر لے۔ اس کی ایک تین برس کی بیٹی بھی ہے۔ ڈیفنس میں شاہ نواز کا ایک خوبصورت اور شاندار بنگلا بھی ہے جو اس نے ایک برس قبل خریدا تھا۔

میں دوسرے دن صبح دس بجے شاہ نواز کا بنگلا دیکھ آیا جو اس علاقے کے خوبصورت مکانوں میں سے ایک تھا پھر میں وہاں سے کمرشل ایریا آ گیا تھا تاکہ کچھ ضروری چیزوں کی خریداری کر سکوں۔ میں ایک دکان کی طرف بڑھ رہا تھا کہ مجھے نجمت آتی دکھائی دی۔ اسے اس وقت اچانک اور غیر متوقع دیکھ کر تعجب اور خوشی بھی ہوئی۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر کھل اٹھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں..... تم اس وقت یہاں کیسے؟ کیا دفتر سے کسی کام سے آئی ہو؟''

''میں یہاں انشورنس کمپنی میں مسز اینڈ مسٹر شاہ نواز کا پریمیم جمع کرانے آئی تھی۔'' اس نے جواب دیا ''مسٹر شاہ نواز پندرہ دنوں کے لیے بیوی اور بچی کے ساتھ مری جا رہے ہیں۔ ہوائی جہاز کے ٹکٹس بھی بک کرانے ہیں۔''

''لائف انشورنس.....'' میں اس کی بات سن کر چونکا۔

''اس کا انشورنس کتنا ہے؟''

''سات لاکھ روپے کا.....'' نجمت نے جواب دیا ''یہ پالیسی کوئی سات مہینے پہلے ہی لی ہوئی ہے۔''

''اچھا.....!'' میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ شاہ نواز دوسری بیوی کے ساتھ بھی وہی کھیل' کھیل رہا تھا جو پہلی بیوی کے ساتھ کھیل چکا تھا۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا ''میں نے مری کی بہت تعریف سنی ہے۔ عجیب سی بات ہے کہ لاہور میں رہتے ہوئے ایک بار بھی مری جا سکا اور نہ ہی سوات۔ کیا تم مری جا چکی ہو؟''

''مری نہ صرف پُرفضا مقام ہے بلکہ بہت حسین جگہ ہے۔ میرے خیال میں ایبٹ آباد' نتھیا گلی اور جگہوں سے بھی بہت خوبصورت ہے۔ وہاں جانے کے بعد واپس آنے کو دل نہیں چاہتا۔ میں دو ایک بار جا چکی ہوں' آپ کو کمپنی دینے کے لیے تیار ہوں اگر آپ وہاں جانا چاہیں اور میرے تمام اخراجات برداشت کر سکیں۔ مری کی سیر اکیلے کرنے میں مزہ نہیں آتا۔''

میرے سارے بدن میں سنسنی بھر گئی۔ وہ بستر کی اور تنہائی کی بہترین رفیقہ ثابت ہو سکتی تھی' میں نے کہا۔

''ابھی نہیں..... جب شاہ نواز مری سے واپس آ جائے گا' تب ہم چلیں گے۔''

میں نے نجمت کے ساتھ شام کو ملنے کا پروگرام بنایا اور جگہ بھی طے کر لی۔ جیب' وہ شام کو مقررہ جگہ ملاقات کرنے آئی تو اپنے جلوے کی حشر سامانیاں لے کر آئی جو بہکا دینے والی تھیں۔ نجمت کسی اعلیٰ قسم کے ہوٹل میں ڈنر لینا چاہتی تھی۔ میں

اس کی پسند کے ہوٹل لے گیا۔ ہم دونوں اس ہوٹل کے سبزہ زار کے ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔ معاً میں نے شاہ نواز اور اس کی پرائیویٹ سیکریٹری شبنم اور ایک شخص کو بھی دیکھا۔ وہ تینوں خاصے فاصلے والی ایک میز پر جا بیٹھے۔ ان تینوں میں سے کسی نے ہماری طرف نہیں دیکھا۔ کیونکہ سبزہ زار پر ملگجی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ نگہت نے ان کے ساتھ جو شخص تھا اس کی طرف دیکھتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''آپ نے اس شخص کو پہچانا؟''

''نہیں تو.....'' میں نے اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا ''میں یہاں تمہارے سوا کسی اور کو نہیں جانتا۔''

''اس شخص کا نام شہنشاہ ہے۔'' نگہت بتانے لگی ''یہ شخص یہاں کا خطرناک ترین بدمعاش مانا جاتا ہے۔ یہ ایک پیشہ ور قاتل ہے۔ اس سے نہ صرف بڑے بڑے بدمعاش بھی کانپتے ہیں بلکہ پولیس بھی اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے گھبراتی ہے کیونکہ اسے ایک وزیر کی پشت پناہی حاصل ہے۔ لہٰذا اس شخص کا شاہ نواز سے کیا کام ہو سکتا ہے؟ شبنم بھی ساتھ موجود ہے۔''

''ان باتوں کو تم نہیں سمجھو گی۔'' میں نے سرگوشی میں آہستگی سے کہا ''یہ میں جانتا ہوں' کاش! اس وقت کیمرا ہوتا۔''

''کیا آپ شاہ نواز اور اس شخص کی تصویر اتارنا چاہتے ہیں؟'' نگہت نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''اس شخص کے ساتھ نہیں بلکہ شبنم کے ساتھ..... ان تصویروں سے میں شبنم اور شاہ نواز کے تعلقات ختم کر سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کیا بلیک میل کریں گے آپ شاہ نواز کو؟'' نگہت مسکرا دی ''اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا کیونکہ جمیلہ ایک جذباتی اور روایتی عورت ہے۔ اپنے شوہر کو حد سے زیادہ چاہتی اور مجازی خدا سمجھتی ہے۔''

''بلیک میل نہیں۔'' میں بھی جواباً مسکرا دیا ''میرے ذہن میں اور ہی تدبیر ہے۔ میں اس کی اور شبنم کی ساتھ ساتھ تصویریں بنانا چاہتا تھا۔''

''میرے پاس ان دونوں کی رومانی' جذباتی انداز کی دس بارہ تصاویر موجود ہیں جو دفتر میں ان دونوں کو دنیا و مافیہا سے بے نیاز لنچ کے موقع پر کسی نہ کسی طرح اتار لی تھیں تاکہ صاحب کو اپنی طرف متوجہ کر سکوں..... شہنشاہ کو دیکھ کر مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ صاحب کو بلیک میل کر سکوں' اگر آپ ان سے کام لے سکتے ہیں' میں پانچ ہزار روپے کے عوض آپ کو دے سکتی ہوں۔ بہرحال آج رات آپ کے ہوٹل پہنچا دوں گی۔''

''تمہیں زحمت ہوگی۔'' میں نے کہا ''کیوں نہ میں تمہارے ساتھ چل کر تصویریں لے لوں۔ رقم کل صبح پہنچا دوں گا کیونکہ اس وقت جیب میں دو ہزار روپے ہیں یا پھر کل صبح تصویریں دے دینا اور رقم بھی لے لینا۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔''

''میرے گھر والے آپ کو دیکھ کر کچھ خیال نہ کریں۔ میں خود ہی تصاویر آج پہنچا دوں گی۔'' وہ بولی۔

جب ہم اٹھے تو سوا نو بج رہے تھے۔ اس میز پر وہ تینوں باتوں میں مصروف..... سر جوڑے بیٹھے تھے۔ نگہت نے ہوٹل سے باہر نکل کر ٹیکسی لی اور گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں اپنے ہوٹل آ گیا۔ ساڑھے دس بجے نگہت تصویریں لے کر ہوٹل میں آ گئی۔ تصویریں تو ایک بہانہ تھیں وہ صبح نو بجے کمرے سے نکلی تو میں بڑی دیر تک سوتا رہا۔ کیونکہ نگہت نے مجھے ساری رات سونے نہیں دیا تھا۔ اس نے پانچ ہزار روپے کے عوض تصویروں کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بھی پیش کر دیا تھا۔

شاہ نواز چونکہ تیسرے دن ہوائی جہاز سے جا رہا تھا اس لیے میں رات کو خیبر میل سے مری کے لیے روانہ ہو گیا۔ میں ہوائی جہاز سے اس لیے نہیں گیا تھا کہ میں غیر قانونی پستول لے جا نہیں سکتا تھا۔ بڑی سخت چیکنگ ہوتی تھی۔ میں نے مری پہنچ کر ایک فور اسٹار ہوٹل میں کمرا کرائے پر لیا۔ میں نے دو ایک دن میں شاہ نواز کی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جو سات برسوں سے میرے لیے سوہانِ روح بنی ہوئی تھی۔

شبنم نے بھی ایک ہوٹل میں کمرا لے لیا تھا۔ اسی ہوٹل میں شہنشاہ بھی ٹھہرا ہوا تھا۔ شاہ نواز ایک چھوٹے سے بنگلے میں ٹھہرا تھا۔ بیوی اور بچی کے ساتھ..... یہ کسی دوست کا یا کمپنی کا بنگلا تھا۔ اس میں کوئی چوکیدار یا ملازم نہ تھا۔ ایک ملازمہ تھی جو علی الصباح آ کر صفائی ستھرائی کر کے چلی جاتی تھی۔ میرے لیے شاہ نواز کو ختم کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی تھی۔

تیسرے دن صبح گیارہ بجے میں نے اوورکوٹ پہنا اور سر پر اونی ٹوپی چڑھا لی۔ کیونکہ آج موسم بے حد سہانا اور خنک تھا۔ فروری کا مہینا تھا۔ میں اپنا کمرا مقفل کر کے نیچے آیا۔ اوورکوٹ کی جیب میں بھرا ہوا پستول تھا۔ کاؤنٹر پر کمرے کی چابی دے کر جنرل اسٹور کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے کوئی سو روپے کی چپس' ٹافیاں اور چاکلیٹس خریدیں اور شاہ نواز کے بنگلے کی طرف بڑھ گیا۔ شاہ نواز ٹھیک دس بجے اس

ہوٹل کی طرف جاتا تھا' جس میں شبنم نے کمرا لیا ہوا تھا۔

جب میں نے اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا تو میری نظروں کے سامنے تیس برس کی ایک حسین عورت کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک تقدس سا تھا۔ وہ ایک سیدھی سادی اور معصوم سی عورت لگتی تھی۔ مجھے اس لمحے ایسا لگا کہ میری نظروں کے سامنے نرگس کھڑی ہوئی ہے۔ وہ نرگس کی طرح تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک دل کش مسکراہٹ بکھر گئی' اس نے بڑی شائستگی اور نفیس لب و لہجے میں پوچھا۔ ''فرمائیے..... آپ کو کس سے ملنا ہے؟''

''کیا مسٹر شاہ نواز تشریف رکھتے ہیں؟ میں ان سے ملنے حاضر ہوا تھا۔''

''وہ اپنے کسی دوست سے ملنے ہوٹل گئے ہوئے ہیں۔'' اس نے جواب دیا ''وہ تھوڑی دیر میں آتے ہی ہوں گے۔''

''کیا میں اندر بیٹھ کر ان کا انتظار کر سکتا ہوں؟'' میں نے کہا ''مجھے ان سے بہت ہی ضروری کام ہے۔''

''ضرور..... ضرور..... کیوں نہیں۔'' اس نے ایک طرف ہٹ کر مجھے اندر آنے کا راستہ دیا۔

پھر جمیلہ مجھے اپنے ساتھ لے کر نشست گاہ کی طرف بڑھی۔ نشست گاہ میں فرش پر بچھے ہوئے قالین پر اس کی تین سالہ بیٹی کھلونوں سے کھیل رہی تھی۔ بڑی خوبصورت اور پیاری سی بچی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا تو میرے پاس آ کر بڑے ادب سے آداب کیا۔

میں نے صوفے پر بیٹھ کر اسے اپنے سے قریب کر لیا۔ اس کے پھول سے رخسار پر ایک بوسہ ثبت کر کے اس کی طرف پیکٹ بڑھا دیا۔

''اس میں آپ کے لیے چپس' چاکلیٹس اور ٹافیاں ہیں۔''

''شکریہ انکل!'' بچی نے میرے ہاتھ سے پیکٹ لینے کے بعد میرا شکریہ ادا کیا۔ پھر وہ پیکٹ میز پر رکھ کر کھلونوں سے کھیلنے لگی۔

''آپ نے بڑی زحمت کی۔'' جمیلہ بولی ''میں آپ کو پہلی بار دیکھ رہی ہوں' آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا؟''

''میرا تعارف.....!'' میں مسکرایا ''میرا نام اکمل ہے۔ شاہ نواز میرے بہترین دوستوں میں سے ہیں..... کیا انہوں نے کبھی آپ سے میرا تذکرہ نہیں کیا.....؟''

''جی نہیں۔'' جمیلہ نے سر ہلایا ''میں آپ کو پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ آپ ان کے قریبی دوستوں میں سے ہیں تو اتنے لمبے عرصے بعد ان سے ملنے کیوں آئے ہیں؟''

''میں ملک سے باہر تھا۔'' میں اسے بتانے لگا ''کراچی آپ کے گھر پہنچا تو بتایا گیا کہ آپ لوگ مری گئے ہوئے ہیں۔''

''آپ کیا پینا پسند فرمائیں گے؟'' جمیلہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میرے خیال میں موسم کے لحاظ سے کافی زیادہ مناسب رہے گی۔''

میں نے سر ہلایا تو وہ کافی بنانے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ میں بچی کے ساتھ کھیلتا اور اس سے باتیں کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد جمیلہ ایک ٹرے میں کافی اور ابلے انڈے رکھ کر لائی۔ سینڈوچز بھی تھے۔ میں کافی پی رہا تھا کہ شاہ نواز اندر داخل ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی اس طرح سے چونکا جیسے برقی جھٹکا لگا ہو۔ اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔

''تم.....!'' اس کی آواز مرتعش ہو رہی تھی۔

''اللہ کا شکر ہے کہ تم نے مجھے پہچان لیا میرے دوست!'' میں اس کی طرف بڑھا ''ہم پورے سات برس بعد مل رہے ہیں۔ یہ حساب تو تمہیں بھی بہت اچھی طرح یاد ہوگا۔''

''تم یہاں کیوں آئے ہو؟ کس لیے آئے ہو؟'' شاہ نواز خود پر قابو پا کر ہذیانی انداز سے چیخا ''تمہیں کس نے بتایا کہ میں یہاں ہوں؟''

''میں یہاں کیوں اور کس لیے آیا ہوں یہ بات تم خود بہت اچھی طرح جانتے ہو۔'' میں نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ''اس کی وضاحت چاہتے ہو تو کر دوں..... اپنے حصے کی رقم مع سود وصول کرنے آیا ہوں۔''

''کوئی حصہ نہیں ہے..... کوئی رقم نہیں ہے میرے پاس..... تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم شرافت سے اسی طرح چلے جاؤ جس طرح آئے ہو۔'' وہ پاگلوں کی طرح چیخا۔

''تم نے اپنی پہلی بیوی نادرہ کا سات لاکھ روپے کا بیمہ کرایا تھا۔'' میں کہنے لگا ''تم نے مجھے اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ میں نادرہ کو قتل کر دوں' بیمے کی رقم چودہ لاکھ ملے گی جس میں سے ہم دونوں ففٹی ففٹی کر لیں گے۔ نادرہ کی جو اسی لاکھ کی کوٹھی ہے اس میں سے بیس فی صد دوں گا۔ جب میں نے تمہارے کہنے پر نادرہ کو قتل کیا تو تم نے مجھے پھنسا دیا اور ساری دولت سمیٹ کر کراچی آ گئے پھر اس حور جیسی معصوم عورت سے شادی کر لی۔''

''بکواس بند کرو.....'' وہ تڑپتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تم مجھے بلیک میل کرنے آئے ہو.....؟''

''میرے شوہر ایسے نہیں ہیں۔'' جمیلہ اپنے شوہر کے پاس جا کر اس سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔

''کاش..... آپ کے شوہر ایسے نہ ہوتے۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے کہا ''آپ بڑی بدنصیب ہیں کہ آپ کا شوہر نہ صرف ایک خبیث شخص ہے بلکہ درندہ صفت بھی ہے۔ پلیز! آپ درمیان میں نہ بولیں۔ آپ ہماری باتیں سنتی رہیں۔ اس کمینے شخص نے اپنے مستقبل کے لیے مجھے بھینٹ چڑھا دیا۔ میری زندگی تاریک کردی اور خود اپنی زندگی تابناک کرلی۔ میں نہ صرف نرگس بلکہ اچھی زندگی سے محروم ہوگیا۔ بہرکیف میں آج اپنے دولت مند دوست سے حساب بے باق کرنے آیا ہوں۔'' میں خاموش ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔

''میں کہتی ہوں' آپ یہاں سے چلے جائیں۔'' جمیلہ نفرت اور غصے سے کانپنے لگی ''اگر آپ نہیں گئے تو پولیس کو فون کر کے بلالوں گی۔''

''آپ پولیس کو بلانا چاہیں' بلالیں۔'' میں نے کہا۔

''میں کہتا ہوں تم یہاں سے جاتے ہو کہ نہیں.....'' شاہ نواز نے غصا میں اپنا مکا لہرایا ''تم نے ذرا بھی بکواس کی تو تمہارا منہ توڑ دوں گا۔''

میرے ہونٹوں پر زہرخند مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے اوورکوٹ کی جیب سے لفافہ نکال کر اس میں سے تصویریں نکالیں۔ پھر اسے جمیلہ کی طرف بڑھایا ''کل ایک درجن تصاویر ہیں لیکن ان میں سے پانچ عدد ایسی ہیں کہ آپ کا دیکھنا مناسب نہیں..... اس لیے صرف سات تصویریں پیش خدمت ہیں۔ ان تصاویر میں آپ کو اپنے شوہر کا اصل چہرہ نظر آجائے گا۔''

جمیلہ نے میرے ہاتھ سے تصویریں لے لیں۔ وہ ایک ایک کر کے تصویریں دیکھنے لگی' اس کے چہرے پر حیرت تھی۔ شاہ نواز بھی دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔ وہ سنبھل کر چیخا۔

''تم نے جعلسازی کر کے یہ تصاویر بنائی ہیں تاکہ مجھے بلیک میل کرسکو۔ ذلیل..... کمینے.....'' اس کا چہرہ سرخ ہوتا چلا گیا۔

''ہاں' ہاں.....'' جمیلہ نے اپنے شوہر کی تائید کرتے ہوئے تصاویر پھاڑ دیں اور فرش پر پھینک کر بولی ''میرے شوہر ایسے نہیں ہیں۔''

''آپ کے شوہر کیا ہیں یہ میں بتاتا ہوں۔'' میں کہنے لگا۔ ''آپ کے شوہر نے وہی منصوبہ بنایا ہے جو سات برس پہلے میرے ساتھ مل کر اپنی دولت مند بیوی کے خلاف بنایا تھا۔ شبنم کی زلفوں کے اسیر ہو کر آپ کے شوہر آپ کو راستے سے ہٹا دینا چاہتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے ساتھ لاکھ روپے کی آپ کی بیمہ پالیسی لی ہے۔ آپ کے قتل کی صورت میں انہیں چودہ لاکھ کی رقم اور آپ کا خوبصورت مکان بھی مل جائے گا۔ اور پھر آپ کا وہ خوبصورت بنگلا' جس کی مالیت دو کروڑ تو ہوگی انہیں مل جائے گا اور اسی مقصد کے تحت آپ کو یہاں لایا گیا ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے' آپ انہی سے دریافت کرلیں۔''

شاہ نواز میری باتیں سن کر بھونچکا رہ گیا۔ وہ دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ مجھے اس کے منصوبے کی ہوا کیسے لگ گئی۔ اس کی پریشانی اس کے بشرے سے جھلک رہی تھی۔ شاید وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ یہ شیطان کہاں سے بیچ میں آ گیا؟

جمیلہ کی آنکھیں حیرت اور دہشت سے پھیل گئیں۔ لمحاتی توقف کے بعد اس نے کہا ''یہ سچ ہے کہ میرا سات لاکھ روپے کا بیمہ کیا گیا ہے تاکہ میری بیٹی کی شادی پر کام آسکے جبکہ اس کی ایسی کوئی خاص ضرورت نہ تھی کیونکہ لاکھوں کی رقم اب بھی بینکوں میں موجود ہے۔''

''تم یہاں سے دفع ہوتے ہو یا نہیں؟'' شاہ نواز نے چراغ پا ہو کر کرسی اٹھائی تاکہ میرے سر پر دے مارے۔

میں نے فوراً ہی ریوالور نکال کر اس کی نال کا رخ شاہ نواز کی طرف کرلیا تو اس نے خوف زدہ ہو کر کرسی واپس رکھ دی۔ میں نے جمیلہ سے کہا ''شبنم ان کی پرسنل سیکریٹری بھی مری میں ہی ایک ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہے اور وہ بدمعاش شہنشاہ کرائے کا قاتل بھی..... شہنشاہ ہی کے ہاتھوں آپ کو موت کی نیند سلانے کا منصوبہ یہ فیئوں بنا چکے ہیں۔''

''کیا یہ سچ ہے شاہ نواز.....!'' جمیلہ نے اپنے شوہر کی طرف گھوم کر کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''یہ سب کچھ جھوٹ ہے..... سراسر بہتان ہے۔'' شاہ نواز نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے قریب کرلیا۔ اس کی آواز بے جان تھی۔ ''یہ لاہور کا خطرناک ترین مجرم اور پیشہ ور قاتل ہے۔ دولت مند لوگوں کو خوف زدہ کر کے دولت وصول کرنا اس کا پیشہ ہے۔''

''میں تم سے رقم وصول کرنے نہیں آیا ہوں۔'' میں نے کرخت لہجے میں کہا ''میں اس خودغرض دنیا میں مزید جینا نہیں چاہتا۔ جیل کی دنیا اس دنیا سے بہت اچھی ہے۔ میں وہاں قیدیوں کو پڑھاتا تھا' اب وہاں جا کر پھر پڑھاؤں گا۔''

''آخر تم چاہتے کیا ہو؟'' شاہ نواز کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں ''صاف صاف بتاؤ۔''

''تمہاری موت..... میں تمہیں قتل کرنے آیا ہوں شاہنواز!'' میں نے سفاک لہجے میں کہا ''میرے لیے تمہاری موت ہی مسرت اور سب سے بڑی دولت ہے۔''

''نہیں... نہیں۔'' جمیلہ اپنے شوہر کے آگے آ کر اسے چھپاتے ہوئے ہیجانی لہجے میں بولی ''یہ میرا سہاگ ہے۔ میری بچی کا باپ ہے..... اس معصوم بچی کا باپ.....!'' اس نے گھوم کر بچی کی طرف دیکھا۔ وہ کمرے میں نہیں تھی۔

''کہاں ہے میری بچی؟'' وہ بدحواس ہوگئی۔

''بچی.....! وہ تھوڑی دیر پہلے اپنے کھلونے لے کر باہر گئی ہے۔'' میں نے جمیلہ کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کردیں۔ یہ ایک لحاظ سے بہت ہی اچھا ہوا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ایک معصوم اور ننھی سی جان اپنے ذلیل ترین اور بے رحم باپ کو اپنی نظروں کے سامنے تڑپ تڑپ کر مرتا ہوا دیکھے۔

جمیلہ کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ اس کی حالت ایک مردے سے بھی بدتر ہو رہی تھی۔ وہ میرے آگے دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگی۔ ''خدا کے لیے تمہیں جتنی دولت چاہیے لے لو' یہاں سے چلے جاؤ۔''

''میں یہاں دولت لینے نہیں آیا ہوں۔'' میرا لہجہ سپاٹ اور کرخت ہوگیا ''میں یہاں اس خبیث شخص سے انتقام لینے آیا ہوں' جس کے لیے میں بہت بڑی قسم کھا چکا ہوں۔ انتقام کی یہ آگ سات دنوں سے نہیں' پورے سات برسوں سے میرے وجود میں بھڑک رہی ہے۔ میں آج اس موقعے کو کسی قیمت پر نہیں گنواؤں گا۔ بہتر ہے کہ آپ ابھی اور اسی وقت بچی کو لے کر لاہور چلی جائیں۔''

''میں نہیں جاؤں گی۔'' وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔ ''تم نہیں جانتے' ایک عورت کے لیے اس کا سہاگ ہی سب کچھ ہوتا ہے۔''

''میں جانتا ہوں..... اس لیے کہ میں انسان ہوں۔ مگر اس سہاگ کے لیے آپ کو بیوہ ہونا ہے۔ اس لیے کہ یہ کمینہ مجھ سے زیادہ سنگدل شخص ہے۔ ایک لڑکی اور دولت کے لیے آپ کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے بھی میں اسے زندہ نہیں رہنے دوں گا۔''

''پھر ایسا کرو کہ مجھے گولی مار دو۔ میرے شوہر کو معاف کردو۔ مجھے شوہر کی جان سب سے زیادہ عزیز ہے۔'' وہ بے توقف لہجے میں بولی۔

میں نے حیران ہو کر اس کی شکل دیکھی۔ پھر شاہ نواز کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ''کیا میں تمہاری بیوی کی درخواست منظور کرلوں؟''

''ہاں' ہاں..... کیوں نہیں۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

''آپ نے دیکھ لیا اپنے شوہر کی خودغرضی کو..... آخر بلی تھیلے سے باہر آ گئی نا۔ کیا یہ شخص اس قابل ہے کہ زندہ رہے؟''

''چھوڑو ان باتوں کو اور مجھے قتل کردو اور چلے جاؤ۔ وعدہ کرو کہ مجھے قتل کرنے کے بعد تم میرے شوہر کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔''

''چلیے..... میں آپ کی بات مان لیتا ہوں۔'' میں نے کہا ''لیکن میری ایک شرط ہے۔''

''کیسی شرط؟'' جمیلہ نے پلکیں جھپکائیں۔

''آپ کو پولیس اور شوہر کے نام خط لکھنا ہوگا کہ..... میں اپنے شوہر کے ہرجائی پن کی وجہ سے خودکشی کر رہی ہوں۔ میرے نام جو مکان ہے وہ کسی یتیم خانے یا خیراتی ادارے کو دے دیا جائے۔'' میں نے اپنی بات ختم کر کے معنی خیز نظروں سے شاہ نواز کی طرف دیکھا۔

''اس خط سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟'' جمیلہ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ایک تو میں آپ کے قتل کے الزام سے بچ جاؤں گا' دوسرا یہ کہ پُرسکون زندگی گزار سکوں گا۔''

''نہیں..... نہیں' تم ایسا خط ہرگز مت لکھنا۔ یہ بدمعاش تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے۔'' شاہ نواز نے فوراً کہا۔

''تم اپنی بیوی کو یہ خط لکھنے سے اس لیے منع کر رہے ہو کہ تم چودہ لاکھ کی رقم سے محروم ہو جاؤ گے..... یہ رقم تمہیں بیمہ کمپنی سے اس لیے کہیں ملے گی کہ تمہاری بیوی نے خودکشی کی ہے۔'' میں نے کہا۔

''میرا مطلب یہ نہیں ہے۔'' شاہ نواز کی آواز لڑکھڑانے لگی۔

''پھر کیا بات ہے؟'' میں اس کی بات سن کر معنی خیز انداز سے مسکرایا۔

شاہنواز غلیظ جھا نکنے لگا۔ جمیلہ قلم کاغذ لینے کے لیے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی تو شاہنواز نے مجھ سے سرگوشی میں کہا۔

''اگر تم جمیلہ کو قتل کر کے فرار ہو جاؤ اور یہ کاغذ پولیس کو نہ دو تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ.....'' شاہ نواز نے جمیلہ کو بیڈ روم سے نکلتے دیکھا تو اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

جمیلہ نے کھانے کی میز پر بیٹھ کر خط لکھا۔ پھر وہ خط لکھ کر

میرے پاس آئی تو اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ پھر اس نے خط میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''یہ دیکھیں' خط میں نے ٹھیک لکھا ہے نا؟''

میں اس کے ہاتھ سے خط لے کر پڑھنے لگا اور اس لمحے غافل سا ہو گیا تھا۔ جمیلہ نے ایک دم سے میرے ریوالور والے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مار کر ریوالور جھپٹ لیا اور ایک قدم تیزی سے پیچھے ہٹ کر مجھے نال کی زد میں لے لیا۔

''خبردار..... اپنی جگہ سے ہلنا نہیں.....''

میں ایک لمحے کے لیے بھونچکا سا ہو گیا۔ شاہ نواز نے اپنے حق میں بازی پلٹتے دیکھی تو وہ تیزی سے جمیلہ کی طرف بڑھا۔

''شاباش جمیلہ! تم نے بڑا کمال دکھایا۔''

''تم بھی اپنی جگہ کھڑے رہو۔'' جمیلہ نے ریوالور کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے تیز و تند لہجے میں کہا۔

''میری بات تو سنو.....'' شاہ نواز رکا نہیں ''ورنہ یہ بدمعاش.....!''

شاہ نواز کا جملہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ ریوالور کی نال نے ایک شعلہ اگل دیا۔ شاہ نواز سینہ دبا کر لڑکھڑانے لگا۔ گولی ٹھیک اس کے سینے پر دل کے مقام پر لگی تھی۔ اگر اس نے اس جگہ اپنا ہاتھ نہیں رکھا ہوتا تو خون کا فوارہ ابل پڑتا۔ اس کا ہاتھ خون میں تر بتر ہو گیا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑا اور دوسرے لمحے اس نے دم توڑ دیا۔

اس کے فرش پر ڈھیر ہوتے ہی جمیلہ نے ریوالور فرش پر پھینک دیا اور صوفے پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں لمحہ بھر کو دم بخود سا رہ گیا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک اور تیزی سے ہوا تھا کہ میں دم بخود رہ گیا' مجھے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اور یہ سب کچھ کسی ڈراؤنے خواب کی طرح تھا۔ دوسرے لمحے میں نے آگے بڑھ کر ریوالور اٹھا لیا اور جیب میں رکھ لیا پھر میں نے اس کے پاس جا کر تحیر زدہ لہجے میں کہا ''یہ کیا' کیا آپ نے..... آپ نے مجھے قتل کرنے کے بجائے اپنے شوہر کو قتل کر دیا۔''

''میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔'' جمیلہ سسکیوں کے درمیان بولی ''میں جانتی تھی کہ آپ مجھے قتل نہیں کریں گے۔ میرے شوہر کو بھی نہیں..... مگر میرا شوہر ہم دونوں کو قتل کر دیتا۔''

''لیکن تھوڑی دیر پہلے تو آپ اس کی خاطر اپنی جان تک دینے پر تیار تھیں۔'' میری حیرانی ابھی تک دور نہیں ہوئی تھی ''آپ نے اپنی زندگی قربان کرنے کے بجائے اپنا سہاگ خود اجاڑ دیا' آخر ایسا کیوں کیا؟''

''میں نے آخری وقت تک اپنے شوہر کو ایک شریف آدمی سمجھا تھا۔'' وہ اپنے آنسوؤں کو دوپٹے میں جذب کرتے ہوئے بولی ''آپ میرے نزدیک بلیک میلر اور پیشہ ور قاتل تھے۔ بیڈروم سے نکلتے وقت میں نے اپنے شوہر کی گفتگو سنی تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ میرا شوہر ایک خود غرض' کمینہ اور درندہ صفت شخص ہے۔ تب مجھے آدمی پہچاننے کی تمیز ہوئی اور میں نے اپنے شوہر کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔''

''آپ نے مجھے میرا ارمان پورا کرنے نہیں دیا۔'' میں نے گہرا سانس لیا ''کتنا اچھا ہوتا کہ ایک برا آدمی..... برے آدمی کے ہاتھوں مرتا۔ آپ نے اچھا نہیں کیا' ایک برے آدمی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ لیے۔''

''میں نے جو کچھ کیا اس پر میرا ضمیر مجھے کبھی بھی ملامت نہیں کرے گا۔'' وہ دل گرفتہ لہجے میں بولی ''البتہ مجھے ساری زندگی اس بات کا دکھ رہے گا کہ میرا شوہر کتنا ریاکار اور منافق تھا۔'' اس نے رک کر سانس لی ''آپ پولیس کو فون کر کے بلا لیں۔ میں اپنے آپ کو قانون کے حوالے کرنا چاہتی ہوں تاکہ مجھے سزا مل سکے۔''

''اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے جمیلہ بیگم!'' میں نے کہا۔ ''قانون کے حوالے میں اپنے آپ کو کروں گا' آپ نہیں۔ قاتل آپ نہیں' میں ہوں۔''

''کیا.....!'' جمیلہ اچھل پڑی ''قتل کا الزام آپ اپنے سر لیں گے..... وہ کس لیے؟''

''اس لیے کہ آپ کی معصوم بچی کو ایک ماں کی سخت ضرورت ہے۔ یہ بچی ماں کے بغیر کیسے رہے گی؟ کیا آپ یہ چاہتی ہیں کہ آپ کی بچی کسی یتیم خانے میں پرورش پائے اور آپ ساری زندگی جیل کاٹیں؟''

''مگر اکمل صاحب!'' جمیلہ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ وہ مجھے منجمد نظروں سے دیکھنے لگی ''قتل ایک سنگین جرم ہے' اس جرم کا ارتکاب میں نے کیا ہے' آپ بے گناہ ہیں' آپ کو کیوں ناکردہ گناہ کی سزا ملے؟''

''ہمارے ہاں عام طور پر بے گناہوں ہی کو سزا ملتی ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اور پھر اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ میرے لیے جیل سے باہر اور جیل کی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یوں بھی میں برسوں جیل کاٹ کر رہا ہوا ہوں اس لیے جیل واپس جانا چاہتا ہوں۔''

وقت' وہ جو بیت جاتا ہے مگر احساس نہیں ہونے دیتا' اور جو نقوش چھوڑتا ہے وہ فراموش نہیں ہوتے۔ انسانی کہانی پیدائش سے شروع ہوتی ہے۔ میری پیدائش کوئی ایسا انوکھا واقعہ نہیں تھا۔ والدین کے لیے بھی گھر کی چوتھی لڑکی تھی۔ امی کو سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا' ابا چھٹیاں لے کر بیٹھے تھے مگر ان سے کچھ ہوتا نہیں تھا۔ صاف بات تھی کہ ابا کی جان مصیبت میں آ گئی تھی۔ ددھیال میں صرف تایا' چچا تھے۔ ان کی بیویوں نے کبھی بنا کر نہ رکھی اسی لیے دادی بھی اپنے الگ گھر میں تنہا رہنے لگی تھیں۔ ننھیال میں دو خواتین تھیں' نانی اور چھوٹی خالہ۔ نانی کی طبیعت خراب اور خالہ کے ہاں ولادت ہونے والی تھی۔ دادی بھی صرف دن کو چکر لگاتیں۔

ایک روز دادی آئیں تو ابا سخت پریشان بیٹھے تھے' سارا گھر گندا' پھیلا ہوا تھا۔ امی کے بستر سے لگے' میرے روتے' بھوکے بہن بھائی دیکھ کر جانے دادی کے من میں کیا آئی کہ جھٹ فرمائش کر دی۔

''بہو' اب کافی روز ہو گئے' اٹھنا پڑے گا۔ رہی نئی بچی تو میں اکیلی ہوں' اس کے ساتھ جی بہلا رہے گا' یہ مجھے دے دو۔''

ابا' امی کی نظریں ملیں' اس فیصلے میں صرف فائدے نظر آئے سو ابا نے کہا ''آپ کی اولاد ہے' لے جائیں!''

یہ کہانی دادی تب سنایا کرتیں جب کوئی اور بات نہ

پچھتاوا

محترم مدیر اعلیٰ

السلام علیکم!

یہ روداد میری اس سہیلی کی ہے جو اپنے ہی دام میں خود آگئی۔ اسی کا طمانچہ خود اس کے گال پر آلگا۔ اس کی بے وقوفی نے کس طرح اسے ذلیل و خوار کیا ہے یہی میں قارئین کو دکھانا چاہ رہی ہوں تاکہ یہ نوعمر لڑکیاں اپنی زندگی کو برباد نہ کر بیٹھیں۔ اسے صرف کہانی نہ سمجھا جائے بلکہ اس سے سبق حاصل کیا جائے۔

ماریہ عرفان

(واہ کینٹ)

ہوتی۔ دادی نے ہر ماں کی طرح ارمان سے بیٹے بیاہے تھے مگر تائی نے ان کے ساتھ وہ کیا جو انہوں نے کبھی بیٹوں سے برداشت نہیں کیا تھا' ان کے ساتھ زبان درازی کی۔ دادی نے تائی کو نرمی سے' آرام سے سمجھایا مگر تائی کے لیے مزاج میں نرمی لانا' دب کر رہنا' یہ سب بہت مشکل تھا۔

''تو ٹھیک ہے' جس طرح یہ بہتر سمجھے' رہے مگر یہاں نہیں۔''

دادی نے اس سرد جنگ کا مظہر تایا کو اپنا فیصلہ بنا دیا۔ تائی تیار بیٹھی تھیں۔ سنا ہے جس روز وہ گئے' دادی کے لبوں پر تب بھی خاموشی تھی مگر ساری رات وہ چھت پر ٹہلتی رہیں۔ جاتے جاتے مظہر تایا' دادی کو ایک اور قسم دے گئے تھے کہ اس گھر میں ان کا کوئی بیٹا' بہو نہیں رہے گا۔ دادی نے ماں بن کر لاڈلے بچے کی طرح مظہر تایا کی یہ ''فرمائش'' بھی مان لی۔

ابا اور چچا میں بہت پیار رہا' یہی پیار انہوں نے امی اور چچی میں منتقل کیا۔ امی دادی کے قریب بھی رہیں۔ دادی کئی بار خواہش ظاہر کر چکی تھیں کہ وہ ہمارے ساتھ رہیں۔ ابا نے بھی بہت کہا مگر دادی مظہر تایا کے ساتھ کیے وعدے پر قائم رہیں۔

☆☆☆

میں نے ہوش سنبھالا تو دیکھا' گھر میں دادی اور میں ہی تھے۔ عورتیں' مرد' بچے' جوان سبھی آ جایا کرتے۔ دادی ہر کسی کی نانی' دادی' اماں' آپا تھیں۔ دادی ان کی باتوں میں' مسائل میں محو ہو جاتیں یا کسی کونے میں سر دیے گھنٹوں کچھ نہ کچھ کرتی رہتیں..... جانماز پر بیٹھتیں تو وہاں ہی بیٹھی رہتیں۔ میری طرف سے مطمئن رہتیں کہ ادھر ہی ہوگی۔

دادی میری ہر بات مان لیتیں' مجھے لڑکیاں بالکل پسند نہیں تھیں۔ لڑکے مجھے اچھے لگتے' میں ضد کر کے بوائے کٹ بال کٹواتی رہی' لڑکوں کی طرح کپڑے بنواتی۔ ٹام بوائے بن کر ہر وقت لڑکوں میں گھسی رہتی۔ میں تو خود کو لڑکا سمجھنے لگی' لڑکے بے وقوف نہیں تھے کہ ہنسوں کے پر لگا کر ہنسوں میں گھس آنے والے کوے کو ہنس ہی سمجھ لیتے۔

کسی نہ کسی دوست کا خالی گھر ملا تو کوئی بڑا دوست مجھے یہ فرق سمجھانے لے گیا۔ دیکھو' تم لڑکی ہو ناں' میں اور ہوں..... فرق ہے ناں..... فرق کی تفصیلات ہر بار مختلف اور آگے تک چلی جاتیں۔ مجھے یہ سب اور بھی اچھا لگنے لگا تھا مگر مجھے بہت آگے جاتے ہوئے ڈر لگتا اور میں خود ہی بھاگ نکلتی۔ گویا میں بچپن میں ہی ذہنی طور پر بالغ ہو گئی۔ لڑکوں میں مجھے اور کشش نظر آنے لگی۔ آزادی بھی تھی۔ دوستوں میں ہر عمر کے لڑکے تھے۔

ہمارا اپنا گھر کھلا ہوتا' دادی ہوتیں بھی تو کسی کونے میں گم۔ عموماً اِدھر اُدھر جانا پڑتا' پھر لڑکوں کا ہمارے گھر آنا کون سا عجیب واقعہ تھا کہ کسی اور کو شک پڑتا۔ بلکہ اس قسم کا ڈر خوف میرے ذہن میں کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ لڑکے البتہ ڈرتے تھے۔ دادی کی عزت تھی' وہ یہ ڈر خوف مجھ سے شیئر نہیں کرتے تھے مگر مجھے محسوس ہوتا تھا۔

مجھے ان لوگوں نے پڑھنے بھی نہ دیا' ہم لوگ اسکول سے بھاگ کر گھومتے پھرتے۔ میں بمشکل تمام مڈل تک پہنچی تھی' ایک تو ہر کلاس میں دو دو تین تین سال لگا کر اتنی بڑی ہو گئی پھر دادی کو سب کہتے' یہ کند ذہن ہے۔ اسے گھر کے کاموں میں لگا کر شادی کر دیں۔

لوگوں کے منہ پر بات آنے کی دیر تھی' میں نے اسکول چھوڑ دیا۔ میں وہاں اسٹوڈنٹ گم' ٹیچر زیادہ لگنے لگی تھی مگر صرف ان کو جو میری وہاں قیام کی مدت جانتے تھے ورنہ میں وہی دبلی پتلی' بوائے کٹ بالوں والی تھی' بس یہ ہوا کہ دوستوں کی فرمائش پر' میک اپ اور لڑکیوں والے کپڑے پہننے لگی' جوتوں میں بھی نزاکت آ گئی تھی۔

اب میرے دوستوں کی شادیاں ہونے لگیں تو دادی کا ماتھا ٹھنکا کہ یہ لڑکی ذات بیٹھی ہے۔ اس سے چھوٹے لڑکے بھی بیاہے جا رہے ہیں۔ میرے والدین تو بے فکر ہو گئے تھے کہ اتنی ساری اولادوں کا بوجھ کم تھا کہ میرا بھی لاد لیتے۔

دادی کافی بوڑھی ہو چکی تھیں' نہ اب دکھائی دیتا' نہ کہیں گھوما پھرا جاتا۔ زیادہ تر بیٹھے یا لیٹے رہنے لگیں۔ ان کی کوشش ہوتی لب ہلا کر دوسروں سے کام کروا لیں۔ یہ ان کی مجبوری ہو گئی تھی۔

اس روز میں کاموں سے فارغ ہو کر دادی کے سامنے آ بیٹھی۔ دادی مجھے دیکھ کر چونک گئیں پھر پوچھنے لگیں۔

''نائلہ! تم سمجھو میں تمہاری سہیلی ہوں' جو پوچھا بتاؤ گی؟''

''سمجھ لیا' پوچھیں۔'' میں نے بے فکری سے کہا تو دادی چارپائی کا سہارا لے کر اٹھ بیٹھیں اور مسکراتے ہوئے بولیں۔

''نائلہ! تو اب تک لڑکوں کے ساتھ ملتی جلتی ہے' کسی کو تیرے ساتھ شادی کا ارادہ ہے تو مجھے بتا دے۔''

''کیوں دادی؟''

''بیٹا! ایک تو اب مجھ سے بھاگ دوڑ نہیں ہوتی' پھر اچھا ہے تجھے یہاں قریب دیکھا کروں گی' اب کتنا وقت رہ گیا ہوگا میرا؟''

دادی کی بات پر پہلی بار میں نے سوچا' مجھے اب تک کسی لڑکے میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی۔ شاید کوئی میری منت بھی کرتا تو میرا دل نہ مانتا۔ ایسی ہی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ مگر دادی سے مجھے پیار تھا' ان کی آخری بات میرے دل کو لگی۔ میں نے فیصلہ کر لیا' دوستوں کی سن گن لوں گی۔ اگر کوئی آمادہ ہوا تو دادی کی خاطر شادی کر لوں گی۔

میں نے قریب رہنے والے دوستوں کو چیک کیا تو ہر کسی کی ویسی ہی حالت ہوئی جیسا ان کے بارے میں سوچ کر میری ہوئی تھی۔ ممکن ہے یہ میرا وہم ہو کہ اب ہم سب ایک دوسرے کو وہ پرانے کپڑے لگ رہے تھے جنہیں ہم عرصے سے پہنتے آ رہے تھے اور اب عرصے بعد اسی کپڑے کو دھو کر استری کر کے عید پر پہننے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہم' میں اس لیے بھی کہ ان کی باتوں کا انداز مختلف تھا' کسی نے کچھ کہا' کسی نے کچھ۔ زیادہ نے چونک کر دیکھا۔

''نائلہ! پہلے تمہیں خیال نہیں آیا' پہلے کیوں نہیں بتایا؟''

''میں نکاح کروا چکا ہوں۔''

''میری تو اب شادی ہونے والی ہے۔''

''یار' میرا ابھی ارادہ نہیں' جوان بہنیں سر پر بیٹھی ہیں۔''

''میں کسی لڑکی سے وعدہ کر چکا ہوں۔'' وغیرہ وغیرہ۔

میرا نہ کسی سے کوئی عہد و پیماں تھا' نہ توقع' نہ پسند۔ باتوں باتوں میں یونہی تذکرہ کیا تھا۔ ان کے جوابات' خیالات سنے' بات ختم ہو گئی۔ ہمارے تعلقات کا اس بات سے کوئی تعلق واسطہ نہ مجھے لگا' نہ انہوں نے احساس دلایا۔

سلیم کو جانے کیوں لگا کہ میں نے اس کی بات کو محسوس کیا ہے۔ اسے تنخواہ ملی تھی' مجھے لے کر بازار آ گیا۔ میں چلاتی رہی' دادی چیخیں گی' کھانا پکا لیتی مگر وہ اپنی کیے گیا۔ گھمایا پھرایا' تحفہ لے کر دیا' ہم نے اکٹھے کھانا کھایا' دادی کے لیے اس نے پیک کروا لیا۔

رات گئے ہم لوٹے' نئی بات نہیں تھی' بس دادی نے کہا۔

''کہاں رہ گئیں' آج کچھ بنایا بھی نہیں۔''

''آپا کے ساتھ بازار گئی تھی' انہوں نے آپ کے لیے کھانا لے دیا مجبوری تھی۔'' میں نے آتے ہی کھانا نکالتے ہوئے کہا۔ دادی نے ''آپا'' کا نہیں پوچھا۔

میں اور دادی سونے کے لیے ساتھ ساتھ چارپائیوں پر لیٹے تو میں نے محسوس کیا کہ دادی کھوئی کھوئی سی ہیں' میرے پوچھنے پر کہنے لگیں۔

''تو نہیں تھی' سلطانہ (پڑوسن) آئی تھی' اس کی لڑکی کا رشتہ ہوا' بس یہی ہے۔''

میں نے دادی کی تسلی کرائی' مجھے کوئی فکر نہیں محسوس ہوئی' اسی رو میں ''دوستوں'' کی ''مجبوریاں'' بھی بتا دیں۔ دادی اور کمزور سی لگنے لگیں۔

''تیرا کسی سے دل تھا؟'' انہیں الٹا میری فکر لگ گئی۔

''نہیں دادی!'' میں بیزاری سے بولی ''نہ دل' نہ کوئی بات۔ وہ تو آپ کی وجہ سے یونہی سب سے پوچھ لیا کہ کسی اور کا دل نہ ہو۔''

''اب کیا کروں' تیرا باپ دوسری لڑکیوں کا کچھ نہیں کر پایا' چھوٹی بہو بھی ان کے لیے کیا کر سکی' مظہر سے تو امید

براعظم انٹارکٹیکا

دنیا کے کئی مقامات ایسے ہیں جو سطح سمندر سے بھی نیچے ہیں مثلاً کیلیفورنیا کی ''وادی موت'' (ڈیتھ ویلی) اور اسرائیل کا بحیرۂ مردار (ڈیڈ سی) لیکن بعض جگہیں ان سے بھی زیادہ پستی میں واقع ہیں۔ ہم بات کر رہے ہیں براعظم قطب جنوبی (انٹارکٹیکا) کی جہاں بعض مقامات سطح سمندر سے 6,000 فٹ تک نیچے ہیں۔ البتہ ہمیں ان کے اتنی پستی پر ہونے کا اس لیے پتا نہیں چلتا کیونکہ ان پر 14,000 ہزار فٹ جتنی موٹی برفیلی پرتیں موجود ہیں' جن کی وجہ سے یہ مقامات سطح سمندر سے 8,000 فٹ بلند معلوم ہوتے ہیں۔

براعظم قطب جنوبی (انٹارکٹیکا) دنیا میں خشکی کے دس فیصد رقبے پر واقع ہے۔ یہ آج تک انسان کے لیے دشوار گزار ترین مقامات میں سے ایک ہے۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ زمین کے شمالی نصف کرے میں بہت بڑے رقبے پر خشکی ہے' اس کے مقابلے میں جنوبی نصف کرے کا بڑا حصہ سمندر پر مشتمل ہے۔ اس مناسبت سے دیکھا جائے تو براعظم قطب جنوبی' سب سے الگ تھلگ بھی ہے جسے دنیا کا سب سے سنسان مقام بھی تصور کیا جاتا ہے۔ یہ واحد براعظم ہے جہاں کوئی درخت نہیں البتہ چند پودے نظر آ جاتے ہیں۔

محمد شیث' کراچی

ہی نہ رکھو....." دادی بڑبڑانے لگیں۔

دوسرے دن میرے وہی معمولات رہے' رات ایک دوست نے پروگرام بنایا کہ کہیں چلتے ہیں۔ میں فارغ ہو کر تیار ہوئی اور گھر سے نکل گئی۔

واپس آئی تو حمیدہ خالہ آئی تھیں' وہ کچھ دور رہتی تھیں۔ دادی کے ساتھ ان کا پرانا تعلق تھا۔ بیوہ عورت' جوانی میں بیوہ ہو گئیں پھر ساری زندگی جدوجہد میں گزار دی۔ لوگوں کے گھروں میں کام کرنے سے لے کر مڈ وائف تک سب کچھ کیا۔ ان کی کوشش تھی' لڑکے پڑھ لیں یا کچھ کر لیں۔ سنا تھا بڑا بیٹا ان کی امیدوں پر پورا اترا' کبھی کبھار خالہ کے پاس بیٹھنے کا موقع ملتا تو اس کا ذکر سن لیتی۔ دوسرے دونوں خالہ کے ساتھ تھے۔ بڑا کہیں یورپ چلا گیا تھا۔ خالہ کے یہاں والے لڑکے شریف تھے' خالہ ان سے بھی ناخوش یا غیر مطمئن نہیں تھیں۔ کبھی کبھار خالہ دل کی بھڑاس نکالنے رات کو ہمارے گھر رک جاتیں۔ پھر دادی اور وہ ساری رات باتیں کرنے میں گزار دیتیں۔

حمیدہ خالہ کو دیکھ کر میں ذرا جھجکی' وہ مجھے دیکھتے ہی خوش دلی سے بولیں "آ گئیں' کس کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں؟"

"وہ..... وہاں ادھر محلے میں ہیں' لڑکیاں بلانے آئیں تو....." میں سمجھ گئی' دادی نے کچھ کہا ہوگا۔ ان کا موڈ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ایک تو میری شادی کی ان کو پڑی تھی۔ حمیدہ خالہ خوش لگ رہی تھیں۔ میں جلدی سے چائے بنا کر ان کے ساتھ آ بیٹھی۔

"خالہ! بہت خوش لگ رہی ہیں۔" میں نے ساتھ شامل ہونے کو بات چھیڑ دی۔

"ہاں بیٹا! خوش کیسے نہ ہوں گی' حسنین آ رہا ہے۔"

"حسنین!"

"حسنین' میرا بڑا بیٹا ہے' انگلینڈ میں ہوتا ہے۔"

"وہاں کیا کرتے ہیں؟" میں دل میں ہنسی کہ وہ کسی ہوٹل میں برتن دھوتا ہوگا۔

"وہ بہت محنتی ہے' وہاں چھوٹی موٹی نوکریاں کر کے کورس وغیرہ کرتا رہا' اب اسے اچھی نوکری ملی ہے' دو ہفتوں کے لیے آ رہا ہے کہ پھر مصروف ہونا پڑے گا۔"

میں دل ہی دل میں شرمندہ ہو گئی کہ ابھی کیا بکواس سوچ رہی تھی۔

خالہ حسنین کی باتیں' اس سے سنی یورپ کی باتیں' بچوں کے بچپن کی باتیں کرتی رہیں' میں سنتے سنتے سو گئی۔

بعد میں کہیں دادی کی خاموشی کو خالہ نے کریدا تو دادی میرے لیے پھٹ پڑیں' خالہ نے تسلی دی کہ وہ بھی کچھ کریں گی' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ صبح حمیدہ خالہ گئیں تو دادی نے بے دلی سے خالہ کے جواب کا بتایا' انہیں خالہ سے امید نہیں تھی یا وہ پریشان بہت تھیں۔ میں نے بھی توجہ نہ دی۔

خالہ حمیدہ تین چار روز بعد آئیں' ان کے ساتھ جو مرد تھا' میں نے ایسی شخصیت کے مرد' بازاروں میں' سڑکوں پر اچھی اچھی گاڑیوں میں بھی کم ہی دیکھے تھے' میرے دوستوں میں ایسے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جو پرفیوم اس نے لگایا تھا' اس کا نام کیا معلوم' بس گھر مہک گیا تھا۔

دادی تو حسنین کا نام سن کر ہاتھ پاؤں پھلا بیٹھیں' کبھی ادھر بیٹھو' کبھی یہ ٹھیک ہے!

"اماں! آپ پریشان نہ ہوں' بیٹھ جاؤں گا۔"

انتہائی مہذب اور میٹھا انداز۔ میں تو اسی میں کھو گئی۔

"نائلہ بیٹا! حسنین کھانا کھائے بغیر نہیں جائے گا۔"

دادی نے چونکا دیا۔ حسنین انکار کرنے لگا۔ دادی بضد رہیں کہ ان کی مانے' پہلی بار تو ایک' وغیرہ وغیرہ۔ کنفرم ہوتے ہی میں نے سوچا "کیا بناؤں؟" تو ذہن اتنا خالی تھا کہ جیسے مجھے انڈا ابالنا بھی نہیں آتا۔ ویسے بھی میرا پکانا ایسے ہی تھا کہ دادی نے زبردستی جھونک دیا۔ میں نے جیسے تیسے کر لیا۔ دادی بڑبڑاتے ہوئے زہر مار کر لیا کرتیں۔ امی وغیرہ آتیں تو خود ہی بنا لیتیں۔ اب اہتمام کرنا میرے بس سے باہر تھا۔

میں چپکے سے باہر نکلی کہ کسی کی مدد لوں۔ نکلتے ہی موٹر سائیکل سے ٹکرا گئی۔

"خیر تو ہے' خودکشی کرنی ہے؟" وہ میرے دوست تھے۔

"سنو خالہ کی فیملی آئی ہے' کھانا کھلانا ہے' کیا کروں؟" میں چھوٹتے ہی بولی۔

"ہوٹل ہیں نا۔" ایک نے کہا اور موٹر سائیکل سے اتر گیا۔ "دونوں جا کر لے آؤ' مجھے گھر جانا ہے۔"

میں نے سوچا' اس کا پروگرام لمبا نہ ہو جائے' میرا دل اندر اٹکا تھا۔ غائب نہیں ہو سکتی تھی۔ "سنو' چائے دینی ہے' تم اکیلے لا دو۔"

"خالہ کی فیملی سے ملواؤ گی؟"

"نہیں' ان کی لڑکیاں پردہ کرتی ہیں' مرد کوئی نہیں آیا ناں' ورنہ آ جاتے۔"

"اچھا جی!"

"سنو' اچھا اچھا لانا....." میں نے منت سماجت کر کے

بھیجا۔ اس کے آنے تک تو میری توجہ باہر گلی میں رہی کہ وہ کچھ الٹی سیدھی نہ کر دیں یا خالہ وغیرہ کو پتا نہ چل جائے کہ کھانا باہر سے منگوا رہی ہوں۔

کھانا اچھا لایا تھا' تعریف حسب توقع میری ہوئی۔ رات گئے تک وہ لوگ بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ حسنین چلا گیا' تب بھی مجھے وہیں بیٹھا محسوس ہوتا رہا۔ باقی رات میں اور دادی اسی کی باتیں کرتے رہے۔ میں بچپن سے صرف مرد ذات کے ساتھ رہی مگر میرا دل پہلی بار حسنین کے لیے دھڑکا۔ میرا دل شدت سے چاہ رہا تھا' تاروں بھری اس رات میں حسنین لوٹ آئے۔ ہم چھت پر یا آنگن کے کسی گوشے میں جا بیٹھیں..... پیار بھری باتیں کریں' وہ مجھ میں' میں اس میں کھو جاؤں۔ جیون ہی بتا دوں۔ کیا؟ میں خود اپنے خیالات پر چونک گئی۔ یہ قطعی ناممکن تھا' اتنی خوبصورت شخصیت کا مالک' اعلیٰ تعلیم یافتہ' تعلیم اور ملازمت بھی باہر۔

تیسرے روز شام کو میری اور دادی کی حیرت انتہا پر آ گئی۔ جب حمیدہ خالہ' چھوٹے بیٹوں کے ساتھ ہمارے گھر' میری منگنی کرنے آ پہنچی تھیں۔ حسنین خود نہیں آئے تھے۔ خالہ نے سادگی سے وہیں منگنی کی رسم کر دی۔ مجھے لگ رہا تھا' سپنا دیکھ رہی ہوں۔ یوں ہی میں "چاہا" حاصل ہو جائے... مجھے قطعاً توقع نہیں تھی۔ کبھی یقین کا کوئی لمحہ' تعبیر کا پل حاصل ہو جاتا ہے تو' پاؤں ہواؤں میں معلق ہو جاتے ہیں' روح کی شادمانیاں آسمان کی وسعتوں کو چھونے لگتی ہیں۔ مسکراہٹ آپ ہی آپ ہونٹوں پر بکھر جاتی ہے۔

دادی کا بھی یہی حال تھا۔ مگر ہماری خوشی ایک' احساس جدا تھے' وہ تو رب کے حضور سربسجود تھیں۔ "مولا مجھے سرخرو کر دیا۔"

ڈرتی بھی بہت تھیں۔ مجھے دن بھر باور کرواتی رہتیں۔ "منگنی کچا بندھن ہے' بہن بھائیوں سے بھی نہ کہنا' ایسے لڑکے کو کون چھوڑتا ہے؟"

میں دادی کی باتیں سنتی رہتی مگر اڑائی نہیں تھیں جیسا میں کرتی تھی۔ اس بات سے صرف میرے والدین آگاہ تھے' حمیدہ خالہ سے وہ یہیں دادی کے گھر ملا کرتے۔ ان کی خوشی تو دادی سے بھی بڑھ کر تھی۔

حسنین جانے والے تھے۔ ابو اور دادی کے اصرار پر دادی کے گھر میں سادگی سے میرا نکاح ہو گیا۔

حسنین نکاح کے بعد اور انگلینڈ جانے سے ایک دن پہلے شام کو ملنے آئے۔ انہوں نے مجھ سے بہت ساری باتیں کیں۔ وہ بہت سلجھے ہوئے تھے' مشرق' مشرقی اقدار' مذہبی

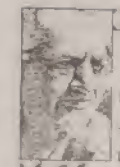

زمانۂ اسیری

فیض صاحب راولپنڈی [illegible] حیدرآباد جیل میں اسیر تھے۔ آمنہ بیگم مجید ملک اور ڈاکٹر شوکت صاحبہ ان سے ملنے جاتی رہتی تھیں۔ 23 مئی 1954ء کو میں بھی حیدرآباد تک گئی مگر میرے نام کا اجازت نامہ نہ تھا۔ سوچا کہ اپنے محبوب شاعر کو جیل میں کس طرح دیکھ سکوں گی۔ اس لیے مجھے مجبوراً رکنا پڑا۔ واپسی پر ڈاکٹر صاحبہ اور آمنہ آپا کی اداس باتیں سنتی رہی۔ ان کی باتوں سے فیض صاحب کی مختلف تصویریں بناتی چلی گئی۔ فیض صاحب کی باغ و بہار شخصیت کے مختلف موڈ کے رنگ ان کے چہروں پر ابھرتے رہے۔ آمنہ آپا جب جیل میں ملنے جاتیں تو اخبار اور ان کی پسندیدہ سگریٹیں لے جاتی تھیں۔ واپسی پر فیض صاحب کی تازہ نظم یا غزل یا اشعار لے آتیں۔ اس دن فیض صاحب کا یہ شعر آمنہ آپا لکھ کر لائی تھیں جسے ہم گنگناتے رہے۔

ادھر تقاضے ہیں مصلحت کے، ادھر تقاضائے درد دل ہے
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں، اسیر ذکر وطن سے پہلے

اقتباس: ستارۂ وفا - از: سحاب قزلباش

احساس' یورپ کی آزاد فضا ان کے اندر سے نہ نکال پائی' مجھے بہت کچھ کہہ' سمجھا' سنا کر جاتے جاتے کہا۔

"خط تو لکھ لیتی ہو' مجھے خط لکھنا' پوسٹ میرے بھائیوں یا اپنے والدین سے کروانا۔" میں نے منہ پر تو ہامی بھر لی مگر یہ کام میرے لیے کیا مشکل تھا۔

اب حسنین کے بھائی گاہے گاہے چکر لگانے لگے۔ دادی میرے پیچھے پڑ گئیں کہ گھر رہا کرو' ہر وقت ایک ہی رٹ گرہستی' گرہستی' گرہستی۔ میں سنی ان سنی کر دیتی جیسا کہ بتایا' دادی کو دکھائی کم دیتا تھا۔ ابو کے بہن بھائیوں کا خیال تھا' ابو دادی کے لاڈلے ہیں' وہی ان کے سیاہ سفید کے مالک ہیں تو علاج بھی کروائیں' ابو آج کل کرتے رہے اور دادی کمرے کے کونے میں پڑی رہتیں' بس مجھے آوازیں دے کر تسلی کر لیتیں کہ گھر میں ہی ہوں' کہیں جانا ہوتا تو جو جھوٹ بول کر نکل جاتی' وہ مان لیتی تھیں۔ گھر کوئی سارا دن گھسا رہے' آواز نہ آئے تو دادی لاعلم..... لیکن دادی جانتی تھیں' محلے کے لڑکوں سے میری میل ملاقات ہے مگر وہ اسے میرے تسلی کرانے پر بچپن کا ساتھ سمجھ لیتیں' پھر کوئی شادی کو تیار نہ ہوا تو دادی کو یقین ہو گیا کہ معاملہ کچھ اور نہیں ہے پھر بھی انہیں کوئی خدشہ تھا یا میری سوچ غلط تھی کہ انہوں نے امی کو بلوایا۔

دونوں کافی دیر بیٹھی رہیں' میں نے سنا تو تب جب دادی کہہ رہی تھیں "بیٹا! اب یہ لڑکی میرے اختیار سے باہر ہے' سمجھاؤ۔ دوستیاں ختم کرے اور گھر سے فضول نہ نکلا کرے!"

امی مجھے اپنے گھر لے آئیں' سارا دن سمجھاتی رہتیں' کبھی پیار سے' کبھی غصے سے' اور کاموں میں لگا لیتیں' چور کو چوری کے لیے کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ یہاں دادی کے گھر جیسی آزادی تو نہیں تھی مگر..... دادی کے محلے سے دوست آجاتے' یہاں بھی نئے بن گئے۔ اُدھر دادی کو مسئلہ ہو رہا تھا۔ امی کو تسلی ہوگئی کہ میں ٹھیک ہوں۔ کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے یوں میں واپس آ گئی۔

حسنین کے بھائی آتے تو باتیں صرف دادی سے کرتے اور دادی ان کو یہی بتاتی رہتیں' ایسے مجھے پالا' یوں خواب دیکھے۔ یوں پورے ہوئے' اب بہت خوش ہیں' حسنین اور میری شادی ان کی زندگی کی بڑی خوشی ہوگی' وغیرہ وغیرہ۔ ہر بار یہی باتیں' اس جوش اور خوشی کے ساتھ کہ پہلی بار بتا رہی ہوں۔

اُدھر دادی امی کو میری فکر اور سسرالیوں کا آنا جانا بتاتی رہتیں' امی نے بھی چکر بڑھا دیے اور دو مرتبہ مجھے پکڑا' امی کو مجھ پر شدید غصہ تھا' حرکتیں ہی ایسی تھیں۔ مجھے اور دادی کو لے کر گھر آ گئیں۔ ابو سے کہا کہ دادی کی آنکھوں کا علاج کروانا ہے' اب یہاں پہلے سی نرمی نہیں تھی۔ میرا دم گھٹتا تھا۔

مجھے یہ فکر بھی تھی کہ دادی اسپتال میں ہیں۔ ان کو کچھ ہوا تو میرا کیا ہوگا؟ یہاں تو میں کسی صورت نہیں رہ سکتی' وہ بھی کڑی نگرانی میں۔ میں گم صم سی رہنے لگی۔ بہنوں' بھائیوں کے ساتھ بھی کم ہی بات کرتی۔ جو کام کہا جاتا' خاموشی سے کر دیتی ورنہ کسی کونے میں جا کر پڑ جاتی۔ خط و کتابت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور فون کی سہولت پاس پڑوس میں شاید ہی کہیں تھی' مجھے اس کا صحیح علم بھی نہیں تھا۔ لے دے کر حسنین کے خط تھے' اب وہی میرا سب کچھ تھے۔ میٹھی بار بار پڑھتی رہتی۔ اس روز دادی اسپتال سے آئیں تو میں لپٹ کر رونے لگی۔ ابو نے جلدی سے الگ کیا کہ ان کا آپریشن ابھی تازہ تھا۔ دادی کو فکر لگ گئی' مجھے کسی نے کچھ کہا تو نہیں؟ میری بہن رات امی سے کہہ رہی تھی۔

"امی! باجی بالکل بدل گئی ہیں' جانے کیا ہوا ہے؟"

"ہاں' سمجھ گئی ہے۔ میں ہی غلط تھی' وہ بچپن کے ساتھی ہوں گے' بات چیت کرتی تھی!"

"کون' کیا امی.....؟" میری بہن نے پوچھا۔

"کچھ نہیں' تم اپنا کام کرو۔"

دادی سو رہی تھیں' میں بہت اداس تھی' میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی دادی کو لے کر چلی جاؤں' مگر ابھی یہ ممکن نہیں تھا۔ دادی کے لیے رکنا تھا۔ امی کا یہ بھی خیال تھا کہ دادی کی نظر ٹھیک ہوگئی ہے تو اب مجھ پر نظر رہے گی۔ مجھے ان کی باتیں سن کر اندازہ ہوا کہ میری بوریت اداسی کو وہ شرافت سمجھ رہی ہیں تو میں اور بھی "اچھی" بن گئی کہ جلدی یہاں سے نکلیں۔

میں یونہی رہنے لگی اور پھر بالآخر ہمیں جانے کا پروانہ مل گیا۔ امی ہمارے ساتھ آئیں' میں دادی کے گھر بھی امی کے سامنے ویسی ہی رہی۔ میرے دوست البتہ بھاگے آئے مگر اب پہلے کی طرح دروازہ چوپٹ کھلا نہیں تھا' امی کنڈی لگا کر دیکھتیں' خود کھولتیں اور وہ لوگ بہانے بنا کر کھسک لیتے۔

میں چھت پر گئی تو پڑوس کی چھت پر دو دوست بیٹھے تھے۔

"کہاں تھیں' تمہاری دعوت کرنی تھی' پیسے بٹھا دیے۔"

"دعوت!" مجھے ہوٹل یاد آنے لگے۔

"ہاں' قسم سے نکلو ناں!"

"رک جاؤ' امی کل تک رکیں گی پھر' میں بھی تنگ آ گئی ہوں۔" میں جوش میں اوٹ پٹانگ بول گئی۔

"اچھا' باتیں کرلو۔"

"نہیں' امی آ جائیں گی' کل تک کی تو بات ہے۔"

میں انہیں کہہ رہی تھی اور صبر مجھ سے نہیں ہو رہا تھا۔ وقت یونہی چلتا رہا۔ حمیدہ خالہ نے میرے دیوروں کی بھی منگنیاں کر دی تھیں۔ منگنیوں کے بعد ان کا ہمارے گھر آنا جانا پہلے سے کچھ کم ہوگیا تھا۔ میرا تو دل چاہتا وہ ادھر نہ آئیں مگر ایسا نہ ہوا' اب ہر روز آتے مگر ایک آدھ بار ہی' پہلے کی طرح کسی بھی وقت اور کئی کئی چکر نہ لگاتے۔

وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا اور حسنین واپس آ گئے۔ وہ شام کی فلائٹ سے پہنچے تھے اور کچھ ہی دیر بعد ملنے آ گئے۔ میں ان کی شخصیت سے متاثر کیا ہوتی' دب سی گئی' دیکھتی رہ گئی۔ دوسرے دن بھی آئے' رویہ بہت اچھا تھا۔ میں قوسِ قزح کر رہی تھی۔

حمیدہ خالہ دو بیٹوں کی شادیاں کرنے پر لگ گئیں' ہماری اور میرے ایک دیور کی تیاریاں جلدی جلدی ہو رہی تھیں۔ حسنین کو جانا تھا لہٰذا شادی وغیرہ سب اسی عرصے میں آرام سے ہو جائے۔

جوں جوں شادی کے دن قریب آ رہے تھے' حسنین کا رویہ بدل رہا تھا' بدلتا یوں کہ وہ سنجیدہ سے ہو رہے تھے' امی انہیں اپنے گھر لے آئیں۔ وہاں تائی' چچی' دادی کے پاس آ کر دبلی

زبان میں لڑتیں کہ اتنا اچھا لڑکا ملا' ہماری لڑکیاں نظر نہ آئیں؟ وہ پوتیاں نہیں ہیں' وغیرہ وغیرہ۔ یہاں منہ پھول گئے۔

یونہی شادی ہوگئی' میں بہت خوش تھی مگر حسنین یوں خوش نہیں تھے پھر میری بہنیں' خاموش طبیعت' سیدھی سادی سی تھیں۔ میرے دیوروں کی سالیاں چالاک' تیز سی تھیں۔ ہر وقت حسنین کو گھیرے رہتیں۔ مجھے کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ میرے کمرے میں حمیدہ خالہ' کوئی پڑوس کی عورت یا بچے سے کوئی آ جاتا تو دو چار باتیں ہو جاتیں۔ حسنین رات گئے آتے۔ صبح اندھیرے ہی نکل جاتے۔ کھانا بھی انہی لوگوں کے ساتھ کھاتے۔ تنگ آ کر ایک رات میں ان سے لڑ پڑی۔

"آپ بھائی اور اس کے سسرال میں میری بے عزتی کروا رہے ہیں۔ وہ ادھر آتے ہیں؟ آپ ان کے کمرے میں گھسے رہتے ہیں۔ میرے بہن بھائی' سیدھے سادے ہیں اس لیے آپ....."

مجھے نہیں پتا تھا' حمیدہ خالہ باہر سن رہی ہیں۔ حسنین البتہ خاموش رہے۔ دوسرے دن حمیدہ خالہ میرے پاس آئیں اور سرگوشیوں میں مجھ سے کہا کہ حسنین کو بتایا گیا ہے کہ لڑکے تمہارے گھر آتے تھے' پھر وہ بولیں "میں نے بہت کہا کہ وہ سودا سلف کا پوچھنے آتے تھے' محلے کے تھے' میں ہمیشہ جاتی رہی' مجھے تو کوئی برائی نظر نہیں آئی مگر تمہاری دیورانی کے گھر والوں نے کہا کہ آپ کو کچھ پتا نہیں جو ہم جانتے ہیں۔ ایسی ایسی باتیں حسنین کو لگائی ہیں۔"

"کیا.....؟"

"پتا نہیں مگر کوئی ایسی بات ضرور ہے کہ حسنین ان کی ہر بات کو سچ مان رہا ہے۔" حمیدہ خالہ نے سر سے پاؤں تک مجھے گھور کر کہا' میں نے نگاہیں جھکا لیں۔

خالہ پھر بولیں "تم رات جو کہہ رہی تھیں' وہ غلط تھا' حسنین تمہارے بہن بھائی کی بہت تعریف کرتا ہے' مجھے بھی کہتا ہے انہی لڑکیوں سے تمہارے دیوروں کے رشتے کرتی۔ اب تو مجھے بھی غلطی کا احساس ہو رہا ہے' تمہاری دیورانیاں بہت چالاک ہیں' ابھی سے میرے بیٹے ہاتھ سے نکل گئے۔" وہ اپنا دکھ کہنے لگیں۔

مجھے بہت جلد علم ہوگیا کہ حسنین کو دیکھنے کے بعد میرے دیوروں کے سسرالی مرمٹے' دیور ان کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے۔ انہوں نے حسنین کو میرے "کرتوت" بتا دیے۔ ان کے لیے میں آسان ہدف بن گئی کہ مجھے الگ کر کے حسنین کو قابو کر لیں۔ یوں سب نے حسنین کو ایک کی چار لگا کر بتائی تھیں۔ کچھ خدا کی مہربانی' کچھ قسمت' کچھ حسنین کی سمجھ

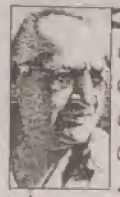

فیض صاحب بڑے تعلیق اور شفیق انسان تھے۔ ان کے دل میں درد مندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ دوستوں کے دوست تھے ہی لیکن دشمنوں سے دشمنی ان سے کبھی نہ ہوسکی۔ ایک مجموعے کے شروع میں عرفی شیرازی کا یہ شعر انہوں نے خود لکھا:

برو اے عقل و منہ منطق و حکمت پے ثم
کہ مروا نسخہ ہائے فلاں درپیش است

اگرچہ وہ ہم نشینوں میں بیٹھ کر مسکراتے بھی تھے۔ باتوں کا مختصر جواب بھی دے دیا کرتے تھے لیکن اکثر وہ کھو جاتے تھے۔ بڑی بڑی آنکھوں سے خلا میں گھورتے رہتے' سگریٹ پیے جاتے۔ ان کی روشن پیشانی چمکنے لگتی اور مجھے لگتا کہ

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

سحاب قزلباش کے مضمون "ستارۂ وفا" سے اقتباس

داری' کچھ وہ دو پارٹیاں' دونوں کے مختلف انداز اور جھوٹ۔ کچھ ہوا تو نہیں مگر حسنین کا دل ضرور برا ہو چکا تھا۔ پھر جو اُن کا اب رویہ تھا' یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس سے میں بہت تنگ تھی۔

حسنین تین ماہ بعد واپس چلے گئے۔ مجھے کہہ گئے اب آ کر تمہیں لے جاؤں گا۔ مجھے تو حسنین کے رویّے کو دیکھ کر اس سے بول آنے لگا۔ وہاں کیسے رہوں گی؟ کس سے بات کروں گی؟ حسنین بددل ہیں۔ مجھے وہاں مار پیٹ نہ کریں اور اگر جان سے مار کر نہیں دفنا دیں تو میرے گھر والوں کو کیا علم؟

میں نے سوچ لیا' میں ہرگز نہیں جاؤں گی۔

میرا بیٹا پیدا ہوا' دیور کی بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ حمیدہ خالہ میرے واری صدقے جا رہی تھیں۔ دوسری بہو کے روتے سے ویسے ہی تنگ تھیں۔ حسنین بھی آ گئے۔ اس بار وہ مجھے ساتھ لے جانے کے ارادے سے آئے تھے۔ مگر دادی فوت ہوگئیں' دادی سے میرا لگاؤ سب جانتے تھے مگر میں نے نہ جانے کے ارادے پر ایسے ایسے ڈرامے کیے کہ انگلینڈ گئی تو مر جاؤں گی۔ حسنین نے غلطی یہ کی کہ مجھے سختی سے نہیں کہا اور چلے گئے۔

بھائی سسرال کے بہکاوے میں آ کر حسنین کو بھڑکاتے

رہے۔ دیورانی مجھے تنگ کرتی۔ حمیدہ خالہ کا ایک چھوٹا سا مکان تھا' وہ مجھے لے کر وہاں شفٹ ہو گئیں مگر وہ خود چین سے نہیں بیٹھتی تھیں۔ کبھی کہاں جانا ہے' کبھی کہاں..... اب میں پھر آزاد تھی۔ اس دوران بھی میں پہلے سی رہی۔ پھر وہی گھومنا پھرنا' دوست' آزادی۔ وقت اور گزرا' حسنین اس دوران پانچ مرتبہ مجھے اور خالہ کو لے جانے آئے۔ ہر بار میں نے کچھ نہ کچھ کیا اور انہوں نے لے جانے کی کوئی سختی نہ کی۔ میرے چار بچے تھے۔ ایک بار انہوں نے صرف اتنا کہا کہ بچے باپ کے سامنے ٹھیک رہتے ہیں' وہاں میری نگرانی میں ان کی تعلیم بھی ہوگی۔

''کیوں یہاں اسکول نہیں ہیں؟'' میں نے اتنا کہا اور وہ خاموش ہو گئے۔ نہ سمجھا یا نہ کچھ کہا مگر پھر حسنین نہ آئے۔

حسنین نے مجھ سے رابطہ بھی نہ رکھا۔ حمیدہ خالہ اور بچوں سے رابطہ رہا۔ بچوں سے بھی یوں کہ خالہ فون کرتیں' وہ ساتھ ہوتے تو بات کر لیتے۔ خالہ کو بھی یہی کہتے کہ ٹالہ آنے پر راضی ہو تو بات کروں گا۔ میں دوستوں کے چکر میں خوش رہی کہ وہ خالہ سے جھوٹ بولتے ہیں۔ مجھے سب کہتے' وہاں کوئی عورت رکھی ہوئی ہے۔ ماں کو کہہ دیتا ہے' تم سے خود بات کیوں نہیں کرتا؟ پھر میں نے کسی کے جھوٹے لاروں پر حسنین سے طلاق مانگ لی۔ اس کے بعد حسنین نے مجھے خرچہ بھیجنا بھی بند کر دیا۔ صرف بچوں کے لیے خالہ کے نام پر رقم بھیجتے۔ دیور ہم سے وہ پیسے بھی چھین لیتا' کبھی معمولی سی رقم دے دیتا' خالہ حسنین کو شکایت بھی نہ کرتیں کہ بھائی لڑیں گے۔

ہمارے محلے میں ایک فیملی آئی' انہوں نے دو گھر خرید کر تڑوائے اور خوبصورت سی کوٹھی تعمیر کی۔ انہیں یہاں رہنا نہیں تھا' ان کے عزیز یہاں تھے۔ کچھ اس وجہ سے یہ گھر بنوایا' بہرحال میرے شوہر کا سنا تو مجھ سے رابطہ کیا کہ وہ لوگ بھی انگلینڈ ہوتے ہیں۔ ہمارے حالات پر بات کی' وہ سمجھے میرے شوہر وہاں غیر قانونی رہ رہے ہیں یا ہم کماتے ہیں کہ ہم یہاں رل رہے ہیں۔

''وہ وہاں کے ہی پڑھے ہیں' اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اچھی جاب پر ہیں۔ نیشنلٹی ہولڈر' اپنا گھر سب کچھ ہے۔'' حسنین کا سن کر تصویریں دیکھ کر وہ شرمندہ ہو گئے۔

''پھر آپ لوگ.....؟''

اور ہر بندے کی طرح میں نے بھی خود کو مظلوم ظاہر کیا۔ پھر حسنین کا رویہ ایسا تھا کہ وہ بھی سمجھے کہ ایسا شخص وہاں یقیناً شادی شدہ ہے یا یوں ہی ٹرل فرینڈز کا شوقین ہے۔ ان میں سے ایک صاحب انگلینڈ ایک ماہ کے لیے جا رہے تھے کہ ان کا کوئی کام تھا پھر بعد میں سب کو جانا تھا۔ انہوں نے حسنین کا ایڈریس وغیرہ لیا کہ اصل بات معلوم کر کے مجھے بتائیں گے۔

ایک ماہ بعد وعدے کے مطابق انہوں نے آ کر بتایا۔ ''حسنین صاحب واقعی وہاں ایک قابلِ تعریف پاکستانی ہیں۔ ان کے پاس آپ اور آپ کے بچوں کے لیے آپ کی توقع سے بڑھ کر ہے۔ وہ ایسے ڈپارٹمنٹ میں ہیں جہاں چھوریوں کی کمی نہیں۔ وہ بھی بات بیت کی حد تک سب سے ملتے ہیں مگر آفس سے آ کر گھر میں تنہا رہتے ہیں۔ ان کے ایک دوست سے علم ہوا وہ اپنی بیوی بچوں سے شدید پیار کرتے ہیں' وہ ہیرا ہیں۔ ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا' آپ اپنا گھر بنالیں..... پلیز!''

وہ شخص بول رہا تھا اور میں گم صم تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا' آسمان زمین گھوم رہے ہیں..... زلزلہ آ رہا ہے..... میرے وجود پر چیونٹیاں رینگ رہی ہیں۔ جانے کیا ہو رہا ہے؟

میں بے جان قدموں فون تک گئی۔ حسنین نے کال پک کر لی مگر مجھ سے کچھ نہ بولا گیا صرف ان کا نام لے سکی۔ وہ جلدی سے بولے' خدا کے لیے طلاق نہ مانگنا' تم نے طلاق مانگ کر مجھے تو زندہ ہی تھا۔ میں تم سے رابطہ نہیں رکھوں گا کہ میں یہ لفظ دوبارہ نہیں..... سننا چاہتا۔'' اور فون خاموش ہو گیا۔ انہوں نے خود لائن کاٹ دی تھی۔ میرا ہی طمانچہ میرے گال پر لگا تھا۔ میں کانپ کر رہ گئی۔ مجھ سے پھر ہمت نہ ہوئی لیکن جب بچوں پر نظر پڑی۔ ان کے پھٹے کپڑوں کو دیکھا تو ممتا نے زور مارا اور میں نے دوبارہ نمبر ملایا پھر وہ کیا کہہ رہے ہیں' یہ سنے بغیر میں چیخ چیخ کر رونے لگی' سنتی رہی' مجھے بلا لو۔''

میرا اتنا کہنا ہی کافی ثابت ہوا اور مجھے انہوں نے یہاں بلا لیا۔ تب مجھ پر عیاں ہوا کہ وہ کتنے اچھے انسان ہیں۔ اب میں نے اپنی دنیا محدود کر لی۔ یورپین معاشرے میں رہتے ہوئے بھی اسلامی احکامات کی پابندی کرنے لگی کہ اسلام نے نامحرم غیر محرم کے درمیان فاصلوں کی اسی وجہ سے تاکید کی ہے کہ دامن خراب نہ ہو۔ حسنین کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو پتا نہیں میرا حشر کیا ہوتا۔''

وہ اپنی روداد سنانے کے بعد بولی ''ماریہ! میری کہانی کو ضرور شائع کرانا تاکہ میری جیسی غلطی کوئی اور نہ کرے کیونکہ ہر مرد حسنین نہیں ہوتا۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ حسنین جیسا ہونا بھی غلط ہے۔ اگر وہ پہلے ہی دن مردانہ حوصلے سے کام لیتے اور میرے گال پر دو طمانچے رسید کر کے کہتے' چلی انگلینڈ'' تو شاید میرے بچے اتنے دنوں تک رلتے نہ پھرتے۔''

ستم رسیدہ

جناب ایڈیٹر صاحب
السلام علیکم!
آپ کے ہاں صرف الگ انداز کی کہانیاں چھپتی ہیں اسی لیے میں نے اپنی کہانی بھیجنے کا سوچا ہے۔ میری کہانی بالکل الگ انداز کی ہے جسے پڑھتے ہوئے آپ بھی میری بے وقوفی پر مسکرا دیں گے لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ مزہ بدلنے کے لیے ہی سہی اس کہانی کو ضرور شائع کریں۔

ماجد
(حیدر آباد)

''کیا پاگل ہو گئے ہو؟'' میرے دوست نے مجھ سے کہا۔ ''وہ پہلوان کہیں جان سے مار دے گا۔''

''مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ میں اس کے پاس اسی لیے جاؤں گا کہ وہ مجھے مار دے۔''

''تمہارا شاید دماغ ہی خراب ہو گیا ہے۔''

''ہاں یار محبت اسی کا نام ہے۔ بندے کا دماغ خراب کر کے رکھ دیتی ہے۔ پہلوان کی لڑکی کو تڑ میرے دل میں اتر گئی ہے حالانکہ میری اس سے ابھی تک کوئی بات چیت نہیں ہوئی ہے لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔''

''آخر اس میں ایسی کون سی بات ہے جس نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔''

"میری جان اِک نظر تم میرا محبوب نظر تو دیکھو۔" میں نے کہا۔ "پھر تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا کہ اس میں ایسی کون سی بات ہے۔"

"میں نے اس لڑکی کو تو نہیں دیکھا لیکن اس کے پہلوان باپ کے بارے میں ضرور سنا ہے کہ وہ بہت ظالم اور جابر انسان ہے۔ اب تک آٹھ دس عاشقوں کی بری طرح ٹھکائی کر چکا ہے۔"

"تم نے بالکل صحیح سنا ہے بلکہ اس نے دو چار کی ہڈیاں بھی توڑی ہیں۔"

"اس کے باوجود تمہارے ذہن پر یہ بھوت سوار ہے۔"

"ہاں، اس کے باوجود اور میں نے اس کے لیے پوری پلاننگ بھی کر رکھی ہے۔" میں نے بتایا۔

"کیسی پلاننگ۔"

"مار کھانے کی۔ میں پہلے مار کھاؤں گا، ایک بار، دو بار، دس بار اس کے بعد جب مار کھانے کی عادت ہو جائے گی تو پھر اس پہلوان کے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

"واہ کیا منصوبہ ہے۔" میرا دوست ہنس پڑا۔ "اور یہ مار کس سے کھاؤ گے؟"

"کرائے کے لوگوں سے۔" میں نے بتایا۔ "میں نے دو صحت مند قسم کے بندوں کا بندوبست بھی کر رکھا ہے۔ جو ہر شام ٹھکائی کیا کریں گے۔"

"اگر تمہیں کسی پاگل خانے میں داخل کرا دیا جائے تو کیسا رہے۔" میرے دوست نے کہا۔

"تم ابھی مذاق اڑا رہے ہو لیکن دیکھ لینا، یہ حربہ کتنا کامیاب رہتا ہے۔ مجھے چونکہ مار کھانے کی پریکٹس ہو چکی ہو گی اس لیے پہلوان کی مار کا کوئی خاص اثر نہیں ہو گا۔ میں ایک دن پٹ کر دوسرے دن پھر اس کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ دوسرے دن وہ پھر مارے گا، میں پھر تیسرے دن پہنچوں گا یعنی اس وقت تک مار کھاتا رہوں گا جب تک وہ ظالم باپ مہربان ہو کر یہ نہ پوچھ لے کہ آخر تو چاہتا کیا ہے۔ بس میں اسی وقت یہ بتا دوں گا کہ میں اس کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"اور تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ تمہاری بات مان لے گا۔"

"ہاں کیونکہ وہ بھی انسان ہے۔ اسے یہ احساس ہو جائے گا کہ میں واقعی اس کی لڑکی سے بہت محبت کرتا ہوں۔ ورنہ آج کل کے دور میں اتنی قربانی کون دیتا ہے۔"

"اب میری یہی دعا ہے کہ خدا تمہاری دماغی حالت ٹھیک کر دے۔"

بات یہ تھی کہ میرے دوست نے پہلوان کی اس لڑکی کو دیکھا نہیں تھا ورنہ وہ خود بھی اسے حاصل کرنے کے منصوبے بنانے لگتا۔

شاہانہ چیز ہی ایسی تھی۔ عجیب کھویا کھویا حُسن تھا اس کا۔ آہستہ آہستہ خاکستر کرنے والا ایسا حُسن بہت کم ہوا کرتا ہے۔ نہ جانے وہ کس طرح اس خطرناک پہلوان کے گھر پیدا ہو گئی تھی۔

اس کے انداز، اس کی آنکھیں یہ سب ظاہر کرتی تھیں کہ وہ رومانٹک مزاج کی ایسی لڑکی ہے جس کو چاند راتوں، پھولوں اور خوبصورت شاعری سے عشق ہو گا۔ بعد میں میری یہ باتیں سچ نکلی تھیں۔

میں نے جب اسے پہلی بار دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ ساحر کا وہ مصرعہ ذہن میں گونجنے لگا تھا۔ "تجھے زمیں پر اتارا گیا ہے میرے لیے۔"

ایسا ہی لگا تھا کہ میں اب تک زندگی میں کسی کی محبت سے صرف اس لیے محروم رہا ہوں کہ مجھے اس لڑکی سے عشق ہونا تھا اور وہ ہو چکا تھا۔

البتہ اس کا پہلوان باپ بہت خطرناک قسم کا انسان تھا۔ کیا زبردست جسم تھا اس کا۔ بلا کا ہتھ چھٹ بھی تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے کئی نوجوانوں کی ٹھکائی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

یہ وہ نوجوان تھے جو اس کی بیٹی سے شادی کے طلب گار تھے۔ یعنی ان کا کوئی برا مقصد نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس پہلوان کو یہ گوارا نہیں ہوتا تھا۔

لیکن میری بات اور ہوتی۔ کیونکہ میں مار کھانے کی پریکٹس کرنے والا تھا۔ پہلوان بھی آخر کتنا مارتا جب میں پٹنے کے باوجود اس کے پاس جانے سے باز نہیں آتا تو اسے مجھ پر دھیان دینا ہی تھا۔

میں نے یہ تکنیک ایک ہندوستانی فلم سے سیکھی تھی۔ شاید سلمان خان کی فلم تھی۔ جس میں لڑکی کا باپ اسے بے تحاشا مارتا ہے اور مارتا ہی رہتا ہے لیکن وہ بھی ڈھیٹ بنا ہوا اس کے دروازے پر جم جاتا ہے۔ بالآخر وہ بے رحم شخص ہیرو پر مہربان ہو کر اپنی لڑکی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔

تاریخ اسلام کا ایک ورق

مدینہ منورہ میں زبردست قحط پڑا۔ لوگ غلہ میسر نہ آنے کے باعث بھوک سے مرنے لگے۔ عرب کے اس جزیرہ نما پر یہ بدترین دور تھا جو گزرا۔ انہیں دنوں مدینے کے تاجروں کو پتا چلا کہ حضرت عثمانؓ بن عفانؓ (جو مدینے کے متمول تاجروں میں سے ایک تھے) کے ہاں ان کے بہت سے اونٹ اجناس اور غلے سے لدے ہوئے شام سے آ رہے ہیں۔ تاجروں نے اپنا ایک وفد ترتیب دیا اور یہ وفد حضرت عثمانؓ کے مکان پر پہنچا۔

حضرت عثمانؓ نے آنے کی وجہ دریافت کی تو اس وفد کے لیڈر نے کہا: "حضرت! ہمیں معلوم ہوا ہے کہ شام سے آپ نے کافی غلہ منگایا ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اس وقت اہل مدینہ غلہ کی نایابی کے باعث شدید مشکلات سے دوچار ہیں۔ ہماری دکانوں میں کچھ نہیں ہے اور سارا کاروبار چوپٹ ہو رہا ہے۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ آپ یہ غلہ ہمارے ہاتھ فروخت کر دیں۔"

"تم لوگ اس کی کیا قیمت دو گے؟" حضرت عثمانؓ نے پوچھا۔

"ہم آپ کے مال کو آپ کی خرچ کردہ قیمت سے دگنی رقم میں خریدنے پر تیار ہیں؟"

حضرت عثمانؓ نے کہا: "لیکن اس جنس کی قیمت مجھے پہلے ہی آپ کی قیمت سے زیادہ مل رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" وفد نے کہا۔ "چلیے ہم اس کی تین گنی رقم دے دیں گے۔"

حضرت عثمانؓ نے اس پر دوبارہ کہا ——— "مجھے اس سے بھی زیادہ پیشکش کی جا چکی ہے۔"

تاجروں نے اس بات پر آپس میں کچھ باتیں کیں اور پھر بولے: "اگر یہ بات ہے تو ہم اس کی چوگنی رقم دینے پر تیار ہیں ——— لیکن اس سے زیادہ ہمارے امکان میں نہیں" ——— حضرت عثمانؓ نے اس پر تبسم کیا اور فرمایا: "میں بھلا اس قیمت کو کیا کروں گا، جب کہ مجھے اس سے بھی زیادہ فائدے کی پیشکش پہلے ہی مل چکی ہے۔" اب تو وفد حیران سا ہو گیا۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

"جناب ——— ہم لوگ مدینے کے تمام تاجروں کو جانتے ہیں اور جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے، ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کون سا تاجر ہے جس نے کوئی بڑی پیشکش کی ہے۔" حضرت عثمانؓ نے وفد کی گفتگو دلچسپی سے سنی اور مسکرا کر بولے:

"اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے، میری معافی کسی تاجر سے نہیں، اللہ تعالیٰ سے ہوئی ہے۔" اس کا ارشاد ہے کہ: "اگر تم اپنے مال سے ضرورتمندوں کی مدد کرو گے تو میں تمہارے خرچ کردہ مال سے کم از کم سات گنا زیادہ کا نفع شمار کروں گا۔" ——— انہوں نے رک کر کہا: "میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس غلے کو اہل مدینہ میں مفت تقسیم کروں گا۔"

میرے دوست نے مجھ سے کہا۔ "بے وقوف، تم اس لڑکی سے بات کیوں نہیں کر لیتے۔ میرا مطلب ہے ٹھکائی کی پریکٹس سے پہلے ایک بار اس سے بات تو کر لو۔"

"کس طرح بات کروں۔ میری تو آج تک اس سے بات نہیں ہوئی۔"

"کیا مطلب؟ کیا تم دونوں کے درمیان محبت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔"

"ہے کیوں نہیں لیکن وہ صرف میری طرف سے ہے۔ اس کو تو معلوم بھی نہیں ہو گا کہ اس محلے کا کوئی بندہ اس پر جان دیتا ہے۔"

"پھر تو تمہارا خدا ہی حافظ ہے۔"

"دیکھو میری ساری تیاریاں مکمل ہیں لہٰذا تم مجھے بہکانے کی کوشش نہ کرو۔" میں نے کہا۔

"ارے بھائی کیسی تیاریاں کر لیں۔"

"دیکھو پہلی بات تو یہی ہے کہ میں نے دو عدد باڈی بلڈر قسم کے نوجوانوں کا انتخاب کر لیا ہے بلکہ انہیں ڈیوٹی پر رکھ لیا ہے۔ دوسری تیاری ہے فرسٹ ایڈ باکس تاکہ زیادہ زخمی ہو جاؤں تو اپنی مرہم پٹی خود ہی کر سکوں اور تیسری تیاری

یہ ہے کہ میں نے مُنّا بھائی اعضا بند سے بھی بات کر لی ہے۔"

"وہ کس لیے؟"

"وہ اس لیے کہ ہڈی وغیرہ ٹوٹ جائے تو وہ علاج کر سکیں۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا ہے کہ ہو سکتا ہے... میں آپ کا مستقل گاہک بن جاؤں۔"

"اب میں تمہیں کوئی مشورہ نہیں دوں گا۔" میرے دوست نے کہا۔ "کیونکہ جو آدمی خود اپنی موت کو دعوت دے رہا ہو اسے مشورہ نہیں دیا جاتا۔"

"میری جان تم صرف دیکھتے رہو کہ میرا یہ منصوبہ کس طرح کامیاب ہوتا ہے۔"

"میرا دوست مجھے برا بھلا کہتا ہوا واپس چلا گیا۔

دوسری شام کو دونوں مسخنڈے اپنی ڈیوٹی پر آ گئے۔ وہ دونوں ابتدا ہی سے حیران ہو رہے تھے۔ "صاحب آپ کا یہ شوق تو ہماری سمجھ سے باہر ہے۔" ان میں سے ایک نے کہا تھا۔ "لوگ تو ہم سے دوسروں کی ٹھکائی کرایا کرتے ہیں۔ آپ خود اپنی ٹھکائی کروائیں گے۔"

"بھائی یہ ایک طرح کی منّت ہے۔" میں نے کہا۔ ..."تم لوگ اس چکر میں نہ پڑو بس اپنے کام سے کام رکھو... چلو شروع ہو جاؤ۔"

ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر مجھے ایک گھونسا جڑ دیا۔ بہت ہلکے انداز میں جیسے کسی بچے کو مارا جاتا ہے۔ "یہ کیسا تکلف کر رہے ہو۔" میں نے ڈانٹا۔ "ٹھیک سے مارو۔"

پھر دوسرے نے آگے بڑھ کر جو گھونسا میرے چہرے پر رسید کیا ہے تو دن میں تارے دکھائی دے گئے۔ کم بخت نے زوردار ہاتھ مار دیا تھا۔ میں تیورا کر گر پڑا۔ وہ دونوں ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ "ارے کم بختو خاموش کیوں کھڑے ہو آگے بڑھ کر ٹھوکریں مارو۔"

"ٹھوکریں ماریں۔"

"ہاں ہاں ایک گھونسے سے کیا ہو گا؟"

بس پھر کیا تھا ان دونوں نے بے تحاشا ٹھوکریں مارنی شروع کر دیں۔ کمر پر، پیٹ پر، رانوں پر۔ میں مار کھا کھا کر لہولہان ہو گیا تھا پھر میں نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا۔ "بس، بس آج اتنا ہی۔"

وہ دونوں رک گئے۔ انہوں نے مجھے سہارا دے کر کرسی پر بٹھا دیا۔ درد کی شدت سے میرا پورا بدن پھٹا جا رہا تھا۔

"صاحب ہم کو معاف کرنا۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ "ہم نے جوش میں آ کر کچھ زیادہ ٹھکائی کر دی۔"

"نہیں، نہیں بالکل ٹھیک ہے۔" میں کراہتے ہوئے بولا۔ "اتنا ہی چاہیے تھا۔" میں نے اپنی جیب سے پانچ پانچ سو کے دو نوٹ نکال کر ان دونوں کو دے دیے۔ "یہ رکھ لو۔ پرسوں پھر آ جانا۔"

"آپ کا حکم ہو تو کل ہی آ جائیں۔"

"نہیں کل آنے کی ضرورت نہیں ہے کل میں اپنی سینکائی کر لوں گا۔"

وہ دونوں زیرِ لب مسکراتے ہوئے چلے گئے۔ انہیں بھی زندگی میں مجھ جیسا کلائنٹ نہیں ملا ہو گا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے منہ ہاتھ دھونے کے لیے واش روم کی طرف جانا چاہا تو مجھ سے چلا نہیں گیا۔ پورا بدن کانپ رہا تھا اور درد تو ایسا تھا جیسے پورے بدن پر زخم آئے ہوں۔

بہرحال میں نے چین کر کھا کر درد کے احساس کو کم کیا۔ فرسٹ ایڈ بکس میں اس قسم کی دوائیں لے کر رکھ لی تھیں۔ مرہم پٹی کا بھی پورا سامان تھا۔

وہ ساری رات، دوسرے دن دوسری رات میں بستر ہی پر پڑا رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار مار کھائی تھی اور وہ بھی اتنی زبردست کہ جیسے دھوبی کپڑوں کو پیٹتا ہے۔

بہرحال تیسری شام وہ دونوں پھر آ گئے۔ اس بار انہوں نے ذرا بھی تکلف نہیں کیا تھا۔ اتنا مارا کہ میرے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ اس بار میرا سر بھی پھٹ گیا تھا۔

وہ دونوں میرے سر سے بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے لیکن میں نے انہیں تسلی دی "پریشان کیوں ہو رہے ہو۔ تم دونوں بہت اچھے جا رہے ہیں۔ تمہارا ہر گھونسا میری منزل کو مجھ سے قریب کر رہا ہے۔"

"صاحب جی، یہ تو بتا دیں کہ آپ کی منزل کیا ہے؟" ایک نے پوچھا۔ "کیونکہ ایسی عجیب منزل جو ٹھکائی کے بعد ملتی ہو ابھی مجھ سے باہر ہے۔"

"تم ان چکروں میں نہ پڑو۔" میں نے کہا "تم وہ فرسٹ ایڈ بکس اٹھا کر لاؤ اور میری مرہم پٹی کر جاؤ۔"

دوسری صبح کو جب میرا دوست مجھ سے ملنے کے لیے آیا تو مجھے دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ سر پر بندھی ہوئی پٹی، سوجا ہوا چہرہ، آواز میں کمزوری، چال میں لنگڑاہٹ۔ "ارے کیا ہوا ہے تمہیں؟" اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"کچھ نہیں ہوا۔ یہ سب شاہانہ سے ملنے کی تیاریاں ہیں۔"

"کون شاہانہ؟"

"ارے وہی پہلوان کی بیٹی۔ میں گزشتہ دو دنوں سے بہت کامیابی اور بے رحمی سے مار کھا رہا ہوں۔ ان کم بختوں نے مار مار کر میری حالت خراب کر دی ہے لیکن میں خوش ہوں کہ میں اپنے مقصد کے قریب ہوتا جا رہا ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ شاید تمہارے آخری دن آ پہنچے ہیں۔" اس نے جل کر کہا "انشاء اللہ تم اسی طرح مار کھا کھا کر دنیا سے رخصت ہو جاؤ گے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" میں مسکرا دیا۔ "محبت کی راہ میں ایسے مرحلے آیا ہی کرتے ہیں۔"

"خدا کے بندے میں ایک بار پھر مشورہ دے رہا ہوں کہ تم اس لڑکی سے بات کر لو ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں ٹھکرا دے۔ پھر کیا ہو گا؟"

"ٹھیک ہے۔ میں ہمت کر کے اس سے بات کر ہی لیتا ہوں۔"

لیکن اس لڑکی سے بات کرنے میں تین دن لگ گئے۔ ان تین دنوں تک میری مرہم پٹی ہوتی رہی اور میں خود اپنے بدن کی سینکائی کرتا رہا تھا۔

تین دنوں کے بعد میں اس قابل ہوا تھا کہ اپنے مکان سے نکل کر گلی میں جا سکوں۔ اب مجھے اس لڑکی کے دکھائی دینے کا انتظار تھا۔ وہ مل جاتی تو میں اس کو راستے میں روک کر اس سے بات کر لیتا۔

ایک بات یہ بتا دوں کہ پہلوان کی بیٹی باتیں کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی تھی۔ یعنی محلے کا کوئی بھی نوجوان اس سے باتیں کر سکتا تھا۔ شاید اس میں یہ خود اعتمادی اپنے باپ کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی جہاں کسی نے کوئی غلط حرکت کی اس کا باپ اس کی گردن دبوچ لے گا۔

اسی لیے محلے کے نوجوان اس سے باتیں کرتے ہوئے بہت محتاط رہتے تھے۔ یعنی وہ اس سے باتیں تو کر لیتے لیکن ان کی نگاہیں زیادہ تر جھکی ہی رہتیں یا پھر وہ اسے جی باجی، جی باجی کہا کرتے تھے۔

میں نے ایسے بھی نوجوانوں کو جی باجی کہتے ہوئے سنا ہے جو اس سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ سچ کہتے ہیں کہ زبردست کا ٹھینگا سر پر ہوتا ہے۔

لیکن میں نے آج تک اس سے بات نہیں کی تھی۔ بس دور ہی سے دیکھ کر دل میں آہیں بھرا کرتا اور اسے حاصل کرنے کے خواب دیکھا کرتا۔ اسی لیے جب میں نے راستے

مددگار

بعض حشرات ایسے بھی ہوتے ہیں جو ناپسندیدہ پودوں اور گھاس پھوس کو ختم کرنے میں معاونت کرتے ہیں۔ شمالی کیلیفورنیا کے قریب "گلے میتھ" کے نام سے مشہور ایک دریا بہتا ہے۔ گلے میتھ ایک قسم کی جنگلی گھاس کا نام ہے جو اچانک یورپ، امریکا اور آسٹریلیا تک پھیل گئی اور جس نے وہاں کے مقامی پودوں کو ختم کر دیا تھا۔ اس کے کھانے سے جانوروں میں بھی عجیب تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہو گئیں۔ ان کی افزائش کی صلاحیت متاثر ہونے لگی اور شدید تکلیف دہ چبھن کی کیفیت بڑھنے لگی۔

اسی لیے بھنوروں کی کچھ اقسام یورپ سے آسٹریلیا لائی گئیں جو گلے میتھ گھاس کھاتی تھیں۔ کچھ سائنس داں یہاں سے بھنورے کیلیفورنیا بھی لے گئے جہاں انہیں ان کا قدرتی ماحول دینے کی کوشش کی گئی اور روزانہ پر پانی کے قطروں کا چھڑکاؤ کیا جاتا تاکہ انہیں بارش کے موسم کا احساس دلایا جائے۔

اس طرح یہاں بھنوروں کی بھرپور افزائش کی گئی۔ یہ بھنورے جنگلی گھاس کھاتے تھے۔ اس طرح تقریباً تین سے چار سال کے عرصے میں اس جنگلی گھاس کا صفایا ہو گیا۔

تلاش: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

میں روک کر اس سے بات کی تو وہ حیران رہ گئی تھی۔ میں نے اس سے کہا تھا "تم مجھے تو جانتی ہو گی، میں اسی محلے میں رہتا ہوں۔"

"ہاں جانتی ہوں۔" اس نے حیرت سے کہا۔ "کئی بار آپ کو دیکھ بھی چکی ہوں۔"

"تم سے ایک ضروری کام ہے بلکہ ایک بات کرنی ہے۔"

"بتاؤ کیا بات ہے؟"

"بتانے سے پہلے میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس کے لیے تمہیں میرے گھر آنا ہو گا۔ تم یقین کرو تمہارے ساتھ کوئی غلط حرکت نہیں ہو گی اور ویسے بھی کوئی کر بھی نہیں سکتا۔ تم صرف دس منٹ کے لیے آ جانا

اگر مجھ پر ذرا سا بھی بھروسا ہو تو۔"

"آپ کیا دکھانا چاہتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"یہ میں یہاں نہیں بتا سکوں گا۔ یہ جاننے کے لیے تمہیں آنا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "میں ایک بار پھر تمہیں یقین دلا دوں کہ میری ذات سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے کچھ سوچنے کے بعد اپنی گردن ہلا دی۔ "میں آجاؤں گی۔"

اس شام میں نے ان دونوں سے کہہ دیا تھا کہ آج کی ٹھکائی بہت زیادہ ہونی چاہیے کیونکہ ایک گیسٹ بھی دیکھنے آئے گی۔ لہٰذا جب اس لڑکی کے سامنے وہ دونوں آئے تو انہوں نے بے تحاشا مارنا شروع کر دیا۔

گھونسے، لاتیں، ٹھوکریں جبکہ اس لڑکی کا یہ حال تھا جیسے اس پر سکتہ ہو گیا تھا وہ چیخ اٹھی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیسی غنڈہ گردی ہے۔ میں ابھی محلے والوں کو بلاتی ہوں۔"

وہ مکان سے باہر جانے والی تھی کہ میں نے اسے آواز دے کر روک دیا۔ "سنو رک جاؤ۔ رکو۔"

وہ رک گئی۔ "ارے یہ لوگ آپ کو مار رہے ہیں۔" اس نے بوکھلا کر کہا۔

"ہاں ہاں مار رہے ہیں لیکن میں نے ہی ان سے کہا ہے۔ اس لیے تم ایک طرف کھڑے ہو کر میری ٹھکائی دیکھتی رہو۔ تمہیں کچھ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میرا اشارہ پا کر انہوں نے پھر مجھے مارنا شروع کر دیا۔ اس دفعہ میری ناک سے بھی خون نکلنے لگا تھا۔

"ارے دیکھیں تو سہی۔" وہ پریشان ہو کر بولی "آپ کی ناک ٹوٹ گئی ہے، خون نکل رہا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں بس دو منٹ اور۔ اس کے بعد یہ لوگ خود ہی چلے جائیں گے۔"

اور ٹھیک دو منٹ کے بعد وہ دونوں خدا حافظ کہہ کر چلے گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد بھی میں فرش پر گرا ہوا ہائے ہائے کرتا رہا تھا۔

"یہ کیا ہے؟ یہ لوگ کیوں مار رہے تھے آپ کو۔" اس نے پوچھا۔

"تمہارے لیے مار رہے تھے۔" میں نے بتایا۔

"میرے لیے۔ میرے لیے کیوں مار رہے تھے؟"

"اس لیے کہ میں تمہارے ابا کی مار برداشت کر لوں۔" میں نے کہا "یوں سمجھو کہ میں پریکٹس کے لیے پٹ رہا تھا۔"

"آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"ارے بھئی، جب بھی کوئی نوجوان اپنی شادی کا پیغام لے کر تمہارے باپ کے پاس جاتا ہے وہ اس کی ٹھکائی کرتے ہیں۔ یہ تمہارے سامنے ہوتا ہے۔"

"اوہ، اب سمجھی۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "تو آپ بھی۔"

"ہاں۔" میں نے اپنے لہجے کو رومانٹک بنانے کی کوشش کی۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں۔"

"تو اس کے لیے آپ مار کھا رہے تھے۔"

"ہاں۔ لیکن دوسرے نوجوان تو ایک بار کی ٹھکائی کے بعد بھاگ لیے تھے لیکن میں نہیں بھاگوں گا۔ دوبارہ پھر جاؤں گا، پھر جاؤں گا، پھر جاؤں گا۔ آخر کب تک وہ مارتے رہیں گے۔ کبھی نہ کبھی تو وہ موم ہو ہی جائیں گے۔"

"کمال ہے۔ یعنی آپ مجھ سے اتنی محبت کرنے لگے ہیں۔"

"ہاں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ کاش میں تمہیں اپنی پوری کیفیت بتا سکتا۔"

"بہت بہت شکریہ آپ کا۔" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ "آپ نے مجھے نئی زندگی دے دی ہے۔"

"ارے اب ایسی بھی کیا بات ہو گئی۔"

"آپ میرے احساسات سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں نے یہ سمجھا تھا کہ شاید میری زندگی یونہی گزر جائے گی کوئی اپنا رشتہ لے کر اپنے باپ کے پاس کیوں آئے گا جو صرف آنے والوں کی ٹھکائی کرنا جانتا ہو۔ جسے اس بات کا احساس ہی نہ ہو کہ بیٹی کو رخصت بھی کرنا ہے۔ کتنے نوجوان آئے ٹھکائی ہوئی اور لوٹ کر نہیں آئے۔ لیکن آپ جو کچھ کر رہے ہیں وہ بہت زبردست ہے۔ آپ مجھے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ابا خود بھی کہتے ہیں کہ انہیں ایسا داماد چاہیے جو مستقل مزاج ہو۔ جو ایک بار کے امتحان کے بعد بھاگ نہ لے۔"

"تو یہ تمہارے ابا کا امتحان ہے؟"

"ہاں وہ تو یہی کہتے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"تو پھر تم بے فکر ہو جاؤ۔ میں اس امتحان میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔"

وہ میرا ہاتھ تھامے بیٹھی رہی۔ پھر میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اپنی مرہم پٹی کی۔ درد بھگانے والی گولیاں کھائیں اور بستر پر لیٹ گیا۔

اس دن چونکہ بہت زیادہ ٹھکائی ہوئی تھی اس لیے آئندہ تین دنوں تک ان مارنے والوں کو بلا نہیں سکا تھا۔ تین دنوں کے بعد میں نے اپنے دوست کو فون کر کے بلایا۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔ "ہاں بھئی کیا حال ہے تمہارے پاکل پنتا کا۔"

"عروج پر ہے۔" میں نے کہا "اور تمہاری اطلاع کے لیے یہ عرض ہے کہ میں بہت تیزی سے کامیاب ہو رہا ہوں۔"

"وہ تو تمہاری حالت ہی سے پتا چل رہا ہے۔ جگہ جگہ سے ٹوٹ گئے ہو۔"

"محبت میں تیرے سر کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے اور ہاں میں نے اس لڑکی سے بات کر لی ہے۔" پھر میں نے اسے شاہانہ کی ساری بات بتا دی۔

"وہ لڑکی اپنے باپ کی طرح جنونی معلوم ہوتی ہے۔" اس نے تبصرہ کیا۔

"شاہانہ کچھ دیر کے بعد یہاں آنے والی ہے۔" میں نے بتایا "وہ میری تیاریاں دیکھنے کے لیے آئے گی اور وہ دو نوجوان بھی آنے والے ہیں میں چاہتا ہوں کہ تم بھی آج یہیں رہو۔ تم دیکھو تو سہی کہ میں کس طرح مار کھاتا ہوں۔"

"تمہاری ٹھکائی دیکھنے کا مجھے کوئی شوق نہیں لیکن میں اس لڑکی کو دیکھنے کے لیے ضرور رکوں گا جس کے لیے تم اتنے پاگل ہو رہے ہو۔"

اور جب شاہانہ وہاں آئی تو اسے دیکھ کر وہ جیسے پاگل ہی ہو گیا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ اسی وقت شاہانہ کے لیے اپنا رشتہ پیش کر دیتا۔ اس نے صرف اتنا کہا۔ "بھائی، واقعی اس لڑکی کے لیے تو آدمی پھانسی پر بھی چڑھ سکتا ہے۔"

شاہانہ اس دن اپنے ساتھ ایک موٹا سا ڈنڈا بھی لے کر آئی تھی۔ "یہ کس لیے لائی ہو۔" میں نے پوچھا۔

"آپ اس ڈنڈے کی بھی پریکٹس کر لیں۔" اس نے کہا۔ "کیونکہ ابا کبھی کبھی ڈنڈے سے بھی شروع ہو جاتے ہیں۔"

میں اندر سے لرز کر رہ گیا تھا لیکن وہ سامنے تھی لہٰذا کچھ بول بھی نہیں سکتا تھا جب کہ میرے دوست کے تاثرات کچھ عجیب سے ہو گئے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں نوجوان بھی آ گئے۔ آج وہ بھی بہت جوش میں دکھائی دے رہے تھے۔ "لانہ کا لایا ہوا ڈنڈا ان کی طرف بڑھا دیا۔" "یہ لو بھائی اب اس ڈنڈے سے میری ٹھکائی کرو۔"

"ہم بھی یہی سوچ رہے تھے صاحب۔" ایک نے کہا۔ "کیونکہ آپ ہاتھوں کے عادی ہو چکے ہیں، یہ امتحان تو برداشت کر جائیں گے۔"

"تو بس شروع ہو جاؤ۔"

اور جب وہ باری باری شروع ہوئے ہیں تو میرے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ ظالم بخت اس طرح مار رہے تھے جیسے کسی دشمن کی دھنائی کر رہے ہوں۔ میرا پورا جسم چور چور ہونے لگا تھا۔

جشن مناؤ

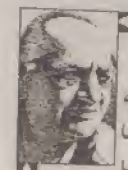

فیض کلاس میں حاضری لے رہے تھے۔ پیچھے سے آواز آئی "ذرا ادھر دی دیکھو سرکار، اساں دی فیسیاں بھریاں ہوئیاں نیں۔" شرمیلے فیض نے جس کا دل پہلی محبت کی ناکامی سے فگار تھا اور جو مونس و غم خوار تلاش کر رہا تھا، آنکھیں اٹھائیں اور کلاس کے بعد اس سے ملنے کو کہا۔ پھر دوستی ہو گئی۔ فیض بہت بڑے شاعر ہو گئے۔ کرنیل ہو گئے اور وہ بدمعاش ہو گیا۔ وقت کی بات ہے۔ راولپنڈی سازش کیس میں فیض جیل چلے گئے اور وہی بدمعاش وہاں موجود۔ فیض کو دیکھ کر حیران پریشان "اوئے، تسی اسیتھے کی کرن آئے او سرکاراں! اسی تے قاتلی تے وارداتی۔ تسی کی واردات کیتی اے؟"

فیض نے کہا "ہمیں کیا معلوم۔ پکڑ کر لے آئے ہیں۔ ہم چلے آئے۔ کہتے ہیں، ہم نے کوئی سازش کی ہے۔"

"بکواس کردے نیں۔ میں ایتھاں دیاں ساریاں چالاں جاندا آں۔ اے ایتھاں نیں خود سازش کیتی اے۔ تے تہانوں اندر کر دیتا اے۔ میں ایتھاں نوں سمجھ لواں گا۔ اوئے پچھے، اوئے کیے، اوئے الو دے چرخیو، دیکھو اج ساڈا استاد آیا اے، اج ساڈے گھر دوتاں آئیاں نیں۔ جشن مناؤ، اج دے دن تے ہتھ ملاؤ اج دے دن" فیض جیل میں دلہا بنے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر ایوب مرزا کی کتاب "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" سے ایک اقتباس

انتہا یہ تھی کہ میری حالت دیکھ کر میرے دوست اور شاہانہ نے اپنے چہرے دوسری طرف کر لیے تھے۔ وہ میری ٹھکائی دیکھ نہیں پا رہے تھے۔ میں بھی اس دن زیادہ پٹنے کے موڈ میں تھا کیونکہ اب مجھے اس کے بعد ڈائریکٹ پہلوان سے بات کرنی تھی۔

بالآخر دونوں میری ٹھکائی کر کے اور اپنی دہاڑی لے کر واپس چلے گئے۔ میں زمین پر گرا ہوا درد سے کراہ رہا تھا۔ شاہانہ اور میرے دوست نے مل کر میری مرہم پٹی کی تھی۔ اس وقت شاہانہ بار بار میری محبت کی تعریف کر رہی تھی۔ ''واقعی آپ نے تو محبت کا حق ادا کر دیا ہے۔ میں یہ فخر سے کہہ سکتی ہوں کہ مجھ سے اس آدمی نے محبت کی ہے جو میرے لیے اپنی جان پر سختیاں برداشت کر سکتا ہے۔''

وہ یہ سب بولے جا رہی تھی لیکن میرا درد سے بہت برا حال ہو رہا تھا جب کہ میرے دوست کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے کیونکہ شاہانہ اس کے سامنے تھی۔ وہ شاہانہ کے لیے میرے اس جذبے کی قدر کرے یا مجھے پاگل سمجھے۔ بہرحال وہ دونوں اپنے اپنے احساسات کے ساتھ واپس چلے گئے۔

میری یہ ٹھکائی پورے ایک ہفتے کے لیے کافی تھی یعنی میں ایک ہفتے تک بستر پر پڑا رہا تھا ایک ہفتے کے بعد جب درد میں کمی آئی اور کسی حد تک چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تو پھر میں نے پہلوان سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ یعنی وہ گھڑی آ ہی گئی تھی جس کے لیے میں نے اتنی مصیبتیں برداشت کی تھیں۔

پہلوان اپنے اکھاڑے میں موجود تھا۔ خدا کی پناہ کیا خطرناک آدمی تھا کہ دیکھنے سے ہیبت طاری ہونے لگتی تھی۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا تھا۔ میں ادب سے سلام کر کے اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''ہاں میاں کیسے آنا ہوا؟'' اس نے دریافت کیا۔

''جناب آپ کے پاس اپنی ایک عرض لے کر حاضر ہوا ہوں۔''

''ہاں کہو۔''

''تنہائی میں کہنے والی بات ہے۔''

''چلو لڑکو۔'' اس نے اپنے آس پاس بیٹھے ہوئے شاگردوں کو مخاطب کیا۔ ''اکھاڑے سے باہر جاؤ تم لوگ۔''

ذرا سی دیر میں اکھاڑا خالی ہو گیا تھا۔

اکھاڑے کو خالی دیکھ کر میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ یعنی اب ٹھکائی کا مرحلہ شروع ہونے جا رہا تھا لیکن مجھے بھی پروا نہیں تھی۔ میں بھی پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا۔

''ہاں اب کہو۔''

''جناب بات صرف اتنی ہے کہ میں آپ کی صاحبزادی کے لیے اپنا رشتہ لے کر آیا ہوں۔''

اتنا کہہ کر میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اب میری ٹھکائی ہونے والی تھی لیکن جب دو منٹ تک کچھ بھی نہیں ہوا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ پہلوان بڑی محبت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ''مجھے تمہارا رشتہ منظور ہے میاں۔'' اس نے کہا۔

''جی۔'' میں حیرت سے اچھل پڑا۔ ''منظور ہے آپ کو؟''

''ہاں بھئی۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو اور تم نے آنکھیں کیوں بند کر لی تھیں۔''

''اس لیے کہ آپ تو رشتہ لانے والوں کی ٹھکائی کر دیتے ہیں۔''

وہ زور سے ہنس پڑا۔ ''بات تو سچ ہے میاں لیکن اصل بات یہ ہے کہ رشتہ لانے والے سب نکمے اور آوارہ قسم کے لونڈے ہوتے ہیں، ان کی ٹھکائی نہیں کرتا تو اور کیا کرتا۔ تم جیسے نوجوان کا رشتہ تو پہلی بار آیا ہے اسی لیے دل و جان سے قبول ہے۔''

اتنا کہہ کر اس نے پیار سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور میں بری طرح بلبلا اٹھا کیونکہ وہ شانہ ابھی تک درد کر رہا تھا۔

کاش میں نے اپنی ٹھکائی کروانے سے پہلے ہی اس پہلوان سے بات کر لی ہوتی لیکن خیر۔ ابھی بھی کوئی خاص نقصان نہیں ہوا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ شادی کے بعد شاہانہ سے جھگڑا ہوتا اور پہلوان میری ٹھکائی کر دیتا تو میں نے اس آنے والی ٹھکائی کے لیے خود کو تیار کر لیا تھا۔

اب شاہانہ سے شادی کو دو سال ہو چکے ہیں۔ اس دوران ہمارا چھوٹا موٹا جھگڑا بھی ہوا ہے لیکن ٹھکائی کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ پہلوان ایک اچھا اور سمجھا ہوا آدمی ثابت ہوا ہے۔ اس نے ہمیشہ شاہانہ کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ مجھے آج تک اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔

میرا دوست مجھ سے یہ کہتا ہے۔ ''میری جان! تمہیں اپنے پیار میں یہ کامیابی اپنے جذبے کی وجہ سے ملی ہے، اپنی ٹھکائی کی وجہ سے نہیں۔''

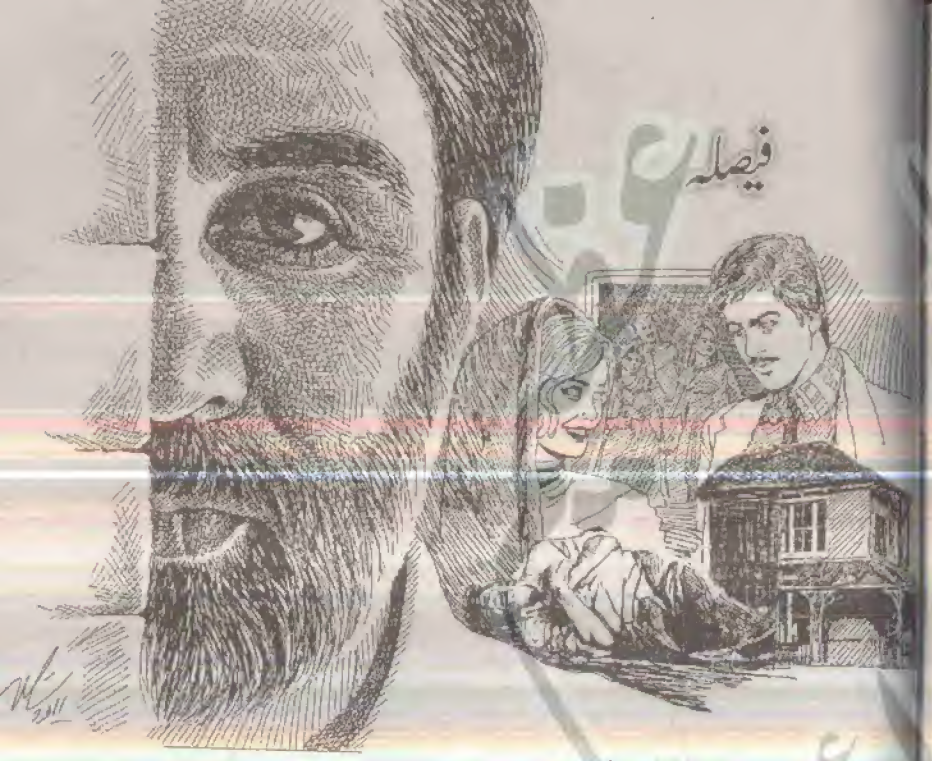

جناب ایڈیٹر صاحب

السلام علیکم!

ایک دوست پر جو گزری ہے وہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ پلیز اسے ضرور شائع کریں۔ ہمارے معاشرے میں مفاد پرستی کس حد تک بڑھ چکی ہے اس کا اندازہ آپ اس ایک واقعے سے لگا سکتے ہیں۔ اگر اس میں سدھار نہ لایا گیا تو وہ دن دور نہیں جب لوگ اپنی ہی بوٹیاں خود نوچیں گے۔ میرے دوست ہارون کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ عبرت حاصل کرنے کے لیے کافی ہے۔

سجاد علی
(فیصل آباد)

گھر کو، اپنے گھر کو لوگ اپنے تحفظ کے لیے بہترین جگہ سمجھتے ہیں لیکن مجھے اپنے گھر سے بھی ڈر لگنے لگا ہے، ہر آہٹ اور ہر کھٹکے پر میں چونک اٹھتا ہوں کہ کہیں کوئی خطرہ میری طرف قدم تو نہیں بڑھا رہا ہے۔ جب سے میں نے یہ تماشا دیکھا کہ سب کچھ گھر میں ہی ہو گیا، کہیں اور نہیں ہوا تو مجھے اپنے لیے اپنا گھر بھی غیر محفوظ محسوس ہونے لگا۔

ہارون بھائی بھی تو اپنے گھر میں تھے، اپنی چھت کے نیچے تھے، اپنے عزیزوں اور چاہنے والوں کے درمیان تھے مگر وہاں بھی انہیں کوئی بچا نہ سکا۔

گھر سے باہر چور اچکوں کا ڈر ہوتا ہے، ڈاکو لٹیرے کا خوف ہوتا ہے۔ دہشت گردوں کی گولیوں، بم دھماکے کا خطرہ ہوتا ہے اسی لیے تو لوگ بچ بچا کر اپنے گھر بھاگتے ہیں لیکن گھر میں بھی اگر جان بچانے کا یارانہ ہو تو بندہ کہاں جائے؟

میرے بھی حالات ہارون بھائی سے ملتے جلتے ہیں۔ ہارون بھائی کو ان کے دوست احباب اکثر کہتے تھے، تمہیں کس بات کا ڈر ہے؟ تمہارے سارے بچے بڑے ہو گئے

ہیں۔ تم نے انہیں ان کے پیروں پر کھڑا کر دیا ہے، اب وہ ہر طرح خوش حال اور مالا مال ہیں۔ میرے احباب مجھے بھی مبارک باد دیتے ہیں کہ تمہارے تو اب مزے ہی مزے ہیں۔ تم اپنی ساری ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہو چکے ہو۔ بچوں کی تعلیم و تربیت مکمل کرا چکے ہو، ان کی شادی بیاہ کرا چکے ہو، اب تمہیں کاہے کا غم؟ لیکن میں جب ہارون بھائی کے انجام کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنا انجام بھی کچھ اچھا نظر نہیں آتا اور میں سر سے پاؤں تک لرز کر رہ جاتا ہوں۔ کہیں، کل کلاں کو میرا گھر، اس کی چھت اور دیواریں میرے لیے بھی خطرناک نہ بن جائیں؟

ہارون بھائی ہمارے دور پرے کے رشتے دار تھے لیکن قریبی عزیزوں سے زیادہ اچھے، مہربان اور مخلص تھے۔ ماں باپ بچپنے میں بے سہارا چھوڑ کر غیبی منی اوڑھ کر سو گئے تھے۔ ایسے میں جینا کتنا دشوار ہو جاتا ہے، اس کا اندازہ ہر ایک بخوبی کر سکتا ہے۔ ہارون بھائی کو بھی بڑی مشکلات کا سامنا تھا لیکن انہوں نے بڑی ہمت اور بڑے حوصلے سے ہر مشکل کا مقابلہ کیا۔ ہر دشواری کو اپنی انتھک محنت، لگن اور جدوجہد سے ختم کیا اور آگے بڑھتے رہے۔ اپنے لیے آسانیاں پیدا کرتے رہے۔ نہ صرف اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے اسباب پیدا کرتے رہے بلکہ اپنے بہترین مستقبل کے لیے تعلیم و تربیت کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ پھر وہ وقت بھی آ گیا جب وہ پڑھ لکھ کر ایک بڑے آدمی بن گئے۔ ایک بڑی کمپنی میں نوکری کر لی۔ ایک بڑے عہدے پر فائز ہو گئے۔ شادی بیاہ کیا۔ بال بچے پیدا ہوئے تو ان کے بہتر مستقبل کے لیے، ان کے آرام و آسائش کا ہر طرح خیال رکھا۔ انہیں کسی کمی کا احساس ہونے نہیں دیا۔ ماں باپ کی عدم موجودگی میں انہوں نے جس محرومی کا سامنا کیا تھا، اس کا انہیں ہر وقت خیال رہتا تھا اس لیے اپنے بچوں کو وہ اپنا پورا پیار اپنی تمام توجہ سے ہمکنار رکھتے تھے کہ انہیں کبھی کسی کمی کا احساس نہ ہو۔ کسی محرومی کا ان پر عکس بھی نہ پڑے۔ ان کے لیے آرام دہ اور پُر آسائش گھر بنایا۔ انہیں بہترین تعلیم دلوائی۔ ان کی شادیاں کروائیں، ان کے مقابلے میں ان کی بیوی رضیہ بیگم ذرا سخت طبیعت کی تھیں۔ بچوں کی شرارتوں اور بدتمیزیوں پر انہیں ڈانٹتی ڈپٹتی، مارتی پیٹتی تو وہ احتجاج کرتے ''کیوں میرے معصوم بچوں کو تشدد کا نشانہ بناتی ہو؟''

وہ کہتیں ''انہیں کنٹرول نہیں کروں گی، انہیں انسان نہیں بناؤں گی، شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دوں گی تو کل یہی ہمارے تمہارے لیے عذاب بن جائیں گے۔ ہماری مصیبت کا سبب بن جائیں گے۔''

وہ ہنس دیتے اور ہنس کر کہتے ''کیسی باتیں کرتی ہو تم رضیہ بیگم! ہمارے بچے کل جب بڑے ہو جائیں گے تو بچے نہیں رہیں گے۔ بڑے ہو کر، پڑھ لکھ کر باشعور بن جائیں گے۔ اپنی ذمے داریوں کو سمجھیں گے۔ اپنے فرائض کی ادائیگی احسن طریقے پر ادا کریں گے۔ ہم نے ان کے ساتھ جو مہربانیاں کی ہیں، ویسی ہی مہربانیاں وہ ہمارے ساتھ بھی کریں گے۔''

''میں ایسے سندر سپنے نہیں دیکھتی۔'' رضیہ بیگم کہتیں۔ ''میں جاگتی آنکھوں سے جو کچھ دیکھتی ہوں اس کے تناظر میں کبھی کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہتی۔ مجھے اللہ کی ذات کے سوا کسی سے کسی بہتری کی توقع نہیں۔''

دونوں میاں بیوی کے موڈ، مزاج میں بڑا فرق تھا اور اس کی وجہ بھی تھی۔ ہارون بھائی کا ماضی بڑا تکلیف دہ تھا، ماں باپ کی محبت سے محروم تھے جبکہ رضیہ بیگم بھرے پُرے گھر سے ان کے گھر آئی تھیں اور انہوں نے اپنے گھر میں جو ماحول دیکھا تھا، اس کے بعد انہیں اپنے بچوں سے بھی کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔

رضیہ بھابی کے جو خیالات اور نظریات تھے، ان پر وہ شروع سے آخر تک کاربند رہیں۔ انہوں نے دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی شادی کے بعد اس گھر میں مزید رہنا گوارا نہیں کیا۔ شاید اس خیال سے کہ اب ان کا گھر ان کا..... نہیں رہے گا اس لیے انہوں نے اپنے ڈھائی کنال کے دائی گھر میں سکونت اختیار کر لی۔ ان کی جدائی نے ہارون بھائی کو اندر سے توڑ دیا تھا۔ ان کو اب احساس ہوا کہ رضیہ بیگم ان کے لیے کتنی اہمیت کی حامل تھیں۔ پہلے پہل تو وہ یہ سوچ کر اپنے آپ کو بہلاتے رہے کہ میرے بچے مجھے میری بیوی کی کمی کا احساس ہونے نہیں دیں گے۔ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی شادیاں ہونے کے باوجود ایک بیٹا اور ایک بیٹی تو ابھی تک کنوارے ہیں اور اس گھر میں ہیں۔ بیٹیاں شادی کے بعد پرائے گھر چلی جاتی ہیں، بیٹے بھی شادی کے بعد ماں باپ کے گھر میں کب رہتے ہیں۔ ان کی بیویاں انہیں لے کر چل جاتی ہیں، اپنا نیا گھر بسا لیتی ہیں، ان کے بیٹوں نے بھی یہی کیا۔ رضیہ بھابی کو شاید یہ سب دیکھنا گوارا نہیں تھا اس لیے انہوں نے خود ہی اپنا الگ گھر بسا لیا تھا مگر ہارون بھائی اب بھی مایوس نہیں تھے۔ کیا ہوا دو بیٹے چلے گئے ہیں تو ایک بیٹا اور ایک بیٹی تو اب بھی میرے پاس ہیں۔ وہ دونوں مجھے میری بیوی کے غم میں سسک سسک کر مرنے نہیں دیں گے۔ وہ ہر

طرح میرا خیال رکھیں گے مگر جلد ہی انہیں مرحومہ کی باتیں یاد آ گئیں۔ ''میں کبھی کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہتی.....'' مرنے والی نے غلط نہیں کہا تھا۔ ابھی تو رضیہ بیگم کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا، ہارون بھائی کا زخم تر و تازہ تھا کہ انہیں احساس ہونے لگا، انہوں نے جو کچھ سوچا تھا، جو آس لگائی تھی، وہ ان کی بھول تھی۔ بچے اب بچے نہیں رہے تھے، بڑے ہو گئے تھے مگر پڑھ لکھ کر اتنے باشعور نہیں ہوئے تھے جس کا انہوں نے خواب دیکھا تھا۔ کئی بار انہوں نے سوچا کہ انہیں ان کی بے راہ روی پر ٹوکیں، روکیں مگر اس سے پہلے انہوں نے خود ان کو روکنا ٹوکنا شروع کر دیا۔

''پاپا! آپ جو اس طرح کھانستے، کھنکھارتے رہتے ہیں، اس طرح گھر آنے والے ہمارے مہمانوں پر برا اثر پڑتا ہے۔ آپ اپنا علاج کیوں نہیں کراتے؟''

''دوائیں تو استعمال کر رہا ہوں۔''

''آپ اسپتال میں ایڈمٹ کیوں نہیں ہو جاتے؟ جب تک کھانسی اچھی نہ ہو جائے، آپ اسپتال ہی میں رہیں۔''

''پاپا! جب میری سہیلیاں آئیں تو آپ ڈائننگ روم میں نہ آیا کریں۔''

''کیوں بھئی! کیا تمہاری سہیلیاں پردہ کرتی ہیں۔''

''نہیں، پردہ تو نہیں کرتیں۔ دراصل آپ جس انداز میں رہتے ہیں، اس سے ہماری بڑی سبکی ہوتی ہے۔''

''مگر میں کوئی پھٹے پرانے یا میلے پیلے لباس میں تو نہیں ہوتا، پھر تمہاری سبکی کیوں ہوتی ہے۔''

''اوہو، آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ آپ کُرتے پاجامے میں ہوتے ہیں، جبکہ ہماری سہیلیوں کے گھروں میں مرد سوٹ بوٹ میں ملبوس ہوتے ہیں۔''

ہارون بھائی کو اب احساس ہونے لگا تھا کہ اب ان کے گھر میں ان کی کیا حیثیت ہو گئی ہے۔ اب ان کے بچے بھی انہیں ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھنے لگے ہیں۔ بچوں کے ایسے رویے پر کبھی کبھی ان کا دل چاہتا، ان کے منہ پر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیں۔ مگر وہ اپنی اس خواہش پر کبھی عمل نہیں کرتے تھے۔ جب یہ لوگ بچے تھے، تب تو انہوں نے ان کو کبھی پھول کی چھڑی سے بھی نہیں مارا تھا۔ اب جب وہ ان سے آنکھیں ملا کر بات کرنے کے قابل ہو گئے ہیں، اب وہ انہیں کیا مارتے؟ ان کا دل مسوس کر رہ جاتا اور انہیں مرحومہ کی بات شدت سے یاد آنے لگتی۔

''کل یہی ہمارے تمہارے لیے عذاب بن جائیں گے۔ ہماری مصیبت کا سبب بن جائیں گے۔''

وہ ٹھنڈی آہ بھر کر دل ہی دل میں کہتے ''رضیہ بیگم! تم تو اس عذاب سے بچ گئیں۔ اکیلے میں ہی بچوں کے نرغے میں رہ گیا ہوں۔ اللہ جانے میرا کیا حشر ہو گا۔''

ایک بار انہوں نے مجھ سے کہا ''میں سوچتا ہوں، کہیں چلا جاؤں۔ اس گھر سے کہیں دور چلا جاؤں۔''

''آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں؟ یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔ اپنے گھر کو چھوڑ کر آپ اور کہاں جائیں گے؟''

''مگر یہ گھر..... اب میرا گھر کب رہا ہے؟ اپنے گھر میں کہیں کوئی اتنا بے وقعت ہوتا ہے؟''

ان کا کہنا غلط بھی نہیں تھا اس لیے میں ان سے زیادہ بحث نہیں کرتا تھا۔ وہ کوئی بچے تو نہیں تھے کہ میری طفل تسلی پر بہل جاتے۔ بہرحال مجھے ان سے ہمدردی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ ان کے گھر کا ماحول درست ہو جائے..... میں ان سے کبھی کبھی کہتا بھی تھا۔ ''ہارون بھائی! زندگی کے جو تھوڑے دن باقی رہ گئے ہیں، انہیں صبر و تحمل سے گزار دیں، کیا کیجئے گا..... وہ آپ ہی کے بچے ہیں..... اور بچے تو اپنے ہی جسم و جاں کا حصہ ہوتے ہیں۔''

''کبھی کبھی میں سوچتا ہوں۔'' وہ دکھ بھرے لہجے میں

Monthly Digest
مکتبہ اعلا و سہلا
SUSPENSE
Sole Distributor
سسپنس
SARGUZASHT
ویلکم بک شاپ
سرگزشت
PAKEEZA
WELCOME BOOK SHOP
پاکیزہ
JASOOSI
P.O.Box 27869
Karama,Dubai
Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961013
Mobile: 050-6245817
جاسوسی
E-mail: welbook@emirates.net.ae
JD Group of Publications

کہتے ''جب یہ چھوٹے چھوٹے سے تھے۔ میں تب مرجاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ جس طرح میرا باپ مجھے بچپنے میں چھوڑ کر قبر میں جاسویا تھا' اسی طرح میں بھی قبر میں لمبی تان کر، مٹی اوڑھ کر سو جاتا تو مجھے آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔''

انسان کبھی کبھی کتنا مایوس ہوجاتا ہے کہ اس طرح کی باتیں سوچتا ہے۔ یہی ہارون بھائی تھے جنہوں نے اپنی یتیمی اور محرومیوں کا عکس بھی اپنے بچوں پر پڑنے نہیں دیا تھا۔ جتنا وہ ترسے تھے، تڑپے تھے..... اتنا ہی انہوں نے اپنے بچوں کو عیش وعشرت کے جھولے میں جھلایا تھا۔ ان کی ناز برداریاں کی تھیں۔ انہیں سونے کا نوالہ کھلایا تھا۔

جن دو بچوں کے حوالے سے وہ سوچ رہے تھے کہ ان کی موجودگی میں انہیں مرنے والی کی کمی کا احساس نہیں ہوگا..... وہ ہر طرح کا خیال رکھیں گے' ان کی دل جوئی کریں گے۔ ان سے اور زیادہ محبت سے پیش آئیں گے وہی بچے جب ان کی اذیت کا سبب بننے لگے' انہیں بات بات پر ذہنی کچوکے لگانے لگے تو کسی حد تک وہ الگ تھلگ ہوگئے تھے۔ اپنے کمرے میں بند ہوکر رہ گئے تھے۔ پھر بھی کبھی کبھی ان کے صبر وضبط کا پیمانہ چھلک پڑتا تھا۔ جب گھر میں بے ہنگم شور شرابا حد سے بڑھ جاتا۔ بچے بچی کے دوست احباب گھر میں سجائی گئی محفلِ موسیقی کے بہانے جب آسمان سر پر اٹھا لیتے تو ان سے چپ رہنا مشکل ہوجاتا۔ نوکروں کے ذریعے کہلواتے ''یہ گھر ہے یا قحبہ خانہ!''

''یہ ہمارا گھر ہے..... ہم اسے گھر رکھیں یا قحبہ خانہ بنادیں۔ آپ ہمیں روکنے ٹوکنے والے کون؟''

نوکروں ہی کے ذریعے انہیں یہ جواب دیا جاتا اور وہ سوچ میں پڑجاتے..... کیا یہ گھر اب میرا نہیں رہا ہے؟ یہ دونوں اس کے مالک بن بیٹھے ہیں مگر کب..... اور کیسے؟

اور پھر اس کب اور کیسے کا جواب بھی ایک دن انہیں مل گیا۔ ''پاپا! یہ گھر آپ ہم دونوں بھائی بہن کے نام لکھ دیں۔''

''مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ میرے اور بھی تین بچے ہیں۔ ان کا بھی میری جائداد میں حصہ ہے۔''

''کون بچے..... کیسے بچے؟ وہی جنہوں نے آپ کو چھوڑ کر اپنی الگ دنیا بسالی ہے؟''

''ہاں وہی..... وہ جیسے بھی ہیں، میری اولاد تو ہیں۔ تمہارے بھائی بہن تو ہیں۔''

''ان کے لیے آپ نے جو کچھ کردیا، وہی ان کے لیے بہت ہے۔ اس گھر کے سلسلے میں انہیں گولی مارئیے۔''

''کیسے گولی ماردیں۔'' وہ قانونا اور مذہبا بھی اس وراثت کے حقدار ہیں۔''

''اگر آپ انہیں گولی نہیں ماریں گے تو ہم آپ کو گولی ماردیں گے۔''

ان کا گھر، کوئی عام اور معمولی گھر نہیں تھا، بے حد خوبصورت..... بہت بڑا اور وسیع..... حویلی نما..... جس کی مالیت کروڑوں روپے تھی۔ ان کے دو بچوں نے جنہیں وہ اپنا ہمدرد اور غمگسار سمجھتے تھے۔ جن پر انہیں بڑا بھروسا تھا، جب انہوں نے دھمکی دی کہ اگر یہ گھر انہوں نے ان کے نام نہیں لکھا تو وہ انہیں گولی ماردیں گے تو وہ مجھ سے بڑے عجیب انداز میں بولے۔

''دیکھو..... دیکھو سجاد! اب وہ مجھے گولی مارنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔''

''ہارون بھائی! آپ ان کی دھمکی سے نہ ڈریئے۔ جب تک آپ اپنی جائداد ان کے نام منتقل نہیں کریں گے تب تک وہ ایسی کسی دھمکی پر عمل نہیں کریں گے۔ ہاں جس دن آپ نے ان کے حق میں دستخط کردیئے اس دن وہ نہ صرف آپ کو اس گھر سے نکال کر باہر پھینک دیں گے بلکہ اس دنیا ہی سے کوچ کرنے پر مجبور کردیں گے۔''

یہ بات شاید ان کی سمجھ میں آگئی تھی۔ لہٰذا انہوں نے ان کے ڈرانے دھمکانے کے باوجود اپنا عظیم الشان بنگلا ان کے نام منتقل نہیں کیا جبکہ وہ بچے اپنی سی کوشش کرتے رہے۔

ابھی دنوں کی بات ہے، مجھے ایک کام کے سلسلے میں اسلام آباد جانا پڑا۔ کوئی ہفتہ عشرہ کے بعد واپس آیا تو سب سے پہلی اطلاع مجھے یہ ملی کہ ہارون بھائی اسپتال میں ہیں اور ان کی حالت بہتر نہیں ہے۔ میں نے اسپتال پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ ان کی حالت تشویش ناک حد تک خراب تھی، بے ہوشی جیسی کیفیت طاری تھی۔ طویل وقفوں کے بعد ہوش آتا..... آنکھیں کھولتے، بولائی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے' پھر ہوش وحواس سے بے گانہ ہوجاتے۔

''آخر انہیں ہوا کیا ہے؟ اس حال کو کیسے پہنچے؟''

''پانی کی ٹنکی میں گر گئے تھے۔ جانے کتنی دیر تک ڈوبے رہے۔ اس وقت نکالا گیا جب حالت بہت بگڑ گئی تھی۔''

پانی کی ٹنکی میں گرنے والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ کس طرح گر گئے؟ یہ معما میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ میرا ذہن کسی اور طرف چلا گیا۔ ان کے پاس اسپتال میں ان کے۔ دو بڑے بیٹے موجود تھے جن کی شادی ہوچکی تھی اور وہ

باپ کے ساتھ بنگلے میں نہیں رہتے تھے۔ میں نے ان سے ان کے دونوں کنوارے بھائی بہن کے بارے میں پوچھا کہ وہ یہاں کیوں نہیں ہیں تو مجھے بتایا گیا۔

''وہ پولیس کسٹڈی میں ہیں۔ انہیں اس شک میں گرفتار کرلیا گیا ہے کہ وہی انہیں مارنے کی کوشش کررہے تھے۔''

''مگر وہ انہیں کیوں ماریں گے؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

''ہاں انکل! یہی تو ہمارا بھی کہنا ہے۔ باپ کو کوئی بیٹی، بیٹا بھلا مارسکتا ہے؟''

''میرے خیال میں تو ایسا ممکن نہیں۔''

''یہ پولیس بھی بڑی عجیب شے ہوتی ہے۔ اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے جس کے گلے میں ان کا پھندا فٹ ہوتا ہے اسی کو گرفتار کرلیتی ہے۔''

''تم لوگوں نے گرفتار بہن بھائی کے بارے میں کیا سوچا ہے، کیا کروگے؟''

''جب تک پولیس پاپا کا بیان قلمبند نہیں کرلیتی، اس وقت تک حتمی طور پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ پاپا کو چند لمحوں کے لیے ہوش آتا ہے اور وہ پھر بے ہوش ہوجاتے ہیں۔ ہوش میں رہنے کا وقفہ ذرا زیادہ ہو تو پولیس ان کا بیان لے۔''

تھوڑی دیر اسپتال میں رہ کر میں واپس چلا آیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہوگیا..... سابقہ حالات کے تناظر میں اس بات کا قوی امکان تھا کہ بنگلا اپنے نام منتقل کرانے والوں ہی نے ٹنکی میں ڈبو کر انہیں مارنے کی کوشش کی ہوگی۔ شاید ہارون بھائی کے مسلسل انکار پر انہوں نے یہ انتہائی حربہ استعمال کیا ہوگا۔ مجھے اپنے آپ پر بھی رہ رہ کر غصہ آرہا تھا کہ میں نے انہیں ان کا مطالبہ نہ ماننے کا کیوں مشورہ دیا۔ پھر یہ سوچ کر اپنے آپ کو بہلاتا کہ اگر وہ ان کے نام بنگلا لکھ دیتے تب بھی وہ ان کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کرتے۔

اگلے روز میں اسپتال گیا تو مجھے معلوم ہوا گزشتہ رات ہارون بھائی کا بیان قلمبند کیا جاچکا ہے۔ گزشتہ شب ان کی طبیعت قدرے سنبھلی تھی اور ہوش میں رہنے کا وقفہ تھوڑا بڑھا تھا۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پولیس نے ان کا بیان لے لیا۔

''انہوں نے کیا بیان دیا؟'' میں نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔

''وہی، جس کی توقع تھی۔ بھلا کوئی اولاد اپنے باپ کو کیوں مارے گی؟''

''یعنی وہ ٹنکی میں خود جا گرے تھے؟''

''جی نہیں..... خود نہیں گرے تھے۔ انہیں ٹنکی میں گرانے والا کوئی اور تھا۔ انہیں پانی میں ڈبو کر مارنے کی کوشش کسی اور نے کی تھی۔''

''کس نے کوشش کی تھی؟ کون تھا وہ مردود! اس کا نام انہوں نے بتایا؟''

''جی نہیں..... وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکے۔ وہ ان کے لیے اجنبی تھے۔ البتہ انہوں نے یہ کہا کہ انہیں دوبارہ دیکھا تو پہچان لیں گے۔''

آج ہارون بھائی کے بیٹوں کے ساتھ ان کی شادی شدہ بیٹی بھی موجود تھی۔ اس بات پر وہ سب بہت خوش دکھائی دے رہے تھے کہ ان کی بہن اور بھائی، بیان کے بعد بے قصور ثابت ہوگئے۔ اب پولیس انہیں چھوڑ دے گی اور وہ باعزت رہا ہوجائیں گے۔

جبکہ میرے حلق سے یہ بات نیچے نہیں اتر رہی تھی۔ آخر کوئی دوسرا انہیں مارنے کی کیوں کوشش کرے گا؟ ان کا تو کوئی دشمن بھی نہیں تھا۔ اگر کسی بھی قسم کی..... کسی سے ان کی کوئی دشمنی ہوتی تو وہ مجھے ضرور بتاتے۔ اس کا تذکرہ کرتے مگر انہوں نے تو کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی۔ پر ایسا دشمن ان کا کہاں سے آگیا جو انہیں پانی کی ٹنکی میں ڈبو کر مارنے کی کوشش کرے گا؟

میں دیر تک اسپتال میں رہا لیکن اس دوران ہارون بھائی کو لمحہ بھر کے لیے بھی ہوش نہیں آیا۔ واپس جانے سے پہلے میں نے ان کے لڑکوں سے کہا۔ ''آج رات تم لوگ آرام کرنا۔ آج میں یہاں نائٹ ڈیوٹی دوں گا۔''

انہوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی ''انکل! آپ دن کو پاپا کی خیریت معلوم کرنے آجاتے ہیں، یہی بہت ہے۔ اپنی رات کیوں کھوٹی کرنا چاہتے ہیں؟''

میں نے ان کی ایک نہیں سنی۔ ''ارے بھئی! میرا بھی تو کوئی حق ہے۔ کیا میں.... ایک رات بھی اپنے بھائی کے لیے جاگ نہیں سکتا؟''

میری ضد پر وہ لوگ مان گئے۔ میں شام کو اسپتال گیا تو معلوم ہوا، میرے جانے کے کچھ دیر بعد ہی انہیں ہوش آیا تھا۔ ہماری زبانی انہیں معلوم ہوا کہ آپ آج رات یہاں گزاریں گے تو کہنے لگے ''کیوں اس غریب کو شب بیداری پر لگادیا۔''

ڈاکٹر کچھ کہتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا ''آپ بے فکر ہوکر ان کے متعلق بتائیں..... ہم لوگوں نے

صورتِ حال سے مقابلہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار رکھا ہے۔''

''ہم لوگ تو ان کی جان بچانے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں لیکن.....''

بات میری سمجھ میں آ گئی کہ حالت تشویش ناک ہے۔ بھرپور کوششوں کے باوجود ان کے بچنے کی امید کم ہے۔ ڈاکٹر نے بتایا'' قاتل یا قاتلوں نے ان کی گردن میں رسی باندھ کر انہیں پانی میں غوطہ دے دے کر مارنے کی کوشش کی تھی۔ جس سے ان کی گردن کی ہڈی پر ضرب آئی ہے۔ سر اور جسم کے دیگر حصے بھی بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ ان میں جان تو پہلے ہی نہیں تھی۔ بہت لاغر اور کمزور تھے۔ قوتِ مدافعت نہ ہونے کی وجہ سے ان کا کیس بہت پیچیدہ ہو گیا ہے۔''

نصف شب کے بعد انہیں ہوش آیا تھا۔ آنکھیں کھولیں تو مجھے اپنے پاس دیکھ کر مسکرا دیے'' طبیعت کیسی ہے؟'' میں نے ان کے قریب ہوتے ہوئے پوچھا۔

انہوں نے فوراً ہی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر تک پلکیں جھپکاتے رہے پھر بولے'' ٹھیک ہوں۔''

''کہاں ٹھیک ہیں؟ کیا اس حالت میں بھی کوئی ٹھیک ہو سکتا ہے؟''

ان کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ کچھ بولے نہیں۔ پھر آہستہ آہستہ آنکھیں بند کرنے والے تھے کہ میں نے ٹوکا۔'' ہارون بھائی! آپ بڑے بھولے ہیں۔ اس بھولپن کی وجہ سے مار کھا گئے۔''

انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور میری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں'' کیا کہہ رہے ہو، میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''اگر وہ کمینے جان کو ہی آ گئے تھے تو کوٹھی لکھ دیتے ان کے نام۔ آپ کی جان سے بڑھ کر تو گھر نہیں تھا۔''

''تم ہی نے تو.....''

''ہاں، میں نے کہا تھا۔ لیکن میرا کہا پتھر کی لکیر تو نہیں تھا۔ بدلتے ہوئے حالات میں فیصلہ بدلنا پڑتا ہے۔''

ایک بار پھر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحوں کے بعد میں بولا'' ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ ان دونوں کے بارے میں آپ نے اپنے دونوں بڑے بیٹوں اور بیٹی کو بتایا کیوں نہیں؟ جب وہ ان کی حق تلفی کرنے پر مُصر تھے تو اس معاملے کو ان تک بھی پہنچانا چاہیے تھا۔ آخر آپ نے انہیں بے خبر کیوں رکھا؟''

''ارے بھائی!'' کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ غالباً وہ مزید کچھ کہنے کے لیے اپنی قوت مجتمع کر رہے تھے۔ ذرا توقف کے بعد بولے'' وہ بھی کون سے میرے ہمدرد تھے۔ بیویوں کے کہنے پر مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ ماں باپ اگر بچوں کو کسی بات پر روکتے ٹوکتے ہیں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ وہ ان سے ناتا توڑ کر الگ چلے جائیں۔''

میں سوچنے لگا، ماں باپ کا دل بھی کیسا عجیب ہوتا ہے۔ بچوں کی نامناسب باتوں پر ناراض بھی ہوتے ہیں مگر بچوں کی محبت ان کے دلوں میں کم نہیں ہوتی۔ ہارون بھائی ان بچوں سے خوش بھی نہیں تھے جو انہیں چھوڑ کر چلے گئے تھے لیکن دوسری جانب جائداد کے مسئلے پر ان کی حق تلفی کے بھی سرِ تسلیم ہونا گوارا نہیں تھا۔ انہی نامعقول بچوں کی خاطر اپنی جان کی بازی بھی لگا دی۔

''جن لوگوں کی وکالت میں آپ اس حال کو پہنچ گئے، ان کو بہرحال اصل صورتِ حال سے آگاہ کرنا چاہیے تھا۔''

''وہ..... میرا خیال ہے کہ حقیقتاً مجھے مارنا نہیں چاہتے تھے، ایک دو ٹکیاں کھانے کے بعد میں بھی یہ سوچ رہا تھا کہ ہاں کہہ دوں، اپنی رضامندی ظاہر کر دوں لیکن.....''

''لیکن کیا؟''

''لیکن شاید..... اسی وقت ادھر کوئی آ گیا تھا..... یا کسی کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھ لیا تھا۔ گھبرا کر انہوں نے ہاتھ کی رسی چھوڑ دی اور ٹنکی کا ڈھکن بند کر کے بھاگ گئے۔''

''اور پھر آپ کو اس وقت ٹنکی سے نکالا جب آپ موت کے دہانے تک پہنچ گئے تھے۔ یہ مرحلہ کب اور کیسے آیا.....؟ کس نے آپ کو ٹنکی سے باہر نکالا؟''

''یہ مجھے معلوم نہیں۔''

میں چند منٹ خاموش رہ کر سوچتا رہا پھر یہ کہے بغیر نہ رہا۔

''مگر یہ تو آپ بتا ہی ..... سکتے ہیں کہ آپ نے غلط بیانی سے کیوں کام لیا؟ پولیس کو جھوٹا بیان کیوں دیا؟''

''تم نے ابھی کہا تھا نا..... بدلتے ہوئے حالات میں فیصلہ بدلنا پڑتا ہے۔''

''ہاں کہا تھا۔''

''بس میں نے بھی پولیس کو بیان دیتے وقت اپنا فیصلہ بدل دیا۔ یہ سوچ کر کہ وہ بچے جن کو میں نے کبھی پھولوں کی چھڑی سے بھی نہیں مارا، انہیں پھانسی کی اذیت یا عمر قید کے عذاب میں کیسے مبتلا کر دوں؟''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے اور ایسے خاموش ہوئے کہ پھر کبھی کچھ بولنے کے قابل نہیں رہے۔

میری زندگی کرداروں کی تلاش میں گزری ہے اور ایسا ہی کردار منان صاحب تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنی پوری زندگی میں ان جیسا عجیب کردار آج تک نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ کرتے پاجامے میں ہوتے۔ جس کے اوپر ایک بوسیدہ سی شیروانی ہوتی اور سر پر ایک میلی سی ٹوپی۔ ویسے وہ عینک بھی استعمال کرتے تھے اور میرے اندازے کے مطابق اس عینک کا فریم کم از کم دس سال سے زیادہ پرانا ہوگا۔

وہ عام طور پر پیدل آتے جاتے ہی دکھائی دیتے۔ ان کا قیام اگرچہ میرے محلے میں نہیں تھا لیکن ہر تیسرے چوتھے دن وہ محلے میں چکر لگایا کرتے۔ ان کی ٹھیلے والوں سے بڑی بے تکلفی تھی۔

پھل والے اور سبزی والے یا ایسی قسم کے دیگر ٹھیلے لگانے والوں سے ان کی بہت اچھی دوستی تھی اکثر وہ ان سے ہنسی مذاق کرتے دکھائی دیتے۔

ان کو دیکھ کر پہلی نظر میں یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ مفلس اور پریشان حال انسان ہیں لیکن ایک دن میرے دوست نے ان کے بارے میں غلط فہمی دور کر دی..... ہم دونوں اس وقت ایک چھوٹے سے ہوٹل میں چائے پی رہے تھے۔ جب مجھے خان صاحب دکھائی دیے۔ وہ حسبِ معمول ایک ٹھیلے والے سے الجھے ہوئے تھے۔

محترم معراج رسول صاحب

السلام علیکم!

اس ماہ پھر میں نے ایک روداد قلم بند کر لی ہے۔ گو کہ منان صاحب کا انتقال ہو چکا ہے لیکن وہ میرے دل میں آج بھی زندہ ہیں۔ ان کی عظمت کو میں سلام کرتا ہوں۔ اس انوکھے شخص کے بارے میں جان کر آپ بھی حیران رہ جائیں گے۔ اب ایسے لوگ کہاں رہے..... مگر نہیں، اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں ورنہ یہ دنیا ختم ہو چکی ہوتی۔

منظر امام

(کراچی)

بڑا آدمی

"یار اسلم، یہ صاحب کون ہیں؟" میں نے اسلم سے ان کے بارے میں دریافت کیا۔

"یہ منان صاحب ہیں۔" اس نے بتایا۔

"بے چارے بہت خستہ حال دکھائی دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"خستہ حال....." اسلم ہنس پڑا۔ "تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس شخص کی ماہانہ آمدنی کم از کم بیس ہزار روپے ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" میں حیران رہ گیا۔ "بیس ہزار روپے مہینہ.....؟" کیونکہ اس زمانے کے بیس ہزار آج کے پانچ لاکھ کے برابر ہوتے تھے۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" اسلم نے کہا۔ "یہ ایک عجیب وغریب انسان ہیں اور ایسا کردار تم نے آج تک نہیں دیکھا ہوگا۔"

"اور یہ کرتے کیا ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں۔" اسلم نے بتایا۔ "اور نہ ہی اس کی کوئی جائداد ہے اور نہ ہی کوئی گھر ہے کچھ بھی نہیں ہے اس کے پاس۔"

"خدا کے بندے تو پھر یہ بیس ہزار کہاں سے آتے ہیں؟"

"ان ہی ٹھیلے والوں سے، اس محلے میں تم جتنے ٹھیلے دیکھ رہے ہو یہ سب اسی کے ہیں۔ نہ صرف اس محلے میں بلکہ دور دراز کے علاقوں میں بھی جتنے ٹھیلے ہیں وہ سب اسی کے ہیں اور میرے اندازے کے مطابق کم از کم ایک ہزار ٹھیلے ہیں۔ ہر ٹھیلے سے یہ صرف بیس روپے مہینہ لیتا ہے اس طرح اس کی آمدنی بیس ہزار ہو جاتی ہے۔"

پھر اسلم نے منان صاحب کے بارے میں جو تفصیل بتائی وہ بہت حیرت انگیز تھی۔ ابتدا میں منان صاحب کے پاس دس ہزار روپے تھے۔

انہیں کوئی بھی بے روزگار بندہ دکھائی دیتا تو وہ اس کے پاس پہنچ جاتے۔ "میاں، کہاں نوکری کرسی کے چکر میں پڑے ہو۔ اپنا کاروبار شروع کرو۔"

"کیسے شروع کروں منان صاحب۔ میرے پاس پیسے کہاں ہیں؟"

"میاں میں تمہیں ٹھیلہ کر کے دے دیتا ہوں۔ پھر تم اپنی مرضی کی چیزیں بیچو اور ٹھیلے پر جو خرچ آتا ہے وہ آہستہ آہستہ کر کے مجھے واپس کرتے جانا۔ اس کے علاوہ صرف بیس روپے مہینہ مجھے دیتے رہنا، یہ میرا منافع ہوگا۔" وہ بے روزگار بندہ فوراً ہی اس بات پر راضی ہو جاتا صرف بیس روپے ہی تو دینے پڑتے تھے انہیں۔ ٹھیلے کے سامان پر دو ہزار سے زیادہ کا خرچ نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح ابتدا میں انہوں نے پانچ بندوں کو یہ کاروبار کرایا پھر ان ہی پیسوں کی رولنگ کرتے رہے۔ ہر مہینے، دو تین ٹھیلے والے ان کے تعاون سے اپنا کاروبار شروع کر دیتے۔

اس طرح انہوں نے دو تین برسوں میں ہی ایک ہزار ٹھیلے لگوا دیے اور اب ہر ایک سے بیس روپے ماہانہ لیا کرتے ہیں۔

"زبردست۔" میں نے تبصرہ کیا۔ "منان صاحب نے تو کمال کر دیا۔"

"اب آگے بھی تو سنو کہ ان کا اپنا خرچ کچھ بھی نہیں ہے۔" اسلم نے بتایا۔ "اب فرض کرو انہوں نے مجھے ٹھیلہ کرا کے دیا ہے اور ایک رات وہ میرے گھر پہنچ گئے بھائی آج رات میں تمہارا مہمان ہوں میرا خیال ہے کہ رات کا کھانا اور سونے کی جگہ تو مل ہی جائے گی۔ اب ظاہر ہے کہ میں کس طرح انکار کر سکتا ہوں کیونکہ منان صاحب نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے لہٰذا وہ رات کو میرے گھر رک گئے اور صبح ناشتا کر کے روانہ ہو گئے پھر دوسری رات دوسرے ٹھیلے والے کے پاس پہنچ گئے۔ اب خود سوچو اس شہر میں ایک ہزار بندے ان کے احسان مند ہیں تو ایک ہزار راتیں ہو گئیں۔"

"کمال ہے، تو پھر یہ بندہ اتنے پیسوں کا کرتا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "کیونکہ اس کو تو ہر طرف سے بچت ہی بچت ہے۔"

"ایک نمبر کا کنجوس انسان ہے۔" اسلم نے برا سا منہ بنایا۔ "ایسا لگتا ہے جیسے سارے پیسے قبر میں لے کر جائے گا۔"

"حد ہو گئی۔" مجھے بھی اس کی فطرت عجیب سی لگی۔ "یہ بندہ تو اپنی ذات کے لیے بھی کنجوس ہے۔"

"مجھے تو اس کے دماغ کا اسکرو ڈھیلا لگتا ہے۔ ویسے بات کرنے میں بہت اچھا ہے بہت سلیقے کی سلجھی ہوئی باتیں کرتا ہے۔"

"یار تم اس سے میری ملاقات کروا دو۔" میں نے کہا۔ "مجھے ایسے کرداروں سے بہت دلچسپی ہے میں تو ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتا ہوں۔"

اتفاق سے منان صاحب سامنے ہی کھڑے تھے۔ اسلم نے مجھے وہیں بیٹھے رہنے کو کہا اور خود منان صاحب کی طرف چلا گیا۔ چند لمحوں بعد جب وہ آیا تو منان صاحب اس

کے ساتھ تھے۔

"منان صاحب، یہ ہیں منظر صاحب۔" اسلم نے میرا تعارف کروایا۔ "بہت زبردست آدمی ہیں۔ کہانیاں لکھتے ہیں اور یہ ہیں منان صاحب۔"

منان صاحب ہاتھ ملا کر وہیں بیٹھ گئے پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں اور کچھ دیر بعد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان کی باتیں بہت معقول تھیں اور وہ پڑھے لکھے انسان معلوم ہوتے تھے۔ بظاہر ان میں ایسی کوئی عجیب بات نہیں تھی لیکن اسلم نے ان کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس کی تصدیق بہت ضروری تھی۔

"منان صاحب، آپ کا قیام کہاں ہے؟" میں نے باتوں باتوں میں دریافت کیا۔

"میاں، میرے گھر کا کیا پوچھتے ہو۔ اس شہر میں ایک ہزار گھر ہیں میرے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اسلم کی بات کی تصدیق ہو گئی۔ منان صاحب ایک ہزار ٹھیلے والوں کے گھروں کو اپنا ہی گھر سمجھا کرتے تھے۔ بہر حال اس دن میں نے ان سے اور کچھ نہیں پوچھا لیکن میں یہ ضرور معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ان کے پاس اتنی دولت کا مصرف کیا ہے۔ اگر یہ ان کی کنجوسی ہے تو یہ کیسی کنجوسی ہے۔ جس نے دنیا کی تمام نعمتوں سے انہیں محروم کر رکھا ہے۔

کئی دنوں کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر راستے میں مل گئے۔ میں اس وقت فرصت سے تھا اسی لیے میں انہیں اپنے ساتھ سامنے والے ہوٹل میں لے آیا۔

"منان صاحب نہ جانے کیوں آپ سے کچھ محبت سی ہو گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"واہ میاں، ایک ہی ملاقات میں محبت۔" وہ ہنس پڑے۔

"یہ تو ہو ہی جاتا ہے منان صاحب، جس سے ذہن مل جائے اس کے لیے ایک ملاقات بھی بہت ہے۔"

"یہ بات تو ہے۔" منان صاحب نے تائید میں گردن ہلا دی۔ "تم بھی مجھے اچھے لگے ہو ویسے تمہارا مشغلہ کیا ہے۔ اس دن تو میں پوچھنا بھول گیا تھا؟"

"بتایا تھا نا کہ میں کہانیاں وغیرہ لکھتا ہوں اور اس سے گزر بسر ہو جاتی ہے۔"

"یعنی ماشاءاللہ معاشی طرف سے کوئی پریشانی نہیں ہے۔"

"جی ہاں۔"

"چلو یہ تو اچھی بات ہے۔"

"منان صاحب آپ سے ایک بات پوچھنی ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر مناسب سمجھیں تو اس کا جواب دے دیں۔"

"نہیں میاں ضرور پوچھو، دل میں کوئی کھٹکا نہیں ہونا چاہیے۔"

پھر میں نے وہ پوچھ ہی لیا جو میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا۔

"منان صاحب، معاف کیجیے گا کہ میں آپ سے بہت ذاتی قسم کا سوال کر رہا ہوں۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جب آپ کے حالات اتنے اچھے ہیں۔ یعنی ماشاءاللہ آپ کی اتنی اچھی انکم ہے تو پھر.....؟"

"میں سمجھ گیا۔" منان صاحب ہنس دیے۔ "میاں میرے بارے میں یہ مشہور ہے کہ میں کنجوس آدمی ہوں اور میرا حلیہ بھی کچھ ایسا ہی ہے نہ میں نے اپنا کوئی ٹھکانا بنایا ہے بس ادھر ادھر بھٹکتا رہتا ہوں۔ حد تو یہ ہے کہ اپنے کھانے پر بھی خرچ نہیں کرتا۔ تو ظاہر ہے کسی بندے کے حالات جب ایسے ہوں تو اسے اور کیا سمجھا جائے گا۔"

"یہی معلوم کرنا تھا منان صاحب کہ آخر کیوں؟"

"میاں، یہ ایک لمبی کہانی ہے۔" منان صاحب نے ایک گہری سانس لی۔ "اور تم کو سن کر مزہ بھی نہیں آئے گا۔ رہنے ہی دو ویسے میں خود یہ سوچ رہا ہوں کہ اب کوئی چھوٹا موٹا مکان لے ہی لیا جائے۔ کب تک بھٹکتا رہوں گا۔"

"جی ہاں، آپ کے لیے یہ بہت مناسب ہوگا۔"

"میاں تو پھر تم ہی نیکی کرو اور میرے لیے کوئی مکان تلاش کر دو لیکن بہت سستا ہو کیونکہ میں زیادہ کرایہ نہیں دے سکوں گا۔"

میں دل ہی دل میں ان کی کنجوسی پر ہنس پڑا۔ واقعی ایسے لوگ بھی ہوا کرتے ہیں جو چمڑی جائے پر دمڑی نہ

شمارہ فروری 2011ء کی منتخب سچ بیانیاں
ہماری پیش کش آپ کا انتخاب
☆ اول: خوش نصیب ۔۔۔ زرینہ (فیصل آباد)
☆ دوم: میں بے قصور ہوں ۔۔۔ عبید (کراچی)
☆ سوم: پناہ گاہ ۔۔۔ حنا (راولپنڈی)
پہلے، دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بیتی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

جائے والے فارمولے پر ساری زندگی گزار دیتے ہیں۔ ''ٹھیک ہے صاحب میں آپ کے لیے کوئی مکان تلاش کرتا ہوں۔''

اس زمانے میں اسٹیٹ ایجنٹ کا زیادہ رواج نہیں تھا اور کرائے کے مکان کے لیے ادھر ادھر محلے والوں سے معلوم کر کے لیا جاتا۔ میں نے بھی اسی طرح منان صاحب کے لیے ایک مکان تلاش کرلیا۔

اس مکان کا کرایہ پانچ سو روپے تھا جو دو کمروں ایک صحن ..... پر مشتمل تھا لیکن منان صاحب کو وہ کرایہ زیادہ محسوس ہوا تو انہوں نے وہ لینے سے انکار کر دیا۔ بالآخر بہت بھاگ دوڑ کے بعد انہیں ایک ایسا مکان مل ہی گیا جس کا کرایہ صرف تین سو تھا اور منان صاحب اس مکان میں منتقل ہو گئے۔

ان کے پاس سامان نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

میرے کہنے سننے پر انہوں نے نہ جانے کس دل سے کچھ برتن اور ایک پرانی چارپائی خریدلی۔ بس اس کے علاوہ ان کے پاس اور کچھ بھی نہیں تھا۔ مکان میں آجانے کے بعد بھی ان کے مشاغل وہی رہے تھے۔ وہی صبح اٹھ کر محلے اپنے ٹھیلے والوں کے پاس جانا۔ ایک ہزار ٹھیلے تھے تو پورا دن بھاگ دوڑ میں نکل جاتا۔

پتا چلا کہ وہ روزانہ اپنے بیس روپے وصول کرنے نکل جایا کرتے تھے اور اسی میں ان کا پورا مہینہ گزر جاتا۔ اب انہوں نے ٹھیلے والوں کے یہاں جا کر رہنا اور کھانا پینا تو چھوڑ دیا تھا لیکن دن بھر مفت کی چائے ضرور پیتے رہتے تھے۔

میرا خیال ہے کہ اس اعلیٰ درجے کے کنجوس دنیا میں چند ہی ہوں گے۔ وہ زیادہ مذہبی بھی نہیں تھے۔ میں نے انہیں صرف جمعہ کی نماز میں جاتے ہوئے دیکھا تھا اور ویسے وہ مسجد میں دکھائی نہیں دیتے تھے۔

ایک دن ان کی شخصیت کا ایک نیا پہلو اچانک میرے سامنے آیا۔

میں نے منان صاحب کو شہر کی ایک مشہور دکان میں خریداری کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ دکان بہت قیمتی ملبوسات کی تھی۔ خاص طور پر عورتوں کے کپڑوں کے لیے بہت شہرت رکھتی تھی۔

میں منان صاحب کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

منان صاحب قیمتی ساڑیاں خرید رہے تھے۔ خدا جانے کیا ماجرا تھا۔ میں ایک آڑ میں کھڑا ہو کر ان کی طرف دیکھتا رہا۔ انہوں نے اس دکان سے تقریباً آٹھ دس قیمتی ساڑیاں خریدیں۔ ان کی قیمت ادا کی اور تھیلے میں بھر کر دکان سے باہر آگئے۔

میرے لیے یہ بالکل نیا انکشاف تھا کہ منان صاحب اور زنانہ ملبوسات کی خریداری جب کہ ان کی نہ بیوی تھی اور نہ ہی بیٹیاں اور سب سے حیرت کی بات یہ تھی کہ انہوں نے بہت قیمتی ساڑیاں خریدی تھیں یعنی اتنی زیادہ رقم خرچ کر دی تھی۔ یہ اور بھی حیران کرنے والی بات تھی کہ جو شخص اپنے کھانے کے لیے صابن نہ خریدتا ہو وہ ساڑیوں کی شاپنگ کر رہا تھا۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا تو میں ان کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

''آداب عرض ہے منان صاحب۔''

''ارے میاں تم.....!'' وہ بری طرح مٹ پٹا گئے۔

''تم یہاں کیسے آگئے؟''

''بس میں یہاں سے گزر رہا تھا تو آپ پر نظر پڑ گئی۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے خیریت تو ہے نا میرا مطلب ہے یہ شاپنگ.....؟''

''ارے میاں بس یوں ہی۔'' وہ کچھ شرمندہ ہونے لگے۔

''سچ سچ بتائیں منان صاحب کیا ماجرا ہے؟'' میں نے کہا۔

''اب تم نے دیکھ ہی لیا ہے تو چلو بتا دیتا ہوں۔'' وہ دھیرے سے بولے۔ ''بات یہ ہے کہ میں یہ سب کچھ اپنی بیٹی کے جہیز کے لیے کر رہا ہوں۔''

''بیٹی کا جہیز.....!'' میں حیران رہ گیا تھا۔ ''منان صاحب آپ کی بیٹی؟''

''ہاں بھئی۔'' وہ مسکرا دیے۔ ''بارہ تاریخ کو شادی ہے اس کے لیے سارے انتظامات کرنے ہیں۔''

''لیکن آپ نے تو پہلے کبھی نہیں بتایا۔''

''پہلے کبھی تم نے پوچھا ہی نہیں اب پوچھ ہی لیا ہے تو بتا رہا ہوں۔'' انہوں نے کہا۔ ''اب آؤ میرے ساتھ، اس کے لیے کچھ الیکٹرونک کی چیزیں بھی لینی ہیں۔''

اس زمانے میں الیکٹرونک کی چیزیں کیا ہوتی تھیں استری، پنکھے، ریڈیو وغیرہ منان صاحب نے صدر سے یہ سب چیزیں خریدیں اعلیٰ کوالٹی کی۔ اس وقت ان کی کنجوسی نہ جانے کہاں چلی گئی تھی اور دل کھول کر پیسے خرچ کر رہے تھے۔

سارا سامان انہوں نے ایک ٹیکسی میں ڈالا اور مجھ سے بولے۔ ''میاں تم کو یہ راز معلوم ہی ہو گیا ہے تو ایک شریف

آدمی کی لاج رکھ لینا اور کسی کو مت بتانا تمہارا بہت بڑا مجھ پر احسان ہوگا۔''

''ارے نہیں منان صاحب، آپ بے فکر رہیں میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔'' وہ میرا شکریہ ادا کر کے ٹیکسی میں بیٹھ کر نہ جانے کس طرف روانہ ہو گئے اور میں سوچتا ہی رہ گیا۔

میں نے منان صاحب کے اس عجیب راز کے بارے میں کسی کو بھی نہیں بتایا ان سے وعدہ جو کر لیا تھا لیکن میری حیرانگی ان کے بارے میں ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ نہ جانے کیسے آدمی تھے جنہوں نے اتنی بڑی خبر اتنی کامیابی سے چھپا رکھی تھی۔

منان صاحب کچھ دنوں کے لیے محلے سے غائب ہو گئے تھے۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ ان کی بیٹی کی شادی ہو رہی تھی اور انہوں نے بارہ تاریخ بتائی تھی۔ بہرحال ان کی واپسی تیرہ تاریخ کو ہی ہوئی..... مجھ سے ملے تو بہت مطمئن اور پرسکون دکھائی دے رہے تھے۔

''خدا کا شکر ہے میاں، سارا کام خیر خوبی سے انجام پا گیا۔'' انہوں نے بتایا۔

''چلیں منان صاحب مبارک ہو۔''

''ہاں میاں۔'' انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ ''یہ بڑی بات ہے کہ خدا ہم جیسوں کی بیٹیوں کو بھی خیر خوبی کے ساتھ ان کی اصل منزل تک پہنچا دیتا ہے۔'' بات آئی گئی ہو گئی۔

منان صاحب کی سرگرمیاں پھر اسی انداز سے شروع ہو گئی تھیں۔ وہی ٹھیلے والوں کے پاس جانا، ان سے باتیں کرتے رہنا اور ان سے اپنا منافع حاصل کرنا۔

کچھ دنوں کے بعد منان صاحب پھر اپنے اسی حلیے میں ایک اور دکان سے شاپنگ کرتے ہوئے دکھائی دے گئے۔

اس بار بھی وہ بہت مہنگی مہنگی چیزوں کی خریداری کر رہے تھے۔ خدا جانے ان کے ساتھ کیا مسئلہ ہو گیا تھا۔ میں نے پھر ان کے سامنے جا کر ان سے دریافت کیا۔

''منان صاحب، کیا بات ہے خیریت تو ہے نا۔ آج آپ پھر سے ماشاء اللہ شاپنگ کر رہے ہیں؟''

''کمال ہے میاں۔'' وہ ہنس پڑے۔ ''اس بار بھی تم عین وقت پر پہنچ گئے ہو۔''

''اب اسے اتفاق کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اس بار کیا سلسلہ ہے؟''

''وہی بیٹی کی شادی اس مہینے کی ستائیس کو ہونی ہے۔''

''شادی تو ہو چکی تھی نا؟''

''یہ دوسری بیٹی ہے میاں۔''

''ایک بات تو بتائیں کتنی بیٹیاں ہیں آپ کی؟''

''یقین کرو گے میری بات کا.....؟''

''ہاں فرمائیں۔''

''دو سو بیٹیاں ہیں میری۔'' انہوں نے بتایا۔

''کیا.....!'' میرے ہوش اڑ گئے..... ''دو سو بیٹیاں.....؟''

''ہاں میاں، دو سو بیٹیاں ہیں۔ یہ جو بے چارے ٹھیلے والے ہیں یہ ان کی بیٹیاں ہیں اور ظاہر ہے کہ ان بے چاروں کی اتنی استطاعت کہاں ہوتی ہے اسی لیے میں ان کی مدد کر دیتا ہوں۔ خود سوچو جو بے چارے بیس روپے مہینہ مشکل سے دے پاتے ہوں وہ بیٹیوں کے لیے جہیز کہاں سے لائیں اور میاں مجھ پر جو کنجوسی کی تہمت ہے تو اس کی وجہ ہی یہی ہے۔ میں اپنے آپ پر خرچ کر کے کیا کروں گا۔ ان غریبوں کی بیٹیاں اپنے اپنے گھروں کی ہو جائیں تو اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔'' میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ خدا کی پناہ یہ منان کتنا بڑا آدمی ثابت ہوا تھا اور کتنے بڑے ظرف کا مالک تھا۔ ذرا سی دیر میں اس کا قد اتنا بلند ہو گیا تھا کہ اس تک نگاہ ہی نہیں جا رہی تھی۔

میں نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ان کی ہتھیلی کی پشت پر بوسہ دے دیا۔

''منان صاحب میں آپ کی عظمت کو سلام کرتا ہوں۔''

''ارے میاں کیوں گناہ گار کرتے ہو۔'' انہوں نے کہا۔ ''میں نے کون سا بڑا کام کیا ہے جس نے مجھے دولت دی ہے میں اسی کی دولت واپس دے رہا ہوں تو اس میں کون سی بڑی بات ہو گئی لیکن میاں میں ایک بار پھر وہی کہوں گا کہ کسی کو اس بارے میں کچھ مت بتانا ورنہ خوامخواہ مجھے شرمندگی ہوتی رہے گی۔''

میں نے ان کے بارے میں کسی کو نہیں بتایا حالانکہ دل چاہتا تھا کہ پورے شہر کو اس عظیم انسان کے بارے میں بتا دوں ایسے آدمی اب کہاں ہوتے ہیں۔

نہ جانے منان صاحب اب کہاں ہوں گے اور ہیں بھی یا نہیں یا اپنے پیدا کرنے والے کے پاس چلے گئے۔ میرا خیال ہے کہ ان جیسے انسان سے زیادہ حساب کتاب بھی نہیں ہوا ہوگا جو نہ جانے کتنی لڑکیوں کو ان کی منزلوں تک پہنچاتے ہیں خدا نے انہیں بھی ان کی منزل یعنی جنت میں پہنچا ہی دیا ہوگا۔

وفا پرست

قابل احترام جناب معراج رسول صاحب
السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!
میں اسکرین پلے لکھ لیتا ہوں، ڈرامے لکھ لیتا ہوں لیکن Short Story کبھی نہیں لکھی۔ پہلی بار لکھ کر آپ کی خدمت میں پیش کررہا ہوں۔ اگر آپ کو پسند آجائے تو سرگزشت میں شائع کردیں۔
نقیس
(لاہور)

وہ مجھے اتفاقاً مل گئی تھی۔ میں ایک ریکارڈنگ پر گیا ہوا تھا۔ میں عام طور پر ریکارڈنگ پر نہیں جایا کرتا۔ میرا کام ہے اسکرپٹ لکھ کر دے دینا اور میں جانتا ہوں کہ اچھا ڈائریکٹر اس کے ساتھ ضرور انصاف کرے گا۔

اس لیے میں مطمئن ہوجاتا تھا لیکن اس ریکارڈنگ پر اس لیے جانا پڑا تھا کہ ڈائریکٹر نے درخواست کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ریکارڈنگ پر پوری ٹیم کو ہونا چاہیے۔

لہٰذا میں بھی چلا گیا اور وہاں میں نے اس لڑکی کو دیکھا۔ اس کی عمر اٹھارہ انیس سے زیادہ کی نہیں ہوگی۔ بہت خوبصورت، اسمارٹ، آنکھوں میں دیے سے جلتے ہوئے۔ کرنک گھنے بال، ماڈل جیسا جسم۔ اسے شاید کوئی ممنی کردار دیا گیا تھا۔

وہ اس فیلڈ میں نئی معلوم ہوتی تھی۔ وہ کافی پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دوسروں سے کٹ کر ایک طرف کھڑی ہوئی تھی۔ ڈائریکٹر نے اسے جو لباس پہنایا۔ وہ مغربی تھا اور صاف محسوس ہورہا تھا جیسے وہ اس لباس میں شرم محسوس کررہی ہو یا یہ سب اس کے مزاج کے خلاف ہو۔ اتفاق سے مجھے اس سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل گیا۔

"کیا بات ہے۔ آپ کچھ گھبرائی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے اپنی گردن ہلادی۔

"کیا پہلی دفعہ آئی ہیں؟"

"جی ہاں، مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا۔" اس نے کہا۔ "میں مجبوراً آئی ہوں۔"

"اوہ۔" میں نے گہری سانس لی۔ "تو کیا آپ ڈراموں میں کام نہیں کرنا چاہتیں؟"

"نہیں..... بالکل نہیں۔ اگر میرا بس چلے تو میں یہاں سے بھاگ جاؤں۔" اس نے کہا۔ "سنیں، آپ تو رائٹر ہیں نا۔ آپ کو تو سب معلوم ہوگا۔ اگر میں چھوڑ کر چلی جاؤں تو کوئی بات تو نہیں ہوگی نا؟"

"پہلے یہ بتائیں کہ آپ کو کردار کیسا دیا گیا ہے؟" اس نے ایک صفحہ میری طرف بڑھادیا۔ یہ اس کا اسکرپٹ تھا جو ڈائریکٹر نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر دے دیا تھا۔ اس میں صرف دو جملے تھے یعنی بہت ہی ممنی کردار تھا بے چاری کا۔ اس نے بتایا کہ ڈائریکٹر صاحب یہ کہہ رہے تھے کہ اس نے اگر تعاون کیا تو اسے اور چانس بھی دلوایا جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں اس بے چاری کو گھیرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔

"تم اس ماحول کی ہرگز نہیں معلوم ہوتیں۔" میں نے کہا۔ "تم یہ بتاؤ تم یہاں کیسے آگئیں؟"

"یہاں مجھے وہ لایا ہے جو میری عزت کا محافظ ہے۔" وہ تلخ ہوکر بولی۔

"کیا مطلب.....؟"

"میرا شوہر لایا ہے مجھے۔" اس نے بتایا۔ "اس کی یہ خواہش ہے کہ میں اس فیلڈ میں بہت آگے جاؤں۔ بہت نام کماؤں، دولت مند ہوجاؤں تاکہ وہ بیش

کر سکے۔"

"اوہ۔" میں نے گہری سانس لی۔ "تو اس قسم کا شوہر ہے تمہارا۔"

"جی ہاں، آپ اسے دیکھتے ہی سمجھ جائیں گے کہ وہ کس مزاج کا انسان ہوسکتا ہے۔"

"چلو پہلے تو تم ڈائریکٹر سے معذرت کرو۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد اپنے شوہر سے ملواؤ۔" پھر دیکھتے ہیں کہ میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں۔"

اس نے اپنا نام تانیہ بتایا تھا۔ اس نے میرے کہنے پر ڈائریکٹر سے معذرت کرلی اور جب وہ ڈائریکٹر کے کپڑے واپس کرکے اپنے کپڑے پہن کر جارہی تھی تو اسی وقت اس کا شوہر بھی وہاں آگیا۔

وہ ایک مزدور قسم کا جاہل انسان معلوم ہورہا تھا۔ نہ جانے تانیہ کے ساتھ ایسی کیا مجبوری تھی کہ اس نے ایسے شخص سے شادی کرلی تھی۔ تانیہ نے جب اسے یہ بتایا کہ وہ کام کرنے سے انکار کرچکی ہے تو اس کا غصہ دیکھنے کے قابل تھا۔

"کیا پاگل ہوگئی ہے تو۔ میں نے اتنی مشکل سے تیرے لیے چانس بنوایا تھا اور تو منع کررہی ہے۔" اس کا لہجہ بھی انتہائی اکھڑ اور جاہلانہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس وقت تانیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ تانیہ مجھے اپنے گھر کا پتا بتا چکی تھی۔ اس لیے میں وہاں بالکل خاموش رہا کیونکہ سیٹ پر دوسرے لوگ بھی تھے۔ خوامخواہ ایک افسانہ بن جاتا۔

دوسری شام میں تانیہ کے گھر پہنچ گیا۔ نہ جانے اس وقت میرے دل میں کیسا جذبہ تھا۔ شاید کوئی کشش تھی جو مجھے کھینچ کر تانیہ کی طرف لے گئی تھی۔ ایک غریب آبادی کا معمولی سا مکان۔ جس میں زندگی کی ضروریات کا سامان بھی بہت کم تھا اور جو کچھ تھا وہ انتہائی کم قیمت تھا۔

دروازہ اس کے شوہر ہی نے کھولا تھا۔ جو مجھے اپنے دروازے پر دیکھ کر حیران رہ گیا چونکہ اس دن اس سے میرا تعارف ہوچکا تھا اس لیے اس کی حیرانی بالکل بجا تھی۔ "سر جی، آپ یہاں.....؟"

"ہاں، میں تم سے ملنے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ارے آئیں... اندر آجائیں۔" اس نے مجھے بیٹھک میں بٹھادیا۔

کچھ دیر بعد تانیہ بھی آگئی۔ ایک لمحے کے لیے

مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک آئی پھر اس کی آنکھیں بجھ سی گئیں۔

''دیکھیں نا سر جی۔'' اس کے شوہر نے بولنا شروع کیا۔ ''یہ بہت بے وقوف عورت ہے۔ اس دور میں اچھا چانس کہاں ملتا ہے پھر آپ جیسے لوگ بھی وہاں تھے۔ آپ تو اس کو آگے بڑھا دیتے۔''

''یہ بات تو ہے۔'' میں نے اپنی گردن ہلائی۔ ''لیکن اچھا ہوا کہ تمہاری بیوی نے انکار کر دیا۔ ورنہ بہت بے عزتی ہو جاتی۔''

''کس بات کی بے عزتی؟''

''دیکھو حمید، یہ جو فیلڈ ہے نا۔ اس میں صرف خوبصورتی نہیں دیکھی جاتی بلکہ ٹیلنٹ بھی دیکھتے ہیں اور بدقسمتی سے تمہاری بیوی میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے اس سے دو چار جملے بلوا کر دیکھ لیے تھے۔ بہت خراب بول رہی تھی۔ ایک بار تو یہ سفارش سے کیمرے کے سامنے آ جاتی۔ اس کے بعد کیا ہوتا۔''

''یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جی۔'' اس کی سمجھ میں میری بات آ گئی۔ ''جب بندہ ہی اس قابل نہ ہو تو مار مار کر تو اس کو ترقی نہیں دلوا سکتے نا۔''

''یار تم تو بہت سمجھ دار آدمی ہو۔'' میں نے اس کی تعریف کی۔ اس وقت میں اپنی پوری حکمت عملی سے کام لے رہا تھا۔ ''عام لوگ ان باتوں کو سمجھتے نہیں ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ بس عورت کی شکل اچھی ہو تو بن گئی ایکٹر جبکہ ایسی کوئی بات نہیں ہوتی۔'' میں نے تانیہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ جیسے میری اس بات سے اور اس حکمت عملی سے وہ مطمئن ہو گئی ہو۔

''یہ تو پاگل ہے صاحب۔'' اس کے شوہر نے کہا۔ ''میں سمجھا تھا کہ ڈراموں میں کام کرے گی تو گھر کے حالات بدل جائیں گے۔ میں مزدور آدمی ہوں۔ یہ کما کرلایا کرے گی تو ہاتھ کھل جائے گا۔''

''تم یہ بتاؤ کہ تم اس سے کتنی توقع رکھتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا مطلب.....؟''

''مطلب یہ کہ یہ مہینے میں کتنی رقم لایا کرے کہ گزارا ہو جائے؟''

''کم از کم تین چار ہزار روپے تو ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''مہینے میں اتنے مل جایا کریں تو مزہ آ جائے۔''

''ٹھیک ہے، اتنے کا بندوبست میں کر دیتا ہوں۔''

''آپ؟'' وہ حیران رہ گیا۔ ''آپ کیوں کرنے لگے؟''

''بس یوں ہی۔ تم لوگوں سے ہمدردی سی ہو گئی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اپنے اپنے سے معلوم ہونے لگے ہو اور جب تمہارے حالات بہتر ہو جائیں تو تم مجھے پیسے واپس کر دینا۔ بس۔'' اب اس کے انداز میں خوشامد سی آ گئی تھی۔ بظاہر وہ انکار کیے جا رہا تھا لیکن اندر سے وہ پوری طرح تیار تھا۔

''ارے سر جی۔ آپ نے یہ کہہ کر دل بڑھا دیا ہے کہ ہم آپ کو اپنے اپنے سے لگنے لگے ہیں۔ آپ اس گھر کو اپنا ہی سمجھیں لیکن یہ پیسوں والی بات۔ یہ تو کچھ ٹھیک نہیں ہے۔''

''سب ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم انکار نہیں کرو گے۔'' میں نے اپنی جیب سے تین ہزار روپے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ ''یہ لو فی الحال اس سے کام چلاؤ۔ کچھ دن بعد اور دے دوں گا۔''

میں نے شاید اتنی بے باکی پہلے کبھی نہیں دکھائی ہو گی۔ تانیہ بھی کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔ بہرحال میں نے تین ہزار اس کے شوہر کو دے دیے۔ نہ جانے کیوں اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ تانیہ میری زندگی میں آگے چل کر کوئی بہت اہم کردار ادا کرنے والی ہے۔ اس سے ملاقات عارضی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

میرا خیال ہے کہ کچھ ایسا ہی ہوتا ہو گا۔ جب کوئی شخص زندگی کے سفر میں کچھ دور تک ساتھ چلنے والا ہوتا ہے تو اس کے لیے حالات بھی ویسے ہی پیدا ہو جاتے ہیں۔

اس طرح تانیہ کے گھر میں میرا آنا جانا شروع ہو گیا۔ میں اس کے لیے واقعی بہت سنجیدہ تھا۔ اسے نیم وحشی شوہر کے ساتھ دیکھ کر افسوس ہوتا تھا کہ آخر تانیہ نے اس انسان سے کیوں شادی کر لی۔ تانیہ نے اس شادی کا پس منظر بتایا تھا۔ ''میں ایک ٹوٹی ہوئی لڑکی ہوں۔ والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ ماموں نے پرورش کی لیکن روایتی کہانیوں کی طرح ان کا رویہ میرے ساتھ بھی مناسب نہیں رہا۔ میں نے انٹر تک تعلیم بھی حاصل کی ہے۔ انٹر کے بعد میں دواؤں کی ایک فیکٹری میں ملازم ہو گئی تھی۔ یہ حمید بھی وہیں ہوتا تھا پیرا ڈائزر تھا۔ اکھڑ مزاج آدمی۔ ایک دن ممانی نے مجھے طعنہ دیا کہ

میں اس گھر کی روٹیاں توڑ رہی ہوں اور ان لوگوں کے لیے بوجھ بن کر رہ گئی ہوں۔ اس دن میں بہت ٹوٹی ہوئی تھی۔ فیکٹری میں ایک طرف بیٹھ کر رو رہی تھی کہ حمید وہاں آ گیا۔ اس نے تسلی دی۔ میں نے اسے اپنا ہمدرد سمجھا اور اس سے شادی کر لی۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ میں ایک جہنم سے نکل کر دوسرے جہنم کی طرف جا رہی ہوں۔ بس یہ ہے میری زندگی کی مختصر کہانی۔''

''مجھے افسوس ہوا یہ سب سن کر۔'' میں نے کہا ''تانیہ..... میں تمہارا ساتھ دینا چاہتا ہوں۔''

''جس طرح ساتھ دے رہے ہیں۔ وہی بہت ہے۔'' وہ دھیرے سے بولی۔ ''ویسے مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آپ میرے ہمدرد بن گئے ہیں۔ اس بات کی خوشی نہیں ہے کہ آپ پیسے بھی دیتے ہیں۔''

''کیوں..... اس کی خوشی کیوں نہیں ہے؟''

''اس لیے کہ یہ افسوس کا مقام ہے۔'' اس نے کہا۔ ''شوہر کے سامنے کوئی شخص اس کی بیوی کو پیسے دے رہا ہو۔ اس کے گھر جب مرضی آئے آ سکتا ہو تو سوائے افسوس کے اور کیا ہو سکتا ہے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو، واقعی ایسا نہیں ہونا چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اس بات پر شکر ادا کرو کہ تمہاری ملاقات مجھ سے ہو گئی۔ ورنہ نہ جانے کیسے لوگوں سے واسطہ پڑ جاتا۔''

''اور آپ بھی بس حاتم طائی بن کر میری مدد کے لیے آ گئے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس کے یہاں میرا آنا جانا لگا رہا۔ ایک دن اس نے ایک عجیب بات بتائی۔ ''آپ کو معلوم ہے، حمید کو آپ کا آنا ناگوار گزرتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''وہ تو خود بلاتا ہے۔''

''ہاں..... لیکن اس وقت جب وہ خود گھر پر نہ ہو۔'' اس نے بتایا۔ ''یہ عجیب نفسیات ہے۔ اسے اس بات پر اعتراض نہیں ہے کہ آپ اس کی غیر موجودگی میں یہاں آتے ہیں بلکہ مجھے تو کھلی اجازت دے رکھی ہے کہ میں اس وقت آپ کو بلا لیا کروں لیکن جب وہ آپ کو میرے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھ لیتا ہے تو اسے ناگوار گزرنے لگتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت اس کا شوہر جاگ جاتا ہو۔''

''اب اس کو پاگل پن کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ بہرحال میں آئندہ سے احتیاط کروں گا۔''

تانیہ کے یہاں میرا آنا جانا لگا رہا بلکہ یہاں تک ہونے لگا کہ میں صبح ہی اس کے پاس پہنچ جاتا۔ ہم دونوں ساتھ بیٹھ کر ناشتا کرتے۔ اس کا شوہر فیکٹری گیا ہوتا۔

اس کے شوہر اور خود تانیہ نے آس پاس کے لوگوں کو یہ بتا دیا تھا کہ میں تانیہ کا قریبی رشتے دار ہوں۔ اس لیے کسی کو میرے آنے جانے پر بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔

اس دوران میں اور تانیہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے بلکہ ہمارے درمیان کوئی دیوار نہیں رہی۔ سارے حجابات ختم ہو گئے تھے اور مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ تانیہ نے مجھے اپنے وجود کا بھرپور رس دیا تھا۔ ایک مرد کو جس انداز سے خوش کیا جا سکتا ہے۔ وہ سارے طریقے اسے معلوم تھے۔

اس نے ایک دن اور حیران کر دیا۔ ''آپ کو معلوم ہے کہ حمید کو ہمارے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''یعنی وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے کتنے قریب آ چکے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے لیکن اسے کیسے معلوم ہوا؟''

''مردوں میں بھی اس قسم کی حس ہوتی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ سب جانتے ہیں اور ایک لمحے میں ہی سمجھ لیتے ہیں۔ اس طرح اسے بھی معلوم ہو گیا ہے۔''

''تو پھر..... کیا میں آنے جانے میں احتیاط شروع کر دوں؟''

''اب کیا ضرورت ہے احتیاط کی۔'' اس نے کہا۔ ''سب ٹھیک ہے اور سب چلتا ہے۔ ہم کو اسی طرح ایک دوسرے کا ساتھ دیتے رہنا ہے۔'' سب کچھ اسی طرح سے چل رہا تھا۔ جب ایک دن میں نے اس کے گھر سے اس ڈائریکٹر کو نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔ جس کی پہلی شوٹنگ پر تانیہ سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ حمید بھی اس کے ساتھ تھا۔ یہ اچھا ہوا کہ ان دونوں نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ میں فوراً ایک طرف ہو گیا اور وہ دونوں ہنستے بولتے ہوئے نکلتے چلے گئے۔

میں سوچتا رہ گیا کہ یہ کیا ڈراما ہے۔ یہ آدمی تانیہ

کے گھر کیوں آیا تھا۔ اب اس سے کیا تعلق ہوسکتا ہے۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اب میں تانیہ سے ملنے جاؤں یا نہ جاؤں کہ مجھے تانیہ بھی گھر سے نکلتی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے بہت اچھی ڈریسنگ کر رکھی تھی اور باہر آ کر ایک رکشے کو ہاتھ دے کر اس میں بیٹھ گئی۔

خدا جانے یہ کیا سلسلہ تھا۔ یہ ایک ایسی صورتِ حال تھی جس نے مجھے الجھا کر رکھ دیا تھا۔ ڈائریکٹر کیوں آیا تھا، جمید اس کے ساتھ کیوں گیا پھر تانیہ کہاں چلی گئی۔ سوالات تھے لیکن ان کے جواب میرے پاس نہیں تھے۔

میں بھی واپس آ گیا۔ ظاہر ہے کہ اب اس گھر کی طرف جانے کا کوئی فائدہ ہی نہیں تھا۔ دوسرے دن میں معمول کے مطابق تانیہ کے گھر پہنچ گیا۔ وہ گھر ہی میں تھی۔ اس نے پہلے ہی کی طرح مجھے میرا استقبال کیا۔ پہلے ہی کی طرح دیکھ کر خوش ہوئی تھی۔

میں نے اس سے کوئی ذکر نہیں کیا لیکن اس نے خود ہی بتانا شروع کر دیا۔ ''معلوم ہے وہ ڈائریکٹر صاحب پھر یہاں آئے تھے۔''

''کون ڈائریکٹر صاحب؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔

''وہی جن کے شوٹ پر آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔'' اس نے بتایا۔

''کیوں آئے تھے؟''

''شاید میرے لیے کوئی اور چانس کی خوش خبری لے کر آئے تھے۔ میں نے تو انکار کر دیا لیکن حمید بہت گھل مل کر باتیں کرتا رہا پھر وہ دونوں کہیں چلے گئے۔''

یہاں تک اس نے ٹھیک ہی بتایا تھا۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا یہ وہی کہہ رہی تھی۔ میں خاموش رہا اس نے پھر بتایا۔ ''ان کے جانے کے بعد میں اپنی ایک دوست کے پاس چلی گئی تھی۔''

''وہ کیوں؟''

''یونہی۔'' اس نے کہا۔ ''بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اسی لیے، ویسے بھی وہ بے چاری بیمار ہی رہتی ہے۔'' میرے جذبات دور ہو گئے۔ میں خوامخواہ اس کی طرف سے غلط فہمی میں مبتلا ہونے لگا تھا جب کہ اس کی طرف سے ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ میں نے اب مایانہ کی رقم بھی بڑھا دی تھی۔ اب میں ان لوگوں کو پانچ ہزار روپے دے رہا تھا۔ پانچ ہزار اس وقت اچھے خاصے ہوتے تھے۔

ایک دن میں تانیہ کے گھر گیا تو وہاں اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ تانیہ نے اس کا تعارف نسرین کہہ کر کروایا۔ یہ وہی لڑکی تھی جس سے ملنے وہ جاتی تھی۔ نسرین اس وقت میرے ہی انتظار میں بیٹھی تھی۔ تانیہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں جتنا شوبز سے دور بھاگتی ہوں میری اس دوست کو اتنا ہی شوق ہے۔ میں نے جب آپ کے بارے میں بتایا تو یہ آپ کے انتظار میں یہاں بیٹھی ہے۔''

میں نے غور سے دیکھا تو وہ تانیہ کے برعکس ایک بے باک قسم کی لڑکی دکھائی دے رہی تھی اور میں سمجھ گیا کہ اس فیلڈ میں وہ یقیناً کامیاب ہو جائے گی کیونکہ وہاں اسی قسم کی لڑکیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ میں اسے کہیں بھیج دوں گا۔

''نہیں جناب اس سے کام نہیں چلے گا۔ آپ مجھے خود اپنے ساتھ لے جائیں گے۔''

''ہاں آپ ساتھ لے جائیں نا۔'' تانیہ نے بھی سفارش کی۔

''ٹھیک ہے کسی دن لے چلوں گا۔'' میں نے اس سے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

کئی دن کے بعد جب میں تانیہ سے ملنے گیا تو اس نے بتایا۔ ''ڈائریکٹر صاحب پھر آئے تھے میرے پاس اور اس بار میں نے ہاں کر دی ہے۔''

''کیا؟'' میں یہ سن کر اچھل پڑا۔ ''تم نے ہاں کر دی...؟''

''ہاں۔'' اس نے اپنی گردن ہلا دی۔

''لیکن کیوں، میں نے کتنی مشکلوں سے تو تمہیں اس جنجال سے نکالا تھا۔'' مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔

''اب میں کیا کروں۔ میرے شوہر کی خواہش ہی یہی ہے۔'' اس نے کہا۔

''لیکن تم اس کی خواہش کو پورا نہیں کرو گی۔''

''نہیں نفیس صاحب۔'' اس نے گہری سانس لی۔ ''اب یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ آپ مجھے جانے دیں اور دوسری بات یہ ہے کہ.....''

''ہاں بتاؤ کیا ہے دوسری بات؟''

''دوسری بات یہ ہے کہ شوہر کی بات ماننی چاہیے چاہے وہ جیسا بھی ہو۔'' اس نے اپنی بات مکمل کر

دی۔ میں غصے سے پاگل ہو گیا کیسی عورت ہے۔ اس کے لیے میں نے پیسوں کی قربانیاں دیں اور اس کا یہ حال ہے۔ میرا موڈ بہت خراب ہو گیا وہ مجھے روکتی رہ گئی لیکن میں اس کے پاس سے واپس آ گیا۔

اسی شام مجھے اس دوسری لڑکی نسرین کا فون موصول ہوا۔ ''کیا ہوا نفیس صاحب، آپ نے مجھ غریب کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔'' وہ بہت لگاؤ کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

''فرصت نہیں مل رہی تھی۔''

''فرصت تو نکالنے سے ملتی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''پلیز فرصت نکالیں نا۔''

میرا دھیان تانیہ کی طرف ہی تھا نہ جانے اس کو کیا سوجھی تھی۔ ایک بار پھر وہ ڈائریکٹر مجھے اس کے گھر کی طرف جاتا ہوا دکھائی دیا۔

میں اس وقت تانیہ سے ملنے اس کے گھر کی طرف گیا تھا جب میں نے اس ڈائریکٹر کو دیکھ لیا۔ میرا موڈ اور زیادہ خراب ہو گیا تھا۔

اسی دن میں نسرین کو اپنے ساتھ اسٹوڈیو لے گیا۔ اس نے بہت خوبصورت ڈریسنگ کر رکھی تھی اور اس دن احساس ہوا کہ وہ اچھی خاصی قبول صورت بھی ہے۔

کئی دن گزر گئے تانیہ کی طرف جانا نہیں ہوا حالانکہ اس دوران میں وہ بہت یاد آتی رہی۔ میں اسے بھلا ہی نہیں سکتا تھا۔ نسرین مجھ سے ملتی رہی وہ روز بروز بے تکلف ہوتی جا رہی تھی۔ جتنی تیز رفتاری سے وہ میرے قریب آ رہی تھی وہ رفتار حیرت انگیز بھی نہ جانے اس کے دل میں کیا تھا لیکن میرا یہ حال تھا کہ میں تانیہ کے علاوہ کسی اور کی طرف دھیان نہیں دینا چاہتا تھا۔

میں نے زندگی میں صرف اس سے محبت کی تھی۔ ہاں میں یہ اعتراف کر رہا ہوں کہ مجھے اس سے شدید محبت ہو گئی تھی حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ شادی شدہ ہے۔ اس کا شوہر ایک جھگڑالو اور بدتمیز قسم کا انسان ہے۔ اگر میں نے تانیہ کو مکمل طور پر اس سے حاصل کرنے کی کوشش کی تو وہ زندگی خراب کر دے گا اس سے کوئی بعید نہیں تھی کہ وہ کہیں بھی کھڑا ہو کر میری بے عزتی کر دے۔ اس کے باوجود میں تانیہ سے دستبردار نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ اس وقت اپنے شوہر کے بہکاوے میں آ کر اس ڈائریکٹر سے ملنے گئی تھی اور یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا ذرا سے دباؤ پر وہ اس ڈائریکٹر کو چھوڑ بھی سکتی تھی لیکن اس سے پہلے ایک اور بات ہو گئی۔

وہ مجھے اسی ڈائریکٹر کے آفس سے نکلتی ہوئی دکھائی دی۔ یہ اتفاق تھا کہ میں نے اس طرف سے گزرتے ہوئے اسے دیکھ لیا تھا۔ اس وقت میں اپنی گاڑی میں تھا۔ میں نے جھلا کر اس کے پاس گاڑی روک دی۔

''ارے آپ؟''

''ادھر سے گزرتے ہوئے دیکھ لیا تم کو۔'' میں نے کہا۔ ''یہ صرف اتفاق ہے ورنہ نہ جانے تم کتنی بار یہاں آ چکی ہو گی۔''

''جی ہاں کئی بار۔'' اس نے آہستہ سے اپنی گردن ہلا دی۔

''چلو بیٹھ جاؤ۔'' میں نے اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔ ''مجھے تم سے کچھ باتیں بھی کرنی ہیں۔'' میں اسے اپنے ساتھ ہوٹل میں لے آیا جہاں میں دیر تک اس پر گرجتا برستا رہا لیکن وہ سر جھکائے میری باتیں سنتی رہی پھر میرے خاموش ہو جانے کے بعد اس نے صرف اتنا کہا۔

''نفیس صاحب، اب بہت مشکل ہے۔''

''کیا مطلب، کیا مشکل ہے؟''

''میں بہت آگے جا چکی ہوں۔ ڈائریکٹر صاحب نے کئی ڈرامے دلوا دیے ہیں اور ان کی ریکارڈنگ بھی شروع ہونے والی ہے۔ اب میں آپ کے کہنے پر ڈرامے تو نہیں چھوڑ سکتی نا۔''

''تو پھر تم مجھے چھوڑ دو۔'' اس کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ اس نے میری طرف دیکھا اور گردن جھکا لی۔ میرا موڈ اتنا خراب ہو گیا تھا کہ میں نے اسے گھر بھی نہیں پہنچایا۔ وہ ہوٹل سے خود ہی چلی گئی۔

اس کے بعد میں اس کی طرف نہیں گیا۔ کوئی فائدہ نہیں تھا جب اسے میری پروا نہیں تھی تو مجھے اس کی کیا پروا ہو سکتی تھی اس دوران میں اس کی دوست نسرین سے بھی میں نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔ ''دیکھو میں نے تمہیں دو چار لوگوں سے ملوا دیا ہے۔ اب تم جانو اور تمہارا کام جانے میں تمہیں ہر وقت اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔'' اس طرح نسرین بھی میری زندگی سے دور ہو گئی پھر کئی مہینے گزر گئے۔ میں نے تانیہ کی طرف جانا ہی چھوڑ دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کسی نہ کسی ڈرامے کی شوٹنگ میں

مصروف ہوئی اس کے پاس اتنی فرصت کہاں ہوگی کہ وہ بھی مجھے یاد کرے۔ اس کے اردگرد تو اب بہت سے لوگ ہوں گے لیکن وہ مجھے اسکرین پر نظر نہیں آئی۔ میں نے اس کا کوئی ڈراما نہیں دیکھا۔ نہ جانے کیا بات تھی۔

ایک پارٹی میں ڈائریکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے تانیہ کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔

''ارے صاحب وہ تو پاگل عورت ہے۔'' اس نے کہا۔

''وہ کیوں؟''

''کتنے دنوں تک مجھے چکر دلواتی رہی۔ ڈراموں میں کام کرنا ہے، کام کرنا ہے اس کا شوہر ہی اسے لے کر آیا تھا پھر ایک دن اس نے صاف صاف انکار کردیا۔ پتا نہیں کیسے مکرے ہوگئے تھے۔ سارا ٹائم ضائع کرادیا اس نے۔''

''کیوں..... انکار کیوں کیا؟''

''اب مجھے کیا معلوم..... پاگل معلوم ہوتی ہے۔''

ایک طرح کی طمانیت سی ہوئی تھی کہ تانیہ نے ڈراموں میں کام کرنے سے انکار کردیا ہے لیکن پھر ڈائریکٹر سے ملاقاتیں کیوں کی تھیں اور مجھ سے اتنی باتیں کیوں کیں۔

وہ ایک معمہ تھا اور اس کا حل ضروری تھا ورنہ میں ہمیشہ الجھن میں رہتا۔ اسی لیے بہت دنوں بعد میں ایک بار پھر اس کے گھر کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔

''آپ؟''

''کیا اندر آنے کو نہیں کہو گی؟''

''آجائیں۔'' وہ ایک طرف ہٹ گئی۔ سب کچھ وہی تھا۔ وہی ماحول، وہی اپنائیت نہ جانے کتنی یادیں اس کمرے سے وابستہ تھیں ایک ساتھ بیٹھ کر ہم نے کیسی کیسی باتیں کی تھیں۔ ایک دوسرے کو کس کس انداز سے محسوس کیا تھا لیکن اب کتنا فاصلہ پیدا ہوگیا تھا۔

''آخر یہ سب کیا ہے تانیہ؟'' میں نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ ''تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟''

''کیا کیا میں نے؟''

''تم نے اس ڈائریکٹر کو بھی انکار کردیا اور مجھ سے بھی رشتے ختم کردیے، آخر کیوں؟''

''اس ڈائریکٹر سے جان پہچان میں نے آپ ہی کے لیے بڑھائی تھی۔'' اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''تاکہ آپ مجھ سے مایوس اور بددل ہوجائیں۔''

''وہ کیوں؟''

''اپنے شوہر کے لیے۔'' اس نے جواب دیا۔

''نفیس صاحب وہ شخص آپ کے سامنے احساسِ کمتری کا شکار ہوگیا تھا۔ میں آپ کو کیا بتاؤں۔ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتا تھا حالانکہ یہ سب خود اسی نے کیا تھا لیکن اسے نہ جانے کس بات کا احساس تھا کہ وہ ذہنی مریض بنتا جا رہا تھا۔ آپ سے وہ کچھ بول نہیں پاتا تھا کیونکہ آپ رتبے میں اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ مجھ سے اس کی یہ حالت دیکھی نہیں گئی اور میں نے اس کی دل جوئی شروع کردی۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ میں آپ سے نہیں ملوں گی۔ مجھے آپ کی نہیں بلکہ اس کی پروا ہے اور اس کی حالت نارمل بنانے کے لیے میں نے اس ڈائریکٹر سے ملنا جلنا شروع کردیا تاکہ وہ آپ کی طرف سے مطمئن ہوکر پھر سے ٹھیک ہوجائے۔''

''اوہ..... اب سمجھا..... تو یہ بات تھی؟''

''جی ہاں اور دوسری طرف مجھے آپ کی تنہائی کا بھی خیال تھا۔ اسی لیے میں نے نسرین کو آپ کے پیچھے لگایا لیکن آپ نے اسے نظرانداز کردیا۔''

''ہاں کیونکہ میں تمہارے علاوہ کسی کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اور اب میں تم سے یہ کہہ رہا ہوں کہ میں تمہیں زندگی بھر یاد رکھوں گا۔ یہ اور بات ہے کہ میں تم سے کبھی ملاقات نہیں کروں گا لیکن تمہاری یاد ہمیشہ میرے ساتھ رہے گی اور اب اس پیار میں تمہارے لیے احترام بھی شامل ہوگیا ہے؟''

''نفیس صاحب۔'' اس کے خوبصورت ہونٹ لرزنے لگے۔

''میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں تانیہ خدا کرے کہ تم اپنے شوہر کے ساتھ ہمیشہ ایک اچھی زندگی گزار سکو اور اب جو پچھ میں کہنے جا رہا ہوں اس سے انکار مت کرنا۔''

''جی فرمائیں۔''

''میں تمہیں اپنے پیار کی یاد کے طور پر پانچ ہزار روپے بھیجتا رہوں گا جب تک میں زندہ ہوں اور تم اسے لینے سے انکار نہیں کرو گی۔'' اس نے اپنی گردن جھکالی میں نے اس پر الوداعی نگاہ ڈالی اور اس کے مکان سے باہر آگیا۔ آج کئی برس گزر چکے ہیں میرا وہی معمول ہے کہ میں اسے ہر مہینے پانچ ہزار بھیج دیتا ہوں اور اس کے لیے دعائیں کرتا رہتا ہوں۔

چراغِ آخرِ شب

جناب معراج رسول صاحب

السلام علیکم!

کہتے ہیں کہ یہ دنیا کی ریت ہے، اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ میں نے جو کیا تھا وہ اب جاکر میرے سامنے آیا ہے کہ میں چراغِ آخرِ شب کی طرح ٹمٹمارہا ہوں۔ کب اور کس وقت زندگی کی شام ہوجائے، کوئی نہیں جانتا۔ بس ایک التجا ہے کہ آپ بھی میرے لیے دعا کرتے رہیں کہ میرے گناہ معاف ہوجائیں

نعیم احمد

(کراچی)

میں اپنے والدین کی سب سے آخری اولاد ہوں اس لیے شروع ہی سے بہت زیادہ لاڈلا تھا۔ میری ہر ضد فوراً پوری کردی جاتی تھی۔ اسی لاڈ پیار نے مجھے خودسر اور ضدی بنادیا تھا۔

مجھ سے بڑے دو بھائی عظیم اور زعیم تھے۔ ان سے چھوٹی راشدہ باجی تھیں، پھر میرا نمبر تھا۔

میں جب میٹرک میں پہنچا تو عظیم بھائی بی ای کرکے ایک پرائیویٹ کمپنی میں بہت اچھی ملازمت کررہے تھے۔ بابا بھی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتے تھے۔ یوں گھر میں پیسے کی کمی نہیں تھی۔ زعیم بھائی کو ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ وہ انٹر میں تھے اور اچھے نمبر لانے کے لیے دن رات محنت کررہے تھے۔

اپنے دونوں بھائیوں کے برعکس مجھے پڑھنے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ میں بس پڑھ رہا تھا۔

میٹرک کے بعد بابا نے مجھے شہر کے بہترین کالج میں ایڈمیشن دلوایا۔ بابا اور عظیم بھائی یہ سمجھتے تھے کہ اس کالج میں پڑھ کر میں بہت کچھ سیکھ لوں گا۔

وہ مخلوط تعلیمی ادارہ تھا۔ وہاں طلبہ پر زیادہ روک ٹوک

بھی نہیں تھی کہ وہاں اعلیٰ طبقے کے بچے پڑھتے تھے۔ یہاں مختلف قسم کی دلچسپیاں تھیں۔ میرے لیے سب سے بڑی دلچسپی اس کالج میں پڑھنے والی الٹرا ماڈرن لڑکیاں تھیں۔ برگر خاندانوں کے یہ لڑکے اور لڑکیاں یہاں محض وقت گزارنے آتے تھے۔

یہ طبقہ نت نئے فیشن پر بات کرتا، نئی آنے والی انگلش فلمیں، غیر ملکی ڈی وی ڈیز اور شوبز میگزینز ان کی گفتگو کا موضوع ہوتے۔

میں ماحول کی یہ رنگینی دیکھ کر اسی ماحول کا حصہ بن گیا۔ کالج کی کئی لڑکیوں سے میری دوستی ہوگئی۔ میں اکثر انہیں لے کر مختلف پارکوں، ریستورانوں اور ساحلِ سمندر پر جانے لگا۔ ان سے کھیلنے لگا کیونکہ میں لچھے دار باتیں بنانے میں طاق جو تھا۔

میں فطری طور پر ذہین تھا لیکن اپنی اس ذہانت کو مثبت طور پر نہیں بلکہ منفی طور پر استعمال کرتا تھا۔

میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ احساس موجود تھا کہ میں جس طرح دوسروں کی عزت سے کھیلتا ہوں، کوئی میری عزت سے بھی کھیل سکتا ہے۔ میں بھی ایک جوان بہن کا بھائی ہوں۔ پھر میں اپنے ضمیر کو تھپک تھپک کر سلا دیتا اور کسی نئی لڑکی کی بانہوں میں سکون تلاش کرنے لگتا۔

زعیم بھائی کو میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا تھا۔ اب وہ پڑھائی میں پہلے سے بھی زیادہ مصروف ہوگئے تھے۔ پھر انہوں نے ہوسٹل میں منتقل ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ ان کا خیال تھا کہ وہاں رہ کر پڑھائی اچھی ہوسکے گی۔

وہ گھر میں تھے تو مجھ پر تھوڑی بہت روک ٹوک بھی کرتے اور مجھے پڑھائی کی ترغیب بھی دیتے تھے اور اکثر مجھے اپنے ساتھ پڑھنے کے لیے بھی بٹھا لیتے تھے۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ میری ہر جا و بے جا ضد بھی پاپا اور عظیم بھائی سے سفارش کرکے پوری کراتے تھے۔ میں لاکھ برا سہی لیکن اپنے بڑے بھائیوں کا احترام کرتا تھا۔

اب زعیم بھائی ہوسٹل منتقل ہوئے تو مجھے روکنے ٹوکنے والا بھی کوئی نہ رہا۔ پاپا اور عظیم بھائی تو صبح کے گئے شام کو لوٹتے تھے۔ وہ تو میرے بارے میں.... صرف اتنا جانتے تھے کہ میں شہر کے ایک بہترین کالج میں پڑھ رہا ہوں اور اپنی تعلیم پر بھرپور توجہ دے رہا ہوں۔ شاید انہیں یہ خوش فہمی اس لیے بھی تھی کہ میں باقاعدگی سے کالج جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک مہنگے کوچنگ سینٹر میں بھی جاتا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں کالج پڑھنے نہیں بلکہ تفریح کی غرض سے جاتا تھا۔ یہ درست ہے کہ وہاں پڑھنے والے بیشتر طلبہ وہاں پڑھنے ہی آتے تھے۔ وہاں پڑھائی بھی بہت اچھی ہوتی تھی لیکن اس تعلیم و تربیت سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے تھے جو واقعی تعلیم کے حصول میں سنجیدہ ہوں۔ میری طرح سیر و تفریح میں مگن رہنے والے طلبہ بھلا وہاں سے کیا حاصل کرسکتے تھے۔ رہا سوال کوچنگ سینٹر کا تو میں نے سرے سے وہاں ایڈمیشن ہی نہیں لیا تھا۔ البتہ میں وہاں کی بھاری فیس پاپا سے ہر ماہ لے لیتا تھا جو میری عیاشیوں کے کام آتی تھی۔

مصیبت تو اس وقت میرے سر پر آئی جب سالانہ امتحانات کے دن قریب آئے۔

میں نے تو کتاب کھول کر بھی نہ دیکھی تھی۔ میں بھلا امتحان کیسے دے سکتا تھا۔

میرے رات دن اسی پریشانی میں گزر رہے تھے کہ پاپا اور عظیم بھائی کو اور سب سے بڑھ کر زعیم بھائی کو اپنی ناکامی کا کیا جواز دوں گا؟

میں نے اس کا بھی ایک حل نکال ہی لیا۔ جس دن سے میرے پرچے شروع ہو رہے تھے، میں نے اچانک طبیعت خراب ہونے کا ڈراما کیا اور بے ہوش ہو کر گر گیا۔

پاپا اور عظیم بھائی آفس جا چکے تھے، امی اور راشدہ باجی گھر میں تھیں۔ وہ دونوں میری حالت دیکھ کر بری طرح گھبرا گئیں اور فوری طور پر مجھے ٹیکسی میں اسپتال لے گئیں۔

ڈاکٹروں نے میرا طبی معائنہ کیا اور کہا کہ بظاہر تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ ممکن ہے انہیں کسی قسم کا ڈپریشن ہو یا ذہنی دباؤ کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔ انہوں نے تجویز دی کہ مجھے کم سے کم ایک ہفتے تک مکمل آرام کرنا چاہیے۔

راشدہ باجی تو چاہتی تھیں کہ مجھے کچھ دن کے لیے اسپتال میں داخل ہی کرا دیں لیکن ایک ڈاکٹر نے کہا کہ ان کی ایسی حالت نہیں ہے کہ انہیں یہاں رکھا جائے۔ یہاں رہ کر تو ان کا ڈپریشن مزید بڑھے گا۔ بس فی الحال انہیں غیر معمولی ذہنی بوجھ سے دور رکھیں اور گھر میں مکمل آرام کرائیں۔ انہوں نے میرے لیے وٹامن بی کمپلیکس کی ٹیبلٹس اور ٹانک بھی لکھ دیے۔

راشدہ باجی نے اسپتال سے پاپا اور عظیم بھائی کو بھی فون کر دیا تھا۔ وہ دونوں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دوڑے دوڑے اسپتال آگئے تھے۔ پاپا حیران تھے کہ مجھے بھلا کس بات کا ڈپریشن ہے؟

وہ مجھے گھر لے آئے اور آرام کرنے کو کہا۔

میں نے روتی صورت بنا کر کہا "پاپا! آج میرا پیپر تھا۔

اب میں امتحان میں فیل ہو جاؤں گا۔"

"پریشان مت ہو نعیم بیٹا!" پاپا نے کہا "ابھی کون سی تمہاری عمر نکل گئی ہے۔ اس سال نہ سہی، تم اگلے سال امتحان دے لینا۔"

مجھے اپنی اس اداکاری پر آج بھی حیرت ہوتی ہے۔ میری اداکاری سے پاپا اور عظیم بھائی دونوں ہی متاثر ہوگئے تھے اور مجھے تسلیاں دے رہے تھے۔

شام کو زعیم بھائی بھی گھر آگئے۔ انہوں نے میری حالت دیکھی اور بولے "نعیم! تمہارے ذہن پر ایسا کون سا بوجھ ہے جس کی وجہ سے نوبت یہاں تک پہنچی؟ تم پڑھائی میں تو کبھی اتنے سیریس نہیں ہوئے تھے کہ تمہارے ذہن پر بوجھ ہو؟"

"میں خود بھی نہیں جانتا زعیم بھائی کہ مجھے کیا ہوا ہے؟ بس مجھے کھڑے کھڑے چکر آیا اور میں گر گیا۔ اپنی اداکاری میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے میں واقعی کھڑے کھڑے گرا تھا۔ اس سے میرے ایک ہاتھ اور شانے میں اچھی خاصی چوٹ بھی آئی تھی۔ ہاتھ پر اچھا خاصا ورم آگیا تھا۔

زعیم بھائی نے مجھ سے کہا "نعیم! تمہارا ایک ہی پیپر تو رہ جائے گا۔ وہ تم بعد میں پاس کر لینا، تم بقیہ پرچے تو دو۔"

راشدہ باجی نے فوراً کہا "زعیم بھائی! آپ اس کی حالت نہیں دیکھ رہے ہیں؟ وہ تو شکر ہے کہ یہ بے ہوش ہو کر گھر ہی میں گرا، اگر کہیں باہر ہوتا تو ہمیں گھنٹوں پتا بھی نہ چلتا کہ نعیم کے ساتھ کیا ہوا؟ آپ اسے آرام کرنے دیں۔"

"میں تمہاری خاطر اتنا کر سکتا ہوں کہ روز صبح ٹیکسی میں تمہیں امتحانی مرکز تک لے جاؤں اور واپسی پر تمہیں گھر چھوڑ دوں۔ میں وہاں تمہارے کسی دوست کو اپنا اور گھر کا فون نمبر بھی دے دوں گا کہ خدانخواستہ وہاں تمہارے ساتھ ایسا ہو تو وہ فوری طور پر اطلاع دے سکے۔"

"نہیں زعیم!" امی نے کہا "ڈاکٹروں نے نعیم کو آرام کا مشورہ دیا ہے۔ انہوں نے کچھ سوچ کر ہی ایسا کہا ہوگا۔ ایک سال کی کوئی بات نہیں۔ امتحان اس کی جان سے زیادہ تو نہیں ہیں۔"

"امی! آپ کیا جانیں کہ ایک سال کسی طالب علم کے لیے کیا حیثیت رکھتا ہے۔" زعیم بھائی نے کہا "خیر، جان ہے تو جہان ہے۔" وہ پھیکے انداز میں مسکرائے، پھر بولے "ہاں نعیم! اب تم مکمل آرام کرو، یہ نہ ہو کہ تم اٹھ کر چل دو۔"

"یہ کہیں جا کر تو دیکھے۔" راشدہ باجی نے کہا "میں اسے کمرے سے قدم بھی باہر نہیں نکالنے دوں گی۔"

ماہنامہ پاکیزہ کراچی
مارچ (بہار نمبر) کی ایک جھلک
انجم انصار کا ناول محبت ہم سفر میری
آخری قسط ملاحظہ کریں اپنے بہترین اختتام کے ساتھ
ذکیہ بلگرامی کا ناول
اگر ملنا نہیں ہمدم سوچ کی نئی راہوں پر گامزن
عالیہ بخاری کا ناول خوشبو کا سفر
ایک نئی مہک کے ساتھ
میمونہ خورشید، لبنیٰ عروج، رضوانہ پرنس اور بلقیس جہاں
کے سچے جذبوں سے مزین پر تاثر ناولٹ
شمیم فضل خالق، سعدیہ رئیس، نویدہ تبسم، نظارت نصر، اجالا خان، شاہدہ ملک، رابعہ حسن اور عذرا آفتاب کے
زندگی سے قریب ترین تلخ و شیریں افسانے
خواتین قومی کرکٹ ٹیم کی آل راؤنڈر
اسماویہ سے خصوصی ملاقات
اس کے علاوہ
بہنوں کی محفل، پاکیزہ کی فیس بک جس میں آپ بھی اپنے کھٹے میٹھے اور تیکھے خطوط کے ساتھ شرکت کرسکتی ہیں۔
آپ کی آواز نگارشات سے سجے مستقل سلسلے
کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! کمال ہے!

زعیم بھائی دوبارہ ہوسٹل چلے گئے اور راشدہ باجی سے کہہ گئے کہ تم نعیم کا خیال رکھنا۔

گھر کے افراد کا ہمدردانہ رویہ دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ وہ بھی میری وجہ سے فکرمند تھے۔ میرے ضمیر نے پھر مجھ پر لعنت ملامت کی کہ اتنے محبت کرنے والے لوگوں کو میں اپنی اداکاری سے بے وقوف بنا رہا ہوں۔ میں نے دل ہی دل میں طے کرلیا کہ اب آئندہ سال میں دل لگا کر پڑھوں گا اور زعیم بھائی کی طرح دن رات محنت کروں گا۔ یہ سوچ کر مجھے خاصا اطمینان محسوس ہوا۔

میں نے وہ سال تفریح، عیاشی اور آوارہ گردی میں ضائع کردیا تھا۔ میں نے خود سے عہد کیا تھا کہ آئندہ سال میں صرف اور صرف پڑھائی کروں گا۔

دوسرے دن جب میں کالج نہ پہنچا تو میرے کالج کے چند دوست گھر پر آگئے۔ ان میں لڑکیاں بھی تھیں اور لڑکے بھی۔ وہ سب تشویش ظاہر کررہے تھے کہ آخر نعیم پیپر دینے کیوں نہیں آیا؟ جب انہیں معلوم ہوا کہ اچانک میری طبیعت خراب ہوگئی تھی تو وہ حیران ہوگئے۔

''اچانک تو بے ہوش کیسے ہوگیا؟'' راشد نے پوچھا۔ وہ بھی میرا اہم مشغلہ تھا، یعنی روز ایک نئی گرل فرینڈ اس کے ساتھ پھرتی تھی۔

''پتا نہیں یار! کیا ہوا۔'' میں نے کہا۔

ثمینہ نے آہستہ سے پوچھا ''کہیں تم نے پینا تو شروع نہیں کردی؟''

''اوشٹ اپ!'' میں نے مصنوعی خفگی کا مظاہرہ کیا۔ ''کبھی مذاق میں بھی ایسا مت کہنا ورنہ میرے پاپا اور بھائی مجھے گھر سے نکال دیں گے۔''

اسی وقت اچانک پاپا آگئے۔ وہ میرے کمرے میں ان لڑکیوں اور لڑکوں کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور مجھ سے بولے۔ ''نعیم! ڈاکٹر نے تمہیں آرام کا مشورہ دیا ہے۔''

''جی پاپا!'' میں نے کہا ''میں تو بس آرام سے لیٹا ہوا ہوں۔''

پاپا نے ناگواری سے ان لوگوں کو دیکھا، پھر کمرے سے باہر نکل گئے۔

مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ میرے ''دوستوں'' کے حلیے ایسے نہیں تھے کہ وہ کسی شریف گھرانے میں جاسکیں۔ ایک لڑکے نے پیلی چکیلی جینز پر اورنج رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے سینے پر مائیکل جیکسن کی تصویر تھی اور پشت پر لکھا ہوا تھا ''لو فور آل'' ایک لڑکی کے جسم پر انتہائی مختصر لباس تھا۔ اس نے ٹخنوں سے اونچی ٹائٹ جینز اور سلیولیس ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جس کا گلا بہت کھلا ہوا تھا۔ دوسری لڑکی بھی جینز میں تھی۔ اس نے اسکن ٹائٹ جینز پہن رکھی تھی جو اس کا جسم چھپانے کے بجائے نمایاں کررہی تھی۔ ان سب کے بال بڑے بڑے اور الجھے ہوئے تھے۔ ایک لڑکے نے بے ہنگم ڈاڑھی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے گلے میں گٹار بھی جھول رہا تھا۔

ان غیر شریفانہ حلیوں کو دیکھ کر کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ کس قسم کے لوگ ہیں۔

وہ لوگ بھی پاپا کی وجہ سے کچھ ڈسٹرب ہوگئے تھے اس لیے فوراً ہی رخصت ہوگئے۔ وہ بھی اپنی گاڑیوں میں آئے تھے۔

ان کے جانے کے بعد پاپا میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ زعیم بھائی بھی تھے۔

میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو پاپا نے کہا ''لیٹے رہو نعیم!'' میں فرمانبرداری سے لیٹ گیا۔

''یہ تمہارے دوست تھے؟'' پاپا نے حیرت سے پوچھا۔

''دوست کیا پاپا، یہ سب میرے ساتھ کالج میں پڑھتے ہیں۔'' میں نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

''یہ کالج میں پڑھتے ہیں؟'' زعیم بھائی نے کہا ''مجھے تو یہ لوگ کسی بھی طرف سے پڑھے لکھے نظر نہیں آتے۔ جس وحشیانہ طریقے سے وہ لوگ بات چیت کررہے تھے اور حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکال رہے تھے، انہیں سن کر تو کوئی بھی یقین نہیں کرسکتا کہ یہ لوگ پڑھتے بھی ہوں گے۔ میں تو انہیں اپنے گھر سے نکلتے دیکھ کر حیران رہ گیا۔'' ان کے چہرے پر تلخی ناگواری کے تاثرات تھے ''تم بتاؤ، اب طبیعت کیسی ہے؟''

''اب پہلے سے بہتر ہے۔'' میں نے آواز میں نقاہت پیدا کرتے ہوئے کہا۔

پاپا نے سنجیدگی سے کہا ''نعیم بیٹا! میری ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کرلو۔ اگر تم ان جیسے لوگوں سے دوستی رکھو گے تو کبھی کامیاب نہیں ہوسکو گے۔ لوگ بھی تمہیں حقارت سے دیکھیں گے کہ انسان اپنے دوستوں ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ ان گھٹیا قسم کے لوگوں سے تمہاری دوستی ہوئی کیسے؟''

''پاپا! ان میں سے گھٹیا تو کوئی بھی نہیں ہے۔ سب بڑے سرکاری افسروں، صنعت کاروں اور بزنس مین کے بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔''

''شٹ اپ نعیم!'' زعیم بھائی کو اچانک غصہ آگیا۔ ''عزت کا معیار پیسا نہیں ہوتا بے وقوف۔ پھر جو کچھ بھی ہیں وہ ان کے باپ ہیں، یہ لوگ خود کیا ہیں؟ ہمیشہ دوست بنانے سے پہلے اس کی شرافت اور اہلیت کے معیار کو دیکھنا چاہیے۔ وہ اگر بڑے باپ کی اولاد ہیں تو کیا خود بھی قابل عزت ہوگئے۔ ان لوگوں کی دوستی چھوڑ دو نعیم!''

''زعیم..... بھائی! یہ لوگ صرف میرے ساتھ کالج میں پڑھتے ہیں اور ان کے ساتھ میری دوستی نہیں ہے۔''

''کیا تمہاری کلاس میں ہر طالب علم اسی طرح کا ہے؟'' پاپا نے پوچھا۔

''نہیں پاپا! اچھے اور ذہین طالب علم بھی ہیں۔ وہ بھی ضرور آتے لیکن شاید اس لیے نہیں آئے کہ کل پیپر ہے، وہ اس کی تیاری کررہے ہوں گے۔''

اچانک امی نے آکر بتایا کہ تمہارا ایک دوست مزاج پرسی کے لیے آیا ہے۔

''اسے یہاں بھیج دو۔'' میرے بجائے پاپا نے جواب دیا۔

میں پریشان تھا کہ اب نہ جانے کون آیا ہو؟ میرے تو سبھی دوست اسی قماش کے تھے۔

تھوڑی دیر بعد طاہر کمرے میں داخل ہوا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ طاہر بہت سلجھا ہوا اور پڑھنے والا لڑکا تھا۔ میری اس سے دوستی نہیں تھی، وہ صرف کلاس فیلو تھا۔

مجھے اس کے آنے سے خوشی ہوئی تھی۔ اس نے شریفانہ پینٹ اور سفید بے داغ قمیص پہن رکھی تھی۔ چہرے پر سنجیدہ فہیم کا عکس تھا۔

اس نے بہت ادب سے پاپا اور زعیم بھائی کو سلام کیا، پھر وہ میرے نزدیک آکر بولا ''کیسے ہو نعیم! مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ اچانک تمہاری طبیعت خراب ہوگئی تھی۔''

''ہاں طاہر! مجھے اچانک نہ جانے کیا ہوا؟''

''تمہاری بیماری سے زیادہ مجھے تمہارا سال ضائع ہونے کا افسوس ہے۔'' وہ مسکرا کر بولا ''خیر، ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ تم تمام فکروں اور پریشانیوں کو بھول جاؤ اور اپنے ذہن پر زیادہ بوجھ مت ڈالو۔''

''طاہر میاں! تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟'' پاپا نے پوچھا۔

''میرے پاپا یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔'' طاہر نے جواب دیا ''وہ نرسز پڑھاتے ہیں۔''

''گڈ!'' زعیم بھائی نے کہا۔

طاہر اٹھتے ہوئے بولا ''اچھا نعیم، اپنا خیال رکھنا۔'' وہ پاپا سے مخاطب ہوا ''انکل! اب مجھے اجازت دیں۔''

''بیٹا! اب کھانا کھا کر ہی جانا۔''

''شکریہ انکل!'' طاہر نے کہا ''میں نے کھانا کھالیا ہے۔''

''اچھا ایک کپ کافی ہی پی لو۔'' زعیم بھائی نے کہا۔

''آپ کا ڈنر اور کافی ادھار رہی، آئندہ آؤں گا تو ضرور پیوں گا۔ اس وقت تو مجھے کل کے پرچے کی تیاری کرنا ہے ورنہ میں انکار نہ کرتا۔'' وہ سلام کرکے رخصت ہوگیا۔

''تمہارا یہ دوست مجھے بہت پسند آیا۔'' پاپا نے کہا۔ ''تمہارے اس دوست اور ان ''دوستوں'' میں واضح فرق ہے۔''

''پاپا! طاہر ہی میرا دوست ہے، ان لوگوں سے تو صرف شناسائی ہے۔''

اس دن طاہر نے وہاں آکر مجھ پر احسان کردیا تھا۔ پاپا اور دوسرے بھائیوں کی نظروں میں مجھے بااعتبار ثابت کردیا تھا۔

دوسرا سال شروع ہوا تو میری طرح وہ سب لوگ فیل ہوگئے جو وقت گزاری کے لیے کالج آتے تھے۔ ان میں سے کچھ کالج چھوڑ کر چلے گئے۔ فیل ہونے والوں میں صرف میں، ثمینہ اور اقبال رہ گئے۔

میں اپنے عہد پر قائم تھا اور نہ صرف تمام کلاسیں پابندی سے اٹینڈ کررہا تھا بلکہ کوچنگ سینٹر بھی جانے لگا۔

اس دن کلاس میں مجھے ایک لڑکی نظر آئی۔ لڑکی کیا تھی غالب کی غزل تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ وہ بلا کی حسین تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر معصومیت تھی۔ جلد ہی مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ کالج میں نووارد ہے۔

کئی لڑکوں نے اس سے دوستی کرنا چاہی لیکن وہ کسی کے ساتھ فری نہ ہوئی۔ لڑکے تو رہے ایک طرف، وہ تو برگر قسم کی لڑکیوں سے بھی دور دور رہتی تھی۔ اس کا نام بھی اسی کی طرح خوبصورت تھا، روبی!

میں ہمیشہ ٹفن اکٹھا کرکے کھانے کا قائل تھا۔ میں ابھی اس لڑکی کو جانچ رہا تھا کہ اس پر کس زاویے سے وار کیا جائے جو کارآمد بھی ہو۔

روبی کی توجہ حاصل کرنے کے لیے میں نے بھی لائبریری میں بیٹھنا شروع کردیا۔ میں وہاں بیٹھتا تھا تو کچھ نہ کچھ پڑھتا

بھی پڑتا تھا۔ میں نے سوچا کہ جب پڑھنا ہی ہے تو سنجیدگی سے کیوں نہ پڑھوں؟ میں بھی سنجیدگی سے پڑھنے لگا۔

ایک دن میں لائبریری میں بیٹھا مطالعے میں غرق تھا۔ روبی بھی وہاں موجود تھی اور کچھ فاصلے پر بیٹھی تھی۔

میں نے کچھ دیر بعد دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ مجھے دکھائی نہیں دی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ لائبریری سے جا چکی ہے۔

میں ابھی اٹھنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ پشت کی جانب سے کسی نے کہا ''ہیلو!''

میں نے گھوم کر دیکھا تو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا، وہ روبی ہی تھی جس سے دوستی کرنے کے لیے میں مرا جا رہا تھا۔

میں نے خوش دلی سے پوچھا ''جی فرمائیے؟''

''کل کی ایک کلاس مجھ سے مس ہو گئی ہے، آپ نے تو نوٹس ضرور بنائے ہوں گے۔ کیا وہ نوٹس مجھے ایک دن کے لیے مل سکتے ہیں؟''

میں نے اس دن کے نوٹس تیار کیے تھے۔ اس میں زیادہ کریڈٹ اس ٹیوشن سینٹر کو جاتا ہے جہاں میں پڑھتا تھا۔ وہاں نوٹس پہلے سے تیار مل جاتے تھے۔ میں نے ہنس کر کہا۔ ''لیکن ایک شرط پر مس.....؟''

میں نے یوں ظاہر کیا جیسے میں اس کا نام بھی نہ جانتا ہوں۔

''روبی!'' اس نے کہا پھر بولی ''آپ کی کوئی شرط بھی ہے؟''

''جی ہاں، بہت معمولی سی۔'' میں نے جواب دیا ''شرط یہ ہے کہ کل وہ نوٹس آپ مجھے واپس کر دیں گی اور اگر کبھی مجھے نوٹس کی ضرورت پڑی تو آپ بھی مجھے دیں گی۔''

''مجھے منظور ہے۔'' روبی نے کہا۔

''تو پھر یہ لیجیے!'' میں نے اپنی فائل سے نوٹس نکالے اور روبی کے حوالے کر دیے۔

میں ایک مرتبہ پھر اس کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا جو میں پڑھ رہا تھا۔ میں نے روبی کی طرف مڑ کر دیکھا بھی نہیں کہ وہ کھڑی ہے یا جا چکی ہے۔ یہ بھی لڑکیوں کو متاثر کرنے کا ایک حربہ تھا۔ ایک سال تک مختلف لڑکیوں سے فلرٹ کرنے کے بعد میں بہت کچھ سیکھ گیا تھا۔

روبی کے مخصوص پرفیوم کی خوشبو گم ہوئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ وہاں سے جا چکی ہے۔ میں نے بھی اپنی کتابیں سمیٹیں اور لائبریرین کے حوالے کر کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

مجھے ایک مرتبہ پھر اپنا عہد یاد آ گیا کہ مجھے اس سال صرف پڑھنا ہے اور کچھ نہیں کرنا۔ میں پڑھ تو رہا ہوں۔ میں نے خود کو تسلی دی۔ اب اگر پڑھائی میں ایسی ہلکی پھلکی باتیں بھی نہ ہوں تو زندگی بے رنگ ہو کر رہ جائے گی۔

میں نے اس دن کے بعد سے روبی سے صرف سلام دعا کی حد تک تعلقات رکھے۔

طاہر اب سیکنڈ ائر میں تھا۔ وہ بھی کالج میں اکثر نظر آ جاتا تھا۔ میں اس کے ساتھ بہت تپاک سے ملتا تھا۔ میں واقعی اس کا احسان مند تھا کہ اس نے گھر پہنچ کر میری عزت رکھ لی تھی۔

ایک دن میں کالج لائبریری سے باہر نکلا تو مجھے طاہر مل گیا۔ اس نے مسکرا کر کہا ''نعیم! مجھے بہت خوشی ہوتی ہے جب میں تمہیں سنجیدگی سے پڑھتے دیکھتا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ تم نے ان دوستوں کی صحبت سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ بس اسی طرح محنت اور لگن سے پڑھتے رہو۔'' یہ کہہ کر وہ لائبریری میں داخل ہو گیا۔

میں بھی اپنی کلاس کی طرف جانے کو مڑا تو مجھے روبی نے پکارا ''نعیم صاحب!''

میں نے مڑ کر دیکھا اور بہت سنجیدگی سے پوچھا ''جی فرمائیے۔ کیا آج پھر آپ کو نوٹس کی ضرورت ہے؟''

''نہیں، آج ایک کتاب چاہیے۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''آپ لائبریری کے سامنے کھڑے ہو کر مجھ سے کتاب مانگ رہی ہیں؟'' میں نے بھی ہنس کر کہا۔

''دراصل وہ کتاب بہت نایاب ہے، لائبریری میں بھی نہیں ہے اور شہر کی کسی دکان پر بھی نہیں ہے۔''

''پھر تو مشکل ہے۔'' میں نے کہا۔

''آپ کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''کیوں؟ میرے پاس کیا الہ دین کے چراغ کا جن ہے؟'' میں بھی مسکرایا۔

میری بات پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس کے موتی جیسے چمکتے ہوئے دانت بہت خوبصورت تھے۔ وہ فوراً ہی اپنی ہنسی روک کر بولی ''اصل میں وہ کتاب آپ کے دوست طاہر کے پاس ہے۔''

''طاہر! یہ..... طاہر احسن؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' روبی نے کہا ''ابھی ان کے ساتھ آپ کو دیکھا تو مجھے خیال آیا۔''

''آپ طاہر سے وہ کتاب خود بھی تو مانگ سکتی ہیں؟'' میں نے کہا۔

''وہ نہیں دیں گے۔'' روبی نے جواب دیا ''اس سے

پہلے بھی وہ ایک کتاب کے سلسلے میں مجھے انکار کر چکے ہیں۔''

''اچھا، دیکھتا ہوں آپ کتاب کا نام بتائیے۔ ویسے آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، طاہر کتاب کسی کو دیتا تو نہیں ہے۔'' میں نے یوں ظاہر کیا جیسے میں طاہر کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔

روبی نے مجھے کتاب کا نام بتایا اور مسکراتے ہوئے چلی گئی۔

میں نے طاہر سے کتاب کی بات کی تو وہ حیران رہ گیا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ کتاب میرے پاس ہے؟'' اس نے خوش دلی سے کہا۔

''یار، جو کتاب لائبریری میں نہ ملے، مارکیٹ میں دستیاب نہ ہو تو وہ تمہارے ہی پاس مل سکتی ہے۔ میں آج اس کی فوٹو کاپی کرا کے کل تمہیں واپس کر دوں گا۔'' میں نے کہا۔

طاہر اس انداز میں اپنی تعریف سن کر خوش ہو گیا اور بولا۔ ''نعیم! وہ کتاب گھر پر ہے۔ تمہیں کل مل سکتی ہے۔''

''ٹھیک ہے، کل ہی سہی۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

میں نے روبی کو کتاب کی فوٹو کاپی دی تو وہ خوش ہو گئی۔

پھر ہمارے درمیان اکثر بات چیت ہونے لگی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں روبی کی محبت میں گرفتار ہوتا جا رہا ہوں۔ وہ میرے حواس پر چھائی جا رہی ہے۔ اب تک جتنی لڑکیاں میری زندگی میں آئیں، روبی ان سب سے مختلف تھی۔ میں نے اپنے دل میں جھانکا تو مجھے یہی جواب ملا کہ روبی عام لڑکیوں سے مختلف ہے، تم اس سے محبت کرنے لگے ہو۔

ہم دونوں غیر شعوری طور پر ایک دوسرے کے نزدیک آ گئے۔ پہلے تو وہ کالج سے باہر میرے ساتھ جاتے ہوئے جھجکتی تھی لیکن آہستہ آہستہ اس کی جھجک ختم ہو گئی اور وہ میرے ساتھ مختلف تفریحی مقامات پر جانے لگی۔

وہ گرمیوں کی ایک تپتی ہوئی دوپہر تھی۔ میں اور روبی کالج سے باہر نکلے تو روبی نے کہا ''نعیم! آج بہت شدید گرمی ہے، کسی سائنڈ کی طرف چلو۔''

''مجھے کلفٹن کا ساحل پسند نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''باکس بے یا سینڈز پٹ چلنا چاہو تو بولو۔''

''ارے باپا، کہیں بھی لے چلو۔'' روبی ہنس کر بولی۔

میں نے اسے اپنی بائیک پر بٹھایا اور باکس بے کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے سے میں نے پانی کی ایک چھ لیٹر والی بوتل، ڈسپوزیبل گلاس، کچھ سینڈوچز، دو برگر اور کچھ فروٹ بھی لے لیے۔

میرے پاس ہیوی بائیک تھی۔ اس میں کیریئر بھی نہیں ہوتا۔ وہ سب سامان میں نے ایک ٹوکری میں رکھوا کر اپنی بائیک کے پیٹرول ٹینک پر رکھ لیا اور روانہ ہو گیا۔

وہ چھٹی کا دن نہیں تھا اس لیے ساحل بھی ویران پڑا ہوا تھا۔

میں نے اپنی موٹر سائیکل ایک طرف روکی اور سامان اٹھا کر آگے بڑھا تو اچانک ایک مقامی شخص میرے سامنے آ گیا اور بولا ''صاحب، ہٹ کا ضرورت ہے؟''

''ہاں یار، ہٹ کی ضرورت تو ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو پھر آؤ، ہٹ دیکھ لو۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

وہ بہت بہترین ہٹ تھی۔ وہ اس کا چوکیدار تھا۔ وہ لوگ مالکان کی عدم موجودگی میں ایک دن کے لیے ہٹ کسی کو بھی کرائے پر دے دیتے تھے۔ اس سے ان کو اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ ہٹ کے مالکان کو بھی معلوم تھا کہ وہ لوگ ایسا کرتے ہیں لیکن وہ بھی خاموش رہتے تھے۔

اس نے آہستہ سے کہا ''پانچ سو روپے ہوں گے صاحب!''

میں نے پانچ سو روپے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ ''لیکن تم مجھے چائے بھی لا کر دو گے۔''

''چائے ابھی لاؤں یا کچھ ٹھہر کر؟'' اس نے پوچھا۔

''ابھی نہیں، میں بعد میں تمہیں خود بتا دوں گا۔''

اس کے جانے کے بعد میں نے اس ہٹ کا تفصیلی جائزہ لیا۔ وہاں تین بیڈ روم تھے لیکن صرف ایک بیڈ روم میں سامان تھا۔ بقیہ کمرے خالی تھے یا پھر صوفہ سیٹ وغیرہ سٹنگ روم میں رکھا تھا۔ میں نے سامان وہاں رکھا اور روبی کے ساتھ ساحل پر آ گیا۔ ساحل پر بھی دور دور تک سناٹا تھا۔

میں اور روبی پہلے تو ٹخنوں ٹخنوں پانی میں چلتے رہے۔ کوئی لہر آتی تو وہ ہمیں گھٹنوں تک بھگو دیتی۔ ایسے موقعے پر روبی پیچھے کی طرف بھاگتی تھی۔ وہ اپنے کپڑے بھگونا نہیں چاہتی تھی۔

اچانک ایک بڑی لہر آئی۔ میں اور روبی اس سے لڑکھڑا کر نیچے گر پڑے۔ ہم دونوں ہی کے کپڑے بھیگ گئے۔

میں نے روبی سے کہا ''پریشان مت ہو، یہاں تیز ہوا چند منٹ میں کپڑے سکھا دے گی۔''

اب کپڑے تو بھیگ ہی چکے تھے، میں نے روبی کو پانی کی طرف کھینچا تو اس نے انکار نہیں کیا۔ ہم کمر کمر تک اونچے پانی میں چلے گئے۔ جب کوئی بڑی لہر آتی تو روبی چیختی ہوئی مجھ سے لپٹ جاتی تھی۔ اس کا گداز جسم مجھ سے ٹکراتا تھا تو میرے پورے جسم میں سنسنی پھیل جاتی تھی۔

ایک بہت اونچی لہر آئی تو روبی خوف سے مجھ سے

لپٹ گئی۔ اس مرتبہ میرے قدم بھی اکھڑ گئے۔ میں نیچے گرا تو روبی مجھ پر آ گری اور مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے بھی مضبوطی سے اسے تھام لیا۔ ہم دونوں کچھ دیر تک اسی حالت میں پڑے رہے۔

میں تو اس میدان کا پرانا کھلاڑی تھا، روبی کے لیے البتہ یہ تجربہ نیا تھا۔ اس کی سانسیں بوجھل ہو گئیں پھر وہ آہستگی سے علیحدہ ہو گئی اور بولی ''نعیم! مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''

میں اسے ہٹ میں لے آیا۔ اس کے کپڑے گیلے ہو کر اس کے جسم سے چپک گئے تھے۔

پھر ہٹ میں وہی کچھ ہوا جس سے میں بچنا چاہ رہا تھا۔ میں روبی کی معصومیت کو داغ دار نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن ایسے موقعے پر انسان کو خود پر اختیار رہتا ہی کب ہے؟

وہاں سے واپسی پر روبی بہت افسردہ اور پشیمان تھی لیکن یہ پشیمانی صرف ایک دن کی تھی۔

دوسرے دن وہ پھر میرے ساتھ تھی۔ میں اس کی عزت کو پامال کرتا رہا اور وہ خوشی سے روزانہ لٹتی رہی۔

آخر اس سے میرا دل بھر گیا۔ وہ بھی عام لڑکیوں کی طرح نکلی تھی۔ وہ مجھ سے شادی کا مطالبہ کر رہی تھی لیکن میں اب اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا اور کہا ''تم کیا سمجھتی ہو؟ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا، اس میں صرف میں قصوروار ہوں۔ آپ بھی اس میں برابر کی شریک ہیں۔''

''میں تمہیں قصوروار تو نہیں ٹھہرا رہی۔'' روبی نے کہا۔ ''تم سے صرف اپنا حق مانگ رہی ہوں۔'' وہ رونے لگی ''تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مجھے کبھی نہیں چھوڑو گے۔''

''ایسے وعدے تو میں نے تم سے پہلے بھی بہت سی لڑکیوں سے کیے ہیں۔ تو کیا میں ان سب سے شادی کر لوں؟ روبی بیگم! آپ بھی اب میرے گلے پڑنے کی کوشش نہ کریں۔''

اس نے آنسو بہاتے ہوئے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا، پھر بولی ''او کے! اب میں کبھی تم سے محبت کی بھیک نہیں مانگوں گی۔'' پھر وہ چلی گئی۔

میرا دل بھی کالج سے اچاٹ ہو گیا تھا، کالج کیا میرا دل تو اس شہر ہی سے اچاٹ ہو گیا تھا۔

میں نے پاپا سے کہا ''پاپا! میں امریکا جانا چاہتا ہوں۔''

''جو آدمی اپنے ملک میں کچھ نہ کر سکے، وہ باہر جا کر کیا کر سکتا ہے؟'' عظیم بھائی نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں تمہیں امریکا بھجوا دوں گا۔'' پاپا نے ہامی بھر لی۔

دو ہی مہینے کے اندر میں امریکا آ گیا۔ میں نے وہاں بہت سنجیدگی سے پڑھائی شروع کر دی۔ یوں بھی دنیا کی رنگینیوں سے میرا دل کچھ اوب چکا تھا۔ میں پارٹ ٹائم ملازمت بھی کر رہا تھا۔ یوں زندگی گزر رہی تھی۔

تعلیم سے فارغ ہو کر میں نے وہیں ایک فرم میں ملازمت کر لی۔

اس دوران میں میرے گھر میں کئی انتقالات آئے لیکن میں پاکستان نہیں آیا۔

پہلے عظیم بھائی کی شادی ہوئی پھر زعیم بھائی کی۔ راشدہ باجی کی شادی تو اس وقت ہوئی تھی، جب میں پاکستان میں تھا۔

پاپا نے چاہا کہ میں ان شادیوں میں شرکت کروں لیکن میرا دل ہی نہ چاہا۔

پھر ایک دن مجھے امی کے انتقال کی خبر ملی تو مجھ سے رہا نہ گیا اور میں پاکستان آ گیا۔

میرے دونوں بھائیوں کو یہ شکایت تھی کہ نعیم ہماری خوشی میں شریک نہیں ہوا، خاص طور پر زعیم بھائی تو مجھ سے بہت ناراض تھے۔ ان کی شادی تو گزشتہ ماہ ہی ہوئی تھی۔

''اچھا، میں آپ لوگوں سے معافی چاہتا ہوں، پلیز مجھے معاف کر دیں۔'' میں نے کہا۔

''جاؤ معاف کیا۔'' عظیم بھائی مسکرا کر بولے۔

''ایسے نہیں، آپ لوگ پہلے مجھے میری بھابیوں سے تو ملوائیں۔''

عظیم بھائی کی بیوی بھابی سعدیہ بہت اچھی، پڑھی لکھی اور خوبصورت تھیں۔ انہوں نے ہنس کر کہا ''اچھا تو یہ ہے نعیم!''

''ہاں، فی الحال تو یہی ہے۔'' عظیم بھائی نے کہا تو سب ہنس پڑے۔

پھر زعیم بھائی مجھے اپنے کمرے میں لے گئے اور بولے۔ ''نعیم! اب اپنی بھابی روبی سے ملو۔''

میں نے بھابی کی طرف دیکھا تو میرا دل اچھل کر گویا حلق میں آ گیا۔ وہ روبی ہی تھی، وہی روبی جسے میں نے ایک دفعہ نہیں، کئی بار پامال کیا تھا۔ وہی روبی آج میری عزت بنی میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی نظروں میں میرے لیے تضحیک تھی۔

''ارے بھائی، کیا ہوا؟'' زعیم بھائی نے کہا ''کیا میری بیوی تمہیں پسند نہیں آئی جو تم یوں منہ لٹکائے کھڑے ہو؟''

میں جبراً مسکرایا اور بولا ''زعیم بھائی! روبی بھابی تو بہت خوبصورت ہیں۔'' میں نے کہا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

آخر یہ روبی یہاں تک پہنچی کیسے؟ میں نے سوچا مگر مجھے اس کا جواب نہ ملا۔

☆☆☆

اب مجھے وہاں رہتے ہوئے بھی وحشت ہوتی تھی۔

ایک دن میں لان میں بیٹھا ہوا تھا کہ روبی آ گئی اور بولی۔ ''نعیم! تم نے مجھے ٹھکرا دیا تھا لیکن تمہارے بھائی نے مجھے اس گھر کی عزت بنا لیا۔ ہوں تو میں وہی بدکردار اور بدچلن لڑکی جسے تم نے ٹھکرایا تھا۔''

''روبی! اب ان باتوں کو چھوڑو۔ اب تم اس گھر کی عزت ہو۔'' میں نے کہا۔

''میں عزت والی کب ہوں۔'' روبی نے کہا ''میں تو تمہیں بھی پورے گھر کے سامنے بے نقاب کروں گی۔''

''ضرور کرو۔'' میں نے کہا ''پھر اس گھر میں تمہارے لیے کوئی گنجائش نہ ہوگی۔''

''تو نہ ہو۔'' وہ طنزیہ انداز میں مسکرائی ''میں تو خود اس گھر میں رہنا نہیں چاہتی۔''

''اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں روبی!'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا ''اب تم صرف اور صرف ڈاکٹر زعیم احمد کی بیوی ہو، اس کی عزت ہو اور بس!''

''میں تو خود بدچلن ہوں، بدکردار ہوں، میں کسی کی عزت کیسے ہو سکتی ہوں؟''

وہ میرے ہی الفاظ دہرا رہی تھی۔

''روبی پلیز!'' میں نے کہا ''اب تم سب کچھ بھول جاؤ اور صرف مستقبل کی طرف دیکھو۔''

''میں سب کچھ بھول جاؤں گی لیکن تمہیں بے نقاب کرنے کے بعد۔'' روبی یہ کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔

میرے دل میں عجیب وسوسے آ رہے تھے۔ اگر زعیم بھائی کو اس بات کا علم ہوا تو جانے وہ کیا سوچیں گے؟ پاپا اور عظیم بھائی کے سامنے میری کیا عزت رہ جائے گی؟

روبی سے کچھ بعید نہیں تھا، وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ وہ مجھے میرے سارے گھر والوں کے سامنے ننگا کر سکتی تھی۔

میں سوچ کر آیا تھا کہ پاکستان ہی میں ملازمت تلاش کروں گا لیکن اب میں نے یہاں رہنے کا فیصلہ بدل دیا تھا اور واپس امریکا جا رہا تھا۔

پاپا نے مجھے سمجھایا، دونوں بھائیوں نے سمجھایا لیکن میں کسی بھی قیمت پر وہاں رکنا نہیں چاہتا تھا۔

ایک دن موقع پا کر روبی مجھ سے بولی ''تم کیا سمجھتے ہو، تم یہاں سے فرار ہو کر مجھ سے بچ جاؤ گے؟ میں تو تمہیں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑوں گی۔ تم کیا میری زبان بھی ساتھ لے جاؤ گے؟''

مجھے روبی کے تیور خطرناک نظر آ رہے تھے لیکن میں کچھ بولا نہیں۔

روبی شام کو اکثر ادھر میرس میں چلی جاتی تھی اور گھنٹوں وہاں بیٹھی رہتی۔ ایک دن گھر میں کوئی نہیں تھا۔ صرف پاپا تھے کہ روبی کا پاؤں پھسلا اور وہ میرس سے نیچے گر پڑی۔

میں گھر پہنچا تو مجھے یہ اندوہناک خبر ملی۔ زعیم بھائی روبی کو اسپتال لے گئے جہاں پہنچ کر بھی روبی بچ نہ سکی۔ میرس سے گرنے سے شاید وہ بچ جاتی لیکن اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی، پھر وہ امید سے بھی تھی اس لیے اس کا بچنا محال تھا۔ آخر کچھ دیر بعد وہ ہمیشہ کے لیے دنیا سے منہ موڑ گئی۔

گھر کے تمام لوگ بری طرح رو رہے تھے۔ بہ ظاہر میں بھی زعیم بھائی کے غم میں شریک تھا لیکن اندر سے میں بہت خوش تھا کہ میرے راستے کا کانٹا خود بہ خود دور ہو گیا۔

کچھ دن پاکستان میں رہنے کے بعد میں واپس امریکا چلا گیا اور خود کو بھولنے کے لیے دن رات شراب و شباب میں ڈبوئے رکھنے کی کوشش کرنے لگا مگر اس کا نتیجہ بھی جلد سامنے آ گیا، ایڈز جیسے موذی مرض نے مجھے گھیر لیا۔

اب کسی بھی وقت میری زندگی کی شام ہونے والی ہے۔ چراغ آخر شب ہوں، کسی بھی وقت بجھ سکتا ہوں۔ موت مجھ کو میری طرف بڑھ رہی ہے۔ میں مرنے ہوئے آپ سے اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ روبی کی موت پر پچھتاوے سے نہیں ہوئی تھی بلکہ میں نے اسے اوپر سے نیچے دھکیلا تھا۔ اتنی بلندی سے گر کر کوئی مرتا نہیں ہے، یہی سوچ کر میں نے پہلے اس کی گردن پر زبردست وار کیا تھا، پھر وہ حاملہ تھی اور ولادت نزدیک تھی اس لیے مجھے یقین تھا کہ وہ بچ نہیں سکے گی۔ ایسا ہی ہوا تھا لیکن اب ضمیر کی خلش مجھے بے چین رکھتی ہے کہ کاش..... میں نے ایسا نہ کیا ہوتا؟ اب تو پروردگار میں اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں۔ میرے گناہ قابل معافی تو نہیں ہیں لیکن وہ رحیم و کریم ہے، وہ مجھے بخش سکتا ہے لیکن روبی جیسی دوسری لڑکیاں مجھے کبھی معاف نہیں کریں گی۔ بس، آپ سب سے درخواست ہے کہ میرے حق میں دعا کریں کہ مجھے سکون مل جائے کہ میں نہ جانے کب سے گناہوں کی تاریکیوں میں بھٹک رہا ہوں۔ مجھ تک دعاؤں کی روشنی ضرور پہنچے گی۔ شاید اللہ تعالیٰ آپ ہی کی دعا سن لے کہ میں تو اب چراغ سحری ہوں۔

وہ میرے دفتر میں زبردستی گھس آئی تھی۔

میرے عہدے کا تقاضا یہ تھا کہ ملاقاتی وقت طے کرنے کے بعد مجھ سے ملتے تھے اور وہ بھی میری پرسنل سیکریٹری کی معرفت۔ وہ مجھے انٹرکام پر اطلاع کرتی تھی تو پھر میری مرضی، میں ملوں یا نہ ملوں لیکن وہ اس طرح گھستی چلی آئی تھی جیسے اس کے باپ کا دفتر ہو اور اس کے..... پیچھے پیچھے میری سیکریٹری اور چپراسی دونوں اندر آئے تھے۔ چپراسی تو خیر مرد تھا، لڑکی کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا لیکن میری سیکریٹری نے اسے گھسیٹ کر باہر لے جانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ پتھر کی طرح جم کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''سر، آپ دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے روکنے کے باوجود یہ اندر چلی آئی اور اب باہر جانے کو بھی تیار نہیں ہے۔''

''اسے چھوڑو اور تم دونوں باہر چلے جاؤ۔''

''سر، آپ کہیں تو پولیس.....''

طمانچہ

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم!
مجھے ایک نوعمر لڑکی نے جو طمانچہ رسید کیا ہے اس کی ٹیس میں تاعمر محسوس کرتا رہوں گا۔ اس نے وہ طمانچہ کیوں اور کس لیے، کس طرح مارا یہ آپ بھی ملاحظہ کرلیں۔ میں تو یہ سوچ کر خاموش ہوں کہ یہ میرے کیے کی سزا ہے۔

توقیر علی خان
(سرگودھا)

میری سیکریٹری کے باقی الفاظ ابھی اس کے منہ میں تھے کہ میری آنکھیں دیکھ کر وہ باہر نکل گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے چپراسی بھی چلا گیا۔ اس لڑکی نے ایک جھٹکے سے اپنے ماتھے کے بال ہٹائے اور میری طرف امید بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ میں کوئی نوجوان لڑکا نہیں تھا کہ اس کی اس ادا پر نثار ہو جاتا۔ 52 سالہ پختہ مرد تھا اور جس عہدے پر تھا اس نے مجھے مزید پختہ کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے ابھی تک اسے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا تھا لیکن پھر بھی یہ پوچھنا ضروری تھا کہ وہ کس مقصد سے آئی ہے۔

''یہ مت سمجھنا کہ مجھے تم پر رحم آ گیا اس لیے اپنے اسٹاف کو باہر بھیج دیا اور اب تمہارے آنسو پونچھوں گا۔''

''میں رو کہاں رہی ہوں سر!''

''زیادہ باتیں مت بناؤ۔ یہ بتاؤ کس ارادے سے آئی ہو اور کیا چاہتی ہو۔''

''سر، میں بہت غریب لڑکی ہوں۔ میں نے بی ایس سی کیا ہے۔ ٹائپنگ بھی جانتی ہوں۔''

''نوکری چاہتی ہو؟''

''جی سر!'' اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''تم نے اپنے طریقے پر غور کیا؟ کسی کے گھر میں اجازت کے بغیر گھسو گی تو کوئی بھیک بھی نہیں دے گا۔''

''سر، میں معافی چاہتی ہوں۔ میری ضرورت اس طرح مجھے لے آئی۔''

''میرے دفتر میں کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔ کہیں اور ٹرائی کرو۔''

''سر، میں آدھے شہر میں گھوم چکی ہوں۔ ہر جگہ سے یہی جواب ملتا ہے۔ آپ کے دفتر میں آنے سے پہلے میں نے سوچ لیا تھا کہ کچھ ہو جائے، نوکری لے کر جاؤں گی۔''

''میں نے کہہ دیا، میرے دفتر میں نوکری نہیں ہے۔ اب تم جا سکتی ہو۔ گیٹ آؤٹ فرام ہیئر۔'' میں اتنی زور سے چیخا تھا کہ اصولاً اسے چلا جانا چاہیے تھا لیکن وہ ڈھیٹ بن کر کھڑی تھی۔ ''تم جاتی ہو یا بے عزت کر کے نکلواؤں؟'' میں پھر چیخا۔

''کمرے سے چلی جاتی ہوں لیکن نوکری تو مجھے یہیں کرنی ہے۔'' اس نے کہا تھا اور باہر چلی گئی تھی۔

اس کے چلے جانے کے بعد میں اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ پھر ایک دوست آ گئے، ان سے گپ شپ کرتا رہا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد میری سیکریٹری میرے کمرے میں آئی۔

''سر، اس لڑکی سے آپ نے باہر انتظار کرنے کے لیے کہا ہے؟''

''نہیں تو۔''

''وہ ابھی تک باہر بیٹھی ہوئی ہے۔''

''بیٹھی رہنے دو، تمہارا کیا لے رہی ہے؟''

''سر، یہ ڈسپلن کے خلاف ہے۔ اس طرح تو کوئی بھی وقت گزاری کے لیے باہر سے آ کر یہاں بیٹھ جائے گا۔''

''ہٹا دو اسے۔ میں نے تمہیں روکا تو نہیں ہے۔''

''بس سر، یہی پوچھنا تھا کہ آپ کے کہنے سے تو وہ یہاں نہیں بیٹھی ہے؟''

کچھ دیر بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ چلی گئی ہے۔ میں نے شکر ادا کیا کہ بلا ٹلی۔ نہ جانے کیوں وہ میرے اعصاب پر سوار ہو گئی تھی۔ اس کے چلے جانے کے بعد بھی میں اس کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اس کی ڈھٹائی پر غصہ بھی آ رہا تھا اور یہ احساس بھی ہو رہا تھا کہ وہ واقعی ضرورت مند ہے۔

دفتر کی چھٹی کا وقت ہوا تو میں نے چپراسی کو بلایا۔ وہ اندر آیا اور میرا بریف کیس اور کچھ فائلیں اٹھا کر گاڑی میں رکھنے چلا گیا۔ میں نے واش روم میں جا کر ٹائی کی ناٹ درست کی، بال سنوارے۔ باہر نکل کر کرسی پر پڑا کوٹ ہاتھ پر ڈالا اور کمرے سے نکل آیا۔ میں گاڑی خود ڈرائیو کرتا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور گاڑی کو پارکنگ سے نکال لیا۔

میں نے گھر کے سامنے پہنچ کر گیٹ کھلوانے کے لیے ہارن دیا ہی تھا کہ وہی لڑکی دوڑتے ہوئے گاڑی کے قریب آ گئی۔ میں نے اسے دیکھتے ہی اپنی طرف کا شیشہ اتار دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہاں کوئی ہنگامہ کھڑا ہو۔ میری بیوی ویسے ہی شکی مزاج تھی۔ اگر وہ اسے دیکھ لیتی تو ہزار باتیں دل سے بنا لیتی۔

چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تھا۔ میں گاڑی اندر لے جا سکتا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ دوڑتے ہوئے اندر آ جائے گی۔ اسے باہر ہی سے ٹہلا دینا ضروری تھا۔

''تمہیں جو کچھ کہنا ہے، کل دفتر آ کر مجھ سے ملو۔ یہاں میں تمہاری کوئی بات نہیں سن سکتا۔''

''آپ اجازت دے رہے ہیں؟ کل آ جاؤں دفتر؟''

''ہاں بابا، آ جانا۔'' میں نے گاڑی آگے بڑھا دی اور وہ پیچھے ہٹ گئی۔

میں نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی۔ ایک ملازم اس وقت تک گاڑی کے قریب آ چکا تھا۔ اس نے بریف کیس اور فائلیں اٹھائیں۔ میں لاؤنج میں آ کر جوتے اتارنے لگا۔ گھر میں سناٹا تھا۔ میری بیوی عرفانہ کو تو خیر میرے استقبال کی کبھی

توفیق ہی نہیں ہوئی تھی لیکن بچوں کو تو معلوم ہوتا تھا کہ میں آ رہا ہوں۔

''گھر میں کوئی نہیں ہے؟''

''نہیں صاحب! بی بی جی کی کوئی سہیلی باہر سے آ رہی تھیں، انہیں لینے ائرپورٹ گئی ہیں۔''

''اور بچے؟''

''وہ بھی ساتھ گئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، تم خیر محمد سے کہہ کر چائے بنواؤ۔'' میں نے کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

میرا ذہن اس وقت اس لڑکی اور عرفانہ میں الجھا ہوا تھا۔ عرفانہ کو اتنی تمیز نہیں کہ میرے دفتر سے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ اتنی ہی ایمرجنسی تھی تو فون کر سکتی تھی۔ ایک وہ لڑکی ہے جو چند روپوں کی نوکری کی خاطر بے عزتی کے باوجود پیچھے پڑی ہوئی ہے ایک یہ ہیں کہ جیسے میری کوئی اہمیت ہی نہیں۔

میں غسل کرنے اور کپڑے بدلنے کے بعد باہر آیا تو... خیر محمد چائے بنا چکا تھا۔ ہم شام کی چائے عموماً لان میں بیٹھ کر پیا کرتے تھے لیکن اس وقت اکیلا بیٹھ کر کیا کرتا۔ میں نے چائے اپنے کمرے میں منگوالی۔ کچھ دیر بعد عرفانہ آ گئی تھی۔ میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ اگر جانا ہی تھا تو کم از کم فون ہی کر دیا ہوتا اور اس نے پورا گھر سر پر اٹھا لیا تھا۔ نوکروں کے سامنے میری بے عزتی کرنا اس کا معمول تھا۔ وہ جب گرجتی تھی تو یہ نہیں دیکھتی تھی کہ نوکر سن کر کیا کہیں گے اور پھر کئی روز کے لیے بول چال بند ہو جاتی تھی۔

میں اس سے اتنا دبتا کیوں تھا؟ اس لیے کہ اسی کے بل بوتے پر میں یہ شاندار زندگی گزار رہا تھا۔ میں مختصر اپنے اور اس کے بارے میں بتا دوں۔ میرے سسر یعنی عرفانہ کے والد کی انشورنس کمپنی تھی۔ میں وہاں منیجر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ وہ مجھے بہت پسند کرتے تھے۔ پھر ایک روز انہوں نے پیش کش کر دی کہ میں ان کی بیٹی یعنی عرفانہ سے شادی کر لوں۔ یہ پیش کش ایسی دل خوش کن تھی کہ میں کیا کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا تھا، میں نے سر جھکا دیا اور یوں عرفانہ سے میری شادی ہو گئی۔ ہم دونوں کی لیٹ میرج ہوئی تھی۔ میں چھتیس سال کا تھا اور عرفانہ بتیس سال کی ہو گئی تھی۔ اس کی عمر زیادہ ہو گئی تھی غالباً اسی لیے میرے سسر اس کی شادی مجھ سے کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ میں ان دنوں ایک سو بیس گز کے چھوٹے سے مکان میں رہا کرتا تھا۔ میرے سسر کی شان کے خلاف تھا کہ میں ان کی بیٹی کو بیاہ کر اس چھوٹے سے مکان میں لے کر جاؤں لہٰذا انہوں نے جہیز میں یہ بنگلا دیا تھا جس میں، میں اب رہ رہا تھا اور ظاہر ہے یہ میرا نہیں عرفانہ کا تھا۔ مجھے شروع میں ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ عرفانہ بدزبان اور بدمزاج ہے لیکن سونے کا انڈا دینے والی مرغی تھی لہٰذا مجھے برداشت کرنا پڑا۔

میری شادی کے صرف دو سال بعد میرے سسر کا انتقال ہو گیا۔ انہیں احساس ہو گیا تھا کہ وہ بچیں گے نہیں لہٰذا انتقال سے صرف دو دن قبل انہوں نے وکیل کو بلا کر اپنی انشورنس کمپنی عرفانہ کے نام کر دی تھی اور مجھے اپنی جگہ ایم ڈی مقرر کر دیا تھا۔ اب میں اس کمپنی کا مالک بھی تھا اور عرفانہ کا نوکر بھی۔ اب یہ عرفانہ کے ظرف کا امتحان تھا کہ وہ مجھے شوہر سمجھتی ہے یا اپنی کمپنی کا ملازم۔ اس نے مجھے شوہر سمجھا ہی نہیں حالانکہ میں نے اسے شروع میں ہی جتا دیا تھا کہ گھر میں آنے کے بعد میں اس کا شوہر ہوں، اس کی کمپنی کا اعلیٰ عہدے دار نہیں لیکن وہ ہمیشہ مجھے اپنا نوکر ہی سمجھتی رہی۔ مجھے اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے تھا لیکن ہر دو چار دن کے بعد میرے اندر کا مرد جاگ جاتا تھا اور ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ مجھے اپنی بے عزتی کرانے کا شوق سا ہو گیا تھا۔ اب تو بچے بھی بڑے ہو گئے تھے۔ بڑا بیٹا تیرہ سال کا اور چھوٹا دس سال کا تھا۔

اس جھگڑے کے بعد دوسرے دن میں دفتر گیا تو مجھے یاد بھی نہیں تھا کہ وہ لڑکی مجھ سے ملنے آئے گی۔ عرفانہ سے جھگڑے کے بعد موڈ بھی ایسا ہو گیا تھا کہ اپنے سوا کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ دفتر میں بیٹھے ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے کہ میری سیکریٹری نے اس کے آنے کی اطلاع دی۔

''سر، وہ لڑکی جو کل آئی تھی پھر آ گئی ہے اور اندر آنے کی ضد کر رہی ہے۔ کہتی ہے آپ نے اسے بلایا تھا۔''

''اسے اندر بھیج دو۔''

سیکریٹری کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے بلا رہا ہوں۔ اس نے دوبارہ یہی سوال پوچھا تھا اور میں نے ڈانٹ کر اپنا جواب دہرایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ کھلا اور وہ ہنستی مسکراتی اندر آ گئی۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور وہ میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے بیٹھ گئی۔

''سر، آپ کتنے اچھے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ آپ مجھے نوکری ضرور دیں گے۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے اس کی خوشی کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''سر، نائلہ! نائلہ متین۔''

''شادی شدہ ہو؟''

''نہیں سر، ابھی کہاں۔''

"تم ٹائپسٹ کی جاب قبول کرلوگی؟"

"میں ہر کام کرنے کو تیار ہوں۔"

"تم منیجر صاحب سے جا کر مل لو۔ میں فون پر ان سے بات کرلوں گا۔"

"آپ مل تو نہیں رہے ہیں۔"

"تمہیں بات کرنے کی تمیز ہے یا نہیں؟" میں نے بری طرح اسے جھڑکا "میں جھوٹ بولوں گا تم سے؟"

"سوری سر!"

"میری سیکریٹری سے مل لو' وہ تمہیں گائڈ کردے گی۔"

وہ اٹھ کر چلی گئی۔ میں نے سیکریٹری کو سمجھا دیا۔ منیجر سے بھی کہہ دیا کہ وہ اسے رکھ لیں۔ مجھے یاد ہے چھٹی ہونے سے کچھ دیر پہلے وہ آئی تھی اور میرا شکریہ ادا کیا تھا۔ میں نے پھر اس کی دل شکنی کی تھی۔

"یہ خوشامد چھوڑو اور اپنے کام سے کام رکھو اور ہاں، آئندہ میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"جی سر!" اس نے کہا تھا اور چلی گئی تھی۔

اسے واقعی میں نے پھر بہت دنوں تک نہیں دیکھا۔ ایک معمولی درجے کی ٹائپسٹ سے میرا تعلق بھی کیا تھا۔ دفتر سے باہر نکلنے کا راستہ بھی میرے لیے الگ بنایا گیا تھا لہٰذا آمنا سامنا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کچھ مہینوں بعد مجھے اس کی یاد اس طرح آئی کہ اچھی کارکردگی کی بنا پر کچھ ملازمین کی تنخواہ میں اضافے کی سفارش کی گئی تھی۔ منظوری مجھے دینی تھی۔ یہ فہرست میرے سامنے آئی تو اس میں نائلہ تبسم کا نام بھی تھا۔ میں نے نہ جانے کس جذبے کے تحت اسے بلا لیا۔

"تمہارا نام میرے پاس اس سفارش کے ساتھ آیا ہوا ہے کہ تمہاری تنخواہ بڑھا دی جائے۔"

"جی سر، مجھے معلوم ہوا تھا۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تم دل لگا کر کام کررہی ہو۔"

"شکریہ سر!"

"تم مجھے کیسا آدمی سمجھتی ہو؟"

"آپ بہت اچھے انسان ہیں۔"

"میں تمہارے ساتھ بہت بری طرح پیش آتا رہا ہوں' تم پھر بھی میری تعریف کررہی ہو۔ صرف اس لیے کہ میں مالک ہوں اس دفتر کا؟"

"نہیں سر' میں کسی کی جھوٹی تعریف نہیں کرتی۔ غلطی میری تھی، میں آپ کے دفتر میں گھس آئی تھی۔ اس کے باوجود آپ نے مجھے نوکری دی۔ تھوڑا بہت ڈانٹ لیا تو کیا ہوا۔ آپ میرے بڑے بھی تو ہیں۔"

"تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں؟"

"نہیں سر' سب لوگ بہت اچھے ہیں۔"

میں نے اس کے گھر کے متعلق بھی بہت سی باتیں کی تھیں، گھر والوں کے متعلق بھی پوچھا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ اس کے والد سرکاری ملازم تھے لیکن قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی ہے کیونکہ بیمار رہتے ہیں۔ ایک بھائی ہے جو ایک پرائیوٹ نوکری کرتا ہے۔ ایک چھوٹی بہن ہے جو پڑھتی ہے اور والدہ ہیں۔

اس کے بعد وہ پھر کہیں غائب ہوگئی تھی یا یوں کہیے کہ میرا اور اس کا کوئی جوڑ ہی نہیں تھا۔ جب تک میں نہ بلاؤں اس سے ملاقات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ پھر اسے بلانے کا ایک بہانہ مل گیا۔ میری سیکریٹری تین ماہ کی رخصت پر جارہی تھی۔ میں اس کی چھٹی منظور کرنے میں پس و پیش کررہا تھا کہ کون سنبھالے گا۔ اچانک مجھے نائلہ تبسم کی یاد آگئی۔ دفتر میں لڑکیاں اور بھی تھیں پھر وہ ہی کیوں یاد آئی، شاید وہ میرے دل میں کہیں چھپی ہوئی تھی۔

وہ ایک مرتبہ پھر میرے دفتر میں بیٹھی ہوئی تھی اور میں اسے بتا رہا تھا کہ میری سیکریٹری رخصت پر جارہی ہے۔ میں چاہتا ہوں اس کی غیر حاضری میں تم اس کی جگہ سنبھال لو۔

"میں..... سر! میں یہ کام کیسے کرسکتی ہوں؟"

"اس میں ہے ہی کیا۔ چند فون اٹینڈ کرنے ہوں گے۔ مجھے میرے اپائنٹمنٹ یاد دلانے ہوں گے اور بس۔ کوئی تم جیسی سر پھری لڑکی آجائے تو اسے روکنا ہوگا۔"

اسے توقع نہیں تھی کہ میں اس سے مذاق بھی کرسکتا ہوں۔ ہنسنے کے بجائے وہ اور زیادہ سنجیدہ ہوگئی تھی۔ شاید ذمے داریوں کے احساس نے اسے سنجیدہ بنا دیا تھا۔ میں نے اس دن اس کی طرف غور سے دیکھا تھا۔ اسے خوبصورت کہا جاسکتا تھا۔ آنکھیں اور ہنسی تو بہت ہی خوبصورت تھی۔

"تمہاری تنخواہ میں بھی اضافہ ہوجائے گا۔ سیکریٹری کے آجانے کے بعد بھی تمہیں اضافی تنخواہ ملتی رہے گی۔" میں نے اسے ایک اور لالچ دیا تھا۔

"سر، آپ تنخواہ نہ بھی بڑھائیں تو بھی آپ کا حکم ماننا میرا فرض ہے۔ آپ کی خدمت کرکے مجھے خوشی ہوگی۔ آپ میرے محسن ہیں۔"

"مس مینا کی درخواست میں منظور کیے لیتا ہوں۔ کل سے اس کی جگہ تم بیٹھو گی۔"

"تھینک یو سر!"

دوسرے دن سے وہ میرے کمرے سے ملحق کمرے میں بیٹھنے لگی۔ میرے کمرے میں آنے کے لیے اندر ہی سے دروازہ تھا۔ ویسے اندر آنے کی ضرورت پڑتی نہیں تھی جب تک میں نہ بلاؤں۔ فون پر البتہ اس کی آواز بار بار سننے کو ملتی تھی۔

سیکریٹری اور باس کا رشتہ دوریوں کے باوجود قربت کا ہوتا ہے اور اس کے لیے تو میں اپنے دل میں ایک خاص جذبہ محسوس کرنے لگا تھا۔ کچھ دن تو میں اسے رحم کا جذبہ قرار دیتا رہا پھر مجھے اس حقیقت کو محسوس کرنے لگا کہ مجھے اس سے محبت ہوگئی ہے۔ کبھی کبھی ہنسی بھی آتی تھی کہ میں یہ کس راہ چل پڑا ہوں۔ میری اور اس کی عمر میں کتنا فرق ہے۔ اگر میری صحیح عمر میں شادی ہوجاتی تو اتنی بڑی تو میری بیٹی ہوتی۔

اس روز میں چھٹی کے بعد تک کام کرتا رہا تھا۔ نائلہ مجھ سے کئی مرتبہ پوچھ چکی تھی۔ پھر میں نے اس سے کہا کہ وہ چلی جائے' مجھے کسی کے فون کا انتظار ہے۔ چوکیدار سے میں نے کہہ دیا تھا، جب مجھے جانا ہوگا تمہیں بلا لوں گا۔ آکر کمرا بند کردینا۔

کام ختم کرنے کے بعد میں کمرے سے نکلا۔ میں یہ دیکھ کر ٹھٹک گیا کہ نائلہ اپنی سیٹ پر موجود تھی۔

"تم گئیں نہیں؟"

"سر، آپ بیٹھے تھے، میں کیسے چلی جاتی۔"

"میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ چلی جاؤ۔"

"بس جانے ہی والی تھی۔"

"کیسے جاؤ گی؟"

"جیسے روز جاتی ہوں، بس سے یا کوئی رکشا لے لوں گی۔"

"آؤ، میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔"

"نہیں سر، آپ کو دیر ہوجائے گی۔ بیگم صاحبہ انتظار کررہی ہوں گی۔"

"میں نے فون کردیا تھا۔"

وہ پھیلا دوپٹا کھول کر مینڈھ رہی تھی لیکن میرے اصرار پر آگے بیٹھ گئی۔

"مس نائلہ! تمہیں موسموں میں سے کون سا موسم پسند ہے؟" میں نے بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈا۔

"مجھے تو برسات کا موسم بہت پسند ہے۔"

"اس معاملے میں میری تمہاری پسند ایک ہے۔ مجھے بھی برسات کا موسم بہت اچھا لگتا ہے۔"

"یہ تو عورتوں کی پسند ہے سر!"

"ہر وہ مانگ آدمی کے اندر ایک عورت بھی چھپی ہوتی ہے۔"

"پھر تو آپ شعر بھی کہتے ہوں گے؟"

"نہیں بھئی، یہ خرافات نہیں البتہ دوسروں کے شعر اچھی عورتوں کو دیکھ کر پڑھ ضرور لیتا ہوں۔"

"آپ تو مجھے شروع میں بہت سخت لگے تھے مگر آپ تو بہت نرم دل ہیں۔"

"نرم دل تھا تو نہیں مگر اب لگتا ہے، ہوگیا ہوں۔"

"اب کیوں؟"

"کسی وقت فرصت سے بیٹھیں گے تو بتاؤں گا۔" میری ہمت جواب دے گئی تھی "اس وقت تو یہ بتاؤ مجھے کس طرف جانا ہے؟ ناظم آباد آگیا ہے، تمہیں اپنے گھر کا راستہ تو معلوم ہوگا۔"

"آپ مجھے گھر تک چھوڑیں گے؟"

"نہ صرف چھوڑوں گا بلکہ تمہارے گھر میں بیٹھ کر تمہارے ہاتھ کی چائے بھی پیوں گا۔"

"بس اب جو کٹ آرہا ہے، اس سے اندر گلی میں لے لیجیے گا۔"

اس کے کہنے پر میں نے ایک گھر کے سامنے گاڑی روک لی۔ مجھ سے پہلے وہ اتری اور دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ کوئی لڑکی اندر سے نکلی۔ وہ اس کی چھوٹی بہن تھی۔ نائلہ اندر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی اور مجھے اندر بلا لیا۔

وہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ فرنیچر پرانا تھا مگر بڑے سلیقے سے رکھا ہوا تھا۔ اس کے والد اور والدہ بھی آکر بیٹھ گئے۔ اس کی والدہ میری تعریفیں کررہی تھیں لیکن ہر جملے میں میری عمر کا تذکرہ ہورہا تھا۔

"بس اب مطمئن ہوگئی کہ نائلہ آپ کی سرپرستی میں کام کررہی ہے۔ میں سمجھ رہی تھی کہ کوئی لڑکا بالا ہوگا۔ آپ تو بڑی عمر کے ہیں، نائلہ کے لیے تو اس کے بزرگ ہی ہیں اور اتنے اچھے اخلاق کے کہ ہم غریبوں کے گھر آگئے۔"

اس کے والد نے بھی کہا "آپ بچوں والے ہیں نائلہ کا ضرور خیال رکھیں گے۔"

میں نائلہ کے گھر سے لوٹا تو میری عجیب حالت تھی۔ مجھے اپنی عمر اور مرتبے کا شدت سے احساس ہورہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جو باتیں اس کے والدین کررہے تھے، وہ نائلہ کی زبان سے ادا ہورہی تھیں۔ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں لیکن وہ تو مجھے اپنا بزرگ ہی سمجھ رہی ہوگی۔ میں اگر ابتدائی عمر میں ہوتا تو اب تک اظہارِ محبت کرچکا ہوتا لیکن اب میں نائلہ کے ردِعمل سے ڈر رہا تھا۔ میں نے سوچا زبانی اظہارِ محبت کے بجائے اپنے رویے سے ظاہر کروں کہ میں اسے پسند کرنے لگا ہوں۔ اب میں زیادہ سے زیادہ اس کے قریب

رہنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ اس کا ایک نادر موقع مجھے مل گیا۔ میری سیکریٹری کا استعفیٰ آ گیا۔ نائلہ جو عارضی طور پر اس سیٹ پر آئی تھی، مستقل ہوگئی۔ میں نے اسے خوش کرنے کے لیے اس کی تنخواہ دوگنی کردی۔ اب میں یہ اہتمام بھی کرنے لگا تھا کہ وہ اپنے کمرے سے زیادہ میرے کمرے میں رہے۔ کسی نہ کسی بہانے بلا لیتا اور ہم دونوں باتیں کرتے رہتے۔ دفتر کے لوگ میری اس تبدیلی کو دیکھ رہے تھے یقیناً نائلہ نے بھی محسوس کرلیا تھا کیونکہ اب اس کی جھجک ختم ہوگئی تھی۔ اس کی باتوں میں شوخی آ گئی تھی۔ میرے دیے ہوئے تحفے بھی قبول کرنے لگی تھی۔

اس روز دفتر کا ہاف ڈے تھا۔ میں نے ہمت کرکے نائلہ کو کہیں باہر چلنے کی پیش کش کی جو حیرت انگیز طور پر اس نے مان لی۔ باتیں کرنے کا سوقع دفتر میں بھی مل جاتا تھا۔ کوئی ڈسٹرب کرنے والا نہیں تھا۔ میں تو صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ جانے پر تیار ہوتی ہے یا نہیں؟ وہ تیار ہوگئی تھی۔ اب میری عمر سے زیادہ میرا عہدہ آڑے آ رہا تھا۔ میں ٹین ایجر لڑکوں کی طرح ساحلِ سمندر پر جا کر نہیں بیٹھ سکتا تھا، لے دے کے کوئی ہوٹل ہی رہ جاتا تھا۔ میں اسے لے کر شیرٹن چلا گیا جہاں پُرتکلف لنچ کیا۔ وہ یقیناً یہاں پہلی مرتبہ آئی ہوگی۔ ایک ایک چیز کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ کچھ نروس سی بھی لگ رہی تھی۔ یہ فطری امر تھا۔ وہ پہلی مرتبہ میرے ساتھ آئی تھی اور پھر اتنے بڑے ہوٹل میں۔ یہاں کے ماحول سے ناآشنا تھی۔

میں چاہتا تھا اس سے اس کی کچھ ذاتی باتیں پوچھوں لیکن مجھ سے پہلے وہ میرے بارے میں جاننے کی کوشش کرنے لگی۔ میری بیوی کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ میرے بچوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کررہی تھی۔ مجھے معلوم تھا، اس موقع پر مجھے کیا کہنا ہے۔ بیوی سے میرے تعلقات خوشگوار نہیں تھے۔ اس کا اظہار میں نے اس کے سامنے کرنا بھی ضروری سمجھا تاکہ وہ سمجھ سکے کہ میں اس کے ساتھ وقت گزارنے پر کیوں مجبور ہوں۔ اس نے سب باتیں سننے کے بعد بڑی سمجھداری کی بات کی۔

''ہم صرف باہر سے دیکھتے ہیں اور لوگ ہمیں خوش نظر آتے ہیں۔ کسی انسان کے اندر کون سا غم چھپا ہے، ہمیں معلوم ہی نہیں ہوتا۔ میں سمجھتی تھی، آپ کتنے خوش ہوں گے۔ اتنے بڑے کاروبار کے مالک ہیں۔ کتنے لوگ آپ کے ماتحت ہیں' ہر نعمت آپ کو میسر ہے۔ آپ اتنے دکھی ہو سکتے ہیں، یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔''

''میں تو تمہارا شکر گزار ہوں نائلہ! تمہارے ساتھ وقت گزر جاتا ہے۔''

''میں بھی کب تک سر! آپ اپنی بیوی کو سمجھانے کی کوشش کریں۔''

''وہ سمجھے... کی نہیں ہے۔ شاید کبھی کوئی ساتھی مجھے مل جائے مگر اس عمر میں کون میرا ساتھ دے گا؟''

''کیوں، آپ کی عمر کو کیا ہوگیا۔ میچور لوگوں کو تو آج کل لڑکیاں بہت پسند کررہی ہیں۔''

میرے جی میں آئی تھی کہ اس سے پوچھوں، سب کی چھوڑو تم بتاؤ، تمہیں میچور لوگ پسند ہیں یا نہیں اور میں تمہیں کیسا لگتا ہوں، میں نے سوچا ضرور لیکن کہنے کی ہمت نہ کرسکا۔

گھر آ کر بہت دیر تک اس نشے میں رہا کہ نائلہ کو میچور لوگ پسند ہیں۔ اب کسی وقت اس سے وہ بات بھی کہہ سکتا ہوں جو میرے دل میں ہے۔

میں اپنے دل میں پوری طرح طے کرچکا تھا کہ اگر نائلہ تیار ہوئی تو میں اس سے شادی کرلوں گا۔ اس دن میں نے اسے بلایا بھی اسی ارادے سے تھا۔ بیوی سے زبردست جھگڑا ہوا تھا اس لیے میں بھرا بیٹھا تھا اور سوچ لیا تھا کہ آج جو کچھ دل میں ہے ضرور کہہ دوں گا، وہ آئی تو کچھ اداس نظر آ رہی تھی۔ میں نے یونہی اس کی اداسی کا سبب پوچھ لیا۔ اس نے جو وجہ بتائی اس نے میرے ہوش اڑا دیے۔

''سر، گھر میں میری شادی کی باتیں ہورہی ہیں۔ میرے کزن کا رشتہ میرے لیے آیا ہے۔''

''یہ تو خوشی کی بات ہے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ اگر تمہیں نوکری کی پریشانی ہے تو فکر مت کرنا، شادی کے بعد بھی نوکری کرتی رہو گی۔''

''مجھے نوکری کی فکر نہیں ہے۔'' نائلہ نے کہا ''میں اس سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتی۔''

''کیوں بھئی، کیا خرابی ہے اس میں؟''

''میرٹ پسند میچور آدمی ہے، میں زیرہ میسر سے زندگی شروع کرنا نہیں چاہتی۔''

''میچور آدمی سے تمہاری کیا مراد ہے، جیسے میں ہوں؟''

''آپ ہیں تو لیکن آپ کہاں؟''

''میں تو یہی کہوں گا کہ تم وہاں شادی کرو جہاں تم خوش رہ سکو۔ اگر تمہاری رضا ہو تو تمہیں خوش رکھنے کے لیے میں تیار ہوں۔''

''سر، آپ.....؟''

''کیوں، اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ تم یہی کہو گی نا کہ میں شادی شدہ ہوں، میرے بچے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میں دو گھروں کا خرچ اٹھا سکتا ہوں۔''

''سر، اب مجھے یہ کہنے میں تکلف نہیں کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ کہنے کی ہمت ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ آپ کے اور میرے درمیان بہت فاصلہ ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرے لیے آپ کے دل میں کیا ہے لیکن آپ نے بھی کبھی اظہار نہیں کیا۔''

''میں بھی یہی سوچتا تھا کہ نہ جانے تمہارا ردِعمل کیا ہو؟''

''میں..... سوچتی ہوں کہ آپ بڑی مصیبت سے دوچار ہوجائیں گے۔ آپ کی بیوی یہ کبھی برداشت نہیں کریں گی کہ آپ دوسری شادی کریں۔''

''وہ میرا معاملہ ہے، میں سنبھال لوں گا۔ مجھے تو یہ فکر ہے کہ تمہارے گھر والے کیا سوچیں گے۔ وہ تیار ہوتے ہیں یا نہیں؟''

''آپ پہلے اپنی بیوی سے بات کرلیں۔ میرے گھر والے تو شاید خوش ہی ہوں گے کہ میری شادی اتنے بڑے آدمی سے ہورہی ہے۔''

اس کی بات بھی معقول تھی۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ میں اپنی بیوی سے بات کروں گا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے محسوس ہوا جیسے میرے کمرے میں بہت سے پھول بھر گئے ہیں۔ پھر اچانک وہ پھول ایک ایک کرکے مرجھانے لگے ہیں۔ مجھے یہ فکر ہونے لگی تھی کہ میں اپنی بیوی سے کیسے بات کروں گا۔ یہ بات سن کر اس کا ردِعمل کیا ہوگا۔ اس ردِعمل کے جواب میں مجھے کیا کہنا ہوگا۔ بہت دیر تک میں یہی سوچتا رہا تھا کہ میں یہ کہوں گا تو وہ یہ کہے گی۔ اس نے اگر یہ کہا تو میں کیا کہوں گا۔ مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا تھا کہ میں اس سے ڈرتا ہوں۔ ہمت کرنے کے باوجود ہمت نہیں ہورہی تھی۔ یہی سب کچھ سوچتے سوچتے چھٹی کا وقت آ گیا۔ میں نے نائلہ کو ساتھ لیا اور اسے اس کے گھر چھوڑتے ہوئے اپنے گھر آ گیا۔ عرفانہ میرا انتظار کیے بغیر چائے کی ٹیبل پر آ گئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی مجھے غصہ آ گیا۔ ایسی عورت کے ساتھ رہنے سے کیا فائدہ جو چائے تک پر میرا انتظار نہیں کرسکتی۔ میں خود ہی بے غیرت بن کر ٹیبل پر آ گیا۔ میرا بڑا جی چاہا بھی وہاں بیٹھا تھا لہٰذا اس وقت بات کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے سوچا کسی اور وقت موقع دیکھ کر بات کرلوں گا۔

چائے سے نمٹتے ہی عرفانہ کسی پارٹی میں چلی گئی۔ بیٹے اپنے اپنے کمروں میں بند ہوگئے۔ میں اپنے کمرے میں لیٹ کر ٹی وی دیکھنے لگا۔ مجھے نیند آ گئی تھی کہ عرفانہ لوٹ آئی۔ میں کچھ سوچ کر رک گیا کہ اس وقت عرفانہ کا موڈ نہ جانے کیسا ہو، کل بات کرلوں گا۔

دوسرے دن دوپہر ہی کو آفس سے چلا آیا۔ یہ سوچ کر آیا تھا کہ جاتے ہی عرفانہ سے بات کروں گا۔ دفتر سے جلدی آ جانے پر عرفانہ نے پوچھا بھی تھا لیکن اصل بات بتانے کے بجائے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کرکے لیٹ گیا۔ شام کو کچھ مہمان آ گئے اور بات پھر رہ گئی۔

اسی طرح کوئی نہ کوئی رکاوٹ آتی رہی اور بات نہ ہوسکی۔ ہفتہ بھر گزرا تھا کہ نائلہ نے مجھے یہ اطلاع دی کہ اس کے کزن کا رشتہ آیا تھا اور اس نے انکار کردیا۔ اس کے گھر میں بہت ہنگامہ ہوا تھا اور وہ میری خاطر سب سے الجھ پڑی تھی۔ اس نے غصے میں آ کر سب کے سامنے کہہ دیا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرے گی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کے گھر والے خوش ہوں گے کہ انہیں پیسے والا داماد مل رہا ہے لیکن وہاں تو ماتم ہوگیا تھا۔ مجھ سے الجھنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی ورنہ تو سب مجھ سے لڑنے میرے دفتر چلے آتے۔ اور اب وہ میرے آگے گڑگڑا رہی تھی۔

''میں نے آپ کی خاطر پورے خاندان سے لڑائی مول لے لی ہے۔''

''تم فکر کیوں کرتی ہو۔ میں نے اپنی بیوی سے بات کرلی ہے۔ بس تم کچھ دن صبر کرلو۔ ایک بار اور بات کرلوں۔''

''سر، اب میرا گھر میں رہنا مسئلہ بن گیا ہے۔''

''میں نے کہا نا، کچھ دن اور صبر کرلو۔''

وہ مطمئن ہوگئی لیکن میں فکر میں ڈوب گیا۔ میں اسی وقت دفتر سے اٹھ کر گھر آ گیا۔ یہ سوچ کر آیا تھا کہ ابھی تازہ تازہ غصہ ہے جاتے ہی، بیوی سے بات کروں گا۔ اس کی بداخلاقی یاد دلاؤں گا اور صاف کہہ دوں گا کہ میں دوسری شادی کررہا ہوں۔ دل میں ڈر بھی رہا تھا لیکن نائلہ کی باتیں سن کر ایسا دل دکھا تھا کہ عرفانہ ایسی ہستی نظر آ رہی تھی جس نے مجھ پر بھی ظلم کیا ہے اور نائلہ پر بھی۔

مجھے ناوقت گھر پر دیکھ کر عرفانہ حیران ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا بھی تھا لیکن میں کوئی جواب دیے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اسے نظرانداز کیا تھا۔ اسے یہ کہاں برداشت ہوتا۔ وہ پاؤں پٹختے ہوئے اندر آئی۔

"یہ کیا لگا رکھا ہے۔ جب دیکھو، دفتر چھوڑ کر گھر چلے آتے ہو۔ اس طرح تو ہو چکا کام۔"

"میری طبیعت خراب تھی۔"

"اب تمہاری طبیعت خراب رہنے لگی ہے تو ایسا کرو گھر میں ہی پڑے رہو۔ میں دفتر کسی اور کے سپرد کر دوں گی۔"

"تم تو ایسی بات کر رہی ہو جیسے میں تمہارا نوکر ہوں۔"

"یہ مت بھولو کہ یہ دفتر میرا ہے۔ اب تم خود کو نوکر سمجھو یا کچھ اور۔" اس نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

اس کے چلے جانے کے بعد میرے سوچنے کے لیے ایک دروازہ اور کھل گیا۔ میں سوچ رہا تھا، صرف طبیعت خراب ہونے پر یہ عورت مجھے دفتر سے نکالنے کی دھمکی دے رہی ہے میں دوسری شادی کر لوں گا تو یہ مجھے گھر سے نکال دے گی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ یاد آیا کہ جس گھر کی چھت کے نیچے میں بیٹھا ہوں، وہ بھی اسی کے نام ہے۔ سارے اکاؤنٹ تک وہ دیکھتی ہے۔ میرا یہاں کیا ہے میں نے اگر نائلہ سے شادی کر لی تو پھر وہیں کھڑا ہو جاؤں گا جہاں سے سفر آغاز کیا تھا۔ اب میری عمر ایسی ہے کہ اپنا مستقبل پھر سے بناؤں گا؟

یہ سب باتیں مجھے پہلے میں سوچ لینی چاہیے تھیں۔ میں نے نائلہ کے دل میں اپنی محبت کا چراغ جلا دیا تھا۔ اس نے میری خاطر منگنی بھی توڑ دی تھی اور اب یہ باتیں سامنے آ رہی تھیں۔ اب مجھے دونوں راستوں میں سے ایک راستے کا انتخاب کرنا تھا۔ ایک طرف شاندار عہدہ، شاندار رہائش اور عیش و آرام تھا، دوسری جانب نائلہ کے جذبات تھے۔ پھر میں نے اپنے لالچ پر ایک اور پردہ ڈالا۔ میرے بچوں کا مستقبل تباہ ہو جائے گا یا کم از کم یہ تو ہوگا کہ وہ مجھ سے چھن جائیں گے۔

میں دوسرے دن دفتر گیا تو کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ نائلہ جتنی مرتبہ میرے کمرے میں آئی میری طرف سوال طلب نظروں سے دیکھتی رہی۔ میں انجان بنا رہا۔ کوئی جواب تھا ہی نہیں تو کیا دیتا۔ بالآخر چھٹی سے کچھ دیر قبل اس نے خود ہی پوچھ لیا میں نے پھر اس سے دو چار دن کا وقت مانگ لیا۔

یہ دو چار دن بھی یونہی گزر گئے اور اب میں کسی نتیجے پر پہنچ گیا تھا۔ میں نے نائلہ سے کہا، وہ میری گاڑی میں جا کر بیٹھے، میں آتا ہوں۔ اس کی خوشی اس کے چہرے پر آ گئی تھی۔ وہ بے چاری یہی سمجھی ہوگی کہ میں اسے خوش خبری سنانے کے لیے کہیں لے جا رہا ہوں۔

جو باتیں میں کرنا چاہتا تھا اس کے لیے دفتر مناسب جگہ نہیں تھی۔ عرفانہ نے ایک بنگلا گلشن معمار میں بنوایا تھا۔ میں اسے وہاں لے کر چلا گیا۔ میں ایسا ... کم ہمت تھا کہ وہاں پہنچ کر بھی خاموش بیٹھا تھا۔ بالآخر اسی نے خاموشی کو توڑا۔

"آپ کچھ بولیے نا۔ آپ مجھے یہاں کیا بتانے کے لیے لائے ہیں؟"

"نائلہ، میری عمر اور میرا تجربہ تم سے بہت زیادہ ہے۔"

"یہی بات تو مجھے اچھی لگتی ہے۔"

"میرا تجربہ کہتا ہے کہ جو ہم نے سوچا تھا، غلط تھا۔"

"کیا مطلب سر!"

"مطلب یہ کہ میں نے بہت غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ہمارے لیے کسی طرح مناسب نہیں ہوگا کہ ہم شادی کر لیں۔ میرے بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ ان کے لیے یہ شادی حادثے سے کم نہیں ہوگی۔ ان پر اس کا اثر بہت برا پڑے گا۔ میری بیوی بھی اسے آسانی سے برداشت نہیں کرے گی۔ کوئی ایسا ہنگامہ کھڑا کر دے گی جو تمہیں متاثر کرے گا۔ دو گھروں کو بچانے کے لیے ضروری ہے کہ میں راستے سے ہٹ جاؤں۔ تم جوان ہو، تمہیں بھی شادی کرنی ہے، اچھی زندگی گزار سکتی ہو۔ تمہاری نوکری پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ میں تمہاری تنخواہ بھی بڑھا دوں گا تاکہ تم اپنے شوہر کے ساتھ اچھی زندگی گزار سکو۔"

"سر، آپ نے بالکل صحیح سوچا۔ میری کم عمری نے یہ باتیں مجھے سجھائی ہی نہیں تھیں۔ واقعی میں کتنی نادانی کر رہی تھی۔ ایک عورت کا گھر اجاڑ کر اپنا گھر بسانا چاہتی تھی۔ آپ کے بچے آپ کو کتنے عزیز ہوں گے، وہ بھی چھوٹ جائیں گے۔ اچھی بھلی زندگی اجڑ جائے گی۔ ایک میری خوشی کے لیے آپ اتنی زحمت کیوں اٹھائیں۔"

"مجھے معلوم ہے یہ سب تم دل سے نہیں کہہ رہی ہو۔"

"نہیں سر، میں خوش ہوں۔ مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو گیا ہے۔ میں جوان ہوں، مجھ سے تو کوئی بھی شادی کر سکتا ہے، آپ کیوں فکر کرتے ہیں۔"

مجھے معلوم تھا کہ اس کی آواز رو رہی ہے۔ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، دل سے نہیں کہہ رہی ہے لیکن اس وقت مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ مان گئی تھی یہی بہت تھا ورنہ میں تو یہ ڈر رہا تھا کہ اگر اس نے ہنگامہ کیا اور بات عرفانہ تک پہنچ گئی تو کیا ہوگا؟

میں اسے چھوڑنے اس کے گھر تک گیا تھا۔ وہ گھر سے کچھ فاصلے پر ہی اتر گئی تھی۔ میں نے اترتے ہوئے ہلکے سے اس کا ہاتھ دبایا تھا اور تسلی دی تھی کہ وہ پریشان نہ ہو۔ میری مجبوری سمجھ کر مجھے معاف کر دے اور پابندی سے دفتر آتی رہے۔

میں اسے یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ میرے دل میں لالچ آ گیا ہے۔ میں عہدہ اور عیش و عشرت نہیں چھوڑ سکتا۔ میں نے تو اسے یہ باور کرایا تھا کہ ایک عورت کو اپنانے کے لیے دوسری عورت پر ظلم کیوں کروں۔

میں نے سوچا تھا، وہ آتی رہے گی تو اسے آہستہ آہستہ سمجھاتا رہوں گا۔ اسے مجبور کروں گا کہ وہ اپنے کزن سے شادی کر لے لیکن اس نے تو کمال کر دیا۔ وہ کئی دن تک غیر حاضر رہی اور پھر اس کا استعفیٰ آ گیا۔ اس کا ردعمل یہی ہونا چاہیے تھا۔ یہ معاملہ میرے لیے اہمیت نہ رکھتا ہو لیکن اس کے لیے تو لڑکی ہونے کے ناتے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ میری خاطر وہ اپنا مستقبل چھوڑ چکی تھی۔ میں نے تو ایک طرح سے اس کی بے عزتی کی تھی۔ میں اس کا استعفیٰ ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا، اس کے گھر جا کر اس سے معافی مانگوں اور کہوں کہ وہ استعفیٰ واپس لے لے۔ میری کم ہمتی پھر میرے آڑے آ گئی۔ میں نے سوچا، اس سے پہلے کہ کوئی اور بات نکلے چپ ہی رہو۔ اگر اس راستے پر چلتا رہا تو کوئی نہ کوئی ٹھوکر ضرور لگے گی۔

مجھے یہ احساس ضرور تھا کہ کسی لڑکی کو میں نے دھوکا دیا ہے لیکن کوئی احساس کسی کو کتنے دن پریشان کر سکتا ہے۔ رفتہ رفتہ نائلہ میرے خیالوں سے دور ہوتی چلی گئی۔ ایک دن وہ بھی آیا کہ شاید نائلہ کا نام بھی میرے ذہن میں محفوظ نہیں رہا ہوگا۔

اس واقعے کو آٹھ سال ہو گئے تھے۔ میرے بڑے بیٹے نے پسند کی شادی کر لی تھی۔ دوسرا بیٹا پڑھنے کے لیے لندن چلا گیا تھا۔ میں خوش تھا کہ میری ذمے داریاں ختم ہو گئیں لیکن عرفانہ سے میرے جھگڑے بڑھتے جا رہے تھے۔ اب ہمارے کمرے بھی الگ ہو گئے تھے۔ ہمارے ان جھگڑوں نے بیٹے اور بہو پر بھی اثر ڈالا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ میری بیوی ہی میری عزت نہیں کرتی تو اسے کیا پڑی تھی۔ اس نے بھی میری بے عزتی شروع کر دی۔ بیٹا پہلے ہی سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ اب عرفانہ نے اسے مزید بھڑکانا شروع کر دیا تھا۔ میری حالت یہ ہو گئی کہ گھر کے نوکر بھی مجھے اپنا نوکر سمجھنے لگے۔ بیٹے کے دل میں یہ بے ایمانی آئی کہ میری جگہ وہ سنبھال لے اور مجھے دفتر سے بالکل ہی بے دخل کر دے۔ پھر ایک دن عرفانہ نے یہ حکم سنا ہی دیا کہ وہ مجھے نوکری سے نکال رہی ہے۔

"عرفانہ، تم مجھے اب تک نوکر سمجھتی رہی ہو جو نوکری سے نکال رہی ہو۔ ٹھیک ہے یہ کاروبار تمہارے باپ کا ہے اور تمہارے نام ہے لیکن میں تمہارا شوہر ہوں۔ تمہارے بچوں کا باپ ہوں۔ اگر میں بوڑھا ہو گیا ہوں تو ٹھیک ہے، گھر بیٹھ جاتا ہوں۔ تمہارا بیٹا کاروبار سنبھال لے گا۔"

"کون سے گھر میں بیٹھو گے؟" عرفانہ نے بڑی بدتمیزی سے کہا "یہ گھر بھی تو میرا ہے۔"

"میں نے کب کہا میرا ہے لیکن میاں بیوی ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ دونوں کی چیزیں الگ الگ نہیں ہوتیں۔"

"اتنی غیرت تھی تو بنواتے الگ گھر اور ٹھہراتے مجھے وہاں۔"

"میں نے جتنے دن تمہاری نوکری کی اس کی تنخواہ گھر ہی میں تو خرچ کی۔ تمہارے سر پہ آٹے اسی سے تو ہوتے تھے۔ میں نے اپنی تنخواہ الگ جمع کر کے تو نہیں رکھی۔"

"مجھے کیا خبر تم نے کتنا غبن کیا اور کہاں کہاں لٹایا؟"

"میں کہاں لٹاؤں گا عرفانہ!"

"لڑکیوں پر اور کہاں، تمہیں تو یہ شرم بھی نہیں آتی کہ اس عمر میں ایسی حرکتیں کرتے پھرتے ہو۔"

"میں نے کس لڑکی پر کیا خرچ کر دیا؟"

"اب میں تمہارے پیچھے پیچھے تو پھرتی نہیں رہتی ہوں۔ بس اتنا معلوم ہے نائلہ نام کی کوئی لڑکی ہے جس پر تم فدا ہو اور کون کون ہے مجھے کیا خبر؟"

"تم کس نائلہ کا ذکر اس وقت لے کر بیٹھ گئیں۔"

"یاد آ گئی نا نائلہ!"

"وہ میری سیکریٹری تھی اور کچھ نہیں تھی اور وہ اب نوکری چھوڑ بھی چکی ہے۔"

"ملنا جلنا تو نہیں چھوڑا اور کیا خبر شادی بھی کر لی ہو۔"

"عرفانہ، ایسا کچھ ہوتا تو میں تمہیں بتا چکا ہوتا۔"

"چلو، تمہیں زحمت نہیں کرنی پڑی۔ مجھے خود معلوم ہو گیا۔"

"تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے۔ تم وہمی ہو اور شکی بھی۔ اس وقت بھی محض شک کی بنیاد پر بات کر رہی ہو۔ اس کا علاج تو لقمان کے پاس بھی نہیں۔"

"لقمان کے پاس نہ ہو لیکن میرے پاس ہے۔ میں تم سے طلاق لے رہی ہوں۔ میرے بیٹے اب بڑے ہو گئے ہیں۔ وہ میری دیکھ بھال تم سے اچھی کر لیں گے۔"

"عرفانہ!" میری آواز پہلی مرتبہ اس کے سامنے بلند ہوئی "تم اتنی خود غرض بھی ہو سکتی ہو' یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ تم مجھ سے طلاق مانگو، میں خود تمہیں طلاق

دے دوں گا۔ میں تمہیں ایک ہفتہ سوچنے کے لیے دے رہا ہوں۔ اس کے بعد بھی تمہیں عقل نہیں آتی تو میں تمہارا یہ شوق بھی پورا کردوں گا۔''

''میں اچھی طرح سوچ چکی ہوں۔ مجھے طلاق چاہیے۔''

''ایک ہفتے بعد ملے گی۔'' میں نے کہا اور گھر سے نکل گیا۔

رات کا وقت تھا۔ یونہی بے مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہا۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ نائلہ کے گھر جاؤں لیکن آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ میرا یہ سوچنا بجا تھا کہ اب تک تو اس نے شادی بھی کرلی ہوگی۔ نہیں بھی کی ہو تو ملتے ہوئے کیا اچھا لگوں گا۔

رات کو کسی وقت گھر آیا۔ چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ میں نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی اور اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔ صبح اٹھا تو عرفانہ سو رہی تھی۔ ملازم نے ناشتا لگا دیا۔ میں جس طرح دفتر جاتا تھا، اسی طرح دفتر چلا گیا لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مجھ سے پہلے میرا بیٹا میرے کمرے میں موجود تھا۔ نہ صرف موجود تھا بلکہ میری کرسی پر بیٹھا تھا۔

''ممی نے کہا تھا، آج سے آپ کا کام میں سنبھالوں گا۔ اچھا ہوا آپ آ گئے، ضروری فائلیں وغیرہ آپ سے سمجھ لوں گا۔ اکاؤنٹنٹ کو میں نے بلا لیا ہے، وہ حساب کتاب بھی چیک کرا دے گا۔ آپ کے پاس جو چیک بکس وغیرہ ہیں وہ بھی دے دیجیے۔''

وہ بول رہا تھا اور میں اس کا منہ دیکھ رہا تھا۔ میرا بیٹا ہو کر کس بدتمیزی سے مجھ سے بات کر رہا تھا۔ آفس میرا تھا اور میں کسی کلائنٹ کی طرح اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہی ملازم جو کل تک مجھے سلام کرتے تھے، اب اس کے لیے فرشِ راہ ہو رہے تھے۔ مجھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سب مجھ پر شک کر رہے ہوں۔ ممکن ہے یہ میرا وہم ہو۔

''ٹھیک ہے ڈیڈی، باقی کام رفتہ رفتہ میری سمجھ میں آ ہی جائے گا۔ دفتر کے لوگ مدد کردیں گے اور پھر میں پڑھا لکھا ہوں، آپ سے اچھا ہی سنبھال لوں گا کاروبار۔'' میرے بیٹے نے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن کبھی یہ سوچا کہ تمہیں پڑھا لکھا کر اس قابل بنایا کس نے؟''

''کون سا کمال کیا ڈیڈی! سب کے باپ یہی کرتے ہیں۔''

''مگر سب کے بیٹے انہیں کاروبار سے بے دخل نہیں کر دیتے۔''

''بے شک! لیکن یہ کاروبار آپ کا نہیں ممی کا ہے۔ وہ جس کو چاہیں رکھیں جس کو چاہیں نکالیں۔ بے دخل میں نہیں کر رہا ہوں، ممی نے آپ کو بے دخل کیا ہے۔''

''تم انہیں سمجھا تو سکتے تھے، اس بڑھاپے میں مجھے یہ دن بھی دیکھنا تھا۔''

''وہ آپ کا اور ممی کا معاملہ ہے، میں کیا کرسکتا ہوں؟''

میرا خون مجھے آنکھیں دکھا رہا تھا۔ کسی اور سے کیا گلہ کرتا۔ کچھ اور کہنے کی گنجائش یوں بھی نہیں رہی تھی کہ میرے بیٹے نے اپنے ڈرائیور کو بلا لیا تھا۔ میں اس کے آنے سے پہلے کمرے سے نکل آیا۔ کئی ہاتھوں نے مجھے سلام کیا لیکن ظاہر ہے اب ان میں وہ گرم جوشی نہیں تھی جو کبھی ہوا کرتی تھی۔

گھر کے سوا کون سا ٹھکانا تھا' میں گھر چلا آیا۔ عرفانہ پھر میرے سامنے نہیں آئی تھی۔ یہ لگتا تھا جیسے پردہ کر رہی ہو۔ میرے دل میں ایک ہلکی سی امید پھر بھی تھی کہ ممکن ہے وہ اپنے فیصلے پر... نظرِ ثانی کرلے۔ کاروبار بے شک اس کا بیٹا سنبھال لے۔

میں نے اس گھر میں ایک ہفتہ بن بلائے مہمانوں کی طرح گزارہ۔ عرفانہ اپنے وعدے کی پکی تھی۔ ایک ہفتہ گزرنے کے بعد وہ میرے سامنے آئی اور ایک مرتبہ پھر اپنا مطالبہ دہرایا۔ میں نے پھر سمجھانے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ اب تو وہ یہ دھمکی دے رہی تھی کہ اگر میں نے اسے ازخود طلاق نہیں دی تو وہ مجھے عدالت میں بلا لے گی۔ عدالت ظاہر ہے وہی فیصلہ کرتی جو فیصلہ عرفانہ کا ہوتا لہٰذا میں نے طلاق دے دی۔ عرفانہ نے یہ احسان کیا کہ مہر کی رقم معاف کردی۔

میرا اس گھر میں کچھ نہیں تھا۔ میں نے اپنی عمر کے قیمتی سال یہاں گزارے تھے جو کچھ کمایا تھا اسی گھر میں لگایا تھا۔ بچوں کی تعلیم پر جو کچھ خرچ کیا تھا وہ میرا تھا اور اب میرے لیے کچھ نہیں تھا۔ میرے استعمال میں جو گاڑی تھی وہ بھی میرے نام نہیں تھی لہٰذا جب میں گاڑی میں بیٹھنے لگا تو ایک ملازم نے آ کر روک دیا، بیگم صاحبہ کہہ رہی ہیں، یہ گاڑی یہیں چھوڑ کر جایئے۔ میں نے اسی ملازم سے ٹیکسی منگوائی اور ہوٹل مہران چلا گیا۔ یہی میں نے سوچا تھا کہ کچھ دن ہوٹل میں ٹھہر کر کرائے کے کسی مکان کا بندوبست کرلوں گا۔

ایک اٹیچی جس میں کپڑے بھرے ہوئے تھے، اس کے سوا میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ کوٹ کی جیب میں ایک چیک بک پڑی تھی جو میرے ذاتی اکاؤنٹ کی تھی۔ میرے

اکاؤنٹ میں تقریباً دس لاکھ کی رقم تھی۔

دوسرے دن میں بینک گیا اور کچھ رقم نکلوالی۔ یہ نائلہ کی کشش تھی یا کیا تھا کہ میں نے ناظم آباد میں ایک مکان کا پورشن اپنے رہنے کے لیے کرائے پر لے لیا۔

میں نے پہلی ہی رات اپنی زندگی کا جائزہ لیا تو میں وہیں کھڑا تھا جہاں سے زندگی شروع کی تھی بلکہ اس سے بھی نیچے آ گیا تھا۔ میں والدین کے ساتھ کرائے کے مکان ہی میں رہتا تھا لیکن پورا مکان تھا اور اب ایک پورشن میں رہ رہا تھا۔ والدین کے انتقال کے بعد جب عرفانہ کے والد سے ملاقات ہوئی تو وہ مکان میں نے چھوڑ دیا تھا اور اب دنیا گول ہے کے مصداق وہیں آ گیا تھا۔ یہ سوچ کر بھی دکھ ہو رہا تھا کہ آٹھ سال پہلے اگر نائلہ سے شادی کرلی ہوتی تو بھی یہی ہونا جو اب ہوا ہے۔ میں نے جو کچھ پانے کے لیے نائلہ کو ٹھکرایا تھا وہ اب چھن گیا۔ یہی سب کچھ ہونا تھا تو اس وقت ہو گیا ہوتا۔ اس وقت سے اب تک میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو چکا ہوتا۔ نائلہ بھی ہاتھ سے گئی اور عیش و عشرت بھی چھن گئی۔ میں نے لالچ کیا تھا، میرا انجام یہی ہونا تھا۔

میرے پاس تجربہ بھی تھا اور تعلقات بھی تھے۔ ایک دوست کی معرفت مجھے منیجر کی جاب مل گئی۔ تنخواہ اتنی تھی کہ مجھ اکیلے کے لیے کافی تھی۔ میں نے سیکنڈ ہینڈ گاڑی خرید لی۔ زندگی آرام سے گزرنے لگی لیکن ایک خلا تھا جو بھرنے میں نہیں آ رہا تھا۔ وہی نائلہ جسے میں فراموش کر چکا تھا، اب میرے حواس پر چھا گئی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے اس کا خیال آتا تھا۔ وہ اگر برباد ہوگئی ہوگی تو اس کا ذمے دار میں ہوں۔ خدا جانے وہ کہاں ہوگی۔ اسی دکھ نے مجھے شراب کی طرف مائل کردیا۔ اکیلا رہتا تھا۔ نہ کوئی ٹوکنے والا تھا، نہ ہاتھ پکڑنے والا۔ شراب میں ڈوبا تو ڈوبتا چلا گیا۔ شراب کس کی ہوئی ہے جو میری ہوتی۔ جو کچھ جمع پونجی تھی، آہستہ آہستہ خرچ ہونے لگی۔ صحت بھی ساتھ چھوڑنے لگی تھی۔ اس نشے نے میرے کام پر بھی اثر ڈالا۔ نوبت یہ آ گئی تھی کہ میں دفتر میں بیٹھ کر شراب پینے لگا۔ مالکان کب تک برداشت کرتے، دوستی ہونے کے باوجود انہوں نے مجھے ملازمت سے نکال دیا۔ اب میں نے دل کو راتیں بنالیا۔ ہر وقت شراب میں ڈوبا رہنے لگا۔ بینک میں چند لاکھ روپے رہ گئے تھے اور میں سمجھ رہا تھا زندگی اسی میں گزر جائے گی۔ دو سال اور گزرے تو اچانک مجھے ہوش آ گیا۔ بینک میں صرف دو لاکھ باقی رہ گئے تھے۔ یہ کتنے دن چلیں گے؟ مجھے کہیں نوکری کرنی چاہیے لیکن میری حالت ایسی نہیں تھی کہ کوئی مجھے نوکری دیتا۔ میں نے کوشش کی کہ شراب چھوڑ دوں لیکن اب شراب مجھے نہیں چھوڑ رہی تھی۔ نشے نے اعصاب اتنے توڑ دیے تھے کہ خود پر بھی قابو نہیں رہا تھا۔ روز توبہ کرتا تھا، روز توڑ دیتا تھا۔ کئی مرتبہ سوچا کہ قسطوں میں مرنے سے بہتر ہے ایک ہی مرتبہ مر جاؤں۔ خودکشی کرلوں۔ تماشا بننے سے تو حرام موت ہی اچھی لیکن کم ہمت تھا، یہ حوصلہ بھی نہ ہوا۔ تنگ آ کر میں نے ایک ایسے اسپتال کا رخ کیا جن کا دعویٰ تھا کہ وہ ہر قسم کا نشہ چھڑوا دیتے ہیں۔ ان لوگوں نے مجھے ایڈمٹ کرلیا۔ میں نے وہاں جو تکلیف اٹھائی اس کا ذکر فضول ہے۔ یہ اسپتال کیا تھا، ایک قسم کا پاگل خانہ تھا۔ مجھے ''چرس یا وارڈ'' میں بھیج دیا گیا۔ مجھے زنجیروں سے باندھ کر رکھا جاتا تھا۔ طرح طرح کے انجکشن لگائے جاتے تھے۔ میں شراب کے ایک قطرے کے لیے بھیک مانگتا تھا جس کے جواب میں مجھے بے ہوش کردیا جاتا تھا۔ تقریباً پندرہ دن کی اذیت کے بعد مجھے جنرل وارڈ میں بھیج دیا گیا۔ اب میری حالت بہتر تھی۔ کبھی کبھی طلب ہوتی تھی جسے کسی انجکشن سے بجھا دیا جاتا تھا۔ پندرہ دن یہاں گزار دیے۔ اب میں بالکل ٹھیک تھا لیکن سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا۔ ڈاکٹروں کے بقول اب یہ میرے اوپر تھا کہ میں شراب چھوڑ دوں یا اس کے قریب نہ جاؤں۔ میں اسپتال سے نکلا تو نئی دنیا کا انسان معلوم ہو رہا تھا۔ علاج سے اتنا فائدہ ہوا تھا کہ میری قوتِ ارادی بہت بڑھ گئی تھی۔ ایک آدھ مرتبہ رات کے وقت شراب کا خیال بھی آیا تو میری قوتِ ارادی نے اس خیال کو ٹھکرا دیا۔ وقت گزاری کے لیے اپنا زیادہ وقت باہر گزارنے لگا تھا۔ ان دوستوں سے ملنا ترک کردیا تھا جو اس شغل کے عادی تھے۔ زندگی پھیکی ضرور ہوگئی تھی لیکن میں اب شراب کے قریب نہیں جا رہا تھا۔ اپنی غذا کا بھی خیال رکھ رہا تھا تاکہ کھوئی ہوئی طاقت بحال ہو جائے۔ رفتہ رفتہ میری ہڈیوں پر گوشت آنے لگا۔

ایک روز اخبار پڑھ رہا تھا کہ ایک اشتہار پر نظر پڑی۔ ایک فرم کے لیے منیجر کی ضرورت تھی۔ تجربہ شرط تھی، عمر کی کوئی قید نہیں تھی۔ میرے لیے یہ اسامی نہایت موزوں تھی۔ میرے پاس تجربہ بھی تھا اور تعلیمی قابلیت بھی۔ میں نے اسی وقت ہاتھ سے درخواست لکھی اور تحریر کردہ ایڈریس پر بھیج دی۔

مجھے یقین تھا کہ درخواست کے جواب میں انٹرویو لیٹر ضرور آئے گا۔ وہی ہوا تقریباً پندرہ دن بعد میرے پاس لیٹر آ گیا۔ میں نے بہت دن بعد اپنے پرانے سوٹ نکالے۔ ان میں سے ایک منتخب کیا اور انٹرویو کے لیے پہنچ گیا۔ مجھے ایک بڑے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ میرے علاوہ وہاں چار آدمی

اور بیٹھے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ یہ چاروں نوجوان تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کا تجربہ مجھ سے کم تھا۔ تجربے کی بنیاد پر میرا سلیکشن لازمی تھا۔ میں ایک انشورنس کمپنی کا ایم ڈی رہ چکا تھا۔

انٹرویو شروع ہوا تو ایک نوجوان اٹھ کر گیا۔ سب کی نظریں اس کی واپسی پر لگی ہوئی تھیں۔ سب یہ جاننے کے لیے بے چین تھے کہ انٹرویو لینے والا کیسا ہے اور کیا سوالات پوچھے جارہے ہیں۔ وہ نوجوان جیسے ہی واپس آیا سب نے سوالوں کی برسات کردی۔ معلوم ہوا انٹرویو لینے والی خاتون ہے اور بڑی سخت طبیعت کی مالک ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے جیسے اسے مردوں سے نفرت ہے۔

وہ نوجوان کچھ مایوس نظر آرہا تھا حالانکہ اس کے پاس باہر کی ڈگری تھی۔ اتنی دیر میں دوسرے صاحب اندر جاچکے تھے۔ باقی دو کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

''بزرگوار! شاید آپ کا کام بن جائے۔'' ایک نے کہا۔

''کیوں بھائی، وہ کیوں؟''

''انٹرویو لینے والی نوجوان لڑکی ہے۔ آپ کا تو وہ یوں بھی ادب کرے گی۔''

''ادب کرے گی لیکن ضروری نہیں کہ نوکری بھی دے دے۔''

''ہاں، یہ بھی ہے۔'' وہ دونوں چپ ہوگئے۔

دوسرا نوجوان واپس آیا تو وہ بھی زیادہ خوش نہیں تھا۔ اب تیسرے صاحب کی باری تھی۔ یہ ادھیڑ عمر کے تھے لہٰذا کچھ کچھ یقین کیا جاسکتا تھا کہ وہ مایوس نہیں لوٹیں گے۔ وہ واپس آئے تو واقعی خوش تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ عورت مزاج کی سخت ہے لیکن قابل آدمی کی قدر کرتی ہے۔ اب ایک صاحب اور تھے یا میں تھا۔ مجھ سے پہلے ان صاحب کا نمبر پکارا گیا۔ اب میں اکیلا رہ گیا۔ ذہنی طور پر تیار ہوچکا تھا کہ ان صاحب کے آنے کے بعد مجھے بلایا جائے گا لیکن اس وقت مجھے دھچکا لگا جب ایک خاتون نے آکر مجھے بتایا کہ میڈم تھک گئی ہیں۔ اب وہ مزید انٹرویو نہیں کرسکتیں، آپ کل تشریف لائیے گا۔ یہ سننا تھا کہ میرا پارا چڑھ گیا۔

''میڈم اتنی نازک ہیں کہ چار آدمیوں کے انٹرویو لینے میں تھک گئیں؟''

''میں کیا کرسکتی ہوں، ان کا یہی حکم ہے۔''

''میں انہیں بتاتا ہوں کہ حکم کیسے دیا جاتا ہے۔'' میں نے کہا اور میڈم کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔

''انکل، کیا کررہے ہیں۔ اس طرح تو آپ اپنا کام اور بگاڑ لیں گے۔'' وہ چیختی رہی اور میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ میرے ساتھ ہی اس کی سیکریٹری بھی اندر داخل ہوئی۔

''میڈم، یہ صاحب زبردستی اندر گھس آئے ہیں جبکہ میں نے انہیں بتادیا تھا کہ انٹرویو نہیں ہوسکتا۔''

''کوئی بات نہیں، بزرگ آدمی ہیں، تم جاؤ۔''

اتنی دیر میں، میں اسے پہچان چکا تھا۔ وہ جان بوجھ کر فائلوں پر جھکی ہوئی تھی لیکن میں اسے کیسے نہ پہچانتا۔ وہ نائلہ تھی۔

''ارے..... سر، آپ!'' اس نے فائلوں سے نظر اٹھائی۔

''اس طرح زبردستی کسی کے کمرے میں گھس آنا بدتمیزی ہوتی ہے لیکن میں اس طرح آپ کو نہیں ڈانٹ سکتی جس طرح آپ نے کبھی اس حرکت پر مجھے ڈانٹا تھا، آپ تشریف رکھیں۔''

میں کرسی پر بیٹھا نہیں گرگیا۔ اس نے پھر بولنا شروع کردیا تھا ''سر، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ بہت کمزور لگ رہے ہیں۔''

''ہاں، نائلہ! یہ عمر کی نہیں حالات کی تھکن ہے۔''

''آپ اور نوکری کی تلاش میں؟ میں کچھ سمجھی نہیں۔''

''میں تمہارا مجرم ہوں، پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم نے شادی کرلی؟''

''آپ کو اس سے کیا؟''

''میں سمجھوں گا میرا آدھا جرم کم ہوگیا۔''

''یہ فرم میرے شوہر ہی کی ہے جسے میں چلا رہی ہوں۔ وہ دوسرا کاروبار کرتے ہیں۔''

''چلو، مجھے خوشی ہوئی کہ تمہارا گھر بس گیا۔ میں نے تمہارا دل توڑا تھا مجھے اس کی سزا مل گئی۔ میری بیوی نے مجھ سے طلاق لے لی۔ تمام کاروبار اسی کے نام تھا۔ اب میں نوکری کی تلاش میں ہوں۔''

''میں اتنی بے درد نہیں ہوں کہ اپنے محسن کو بھول جاؤں۔ آپ کل سے جوائن کرسکتے ہیں۔''

''بہت اچھا۔ میں کل پھر حاضری دوں گا۔''

''میں دفتر سے نکلنے ہی والی ہوں، آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دوں گی۔''

''نہیں، میرے پاس کار ہے، میں چلا جاؤں گا۔''

قسمت مجھے اسی موڑ پر لے آئی تھی جہاں کبھی نائلہ کھڑی تھی۔ اس سے مختلف اسی طرح ہوسکتا تھا کہ اس کی دی ہوئی نوکری قبول نہ کروں۔ میں پھر کبھی لوٹ کر نہیں گیا۔ ایک دوسری جگہ نوکری کرلی ہے اور گمنامی کی زندگی بسر کررہا ہوں۔